خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2015

عمران علی

معراج رسول

نیا سحر انگیز طلسماتی ناول

شیش محل

اسماء قادری کے قلم سے

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرواعلیٰ: عذرا رسول

جلد 45 • شمارہ 10 اکتوبر 2015 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

عید مبارک

پبلشر، پرائنٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 500
: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

مژدہ

ہم جو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی سلائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور دہشتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے حجروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس المناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سوتیلی ماؤں کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کمخواب کے بستر پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھاتی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کھیت یا کھلیان سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی جائے اور پھر دل و دماغ کی آنکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور سیکڑوں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی ظالم کے سرِ پُرغرور کا ایک ذرہ، کسی مظلوم کے چہرے، ہوئے جگر کا ایک ریشہ اور کسی مقتول کی کتری جانے والی انگلیوں کی باقیات اس مٹھی بھر مٹی میں گھل گئی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرے سے کسی نیک نفس اور برگزیدہ انسان کی خوشبو آ رہی ہوگی اور کسی ذرے سے ہامان و نمرود کے خبثِ باطن کی سڑاند اٹھ رہی ہوگی۔

لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹھی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گزشتگاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکھنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویائی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور میں نے تو ابھی زندگی کے مکتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمہیں یا کسی کو بھلا کیا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹھی بھر مٹی اپنے حکمرانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے بارے میں اور اپنے ایسے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی گلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے ہیں، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انہیں بتایا جائے کہ یہاں حکمرانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعون.... بے سامانی کے تجربے۔ ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹینٹوا چبایا۔

اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں امید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش امیدی سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دھتکارے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سنایا جا رہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جا رہی ہے جہاں پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو سکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوبصورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزتِ نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مژدے کو اس امید کے ساتھ سنا ہے کہ یہ وعدے، وعدۂ فردا نہیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انہیں ایک بار پھر نراس نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سنانے والوں نے بستیوں کو تراشنے کی ذمے داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارِ فرہادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنہوں نے کیا وہ اس پر پورے اتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخرو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔

آپ کے خط

محترم قارئین!

السلام علیکم!

اکتوبر 2015ء کا دلفریب شمارہ آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ مقررہ تاریخ پر لانے کے لیے پرچے کی تیاری چونکہ پہلے ہی کی جاتی ہے لہٰذا اس دوران عیدالاضحی اور عازمین حج کے قافلوں کی تیاری بھی عروج پر ہے۔ ہماری طرف سے حج اور عید قرباں کی مبارکباد قبول کیجیے۔ اگرچہ دورِ حاضر میں ان دونوں کی تیاری مہنگائی کی بدولت عوام کے لیے ایک آزمائش بن گئی ہے۔ بہرحال یہ تو سال بھر کے بعد آنے والے مواقع ہیں جیسے تیسے گزارہ کر ہی لیا جاتا ہے جبکہ روزمرہ کے معاملات اور حالات سے مقابلہ زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتا جارہا ہے، ابھی پچھلے دنوں تاجروں کے مسائل اور بینک ٹرانزیکشن پر عائد کردہ ٹیکسز کے مراحل ہی طے نہیں ہو پائے تھے کہ حکومت عالمی منڈی میں پیٹرول کی قیمتوں میں نمایاں کمی کے باوجود یہاں اس کا اطلاق کرانے میں بھی ناکام نظر آئی۔ حتیٰ کہ دودھ کی قیمتوں میں بے جا اضافہ بھی کسی کو نظر نہیں آیا۔ عالمی سطح پر نظر ڈالی جائے تو احساس ہوگا کہ اگر حکمران خلوصِ نیت سے عوام کی فلاح اور نظام کی درستگی کا سوچ لیں تو کون ہے جو ملک کو ترقی کرنے سے روک سکے۔ اس کی بہترین مثال ابوظہبی کے حکمران شیخ زید ہیں، جنہوں نے ایسے تمام نگینے انتہائی منصفانہ اصولوں پہ قائم کیے جو کسی بھی منظم ریاست کے لیے ضروری تھے اور ان کا فعال کردار ہی زندگی کو آسان بنا سکتا تھا۔ ہمارے یہاں صرف مسائل کے انبار اور وسائل کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے جبکہ امریکا کی ریاست کیلی فورنیا نے بھی ثابت کردیا ہے کہ اگر مصمم ارادہ باندھ لیا جائے تو بڑے سے بڑے طوفان کا سامنا بآسانی کیا جاسکتا ہے جو گزشتہ پانچ برسوں سے شدید قحط سالی کا شکار ہے لیکن نہ تو وہاں کوئی پیاس سے مرا اور نہ ہی بھوک و افلاس کا شور ہوا اور نہ ہی فصلیں متاثر ہوئیں جبکہ ہمارے یہاں جب بھی قدرتی آفات نازل ہوئیں چاہے زلزلہ ہو یا سیلابی تباہ کاریاں۔ وسائل کا رونا روتے ہوئے حکمران اور عوام ایک ہی سوچ پر اکٹھے تو ہوئے مگر ان کے حل کے لیے ایک ہی مرکز پر بھی متحد نہ ہوسکے تاکہ موثر اقدامات سے ان کا مقابلہ کیا جاسکتا جبکہ کیلی فورنیا نے تمام تر مشکلات کے باوجود اتنی ہمت کی کہ اس ریاست کی معیشت نے ملک بھر کی اوسط معیشت کے مقابلے میں 27 فیصد زیادہ ترقی کی اور کساد بازاری کے دوران ختم ہونے والی ملازمتیں بحال کر کے خوش حالی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ جب جائزہ لیا گیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہاں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ برسوں سے ان حالات سے مقابلہ کرنے کی تیاری کررہے تھے۔ مگر پاکستان میں تمام مسائل کا حل ہڑتالیں، دھرنے یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچا کر ہی کیوں تلاش کیا جاتا ہے۔ اس سب کے باوجود آج تک عوام کی مشکلات اپنی جگہ برقرار ہیں۔ بجلی، گیس کی لوڈشیڈنگ، مہنگائی کا وبال اور بے روزگاری کا عفریت اب تک پاکستانی عوام کی جان نہ چھوڑ سکے۔ حج کے اس مبارک ماہ میں اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ پاکستان کو بھی امن و سکون اور خوشحالی کی مثال بنادے (آمین)...... دعاؤں کے سائے تلے ہم بھی چلتے ہیں اپنی بارونق محفل کی جانب۔

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں ”ماہ ستمبر کا شمارہ آزادی کے دوسرے دن یعنی کہ 15 تاریخ کو ملا۔ ماڈل کو دلکش اور حسین بنا کر سرورق کو چار چاند لگا دیے۔ ایلیاجی حکومتوں کے بارے میں سمجھاتے نظر آئے جو کہ کافی مشکل سے سمجھ آیا۔ واقعی ستمبر پاک فضائیہ کے لیے یادگار ہے جب ایم ایم عالم نے 30 سیکنڈ میں 6 بھارتی طیارے مار گرائے اور اپنا نام تاریخ میں امر کردیا۔ ایسے شیر دل جوان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ عوام کے دکھ کو اجاگر کرتے اور حکمرانوں کی بے حسی کو بیان کرتے نظر آئے کہ کس طرح سیلاب میں مال مویشی اور انسان تک بہہ جاتے ہیں پر حکومتوں کو پروا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دے۔ اپنی محفل میں آئے تو بھائی عبدالجبار رومی انصاری کو بہت عمدہ اور جامع تبصرہ کرتے ہوئے پایا۔ مبارک ہو بھائی جان۔ توحیدی بھائی اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ نیازی بھائی بھی بہت عمدہ تبصرہ کر گئے اور ہاں کراچی کا موسم اب تو نارمل ہی ہے، کچھ دن کی گرمی نے ہی بے حال کردیا تھا۔ آر اے جے بھائی اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔ واقعی گھر سے باہر عید گزارنی مشکل ہوتی ہے تو جیل میں گزارنی، یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔ فلک شیر اور ابرار وارث بھی عمدہ تبصرے کرتے نظر آئے۔ بشریٰ افضل باجی اللہ پاک آپ کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائیں کہ آپ بہت بڑے دکھ سے گزر رہی ہیں۔ اعجاز احمد راحیل اور شوکت شہریار بھائی مختصر مگر اچھا تبصرہ کرتے بڑے عرصے بعد نظر آئے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی بیسٹ رہے۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی سے شروعات کیں بہت ہی نائس تحریر ہے جہاں پر پنی چری کے دل میں محبت کا لاوا پھوٹ پڑا۔ محبت اور پابندیوں میں جکڑے نوجوان کا احوال جاننے کے لیے اگلے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ کاشف زبیر محترم بھولا بھالا لے کر آئے۔ بہت ہی اعلیٰ پائے کی تحریر تھی جہاں پر سیدھا راستہ اپنانے والا بھولا بھالا اور حرام کمانے والا عقل مند سمجھا جاتا پر حرام کا پیسا حرام پر ہی لگتا ہے۔ جیسا کہ رحیم کریم بھائی کے ساتھ ہورہا ہے۔ اسما قادری کے قلم سے ایک عمدہ کہانی کا آغاز۔ شیش محل کی یہ قسط دیسی مگر اٹھان اچھی رہی۔ بلاشبہ یہ آگے جا کر بہت عمدہ کہانی ثابت ہوگی اور مجھے کردار بہت عمدہ لگے۔ سلیم انور فراموشی کا کھاؤ لے کر آئے جہاں ایک حسینہ فراموش کرنے پر ساتھی کو سزا دیتی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ منظر امام کی فقدان نے موڈ عمدہ کردیا۔ مرزا امجد بیگ کے کیسوں میں سے چنگاری آئی۔ جہاں پر بیگ صاحب نے شاہ نواز اور سائرہ کا مقدمہ بہت عمدگی سے لڑا اور دونوں کی محبت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ تنویر ریاض کی تجربہ میں لیرنس نے بروقت سب کو بچالیا۔ محفل شعر و سخن بہت عمدہ رہی۔ فاروق انجم جیسے کو تیسا لے کر آئے۔ یہ تحریر بھی عمدہ رہی۔ مجاہد نے کیا چال چلی، لطیف اور خادم کے ساتھ کہ ان کی چلی ہوئی چال ان کے گلے میں پڑ گئی۔ ماروی کی یہ قسط قدرے سکون سے رہی۔ مرینہ کے زندہ ہونے پر دکھ ہوا۔ عورت ہے کہ جن کی بچی۔ فی الحال محبوب واپس آگیا، آگے کا کوئی پتا نہیں۔ ابراہیم جمالی کی بہروپ میں جعلی پیر اور اندھے عقائد کے لوگوں کو واضح کیا گیا کہ کس طرح یہ لٹتے ہیں، ڈبا پیروں کے ہاتھوں۔ ثمر عباس کی تیرے نیناں بھی عمدہ رہی۔ حسینہ کے جال میں پھنسے لوگوں کا قصہ، بہت عمدہ رہی۔ شہاب جمال، رشتے کا زہر لے کر آئے۔ تحریر بہت ہی اچھی اچھی سی رہی۔ پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی تھی، بعد میں

جا کر کچھ اچھی لگی۔ یہ خوشی ہوئی کہ صندل کو آخر کار اجمل کی محبت مل ہی گئی۔ کترنیں بھی اچھی رہیں۔'' (بہت شکریہ)

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں شریک ہیں ''ستمبر کا شمارہ فوراً ہی موصول ہوا۔ پچھلے کچھ ماہ سے خاندان میں اموات کی وجہ سے کافی ڈپریشن رہا۔ آج کا انسان شدید مایوسی اور مشکلات کے دور سے گزر رہا ہے۔ اتنا تو آسرا ہے کہ دو دن سسپنس کی رنگارنگ کہانیوں کو پڑھ کر ذہن کو آزاد کرلیں۔ سرورق پر اس دفعہ دوشیزہ نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ معصومیت سے بھرپور ہے۔ ایک شاخ پر طوطا بھی بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔ کوئی اپنے کیمرے میں اس حسن کو قید کررہا ہے۔ انشائیہ میں حکومتوں اور عوام پر سیر حاصل تحریر دل کو لگی۔ یہ عوام ہی ہے جو بار بار نا کام اور بدنیت حکومتوں کو اپنے اوپر مسلط کرتی ہے۔ ہمیں عذاب اٹھانے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ تمام دوستوں کے خطوط بہت مزیدار ہیں۔ کتنی محبت ہے ایک دوسرے کے لیے۔ عبدالجبار رومی نے میرے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی اس کے ساتھ رانا سجاد، ادریس احمد خان، اشفاق شاہین، قاسم رحمٰن نے بہت محبت سے مجھے دلی تسلی دی۔ جو دوست جیل میں ہیں اور اتنا گداز دل رکھتے ہیں، اللہ ان کی غلطیوں کو معاف کردے اور رہائی نصیب کرے تاکہ وہ بھی اپنے پیاروں کے ساتھ آزادی سے زندگی بسر کریں۔ اللہ اکبر کی صداؤں کی لاج رکھ لے اے خدا میرے ملک کو سیلاب اور شدید موسمی حالات سے محفوظ رکھے (آمین)۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی کیا عمدہ تحریر ہے لیکن اس وقت کے سلطان کتنے بے رحم اور طاقت کے غرور میں مبتلا تھے۔ ابھی سلسلہ جاری ہے۔ بھولا بھالا، کاشف زبیر نے اس دفعہ ایک بہت عمدہ کہانی پیش کی۔ انسان کو خدا نے بڑی خداداد صلاحیتیں دی ہیں۔ ایک شخص ایمانداری کی منزلیں طے کرتے ہوئے جب خود پر قابو نہ رکھ سکا تو اسی ایمانداری پر رہتے ہوئے بے ایمانی اور بدبختی کی سزا دے بیٹھا تو بھولا، ٹیڑھا ہوگیا۔ شیش محل، نئی کہانی شروع تو لوکی کی کھیر سے ہوئی لیکن آگے جا کر دلچسپ روپ اختیار کرنے لگی۔ امید ہے آئندہ قسط اس سے بھی مزیدار ثابت ہوگی۔ فراموشی کا گھاؤ، ایک عورت کے انتقام کی کہانی۔ جس کو نظر انداز کیا گیا۔ وہ مشرقی عورت تو نہ تھی۔ اس نے جو شاطرانہ چال چلی وہ قیامت کی چال تھی۔ فقدان، ایک بڑی معمولی کہانی۔ ایک شخص شہر میں سکون ڈھونڈنے نکلا۔ اس سے بہتر تھا کہ گھر میں بند ہو کر پڑا رہتا۔ چنگاری، مرزا امجد بیگ نے اس دفعہ نہ صرف عمدگی سے ملزمان کو آزاد کرایا اور خدا ترسی میں ان کی جان بھی بچائی۔ خدا ایسے مہربان وکیل ہمارے معاشرے میں زندہ اور تابندہ رہیں۔ جیسے کو تیسا، فاروق انجم کی انتہائی دلچسپ کہانی، پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ فریب کار اور برے کے ساتھ کیسا ہاتھ دکھایا گیا۔ اگر لوگ ایسے چالاک ہوں جیسے وکیل صاحب تھے تو برائیوں کو ختم کرنے میں دیر نہ لگے۔ تیرے نیناں، ایک مکار، بدفطرت حسینہ کی کہانی۔ جس کو خدا نے خوب صورت ترین آنکھیں دیں لیکن اس کی بداعمالی اور لوگوں کو استعمال کرنے کی بے ہودہ عادتوں کی وجہ سے وہی آنکھیں اس کی ذلت اور سزا کا ذریعہ بن گئیں۔ بہروپ، ایک اچھوتی کہانی لیکن ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے نہ جانے کتنے سفاک مجرم، عاملوں کا بھیس بدل کر بھولے بھالے مردوں اور عورتوں کو لوٹ رہے ہیں۔ نظریات اور کچے اعتقاد والے لٹ رہے ہیں۔ تجربہ، تنویر ریاض کی اچھی کہانی، کچھ تجربہ کار اور نامی گرامی مجرم ایک نو آموز لیکن بے حد ذہین لڑکے کی چالاکی سے لوٹی ہوئی دولت پولیس والوں کی ناک کے نیچے سے نکال کرلے گئے۔ کہانی کا آخری حصہ ہی کہانی کو قابل دید بناتا ہے۔ رشتے کا زہر، ایک طویل اور پیچیدہ کہانی لگی۔ بہت ممکن ہے بہت سے قارئین کو بہت پسند آئے۔ مجھے کچھ زیادہ مزہ نہ آیا۔ اس دفعہ محفل شعر و سخن بڑے چیدہ اشعار پر مشتمل تھی۔ ہر شعر اپنی جگہ بہت اثر انگیز ہے۔ کترنیں بہت ہی چٹخارے دار ہیں، ان کا اپنا ہی الگ مزہ ہے۔ آپ کا ادارہ ماہنامہ گلاب کی طرح مہکے اور ہم اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔'' (بہت شکریہ)

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، لاہور سے تشریف لائے ہیں ''فل میک اپ کے ساتھ چہرے کی نوک پلک سنوارے کیمرے کے سامنے دلربا کا انداز مدہوش کرنے والا ہے۔ حسین دوشیزہ کے ساتھ سبز شاخ پہ پیارا سا طوطا ٹائٹل کو مزید خوب صورت بنا رہا تھا۔ ٹائٹل کے سحر سے نکلے تو جون ایلیا کی تحریر نا گزیر پڑھی۔ بے شک جب آزاد انسانی فطرت کے مطابق حکومتیں بنتی ہی نہیں تو وہ انھیں کیسے قبول کرسکتی ہیں اور جون ایلیا کی جتنی بھی باتیں ہوتی ہیں ہمارے ملک میں ہر دور میں فٹ آتی ہیں پر انہیں سمجھے کون؟ خیر اپنی محفل میں پہنچا تو اداریہ بھی حالاتِ حاضرہ کی فسوں گری پر نوحہ کناں تھا اور ہونا بھی چاہیے چلو کسی نہ کسی طریقے سے تو سوئے ہوئے اربابِ اختیار تک اپنی بات پہنچانی ہے نا۔ چاہے ان کے کان پر جوں رینگے یا نہ...... ہم م م ستمبر کی صدارت محفل رومی صاحب کے حصے میں آگئی۔ واہ جی مبارک ہو جناب۔ کئی ماہ بعد ملی بھی تو ڈبل خوشیاں کیونکہ ساتھ میں جشنِ آزادی مبارک بھی تو ہے نا۔ بہت خوشی ہوئی مجھے۔ فلک شیر صاحب جون ایلیا تو اپنی اثر انگیز باتوں سے قوم کو جگانا چاہتے ہیں۔ تالی اور بالو اصل بات تو سمجھنے کی ہوتی ہے۔ کہانی پڑھیں تو اس کے مثبت پہلو کو دھیان میں رکھیں نہ کہ منفی پہلو کو اجاگر کرو۔ کہانی اپنے انداز و اطوار سے عام کہانیوں کی طرح ہی تھی، کوئی بھی لفظ غیر اخلاقی نہیں تھا البتہ حد سے زیادہ تنقید کرنے والوں نے شاید اپنی راہ ہی گم کرلی ہو۔ بہرحال اشفاق شاہین، غلام یاسین، قاسم رحمان اور اعجاز احمد راحیل آپ سب نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ بشریٰ افضل آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ یقیناً آپ بڑے صدمے سے گزر رہی ہیں، اس پر آپ صبر کریں اور حوصلہ و ہمت سے اپنے آپ کو سنبھالیں۔ مہرین ناز، زویا اعجاز آپ سب بھی اپنے بھرپور تبصرے لے کر حاضر ہوں۔ اسماء قادری کی کہانی شیش محل جس طرح سننے میں آئی تھی، وہ اس سے بھی بڑھ کر نکلی۔ خلوص، پیار و محبت سے گندھی تحریر بہت اچھی لگی۔ جولیٹ کو راستے میں ملنے والا فقیر لگتا ہے کوئی اڈے کا ہی بندہ ہے جو اسے گھر سے کھونے کی پہچان کروانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف دلدار آغا زبردستی کی دوستی مسلط کررہا ہے جس سے اس پیار و محبت سے بھرپور تحریر میں دلچسپ قسم کا الجھاؤ آرہا ہے۔ شہاب جمال کی رشتے کا زہر، سسپنس کی بہترین کہانی تھی۔ فلمی انداز لیے اسٹوری میں کشور عرف صندل ٹھوکریں کھانے کے بعد بھرپور محبت چاہتی ہے جسے ضیر آزما حوصلے کے بعد مل ہی جاتی ہے۔ من میں بھڑکنے والی محبت کی چنگاری سچائی پر مبنی ہو تو زندگی گل و گلزار بن جاتی ہے اور یہ سب مرزا امجد بیگ اور معظم صدیقی کی کوششوں سے سائرہ اور شاہ نواز کی محبت کو دوام مل سکا۔ ماروی بھی اپنی سرشت میں جاری ہے۔ خدا خدا کرکے مراد میڈونا سے شادی کے لیے تیار ہوا تو ربینہ پھر کسی آسیب کی طرح سامنے آموجود ہوئی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے کہ مراد ربینہ کو کسی طرح ٹال دے اور میڈونا سے نکاح کرے، بعد میں

مرینہ سے بھی نمٹ لے۔ ابراہیم جمالی کی بہروپ بھی اچھی رہی۔ سادہ لوح اور بے وقوف قسم کے لوگ ایسے بہروپیوں کی بھینٹ چڑھتے رہتے ہیں۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی میں دیکھو اب سلطان کے دل میں زکریا کونسا مقام حاصل کرتا ہے۔ فی الحال تو اس کا دل ناہید میں اٹک گیا ہے۔ کاشف زبیر کی بھولا بھالا میں لگتا ہے رحیم کریم بھائی کی اپنی غلطیاں ہی سامنے آرہی ہیں جواب وہ پے در پے نقصان اٹھا رہا ہے اور سچائی کا مظہر بھولا بھالا ناصر اپنے بھولپن میں بھی کامیابیاں سمیٹتا رہا۔ شیخ ناگوری حمیدالدین کے حالاتِ زندگی بہت دلچسپ اور ایمان افروز تھے۔ ان کی کرامات جن تین مریدوں سے ظاہر ہوتیں، وہ بھی کمالات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ محفل شعر و سخن کا ہر شعر زبردست رہا۔ جن میں سے مدحت کراچی، محمد اقبال، کراچی اور زینب کوثر، سرگودھا کا انتخاب بہت اچھا تھا۔‘‘

✠ **محمد حنیف گبول**، نیو سینٹرل جیل ملتان سے محفل میں شریک ہیں ’’ستمبر 2015ء کا شمارہ اس مرتبہ 18 جولائی کو ملا ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا ناگزیر کے عنوان کے تحت مطلق العنانی کے حکومتوں کے رجحان پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے نظر آئے۔ آپ کے خطوط میں مدیر اعلیٰ صاحب کا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ دیگر تبصروں میں عبدالجبار رومی انصاری، احمد خان توحیدی، رانا سجاد اختر، اشفاق شاہین، محمد قدرت اللہ نیازی، آر۔ ایچ۔ اے، ابرار وارث اور شوکت شہریار کا تبصرہ پسند آیا۔ برادرم طالب حسین طلحہٰ صاحب! آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ تمام دوست احباب آپ کو ڈھیروں سلام عرض کررہے ہیں۔ محترمہ بشریٰ افضل صاحبہ! اسی سال آپ کی بڑی بہن، بڑا بھائی، دوسری بڑی بہن کی وفات سے یقیناً آپ پر صدمات کی وجہ سے پریشانیوں کے پہاڑ آپڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے اور آپ سمیت سب سوگوار لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ محفل شعر و سخن میں امجد ریاض، طالب حسین طلحہٰ، شازیہ، داؤد اشفاق، محمد اقبال، فرحانہ عاصم، اشفاق شاہین، عبدالجبار رومی انصاری، جنید احمد ملک، امتیاز علی اور ادریس احمد خان کے اشعار شاندار تھے۔ ماروی کی قسط نمبر 22 میں محی الدین نواب کا قلم حسبِ سابق نئے رنگ دکھا رہا تھا۔ خدنگ عثمانی، شیخ ناگوری اور کہانیوں میں بہروپ، چنگاری، جیسے کو تیسا بہت پسند آئیں۔ کترنوں میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک نیا انداز تھا۔ مدیر اعلیٰ صاحب سمیت تمام ٹیم اور تمام قارئین کو عیدالاضحیٰ کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔‘‘

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے چلی آرہی ہیں ’’سسپنس پر جیسے ہی میری نظر پڑی، دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ رضوان تنولی کی دو دن پہلے کی بات یاد آگئی جب اس نے کہا کہ اسما قادری صاحبہ کی کہانی شیش محل بہت شاندار کہانی ہے اور کل صبح کام پہ جانے سے پہلے اس نے سوچا کہ ابھی کافی ٹائم ہے، چلو کاشف زبیر کی کہانی بھولا بھالا پڑھ لوں۔ کہانی میں ایسے کھو گیا کہ آٹھ بج گئے تو بیچارے رضوان کو بھاگ بھاگ کے دوسری گاڑی میں جانا پڑا۔ کمپنی والی گاڑی تو اس سے نکل چکی تھی۔ ہاہاہا۔ رضوان، کاشف زبیر کی کہانیاں بندے کو ایسے ہی جکڑ لیتی ہیں۔ سرورق بہت صاف اور چمکتا سا رہا۔ جون ایلیا کا انشائیہ ناگزیر پڑھا پاکستان میں تو اب بھی حکومت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پہلے نمبر پہ عبدالجبار رومی انصاری بھائی مبارک ہاں۔ ارے بھائی خفا نہ ہو اس بار میرا ٹھکانا بھی بلیک لسٹ میں ہے۔ بہت دلچسپ اور شاندار تبصرہ واقعی پہلے نمبر کے قابل خط تھا۔ محمد صفدر معاویہ بھائی تبصرہ تو آپ کا لازوال ہی رہتا ہے لیکن مجال ہے کہ کبھی باجی کو بھی یاد کرلو۔ ادریس احمد خان کا تبصرہ بھی دلچسپ رہا۔ بشریٰ افضل سویٹ سسٹر آپ کے بھائی اور بہنوں کی موت کا سن کے بہت دکھ ہوا۔ تاریخی کہانی خدنگ عثمانی الیاس سیتاپوری کی ایک لازوال تحریر۔ سلطان سلیم کے بارے میں اتنی مفصل اور معلوماتی تحریر ان کا ہی کام ہے۔ اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی تحریر بھولا بھالا سسپنس والوں کے لیے ایک اور شاہکار۔ ناصر کو اس کی ایمانداری اور محنت نے اچھا صلہ دیا، ویلڈن کاشی۔ اسما قادری بہت پیاری تحریر شیش محل لے کر آئیں۔ مضبوط پلاٹ، عمدہ الفاظ کے چناؤ کے ساتھ شیش محل بہت پسند آئی۔ اب اگلی قسط کا انتظار شدت کے ساتھ رہے گا۔ محی الدین نواب انکل کی ماروی اپنی بائیسویں قسط تک پہنچ گئی۔ میڈونا دشمن کی بیٹی ہو کر پیار میں مراد کی جان بچا رہی ہے۔ اچھا ہے مرینہ کا کانٹا بھی نکل گیا۔ مراد سے دشمنی میں مہاراج کی ایک بار پھر انٹری ویلڈن نواب انکل۔ ایک طرف مراد کا علاج جاری ہے دوسری طرف مرینہ بھی ٹھیک ہو رہی ہے۔ سلیم انور کی مغربی تحریر مختصر لیکن اچھی تھی۔ ایک ہماری پولیس ہے کہ گالی گلوچ کے علاوہ اور کچھ آتا نہیں۔ منظر امام صاحب کے تو کیا کہنے۔ اس بار بھی ایک اچھی تحریر لائے۔ تنویر ریاض کی مغربی معاشرے کی تحریر تجربہ، واہ واہ کیا کہنے۔ ٹیرنس نے اتنے تجربہ کار لوگوں کو دھوکا دیا۔ تجربے کا عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ آخر میں وہی ناتجربہ کار بچہ ان کو پولیس کے ہاتھوں بچا گیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر شیخ ناگوری بہت ہی دل سوز اور معلوماتی اسلامی تحریر تھی۔ پڑھ کے دل و دماغ روشن ہوگئے۔ دل میں ایمان کی تھوڑی اور چنگی آگئی۔ ثمر عباس کی تحریر تیرے نینان مغربی معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی بہت اچھی تحریر۔ دو بھائی لیکن مختلف مزاج، اس لیے تو کارل مارا گیا۔ ابراہیم جمالی کی تحریر بہروپ پڑھ کے اپنے ملک کے معصوم اور نا سمجھ لوگوں پہ ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا کہ ہمارے ملک کے لوگوں کو ان پیروں فقیروں نے ہمیشہ لوٹا ہے۔ اس بار تو چنگاری میں مرزا امجد بیگ صاحب نرالا کیس لائے اور اپنی عقل و دانش کی تلوار سے اس چنگاری کو ایسے کاٹا کہ سائرہ اور شاہنواز کی زندگی واقعی گل و گلزار ہوگئی۔‘‘

✠ **محمد یوسف سانول**، تحصیل نور پور تھل، ضلع خوشاب سے حاضر ہوئے ہیں ’’رب کائنات سے دعا ہے ادارہ سسپنس کے تمام اسٹاف ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں اور دلی دعا ہے کہ خدا میرے ملک پاکستان کے ہر فرد اور شہری کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین) سب سے پہلے سرورق کو دیکھا اور حیران رہ گیا کہ صنفِ نازک میں اتنی لمبی گردن بھی پائی جاتی ہے؟ نیچے کپکپاتے رضوان تنولی صاحب کیمرا تھام کر پتا نہیں کس کی تصویر بنا رہے تھے۔ اس کے بعد انشائیہ پڑھا جو ہمیشہ کی طرح سچ اور حق پر مبنی تھا جس پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد سیدھے اپنی محفل میں گئے جہاں ادارہ کی طرف سے لکھا گیا اداریہ ملکی صورتِ حال کی مکمل تصویر تھا۔ اپنے حکمرانوں کی طرح ہم بھی کنی کترا کر محفل میں انٹر ہو گئے وکٹری

اسٹینڈ پر رومی صاحب نظر آئے بہت ہی دلکش تبصرہ تھا میری طرف سے جناب کو مبارک باد۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے مگر ہمارا تبصرہ ردی کی ٹوکری کی غذا بن گیا اس کے بعد سیدھے ماروی سے ملے۔ سوری ماروی پڑھی جہاں اپنے مراد صاحب بستر پر پڑ کر بھی دوسروں کی نیندیں خراب کرتے نظر آئے ہیڈونا جیسی لڑکی سے شادی پتا نہیں ماروی سے وفا ہے یا بے وفائی؟ اس کے بعد اسما قادری کا شیش محل جو بالکل کسی خاص ناول کا عکس نظر آیا۔ بہرحال اسما صاحبہ کی تحریر پر گرفت اچھی ہے۔ امید ہے آگے چل کر تہلکہ مچ جائے گا۔ آخری کہانی، رشتے کا زہر سسپنس کی سب سے اچھی کہانی تھی۔ چنگاری، ایڈووکیٹ صاحب ایک بار پھر کیس جیت گئے۔ ادارہ سے گزارش ہے کہ ایک ایسی کہانی شائع کریں جس میں بیگ صاحب کو ہار ملی ہو کیونکہ بندہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے۔ خدنگ عثمانی تاریخی ماحول اور تاریخی پس منظر میں لکھی گئی بہت اچھی تھی۔ زکریا کے کردار پر حیرت ہوئی۔ بھلا کوئی اپنی محبت بھی چھوڑ سکتا ہے؟ تمام شارٹ کہانیاں اچھی تھیں مگر تجربہ اور بہروپ عمدہ پلاٹ کی بہترین کہانیاں تھیں۔ بقول شخصے جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقل مند بھوکے نہیں مرتے۔ تمام کترنیں بھی اچھی تھیں۔ محفل شعر و سخن میں غلام یاسین نوناری کا انتخاب پسند آیا۔''

✠ **بشیر احمد بھٹی**، فوجی بستی بہاولپور سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی، سرگزشت اور پاکیزہ پاکستان کے معیاری پرچے ہیں۔ دلکش بھی اچھا ڈائجسٹ تھا مگر یہاں بہاولپور میں پرانے پرچے تول جاتے ہیں۔ نیا دلکش دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ان پرچوں کی دلچسپ کہانیوں میں آپ کی محنت شامل ہے۔ جبھی یہ آج بھی مقبول ہیں۔ ورنہ اس میدانِ کارزار میں کئی شہسوار آئے اور غائب ہو گئے۔ کئی گہری نیند سو گئے جن کا طوطی بولتا تھا۔ ان کی کامیابی پر دشمنوں کا خون کھولتا تھا۔ محی الدین نواب صاحب ایک بہترین رائٹر ہیں۔ دیوتا جیسی کہانی کے خالق ہیں۔ دنیا کی طویل ترین کہانی لکھنے کا صرف ان کو اعزاز حاصل ہے۔ لیکن اب ان کی کہانیوں میں صرف باتونی جملے ہوتے ہیں۔ یہ معاشرے کے جراح ہیں۔ زیادہ لکھنے سے کہانیوں کا معیار گر جاتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ نے محسوس نہیں کیا ہوگا۔ میں نے سسپنس کی محبت میں یہ سطور لکھی ہیں۔ یقیناً آپ ناراض نہیں ہوں گے۔''

✠ **قمر صائم**، خوشاب سے تبصرہ کر رہے ہیں ''جستِ اول میں محفلِ یاراں میں پہنچے۔ اداریہ میں آپ کے تجزیے سے ایک سو ایک فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ عبدالجبار رومی انصاری کو مسندِ صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک ہو جی۔ سب دوستوں کے نامے بہترین تھے گھما پھرا کے...... نیازی صاحب اوکے لیں، قسمت کے دھنی نکلے ہم۔ (ایڈیٹر صاحب کی مہربانی ہے) آر ایچ اے بھائی! ویلکم کرنے کا شکریہ۔ اللہ عزوجل آپ کے ایام اسیری کو مختصر فرمائے (آمین) ابرار وارث بھائی! سودائے جنوں کے بارے میں ہم سب کے نظریات اسی طرح ''سیم سیم'' ہونے چاہئیں (شکریہ) اشفاق شاہین صاحب! نامے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بشریٰ افضل صاحبہ! اللہ عزوجل آپ کے پیاروں کی منزلیں آسان فرمائیں۔ پہلے کی نسبت اس دفعہ ماروی دلچسپ رہی۔ حق و باطل کا معرکہ شروع ہو چکا ہے۔ مراد ایک بار پھر نیا فیصلہ کرنے جا رہا ہے۔ خیر اسی ہو دے۔ مرزا امجد بیگ کی چنگاری معرکہ خیز رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب اچھا سلسلہ چلائے ہوئے ہیں۔ جزاک اللہ۔ بھولا بھالا ہمارے پاکستانی معاشرے کی عکاس نظر آئی۔''

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے شریکِ محفل ہیں ''سرورق نہایت دیدہ زیب تھا۔ سرورق پر اس بار مناسب شکل دیکھ کر اعجاز راحیل چھپ کر اپنے کہن سالہ کیمرے سے حسینہ کی تصویر بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف پائے گئے۔ انشائیہ حکمرانوں کے مطلق العنانی کے رجحان پر مشتمل رہا۔ اداریہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا عمل ثابت ہوا۔ حکمرانوں کی ترجیحات میں سب سے آخری نمبر پر بھی عوام نہیں ہے تو کوئی عوام کے بارے میں مثبت کیسے سوچے گا۔ عبدالجبار رومی جامع تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان تھے۔ الفاظ کی فراوانی کیا خوب تھی۔ آر ایچ اے (رانا حبیب الرحمان) آپ کا شکوہ بجا ہے۔ ہم سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور معذرت خواہ ہیں اللہ آپ کو رہائی عطا فرمائے اور ہر موسم کا لطف آپ لے سکیں، آمین۔ فلک شیر ملک درست فرمایا کہ حکمران ابھی آلو پیاز کے بحرانوں سے نہیں نمٹ سکے۔ بجلی کے بحران سے کیا نمٹیں گے۔ تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اشفاق شاہین! سالانہ خریداری آپ کے لیے سودمند ہو سکتی ہے۔ غلام یاسین نوناری! تبصرے میں تحریروں کے بارے میں دوسروں کے نہیں اپنے خیالات تحریر کیا کریں۔ طالب حسین طلحہ! اچھی بات ہے کہ اپنے اسیران ساتھیوں کو آپ نہیں بھولے، ہم ان کی رہائی کے لیے بھی دعا گو ہیں۔ آخری صفحات پر شباب جمال کی ''رشتے کا زہر'' سب سے پہلی تحریر تھی جو پڑھی۔ کشور اور اجمل کے جذباتی ڈائیلاگز اور پل پل بدلتے جذبات نے کہانی میں دلچسپی پیدا کیے رکھی۔ نادرہ کا کردار غیر متوقع طور پر کہانی میں شامل ہوا اور کہانی کو نقطۂ اختتام تک لے گیا۔ ایک الجھن بھی رہی کہ پہلے کہا گیا اجمل کے والد کی گولی سے ناصر اور شمشاد کو زخمی کیا، بعد میں نادرہ نے کہا کہ ناصر نے شمشاد کو گولی ماری۔ بہرحال اچھا ٹائم پاس رہی اسٹوری۔ اسما قادری کی نئی سلسلہ وار تحریر شیش محل قیامِ پاکستان سے قبل کے دور پر مشتمل رہی۔ فاروق کا کردار کافی دلچسپ و پراسرار لگا۔ آغا کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑتی نظر آ رہی ہے۔ کہانی کی ابتدا بتا رہی ہے کہ یہ نیا سلسلہ بہت دلچسپ رہے گا۔ مرزا امجد بیگ کی روداد چنگاری میں سائرہ اور شاہ نواز کے انجام بخیر پر مسرت محسوس ہوئی۔ بیگ صاحب نے خوب کہانی گھڑی اور دونوں کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس بار جو تحریر سب سے زیادہ پسند آئی، وہ فاروق انجم کی تھی۔ جیسے کو تیسا، خادم اور عبداللطیف انوکھے سماجی کارکن تھے جن کے پیشِ نظر سماج کے بجائے اپنا مفاد تھا۔ راحیلہ بیویوں کے 90 فیصد طبقے کی نمائندگی کرتی نظر آئی۔ رفیق کا کردار بھی آج کل بہت کامن ہو گیا ہے معاشرے میں۔ رفیق اپنی کامیابی کی تگ و دو کے بجائے مجاہد کو ناکام کرنے میں لگا رہا۔ ابراہیم جمالی کا بہروپ میں عارب ماچھی نے مست ملنگ کا بہروپ بھر کے ڈکیت کو بھی مات دے دی۔ عبدالرحمان کے ڈرامے نے اس کے بہروپ کو مزید تقویت دے دی۔ کاشف زبیر کا بھولا بھالا استاد نکلا۔ ناصر المعروف بھولا بھالا اپنی نیک نیتی اور والدین کی محبت و اطاعت کی وجہ سے سب

بھائیوں پر بازی لے گیا۔ رحیم کریم بھائی کی سخاوت اور فیاضی دیکھ کر تھوڑے سے بل کے لیے چیخ و پکار سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر حال حسب توقع اچھی تحریر تھی۔ الیاس سیتاپوری کی تحریر خدنگ عثمانی، ماضی کے اوراق سے بھی خوب صورت تحریر تھی۔ یتی چریوں پر لگی پابندیاں غیر فطری تھیں تاہم پھر بھی یہ بڑے عرصے تک اپنی ذمے داریاں سرانجام دیتے رہے۔ زکریا کی جذباتی کشمکش کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا گیا۔ محفل شعر وسخن میں راشد حبیب تابش اور ملائکہ حریم کا انتخاب زبردست رہا۔ محمد جاوید کی کترنیں پسند آگئیں۔“

✠ **قاسم رحمان**، ابرار کالونی، ہری پوری سے چلے آرہے ہیں ”تیرہ اگست کو کبیر عباسی کے توسط سے پتا چلا کہ سسپنس میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ چودہ اگست کو پیارے دوست رضوان تنولی نے بتایا کہ سسپنس آچکا ہے۔ بک اسٹال سے پتا کیا تو جواب انکار میں ملا۔ پندرہ اگست کو جا کر پتا کیا پھر بھی جواب انکار میں ملا۔ سترہ اگست کو جا کر پتا کیا تو پتا چلا سسپنس آگیا ہے۔ اس مرتبہ ٹائٹل گرل عالیہ بھٹ جیسا پوز دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ادارے کی وہی تیخ کسیلی مگر سچی باتیں پڑھنے کے بعد خطوط کا مطالعہ کیا۔ اس ماہ عبدالجبار صدر منتخب ہوئے تھے۔ ویسے شکر کریں کہ آپ کا پانچواں تبصرہ اول نمبر پر آیا۔ احمد خان توحیدی اچھا تبصرہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد صفدر معاویہ نے اپنے خط میں خوب فلاسفی جھاڑی۔ محمد قدرت اللہ نیازی کے ساتھ ہونے والے المیے کا دکھ ہوا یعنی چار دن لیٹ رسالے کا دیدار کیا۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ رضوان بھائی اور احسان بھائی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ کہانیوں کی ابتدا آخری صفحات سے یہ سوچ کر کی کہ پچھلے ماہ جیسا شاہکار تھا، اس ماہ اس سے بھی بڑھ کر ہوگی کہانی۔ رشتے کا زہر کہانی کا سرتھانہ ہیرو تاہم اجمل کا کردار اچھا لگا۔ کاشف زبیر کی بھولا بھالا پڑھی تو ناصر کے کریکٹر میں اپنا عکس نظر آیا۔ سمپل سی اسٹوری اور سمپل الفاظ لیکن پھر بھی کہانی بہت بہت زبردست تھی۔ ماروی کروٹ بدل رہی ہے۔ کچھ نئے کردار بابا اجیری اور مہاراج کی انٹری شاندار ہے۔ اب مرینہ اور مراد کی لڑائی حق و باطل کی جنگ میں بدل گئی لیکن مراد اور میڈونا کے نکاح کا دکھ ہوا۔ مرزا امجد بیگ اپنی ڈائری سے اچھا سبق لائے۔ تاہم اس موضوع پر بے شمار فلمیں اور کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ہیپی اینڈنگ ہوا۔ سائرہ اور شاہنواز ایک ہو گئے۔ ثمر عباس کی تیرہ بختیاں اچھی کاوش تھی۔ ایولین کی دغابازی کی اسے سزا مل گئی۔ تجربہ میں ملٹن، ہوپر، چینکو اور لوئس کو ٹیرنس نے اپنے ٹیلنٹ سے بچا لیا۔ اس جملے نے بہت متاثر کیا۔ تجربہ خواہ کیسا بھی ہو وہ کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ فاروق انجم کی کہانی جاندار تھی۔ ہر سیر پر سوا سیر ضرور ہوتا ہے۔ مجاہد نے خادم اور لطیف کے ساتھ بہت اچھا کیا۔ کترنیں بہت زبردست تھیں اور اشعار بھی اعلیٰ پائے کے تھے۔“

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ستمبر کے شمارے نے زیادہ انتظار نہیں کروایا اور 17 کی ڈھلتی سہ پہر کو ہمارے آنگن کو رونق بخش دی۔ رات کو بلب کی روشنی میں سسپنس سے ملاقات کی۔ سرورق موسم اور دل کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ ہر ماہ سرورق کچھ نہ کچھ یاد دلاتا ہے۔ اس دفعہ یہ ایک میٹھی سی کسک دے گیا۔ حسینہ کا مسکرانا اور نادہندہ ہاتھوں کا تصویر بنانا کہ گزرے زمانے یاد آگئے۔ وقت بہت بڑا استاد ہے۔ اپنی محفل میں عزیز بھائی عبدالجبار روی کو صدارت کے عہدے پر فائز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مبارک قبول کریں، تبصرہ پسند کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ جناب آر اے ایچ اے میں نے تو سسپنس ابھی پڑھنا شروع کیا ہے آپ سے تعارف نہیں تھا۔ سزائے موت کے قیدی کی زندگی کا تصور کرنا ہی مشکل ہے پھر آپ تو...... اللہ آپ کو رہائی دے۔ بشریٰ افضل بے شک آپ کے دکھ بہت بڑے ہیں مگر یہ دنیا تو فانی ہے اللہ آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے تاریخ پر مبنی کہانی الیاس سیتاپوری کی زبانی پڑھی۔ جیسے ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، ویسے ہی عورت مرد کو تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے، اچھی سبق آموز کہانی تھی۔ اسما قادری نے بالآخر سسپنس کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ ابتدا اچھی ہے رقابت، حسد، محبت اور نفرت پر مبنی کہانی کچھ اداس کر گئی۔ فاروق کی خاموش محبت اور درد دل پر محسوس ہوئے۔ خلافِ توقع ماروی اس دفعہ ایک اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ مراد کی جرأت اور ایمان نے متاثر کیا۔ مجھے لگتا ہے، میڈونا مر جائے گی۔ آخری صفحات پر رشتوں کے تقدس پامال کرنے اور اجمل کی ہمت پر مبنی کہانی مزہ دے گئی۔ مرزا صاحب بھی اچھا موضوع لے کر آئے۔ چنگاری اچھی کہانی تھی۔ اس ماہ سب سے اچھی کہانی کاشف زبیر کے قلم سے بھولا بھالا تھی۔ فاروق انجم اور منظر امام نے بھی اچھا لکھا آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سسپنس و جاسوسی نے ہمیشہ برے وقت میں ساتھ دیا۔ یہ میرا خاموش دوست ہے اور اس کے تعاون سے بہت اعلیٰ دوست ملے۔ اللہ پاک اس کو ترقی دے۔ (آمین)“

✠ **عبدالغفور خان ساغری خٹک**، جھب، اٹک سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ”18 کو اپنا محبوب رسالہ شیر حلہ گنگ سے خریدا۔ سب سے پہلے جب بس موٹروے پر چڑھی تو رشتے کا زہر کہانی کا مطالعہ شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے جب آخر میں پہنچے تو کیا بتائیں کہ کہانی کا کتنا مزہ آیا۔ پہنچے تو کہانی ختم ہوئی۔ کہانی کا جتنا مزہ آیا۔ وہ میں اپنے الفاظ میں کیا لکھوں لیکن شہاب جمال ویری گڈ۔ اس کے بعد پیسے کو تیسا پڑھی۔ وکیل صاحب اپنے کام اور گھر والی سے پریشان تھے اور ان کے دوستوں نے الٹ کام کر دیا لیکن وکیل نے ایسا کام دکھایا کہ وہ دم دبا کے بھاگ گئے۔ منظر امام کی کہانی فقدان پڑھی بس اچھی تھی۔ محفل شعر وسخن میں امجد ریاض، شازیہ، فلک شیر، راشد حبیب تابش اور نورین شہزاد کے اچھے اشعار تھے۔ باقی بھی اچھے تھے۔ خطوط کی محفل میں جھانک کر دیکھا۔ کافی پرانے اور نئے دوست آئے تھے۔ محفل کی شان تبصروں کی جان سعدیہ بخاری، رضوان کریڑوی، ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحب اور دیگر پرانے دوست نہیں تھے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب، احمد خان توحیدی، اسماعیل اعجاز محفل کی زینت بنے تھے۔ آر اے ایچ اے کا تبصرہ خاصا بہترین تھا۔ لیکن دوست شکوہ شکایت بھی تو اپنوں سے کیا جاتا ہے۔ اسما قادری، مغل صاحب، محی الدین نواب صاحب سے گزارش ہے کہ کچھ وادی کشمیر کے بارے میں بھی لکھیں۔ پرانے دوست کبھی کبھی محفل کی زینت بنا کریں ہم بھی تو ہیں کہ 5-4 ماہ کے بعد [illegible] ٹائم نکال کر۔ باقی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ تمام جملہ اسٹاف اور قارئین کو میری طرف سے عید الاضحیٰ مبارک ہو اور 6 ستمبر بھی۔“

فلک شیر ملک، رحیم یار خان سے محفل میں شریک ہیں۔ ”ستمبر کا سسپنس پڑھا۔ اس دفعہ ٹائٹل والی لڑکی دلربا تھی۔ اس کیمرے کے بجائے اسمارٹ فون ہوتا تو اچھا لگتا۔ انشائیہ میں جون ایلیا الفاظ کی شکل میں موتی پروتے ہوئے نظر آئے۔ حکومت اور رعایا میں یہ جنگ جاری رہے گی۔ ہر انسان کی فطرت ہے کہ وہ جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ مطلق العنان حکومت یا سربراہ مملکت کے بارے میں یہی کہوں گا کہ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ تبصروں میں عبدالجبار رومی انصاری، احمد خان توحیدی، محمد قدرت اللہ نیازی اور ابرار وارث کے تبصرے زبردست تھے۔ کہانیوں میں خدنگ عثمانی، بھولا بھالا، چنگاری، ابراہیم جمالی کی بہروپ، ثمر عباس کی تیرے نیناں سرفہرست رہیں۔ اسما قادری صاحبہ سے عرض کریں کہ شیش محل سے کچھ کرداروں کا خاتمہ کریں۔ اتنے نام یاد ہی نہیں رہتے۔ کہانی کا پلاٹ اچھا ہے۔ شعروسخن میں ایم کامران خالد، محمد بشارت، عتیق الرحمان، امتیاز علی، نورین شہزادا اور نازیہ کراچی سے۔ ان کے شعر ٹاپ پر تھے۔ کوئی انعامی سلسلہ شروع کریں کسی اچھے شعر پر یا کہانی وغیرہ پر تاکہ قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہو۔ کترنوں میں رضوان تنولی کریڑوی، رانا حبیب الرحمٰن اور محمد انعام لودھراں کے مراسلے بہت پسند آئے۔ شہداء چھ ستمبر اور گیارہ ستمبر کے درجات کی بلندی کے لیے میں بھی اور آپ بھی خصوصی دعا کا اہتمام کریں۔“

ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ کا حصول بروقت ہوا۔ آپ سب کی محنت اور کاوشوں سے سجا سسپنس ہر ماہ ایک نئے رنگ و انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے اور دلوں کو موہ لیتا ہے۔ سرورق کو دیدہ زیب بنانے میں بلاشبہ ذاکر صاحب کا بدرجہ اتم حصہ ہے۔ اس مرتبہ بھی ایک منفرد انداز میں حسینہ ناز نینا صراحی دار گردن اور ترچھی چتون کے ساتھ لبوں پر مسکان لیے اپنی تصویر بنوانے میں محو ہے۔ اندر انشائیے میں ناگزیر پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے حکومت اور اس کا محکوم معاشرہ حاکمیت اور محکومیت میں فرق ہے اور بہت واضح فرق ہے۔ حکومت میں حاکم اپنے آپ کو آقا تصور کرتا ہے اور اس کے زیر تسلط رہنے والا اپنے آپ کو اس کا پابند سمجھتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی اپنے معاملات میں آزاد ہو۔ ناموں کی فہرست میں عبدالجبار رومی سرفہرست تھے بہت مبارک اور نیک تمناؤں کا شکریہ۔ احمد خان توحیدی، محمد صفدر معاویہ، محمد قدرت اللہ نیازی، آر اینچ کے لیے پر خلوص دعا کہ اللہ ان کی مشکلات کو دور کرے (آمین) فلک شیر ملک، ابرار وارث، رانا سجاد اختر، اشفاق شاہین، غلام یاسین نوناری، بشریٰ افضل، اللہ آپ کی بھی غموں کی گھڑیوں کو خوشیوں کی ساعتوں میں بدل دے۔ خدنگ عثمانی، الیاس سیتاپوری کی بہت خوب صورت تحریر ہے جو وہ تاریخ کے جھروکوں سے آگاہی کا سبق دیتے ہیں۔ تحریر کے خاتمے پر جاری ہے لکھا ہوا دیکھ کر اگلے ماہ کی بقیہ تحریر کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اچھی تحریر خود اپنا آپ منواتی ہے۔ اس کے لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کاشف زبیر کی تحریر بھولا بھالا ایک پُراثر تحریر تھی۔ سرمایہ داروں کی اکثریت، زیادہ دو نمبر کاموں سے پیسے کماتے ہیں اور پھر اس حرام کے کمائے پیسے کو نیک کاموں پر لٹاتے ہیں۔ نیا سلسلہ شیش محل اسما قادری کا بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ بھی مقبولیت میں اولین رہے گا۔ اسما قادری کو بہت بہت مبارک باد۔ مختصر تحریر منظر امام کی قدردان فراموشی کا گھاؤ، دل سے پیارا لگا تو عروج کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگا۔ دل سے اترا تو پستیوں میں جا گرا، بہت خوب۔ بھی اچھی تحریر تھی۔ تجربہ بھی اچھی تحریر تھی، واقعی تجربہ عمر سے نہیں آتا، مشاہدے سے آتا ہے۔ جو لوگ بچوں کو بچہ سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں ان کے لیے اچھا سبق ہے۔ شعروسخن میں معیاری اشعار نے بھی مزہ دیا۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی دلچسپی کے عنصر کو قائم رکھا۔ فاروق انجم کی تحریر جیسے کو تیسا بھی اچھی تحریر تھی۔ بہروپ نے بھی حقیقت کا در وا کیا کہ کس طرح جعلی پیر سادہ لوح عوام کا استحصال کرتے ہیں اور عوام بھی اندھی عقیدت میں آنکھیں بند کر کے چل پڑتے ہیں۔ جس پر صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ ولیوں کے تذکرے میں شیخ حمید الدین ناگوری کا ذکر ہوا جو بڑے پائے کے ولی اللہ تھے۔ تیرے نیناں اور آخری صفحات کی تحریریں بہت متاثر کن تھیں۔“

ریاض علی البغدادی، نیو سینٹرل جیل، ملتان سے خط لکھ رہے ہیں ”آپ کے خطوط کی محفل میں ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ستمبر 2015ء کے شمارہ پر تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا ناگزیر کے عنوان سے حکومتوں کے سب سے زیادہ محبوب رجحان مطلق العنانی پر نہایت باریک بینی سے منطقی انداز میں بہترین طریق پر بات کرتے نظر آئے۔ آگے بڑھے تو آپ کے خطوط کی محفل میں مدیر اعلیٰ بھی اپنا شاندار انداز میں تبصرہ لیے موجود تھے۔ کسی کے کان پر جوں رینگے یا نہ رینگے لیکن جون ایلیا اور مدیر اعلیٰ اپنی طرف سے فرض ادا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھنے اور عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین) دیگر تبصروں میں عبدالجبار رومی انصاری، احمد خان توحیدی، محمد قدرت اللہ نیازی، آر اینچ اے، رانا سجاد اختر، اشفاق شاہین، شوکت شہریار اور ابرار وارث کے تبصرے بہترین تھے۔ بشریٰ افضل صاحبہ سال 2015ء کی پہلی ششماہی میں ہی عیدالفطر کی خوشیوں سے قبل آپ کو اپنے بڑے بھائی اور دو بہنوں کی جدائی کے صدمات سہنے پڑے۔ یقیناً یہ بہت بڑے سانحات تھے اور آپ واقعی ٹوٹ کر رہ گئی ہوں گی۔ آپ اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے سہارے سنبھالیں۔ یقیناً ہر ایک نے اپنے مقررہ وقت پر اس دارِ فانی سے کوچ کرنا ہے۔ ہم سب قارئین آپ کے غم میں شریک ہیں۔ مدیر اعلیٰ نے واقعی خوب کہا ہے کہ حوصلے سے زندہ رہنے کا نام ہی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے صبر اور نماز کے ذریعے مقابلے کی ہمت مانگیں تو زندگی کے ان کٹھن حالات کا مقابلہ بھی ضرور کر پائیں گی۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب دعاؤں میں یاد رکھنے اور تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب، اشفاق شاہین دعاؤں میں یاد رکھنے کا ڈھیر شکریہ۔ آر اینچ اے صاحب بزم یاراں میں خوش آمدید کہنے پر ڈھیر شکریہ۔ برادرم طالب حسین طلحہٰ صاحب تبصرہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ امید واثق ہے کہ تمام احباب حسبِ سابق ہم زندانوں کے اسیروں کو آئندہ بھی اپنی مقبول دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ محفل شعروسخن میں امجد ریاض، شازیہ، عبدالجبار رومی انصاری، اشفاق شاہین، مدحت، داؤد اشفاق، امتیاز علی، محمد اقبال، طالب حسین طلحہٰ، کمال انور، ادریس احمد خان، اظہر حسین پچار، فرحانہ عاصم اور ... کا انتخاب پسند آیا۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی اور ضیا تسنیم بلگرامی کی شیخ ناگوری روح کی تازگی کا سامان تھیں۔ ماروی کی بائیسویں

قسط میں محی الدین نواب اپنے قلم کے جلوے بدستور دکھاتے نظر آئے۔ اس کے علاوہ بہروپ، چنگاری، تجربہ اور جیسے کو تیسا لاجواب کاوش تھیں۔ اس بار کٹر نیں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور اس مقابلے میں ایک نامعلوم محترم یا محترمہ نے شادی شدہ اور کنواروں کا ایسا خانہ خراب کیا کہ ہم کنوارہ گروپ میں شامل ہونے کے باعث سر کھجا کر رہ گئے۔ جناب مدیر اعلیٰ صاحب کو ان کی تمام ٹیم کے ہمراہ اور بزم یاراں کے تمام قلم کار احباب سمیت سب قارئین کو عیدالضحیٰ کی ہم سب کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔''

✠ **محمد جاوید شبیر بربرہ،** علی پور مظفر گڑھ سے چلے آرہے ہیں ''ستمبر کا شمارہ مقررہ تاریخ پر مل گیا۔ وقت کی پابندی کوئی آپ کے ادارے سے سیکھے۔ سرورق بہت دلفریب تھا۔ ذاکر انکل کے ہاتھ میں واقعی جادو ہے۔ جون ایلیا کو پڑھنے کے بعد اداریہ پڑھا۔ انکل آپ کی کھری کھری باتیں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ آپ نے سیلاب کے دوران حکمرانوں کی غلط سوچ کے بارے میں تو کہا ہے لیکن جب فلڈ آتا ہے تو جو شومیٔ قسمت سے اگر حکمرانوں کی طرف سے کوئی امداد آ ہی جاتی ہے تو اس میں جو بندر بانٹ پٹواری حضرات یا ان کے افسران کرتے ہیں ان کی تو لاٹری نکل آتی ہے۔ سیلاب زدگان سے جو پہلے ہی بیچارے لٹے پٹے ہوتے ہیں۔ ان سے روپے لے کر ان کو امدادی ٹوکن دیتے ہیں اور من پسند لوگوں کو کھاد بیج یا نئے گھروں کی تعمیر کے لیے جو لاکھوں کروڑوں روپے فنڈز کے آتے ہیں، دیتے ہیں۔ مستحق بے چارے ویسے کے ویسے رہ جاتے ہیں۔ بس دعا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دے۔ صدارت پر عبدالجبار رومی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ واقعی شاندار تبصرہ تھا اور صدارت کے اہل تھا۔ احمد خان توحیدی، محمد صفدر معاویہ، قدرت اللہ نیازی کے اچھے تبصرے تھے۔ آر ایچ اے صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔ بس اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرو، تمام حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اعجاز احمد راحیل صاحب واقعی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی جتنی بھی تحریریں ہوتی ہیں، وہ سب لاجواب اور اثر انگیز ہوتی ہیں۔ یہ صرف جاسوسی پبلی کیشنز والوں کا اعزاز ہے کہ ہمیں ڈاکٹر عبدالرب، طاہر جاوید مغل، ناصر ملک، محی الدین نواب، اقلیم علیم، کاشف زبیر، مریم کے خان، اسما قادری، منظر امام وغیرہ جیسے لکھاریوں کی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہم جاسوسی پبلی کیشنز کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں، کم ہے۔ اس ادارے کا ایک معیار ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ملک کے تمام ڈائجسٹوں سے آگے ان کو صفِ اول میں کھڑا کرنے کی توفیق دی ہے۔ کچھ لوگ تو بونگیاں مارتے رہتے ہیں کہ فلاں مصنف کی تحریر اچھی نہیں تھی۔ میں بیس سالوں سے ان رسالوں کا قاری ہوں۔ مجھے آج تک کہانی تو کہانی ایک مراسلہ تک غیر معیاری نظر نہیں آیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مزید ان کو ترقی دے۔ آمین۔ ستمبر کے شمارے کی تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔'' (تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✠ **تابی اور بابالو،** صفدر آباد، ضلع شیخوپورہ سے تشریف لائے ہیں ''16 اگست کی خوب صورت صبح لاہور میں اتری تو بہت ہی دکانیں چھان کر سسپنس کا ستمبر کا شمارہ نظر آ ہی گیا۔ خون آلودہ ہاتھ میں زمانہ قدیم کا کیمرا جو صنفِ نازک کی تصویر لینے میں معروف تھا۔ خطوط میں ہماری طرح سب شیش محل میں انٹری کے منتظر کھڑے ہیں۔ غلام یاسین صاحب آپ بھی یہیں پائے جاتے ہیں۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شیش محل کی پہلی قسط شاندار رہی۔ سلسلہ طویل ہے سو تبصرہ ہوتا رہے گا۔ انڈیا سے نکل کر کردار پاکستان بھی آئیں گے؟ منظر امام کی قدران جنہ پر طمانچے کی طرح لگی۔ کیا ہمارے ہیرو صرف کھلاڑی رہ گئے ہیں؟ کاشف زبیر کی بھولا بھالا خوب رہی۔ ہم کیا کہیں ہم خود بھی بہت بھولے بھالے ہیں۔ رحیم کریم بھائی جیسے لوگوں کو اللہ ہی جانے۔ جیسے کو تیسا فاروق انجم صاحب نے خوب صورتی سے چوروں کے پیچھے مور لگا دیا۔ آخری صفحات پر شہاب جمال کی رشتے کا زہر عجیب سی لگی کہانی اچھی تھی مگر بعض جگہ پر عجیب الجھاؤ سا محسوس ہوا اگر خوب صورت الفاظ استعمال ہوتے تو اچھا لگتا۔''

✠ **اشفاق شاہین،** کراچی سے شریکِ محفل ہیں ''پرچہ حسبِ معمول بروقت ملا۔ سرورق پر نئے سلسلے شیش محل کے ذکر نے خوشی کو دوبالا کر دیا۔ سرورق بھی سسپنس کے معیار کے عین مطابق رہا۔ جون ایلیا کا انشائیہ حکومت کے اختیار اور تسلط سے متعلق تھا جو کہ اب ہمارا مقدر ہے۔ محفل میں پہنچے جہاں عبدالجبار انصاری کرسی صدارت پر جلوہ فرما تھے۔ بہت خوب صورت خط کے ساتھ۔ تمام دوستوں کے خطوط اچھے اور معیاری تھے۔ خود کو پا کر طمانیت کا سا احساس ہوا۔ ایک کی ضرور محسوس ہوئی، وہ ہے صنفِ نازک کی کم حاضری۔ صرف بشریٰ افضل ہی بروقت پہنچ پائیں۔ باقی لیٹ کمرز میں 6 رہ گئیں کہیں ایسا تو نہیں کہ سب بہنیں عید قربان کی ڈشوں کی تیاریوں میں سسپنس کو بھول گئی ہوں؟ بہرحال آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ تاریخی کہانی الیاس سیتاپوری کے قلم کی کاٹ کا خوب صورت شاہکار تھی۔ تاریخ کے کئی گوشوں سے آگاہی ہوئی۔ پھر ماروی پڑھی، دلچسپ رہی۔ مرینہ پھر آن دھمکی ..... رنگ میں بھنگ ڈالنے، دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ رشتے کا زہر، شہاب جمال نے بلاشبہ کمال کا لکھا۔ کتنے اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ سچ کو آنچ نہیں۔ نئی سلسلے وار تحریر شیش محل کا آغاز تو بہت عمدہ ہے آگے جا کے اسما قادری اپنے قلم کی جادوئی کشش سے سب کے دل موہ لیں گی۔ بھولا بھالا میں کاشف زبیر نے بہت خوب صورت لکھا۔ ویسے ہماری اپنی ذات میں بھولا بھالا کی کئی خوبیاں و خامیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ فقدان خوب رہی۔ چنگاری میں مرزا امجد بیگ اپنے خوب صورت اور لازوال انداز کے ساتھ موجود تھے۔ بہت جاندار تحریر تھی۔ جیسے کو تیسا کیا زبردست اسٹوری ہے، ویری گڈ فاروق انجم۔ بہروپ بھی کمال کی ہے۔ ضیا تسنیم نے شیخ ناگوری کے حالاتِ زندگی کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ محفل شعر و سخن میں بھی انتخاب کمال کا تھا۔ خصوصاً امجد ریاض، انعم کمال اور ناہید کے انتخاب کے کیا ہی کہنے۔ تمام دوستوں کو آداب عرض اور عیدالاضحیٰ مبارک۔''

✠ **احمد خان توحیدی،** راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''شمارہ ستمبر 19 اگست کو ملا۔ حسینہ ٹائٹل کے گورے رنگ کو سیلوٹ کر کے۔ انشائیہ جون ایلیا ناگزیر۔ دور اندیش چند الفاظ میں جون ایلیا خود ہی حاصل مقصد ظاہر کر دیتے ہیں۔ ظالم، غاصب، چہرے بدل کر آنے والے پہلے سے دو ہاتھ آگے ہوتے ہیں۔ وطن عزیز کا سب سے بڑا مسئلہ بجلی سے صنعتی و زرعی ترقی، اللہ کی رحمت ..... بارش کا پانی ضائع ہو کر سیلاب کی صورت تباہی مچائے۔ پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے پوری دنیا میں تربیلا سے بھی بڑا اور خوب صورت کالاباغ ڈیم تعمیر نہ ہو تو ایسے تیل سے چلنے والا چراغ اور

ہاتھ سے ہل چلانے والا زمانہ قدیم بہت اچھا تھا۔ اداریہ میں آپ نے خود ہی بجلی کے فقدان کا تذکرہ کر کے حقیقت بتا دی۔ محفل خطوط، رومی انصاری اچھے تبصرے کے ساتھ پرائم منسٹر بنے بیٹھے تھے۔ لکھاں مبارکاں۔ اعجاز راحیل، بشریٰ افضل، اشفاق حسین، ادریس احمد، ابرار وارث، رانا سجاد، آر ایچ اے سینٹرل جیل، صفدر معاویہ، قدرت اللہ نیازی۔ اچھے تبصرے کے ساتھ ہی سب ساتھیوں سے عرض ہے کہ محفل میں کسی کی ازدواجی زندگی کی کامیابی و ناکامی نجی معاملات میں بالکل دخل نہ دیا کریں۔ یہ ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ طویل کہانیاں، بھاگ کر شیو نگ کا سامان لے کر زندگی بھر طویل کہانیاں سنانے والی عظیم رائٹر اسما قادری کے شیش محل میں شیو کرنے پہنچے تو پتا چلا کہ ہم پرائمری اسکول 1964ء سے پرانے رسالے پڑھنے والے اب بڑھے کھوسٹ پارلیش ہو گئے۔ ابتدا تو بہت اچھی ہے۔ جولیٹ، عارف، گولو کا بچھڑنا، فاروق، ثریا، انجام آئندہ شمارے کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ گوری میم کی تلاش میں ماروی کو سلام کرنے گئے۔ پتا چلا مراد سے کسی کی مراد پوری نہیں ہو رہی۔ ہندو لیڈی ڈاکٹر انورادھا عاشق ہو کر جان گنوا بیٹھی۔ بلے اور بلی نے ماروی کو ختم کرنے والوں کو قاضی احمد بن کر سب کا خاتمہ کر کے مراد کی دہشت پھیلا دی۔ مرینہ نے بھی زندہ ہو کر میڈونا کو دیکھ لیا۔ کاشف زبیر کی بھولا بھالا، ناصر نے سادگی میں بھولا بن کر یقیناً رحیم کریم کے بیٹے کو اغوا کر کے تاوان لیا۔ پھر حقہ گرم کرنے کے لیے بیگ صاحب کے چولہے سے چنگاری لینے گئے۔ پتا چلا بیگ صاحب کی بہترین حکمت عملی اور ایوب سولنگی کے پُرخلوص تعاون سے شاہ نواز و سائرہ کی قلبی خواہش شرعی نکاح کر کے دنیا کے شر سے محفوظ ہو گئے۔ فاروق انجم جیسے کو تیسا دلچسپ تحریر لائے۔ بہروپ، ابراہیم جمالی، معاشرے کی سو فیصد تلخ حقیقت کہ پولیس بے چاری چوبیس گھنٹے ڈیوٹی کے باوجود کرپشن میں بدنام ہے۔ جعلی عاملوں اور ڈبا پیروں کو ہتھکڑی لگانے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ ہوگا۔ ایمان افروز تحریر ضیا تسنیم بلگرامی کی شیخ ناگوری، بچے زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ انبیاء علیہ السلام کی تحریر بھی لائیں۔ ثمر عباس، تیرے نیناں، کارل کا اتفاقیہ قتل ہو جانا افسوس ناک ہے۔ تحریر انگلش الفاظ کے بجائے اردو میں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ رشتے کا زہر و یری گڈ، طویل تحریر، کہانی کا انجام بہت اچھا ہوا۔ نادرہ ہو یا کوئی اور حق آخر ظاہر ہو جاتا ہے۔ فقدان، منظر امام کی ہر کہانی چونکا دینے والی ہوتی ہے۔ امجد ریاض، اطہر حسین، کمال انور، جنید احمد ملک، اچھے اشعار۔ سب سے اچھا شعر شازیہ کراچی کا ہے۔ رسالہ بچوں کے قبضے میں ہونے کے باعث سیتاپوری کی خدنگ عثمانی کا مطالعہ باقی ہے۔ کترنیں سب بہت اچھی ہیں۔“

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”جون ایلیا صاحب کا ناگزیر زبردست رہا۔ بہت زبردست لکھا۔ جون صاحب زبردست۔ آپ کے خط میں رومی انصاری صاحب لاہور سے تشریف لائے اور سرفہرست رہے۔ مبارک باد۔ اچھا لکھا۔ توحیدی، معاویہ اور نیازی صاحب بھی اچھا لکھ گئے۔ خواتین کی حاضری بہت ہی کم رہی۔ کیا آپ اس پر کچھ تبصرہ کریں گے۔ الیاس سیتاپوری صاحب خدنگ عثمانی تاریخ کے اوراق سے، بھولا بھالا کاشف زبیر صاحب اچھی کہانی۔ رحیم کریم بھائی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھولا صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم سمجھا دیتے ہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ شیش محل اب کیا تبصرہ کریں۔ اس سے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے کہ کہانی کچھ کھلے۔ منظر امام صاحب زندہ باد۔ مزہ آ گیا، کیا زبردست کہانی لکھی ہے۔ ہم بھی تو امت مسلمہ ہی کا حصہ ہیں بہت خوب انجام۔ چنگاری وکیل صاحب کا ایک اچھا بلکہ بہت ہی اچھا کارنامہ بیگ صاحب نے نیکی کمائی اور خوب کمائی۔ بڑی خوب صورتی سے کیس کو لڑا اور زبردست لڑا۔ ورنہ دو زندگیاں خراب ہو جاتیں۔ بیگ صاحب نے ان کی زندگی کو گل و گلزار کرنے میں زبردست کام انجام دیا۔ ورنہ اکثر انجام بار دھاڑ سے بھرپور اور آخر میں تباہی۔ تنویر ریاض کا تجربہ اور ٹیرنس کا کردار۔ اسے کہتے ہیں بروقت فیصلہ جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں۔ ٹیرنس نے کمال کر دیا اور کمال تو تنویر ریاض صاحب نے بھی خوب کیا۔ بدیسی کہانی کو دیسی انداز خوب دیا۔ جمالی صاحب میں آپ سے سو فیصد متفق ہوں جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقلمند کھاتے رہیں گے۔ بہروپ خوب صورت کہانی تھی۔“

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں حاضری دے رہے ہیں ”ستمبر 2015ء کا سسپنس مقررہ تاریخ کو ہی مل گیا، کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ سرورق حسب معمول حسب روایت دلکش تھا۔ فہرست کی ترتیب بھی اچھی لگی۔ انشائیہ میں جون صاحب نے اس بار تو بہت سچی اور کڑوی حقیقت بیان کر دی۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والے عبدالستار رومی انصاری صاحب کو مبارک باد، موصوف غالباً تیسری مرتبہ پہلے نمبر پر آئے ہیں، تبصرہ اچھا تھا۔ اشعار کی محفل میں آمنہ شاہد، غلام یاسین، قدرت اللہ نیازی، ملائکہ حریم کے اشعار قابلِ داد تھے...... اور اب کہانیوں پر تبصرے اس دفعہ آخری کہانی سے مطالعہ شروع کیا۔ نئے قلم کار شہاب جمالی کی کہانی رشتے کا زہر تھی تو بہت دبنگ مگر اس میں ایک منفرد خصوصیت بھی تھی اور وہ تھی بالکل ہی جدید اور اچھوتی تشبیہات اور کنائیوں کی بھرمار جو کہ اچھے لگے، خوب لطف آیا، فاضل مصنف کو داد دیتا ہوں۔ غیر ملکی کہانیوں میں تجربہ بہت اچھی تھی۔ تیرے نیناں ثمر عباس کا ترجمہ کرنے کا انداز بہت پسند آیا۔ اسما قادری کے ناول شیش محل کے بارے میں ابھی کچھ نہیں لکھوں گا۔ ابھی تو ابتدا ہے آگے آگے دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے پھر تبصرہ کروں گا۔ اور ماروی ہے ہی پھڑ پھڑاتی کہانی، اس کے بھی اختتام پر تبصرہ کروں گا۔ بیگ صاحب کی چنگاری نے تو میرے دل میں شعلہ بھڑکا دیا۔ بہروپ میں بھی خوب مزہ آیا۔ فقدان اس بار منظر امام قاری کو ہنسانے میں ناکام رہے۔ دیگر کہانیاں بھی قابلِ تعریف تھیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
محمد پرویز شیخ، گوجرانوالہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ زویا اعجاز، لاہور۔ فیض الحسن، کوٹ ادو۔ رضوانہ، راولپنڈی۔ آر ایچ اے، سینٹرل جیل لاہور۔ [illegible]ل۔ ثنا محمود، کراچی۔ ریاض احمد، حیدر آباد۔ زین العابدین، کراچی۔ صدف، اسلام آباد۔ حبیب الرحمٰن، سیالکوٹ

خدنگِ عثمانی

الیاس سیتا پوری

دوسرا حصہ

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عجیب مزاج کے لوگ پیدا کیے... جنہوں نے آگے چل کر کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ذات کو ایک شناخت دی، جو فنا کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ آئے اور اس نے اپنے طریقے سے ان کا سامنا کیا... ماضی ایک ایسا قیدخانہ ہے جسے وہ اپنے حصار میں قید کرلے اس کا ذکر آنے والے دنوں میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور دہرایا جاتا ہے... تاریخ کا یہی اصول ہے، دن پر دن تو گزرتے جاتے ہیں مگر ان داستانوں پر وقت کی گرد نہیں جمتی... وہ بھی کسی سرزمین کا بادشاہ نہ تھا اس کے باوجود اس کے حالات کا تغیر، واقعات کا تسلسل اور جذبات کا طوفان اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی رنگ دے گیا۔ جسے بولنے کی جسارت نہ تھی، چلنے کا سلیقہ اور جینے کا حوصلہ نہ تھا... راتوں کی تنہائیوں میں ڈر جانے والی ذات جب ایک نئے ولولے سے زندگی کا ہنر سیکھ لے تو دنیا واقعی حیران رہ جاتی ہے... اور یہی کارنامہ اس نے بھی انجام دے کر کتنی ہی زبانوں کو گنگ کردیا... اور یہ سب مقدر کی مہربانیوں سے ہی ممکن ہوتا ہے کہ کوئی تاریخ کے ایک اہم کردار اور دلچسپ داستان میں ڈھل جائے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

زکریا اپنے گھوڑے کو بھگائے لیے جارہا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اڑ چکی تھی۔ وہ سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس لیے راستے میں چند گھڑسواروں کو بگٹٹ بھاگتے دیکھا تو اسے شبہ گزرا کہ شاید انہی میں وہ ینی چری قاصد شامل ہیں جو سنان پاشا کا خط لے کر سلطان کے پاس سب سے پہلے پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے ہلاک کردیا جائے تو وہ یقینی طور پر سلطان کی خدمت میں سب سے پہلے پہنچے گا لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہا کہ ممکن ہے ان

میں سنان پاشا کے نامہ بر نہ ہوں۔

رات کو اسے رک جانا پڑتا تھا اور قیام کے لیے وہ سرائے کا نہیں بلکہ مسجد کا انتخاب کرتا تھا' اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں اور کسی وقت بھی ہلاک کیا جاسکتا ہے۔

مسجدوں میں بھی اس سے لوگ طرح طرح کے سوالات کرتے مگر وہ نہایت مختصر اور گول مول جواب دے کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اس کو ایک بات پر بڑی حیرت تھی۔ جھیل وان کے کنارے جو کچھ پیش آیا تھا اس کا راہ میں ملنے

والی آبادیوں کو کوئی علم نہ تھا۔ وہ راہ کی صعوبتیں جھیلتا ہوا ادا پزاری سے چند میل جنوب میں دریائے سقریہ کی ایک ساحلی بستی میں دم لینے کے لیے رک گیا۔ معلوم نہیں کیوں زکریا نے سوچا کہ یہاں کسی مسجد میں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اس کو کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کی سرائے میں گیا۔

سرائے نہایت مختصر تھی۔ دس بارہ تنگ و تاریک کوٹھریاں، ان کے سامنے ایک طولانی مسقف دالان۔ اس دالان میں مسافر اپنے گھوڑے باندھتے تھے۔ عجب بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سرائے کے سامنے ایک دو منزلہ مکان بنا ہوا تھا۔ نچلے حصے میں سرائے کے مالک کے ملازم رہتے تھے اور بالائی حصے میں خود مالک سرائے رہتا تھا۔ اس کا اپنا مکان تو بستی ہی میں تھا مگر وہ صبح سے شام تک یہیں رہتا تھا۔ مغرب کے وقت بستی میں چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہیں رہ جاتا تھا۔

زکریا سرائے میں پہنچا اور سرائے کے مالک سے ملاقات کی۔ زکریا نے پوچھا۔ ”برادر عزیز! کیا کوئی کوٹھری خالی ہے؟“

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ ”آج تو کوئی کوٹھری خالی نہیں، ہاں اگر چند گھنٹے پہلے آجاتے تو تین کوٹھریاں خالی مل جاتیں۔“

زکریا کا ماتھا ٹھنکا، پوچھا۔ ”ان چند گھنٹوں میں کون کون آگیا یہاں؟“

سرائے کے مالک نے جواب دیا۔ ”تین نوجوان مسافر جو قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ یہ کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔ اگر تم چاہو تو کل تمہیں ایک کے بجائے تین کمرے مل جائیں گے۔“

زکریا خوف سے سہم گیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”ان تین نوجوان مسافروں کے گھوڑے کہاں ہیں؟“

سرائے کے مالک نے دالان کی آخری تین کوٹھریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ رہے ان کے گھوڑے۔ اگر تم چاہو تو میں ان نوجوانوں سے تمہارے لیے درخواست کروں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تمہیں اپنے ساتھ ٹھہرا سکتا ہے۔“

زکریا نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”نہیں، میں کسی کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔“

سرائے مالک کی طمع نے زور مارا، بولا۔ ”تم کل تک میرے ساتھ رہ سکتے ہو، اوپر والے کسی ایک کمرے میں۔ میں اس کا کرایہ تم سے وہی لوں گا جو ان کوٹھریوں کا لیتا ہوں۔“

زکریا کو یہاں ٹھہرنے میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مسجد کو ہی ترجیح دینا چاہی مگر ارادہ کرتے کرتے باز رہا اور سرائے کے مالک سے کہا۔ ”میں ایک شرط پر بالائی کمرے میں رہ سکتا ہوں۔ میں قسطنطنیہ جا رہا ہوں اور یہ تینوں بھی قسطنطنیہ جا رہے ہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ انہیں میری بابت کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ میں کل صبح ان تینوں سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

سرائے کے مالک نے متجسس نظروں سے زکریا کو دیکھا اور جواب دیا۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کل صبح چلے جاؤ گے یا کل شام کو جاؤ گے۔ میری دلچسپی تو اس میں ہے کہ تم سرائے کا کرایہ فوراً ہی ادا کر دو اور جب تک رہو کرایہ پیشگی ادا کرتے رہو۔“

زکریا نے کہا۔ ”لیکن یہ وعدہ کرو کہ میری آمد کا ان تینوں کو علم نہیں ہوگا۔“

سرائے کا مالک ہنس دیا، بولا۔ ”صاحبزادے! کیسی باتیں کرتے ہو، میں غیر ذمے دار شخص نہیں ہوں۔“

زکریا نے کہا۔ ”جناب والا! میں نہیں جانتا کہ تم ذمے دار شخص ہو یا غیر ذمے دار شخص۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ وہ یہ کہ ان تینوں کو میری موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔“

سرائے کا مالک بھی چڑ گیا تھا، بولا۔ ”صاحبزادے! اگر تم مجھے اعتبار کے لائق نہیں سمجھتے تو کوئی بات نہیں۔ تمہارے لیے میرے پاس کوئی کمرا نہیں، کہیں اور انتظام کر لو جا کر۔“

سرائے کے مالک کے اس دوٹوک اور خشک جواب نے زکریا کو مشتعل کر دیا لیکن اس وقت وہ اس حیثیت میں نہیں تھا کہ اپنے اشتعال کا اظہار کرتا۔

سرائے کا مالک اپنے نچلے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کرنے لگا۔ زکریا نے بات بگڑتے دیکھی تو خوشامد سے کہا۔ ”واہ جناب! میری ذرا سی بات کا برا... مان گئے۔ خیر اگر میرے لیے کمرا نہیں ہے تو نہ سہی مگر یہ وعدہ ضرور کرو کہ میرا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔“

سرائے کے مالک نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کو اندر سے بند کر لیا۔ زکریا کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا پھر کچھ سوچ کر دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے دروازہ کھل گیا اور وہاں سے سرائے مالک کے بجائے کوئی اور بوڑھا شخص نکلا۔ بے مروتی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے...... کس سے ملنا ہے؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”سرائے کے مالک سے ملنا ہے وہ کہاں چلا گیا؟“

بوڑھے نے کہا۔ ”جو کچھ کہنا ہے...... مجھ سے کہہ

دے۔ اب وہ تجھ سے نہیں ملے گا۔''

زکریا نے کہا۔''اس سے کہہ دو کہ میں بہر قیمت ایک رات یہاں گزاروں گا۔ میں اس کا پیشگی اور دوگنا کرایہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

بوڑھا کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ اسی وقت پیچھے سے سرائے مالک نمودار ہو گیا۔ اس نے زکریا کی بات سن لی تھی بولا۔''صاحبزادے! میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے اور اپنے آپ کو راز میں کیوں رکھنا چاہتے ہو۔ میں تم سے یہ ساری باتیں پوچھ بھی نہیں سکتا۔ میرا کام تو یہ ہے کہ اپنے مسافروں کو آرام پہنچاؤں۔ میرا یہ کام ہرگز نہیں کہ اپنے مسافروں کی جاسوسی کروں اور ایک کی خبر دوسرے تک پہنچاتا پھروں۔''

زکریا نے کمرے کا کرایہ دوگنا پیشگی ادا کر دیا۔ سرائے کا مالک اس کو اوپر لے کر چلا گیا۔ اس کا گھوڑا نیچے باندھ دیا گیا۔ زکریا کو جو کمرا دیا گیا تھا، وہاں سے سرائے کی کوٹھریاں بہت صاف نظر آتی تھیں۔ اس نے یہیں سے ان تینوں کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس کی طرح قسطنطنیہ جا رہے تھے لیکن وہ تینوں اپنی اپنی کوٹھریوں میں بند تھے۔ اس نے ان کے گھوڑوں کی جھلک ضرور دیکھ لی جو دالان میں کھڑے جگالی کر رہے تھے۔

شام سے ذرا پہلے سرائے کے مالک کے ساتھ ایک شخص اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس سے درخواست کی کہ زکریا رات کا کھانا اس کے مریدوں کے ساتھ کھائے۔

سرائے کا مالک اس شخص کا بڑا احترام کر رہا تھا۔ اس نے زکریا کو بتایا کہ یہ شخص جس کا نام عثمان ہے، اس علاقے کا پیر ہے۔ اس کے سیکڑوں مرید ہیں جو خانقاہ کے لیے اپنی اپنی آمدنی کا ایک چوتھائی پیر کے حوالے کر دیتے ہیں اور پیر عثمان اس رقم کو مسافروں کی ضیافت اور قرض داروں بیواؤں اور یتیموں پر خرچ کر دیا کرتے ہیں۔ پیر عثمان نے زکریا کو مجبور کیا کہ وہ رات کا کھانا خانقاہ میں کھائے۔ زکریا انکار کر دینا چاہتا تھا مگر سرائے مالک نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ زکریا کو شبہ تھا کہ اس ضیافت میں سرائے میں مقیم تینوں لڑکوں کو بھی مدعو کیا گیا ہوگا اور وہ ان تینوں کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے پیر عثمان سے معذرت کرنا چاہی۔''پیر و مرشد! میں علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اس لیے پوری رات آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ مجھے معاف کر دیا جائے؟''

پیر عثمان نے جواب دیا۔''نوجوان! میں جانتا ہوں تو معذرت کیوں کر رہا ہے۔ سرائے کے مالک نے ساری بات پہلے ہی بتا دی ہے۔ اس لیے میں نے ان تینوں کو ضیافت میں نہیں بلایا ہے۔ انہیں کل صبح بلاؤں گا، آج تیری باری ہے۔''

اب زکریا انکار نہیں کر سکا۔ ضیافت قبول کر لی۔ پیر عثمان یہ کہہ کر چلے گئے کہ مغرب کے بعد ان کا ایک مرید آئے گا اور زکریا کو لے جائے گا۔ پیر عثمان کے چلے جانے کے بعد زکریا نے سنان پاشا کے اس خط کو پھر ٹٹول کر دیکھا جو اس کے دائیں بازو پر تعویذ کی طرح بندھا ہوا تھا۔ تینوں نوجوان کی بابت طرح طرح کے خیالات آ کر ستا رہے تھے۔ خیالات کا سیل مڑا تو ناہید کی طرف چلا گیا۔ صفی الدین کی محبتیں اور اس کا آخری سماں یاد آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر کسی طرح ناہید کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس کے باپ صفی الدین کو خود زکریا نے قتل کیا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ زکریا کو جھرجھری آ گئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مغرب کے بعد جب رات کی سیاہی غالب آ گئی اور سرائے کی کوٹھریوں اور سرائے کے مالک کی دومنزلہ عمارت میں شمعیں روشن ہو گئیں تو زکریا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر نیچے ان کوٹھریوں کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جن میں تینوں نوجوان ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہاں ان کے کھلے دروازوں سے اندر روشن شمعوں کی روشنی باہر گھوڑوں پر پڑ رہی تھی۔ جب وہ نیچے دیکھ رہا تھا، اسی وقت سرائے کا مالک، پیر عثمان کے مرید کے ساتھ اندر داخل ہوا اور زکریا کو مطلع کیا۔...''پیر عثمان نے اپنا مرید بھیج دیا ہے، اب تم جا سکتے ہو۔''

زکریا نے مرید کو بغور دیکھا۔ یہ دبلا پتلا غیر معمولی لمبا ادھیڑ عمر شخص زکریا کو بغور دیکھنے میں مشغول تھا۔ زکریا نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی ذی مرتبہ شخص نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ معمار، حداد یا لوہار ہوگا۔

زکریا اس شخص کے ساتھ نہایت احتیاط سے نیچے اترا۔ اپنے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اچک کر سوار ہو گیا۔ مرید اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور پھر یہ دونوں بستی کے جنوبی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے اور کچھ دیر بعد ایک پھاٹک سے گزر کر چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ یہ پیر عثمان کی خانقاہ اور ان کی مسجد کی چار دیواری تھی۔ جہاں بہت سارے حجرے بنے ہوئے تھے۔ پیر عثمان کے مرید نے ان حجروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اگر

تم سرائے کے بجائے یہاں آجاتے تو مزے میں رہتے۔ ہم مہمانوں کو اللہ کی مہربانی سمجھتے ہیں۔''

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چار دیواری کے بیچ میں خانقاہ بھی اور خانقاہ سے متصل مسجد۔ خانقاہ کے باہر گھوڑوں کو باندھنے کے لیے درختوں کے تنے گڑے ہوئے تھے۔ زکریا اور ساتھی مرید نے اپنے گھوڑوں کو انہی تنوں سے باندھ دیا۔ خانقاہ کے دروازے پر پیرعثمان زکریا کی پیشوائی کو موجود تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر زکریا سے ہاتھ ملایا اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر پھیر لیے۔ زکریا کو ان کے اس حسنِ اخلاق پر شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔

پیرعثمان نے کہا۔ ''مرحبا اے نو وارد...... مرحبا۔''

زکریا نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ''آپ کے انکسار اور خوش اخلاقی نے مجھے آپ کا بندۂ بے دام کر دیا ہے۔''

پیرعثمان نے زکریا کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اسی طرح خانقاہ کے اندر چلے گئے۔ وہاں بہترین قالین بچھے ہوئے تھے اور چھت سے عراقی شیشے کے جھاڑ لٹکے ہوئے تھے اور خاص اس جگہ، جہاں پیرعثمان کی نشست تھی، پانچ بڑے چراغ دان روشن تھے۔ انہیں اصطلاحاً البیوس کہا جاتا تھا۔ منارے کی شکل کے البیوس تانبے کے تین پایوں پر گلاس کی طرح رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پگھلی ہوئی چربی سے بھر دیا گیا تھا۔ گلاس کے بیچ میں منار جیسی شے سے بتی نکلی ہوئی روشن تھی۔ ان پانچوں البیوس (چراغ دانوں) کے پاس ایک آدمی بیٹھا تھا۔ جسے عرف عام میں الجراجی (الچراغچی) کہا جاتا تھا۔

پیرعثمان بڑے البیوس کے پاس پہنچے تو وہاں موجود مریدوں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور جب تک پیرعثمان بیٹھ نہیں گئے وہ سب کھڑے رہے۔ مریدوں کے جسم قباؤں میں اور پاؤں موزوں میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کی کمر میں پیٹیاں تھیں جن میں خنجر لگے ہوئے تھے اور سروں پر سفید اونی ٹوپیاں تھیں ہر ٹوپی کے اوپر بیچوں بیچ میں دو انگلی قطر کا کپڑا لگا ہوا تھا۔

پیرعثمان کے پاس ہی زکریا بیٹھ گیا۔ خانقاہ کے خدام نے پیرعثمان کے اشارے پر کھانے کے برتن رکھنا شروع کر دیے۔ زکریا پیرعثمان کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھا۔

پیرعثمان نے لقمہ توڑا تو بقیہ حاضرین ضیافت نے بھی اتباع کی اور کھانوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ زکریا کو یہ کھانے بہت اچھے لگے۔

جب ضیافت سے فرصت ملی تو پیرعثمان نے زکریا سے پوچھا۔ ''نوجوان! مجھے تجھ سے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن کیا تو بتائے گا کہ تو اتنی عجلت میں قسطنطنیہ کیوں جا رہا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''پیرو مرشد! اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کی ضیافت سے شکر گزار ہو کر آپ جو پوچھیں گے بتا دوں گا تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ براہِ کرم آپ اس نوع کے سوال نہ کریں۔''

پیرعثمان نے پھر سوال کیا۔ ''کیا تیرا تعلق سلطان کے حفاظتی دستے سے ہے؟''

زکریا نے چڑ کر جواب دیا۔ ''پھر وہی، پہلے جیسا سوال۔ افسوس کہ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

پیرعثمان نے کہا۔ ''تو میرا مہمان ہے اس لیے میں تیری تلخیاں بھی گوارا کرلوں گا لیکن یاد رکھ کہ اگر تو نے کسی کو اپنا رازدار نہ بنایا تو رازداری کا ابھار تیری صحت کو برباد کر دے گا۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''پیرو مرشد! آپ جس قسم کی باتیں کر رہے ہیں، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کو اپنے اصولوں پر جان تو دے دینا چاہیے لیکن اصول شکنی نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کا مہمان ہوں۔ آپ کو بھی معلوم رہنا چاہیے اور کچھ نہیں۔''

پیرعثمان کے ایک مرید نے غصے میں کہا۔ ''پیرو مرشد کی موجودگی میں اس قسم کی باتیں کرنا گستاخی میں داخل ہے۔ اگر تو ہمارے پیر کا مہمان نہ ہوتا تو میں اس گستاخی کی سزا ضرور دیتا۔''

پیرعثمان نے مرید کو سرزنش کی۔ ''خبردار! زبان کو قابو میں رکھو۔ یہ نوجوان ہمارا مہمان ہے اور ہمیں اس کے بارے میں تجسس سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' پھر زکریا سے پوچھا۔ ''نوجوان! کیا تو سماع میں دلچسپی رکھتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سماع سے کسے دلچسپی نہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے سوالوں کے جواب نہ دے کر میں بڑی زیادتی کر رہا ہوں۔''

پیرعثمان نے اپنے مرید کو حکم دیا۔ ''مطربوں کو بلایا جائے۔''

اس حکم کے ساتھ ہی گانے والوں کی ایک ٹولی آگئی۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال رکھے تھے۔ زکریا کے گداز دل پر یہ سماع قیامت ڈھانے لگا۔ خوش آواز گانے کے فن سے واقف مطربوں نے خاص عشقیہ کلام شروع کر دیا۔ ساز بجانے والوں نے ان کی دھن کے مطابق ساز چھیڑے اور سننے والوں کے دل و دماغ میں

آگ سی لگادی۔ زکریا کا سینہ ناہید کے عشق کی آگ سے دہک اٹھا۔ اس کو اپنے وجود پر غصہ آرہا تھا جو سلطان کی تابعداری اور فرماں برداری میں وہ کام کر آیا تھا جس کی کوئی تلافی نہیں تھی۔

مغنی عشق، جنون اور دیوانگی کی مدح سرائی کر رہا تھا اور بار بار یہ بتا رہا تھا کہ زندگی بے بندگی سرتاپا شرمندگی ہے، بندگی کیا ہے؟ اپنے محبوب کی پرستاری۔

زکریا کا دل بھر آیا اور وہ بھی رونے لگا۔ وہ اپنے کیے پر نادم تھا۔ وہ اپنے وجود پر شرمندہ تھا۔ بار بار یہی جی میں آرہا تھا کہ وہ یہیں سے جھیل وان کے کنارے واپس جائے اور ناہید کو تلاش کرکے اس کے قدموں میں سر رکھ دے اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔

خواب ناک ماحول میں مطربوں کی پُرسوز آوازیں زکریا کو زیادہ متاثر کرتی رہیں۔ پیر عثمان زکریا کے کرب و اضطراب کو شدت سے محسوس کرتا رہا۔ اس نے زکریا کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”نوجوان! اس زندگی اور دنیا میں کچھ بھی نہیں، انسان کے لیے کچھ بھی نہیں۔ بس اس کا وہی کچھ ہے جو اسے میسر آجائے یا حاصل کرلے۔ تو دنیا کی فکر میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔“

زکریا کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ وہ اپنی داستانِ عشق کسی کو سنا کر اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا، پیر عثمان کو اپنا رازدار بنا کر اس سے دعاؤں کی درخواست کرنا چاہیے لیکن پھر یہ سوچ کر محتاط ہوگیا کہ اس طرح اس کی حیثیت کا راز طشت از بام ہوجائے گا اور سلطانی ہرکارے اس کے آس پاس سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں جو اس کو گرفتار کرکے سلطان کے قدموں میں ڈال دیں گے اور اس طرح وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

پیر عثمان نے پوچھا۔ ”نوجوان! تو کیا سوچنے لگا؟“

زکریا گھبرا کر کھڑا ہوگیا، بولا۔ ”پیر و مرشد! مجھے صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی یہاں سے چلے جانا ہے اس لیے میں اب سرائے واپس جانا چاہتا ہوں تاکہ آرام کرلوں اور صبح تازہ دم ہوکر اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔“

پیر عثمان نے اس کو شانوں پر زور دے کر بٹھا دیا، بولا۔ ”ابھی نہیں...... کچھ دیر اور۔“

زکریا مجبوراً بیٹھ گیا لیکن وہ جتنی دیر بھی بیٹھا دل پریشان اور اچاٹ ہی رہا۔ نصف شب کے بعد وہ خانقاہ سے باہر نکلا۔ پیر عثمان کے اشارے پر دو مرید خانقاہ کے دروازے تک اس کو چھوڑنے گئے۔ باہر ایک مشعل بردار پہلے ہی سے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ مشعل کی روشنی میں گھوڑے تک پہنچنے اور اس پر سوار ہونے میں سہولت ہوئی۔ رات کے سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپیں بڑا شور کر رہی تھیں۔ سرائے کے قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کی رفتار بالکل کم کردی تاکہ اس کے ٹاپوں کی آواز زیادہ شور نہ کرے۔

سرائے کی کوٹھریاں بند ہوچکی تھیں اور شاید اندر کے چراغ بھی گل کردیے گئے تھے مگر آخری تین کوٹھریوں کے دروازے اس وقت بھی کھلے ہوئے تھے اور ان کے اندر روشن شمعوں کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ اس روشنی میں ان کے گھوڑے صاف نظر آرہے تھے۔

زکریا دو منزلہ عمارت کے دروازے پر آہستہ سے گھوڑے سے اتر پڑا اور بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر دربان اتنا چوکنا بیٹھا تھا کہ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ زکریا نے اپنا گھوڑا اس کے حوالے کردیا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں تین نوجوانوں کو بیٹھے دیکھا۔ اس کو خطرے اور وقت کی نزاکت کا اتنا شدید احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ پیش قبض پر چلا گیا لیکن ابھی وہ اپنی پیش قبض نکال بھی نہیں سکا تھا کہ تینوں نوجوان بجلی کی طرح کوند کر اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو بے بس کردیا۔

زکریا نے چیخ کر کہا۔ ”یہ بزدلی ہے کہ تم تینوں ایک غافل شخص پر حملہ کرکے اس کو بے بس کیے دے رہے ہو۔“

ایک شخص نے جواب دیا۔ ”ہم تینوں تیرے پاس لڑنے جھگڑنے نہیں آئے تھے اور اگر تیرا ہاتھ تیری اپنی پیش قبض پر نہ گیا ہوتا تو ہم تجھ پر یوں نہ ٹوٹ پڑتے۔“

زکریا نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے اور تم تینوں میرے لیے جذبۂ خیر سگالی رکھتے ہو تو میری پیش قبض اپنے قبضے میں لے کر مجھ کو چھوڑ دو اور اطمینان سے بات کرو۔“

ان تینوں نے زکریا کی پیش قبض اپنے قبضے میں لے لی اور زکریا کو چھوڑ دیا۔ زکریا نے سکون کی سانس لی اور ان تینوں کے مقابل بیٹھ گیا، پوچھا۔ ”یہ میرے کمرے کو تم تینوں کے لیے کھولا کس نے تھا؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”سرائے کے مالک نے۔ اس ملک میں کوئی بھی شخص ہمارے حکم کو نہیں ٹال سکتا۔“

زکریا نے پوچھا۔ ”تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”سنان پاشا کا خط کہاں ہے؟“

زکریا کے پورے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی بولا۔ ”کون سا خط؟ کون سنان پاشا؟“

دوسرے نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”تو گویا تو سنان

پاشا سے بھی واقف نہیں، عجیب بات ہے۔"
زکریا نے کہا۔ "جناب والا! تمہیں میری بابت یقیناً کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔"
پہلے شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "کیا خیال ہے، ہم تینوں اس کی تلاشی کیوں نہ لے لیں؟"
دوسرے نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔"
زکریا تڑپ کر پیچھے ہٹا اور کونے میں لٹکی ہوئی تلوار اتار لی اور فضا میں لہرانے لگا، بولا۔ "خبردار جو کوئی آگے بڑھا اور میری تلاشی لینے کی کوشش کی۔"
وہ تینوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ گویا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں؟
ایک آگے بڑھا اور بڑی ملائمت سے کہا۔ "تو تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ اس تلوار کو پھینک دے اور پرامن ماحول میں بات کرنے کی کوشش کر۔ ورنہ اگر ہم تینوں لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے تو، تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"
زکریا نے جواب دیا۔ "کوئی پروا نہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں اگر مروں گا تو تم تینوں میں سے دو کو تو میں ٹھکانے ضرور لگادوں گا۔"
ایک نے پوچھا۔ "یہاں کب تک رہو گے؟"
زکریا نے انہیں دھوکا دیا۔ "پرسوں تک، میں کل آرام کرنا چاہتا ہوں۔"
اس شخص نے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں تجھ سے بات ابھی نہیں کرنی چاہیے، صبح مناسب رہے گی۔"
بقیہ دونوں نے بھی اس کی تائید کی اور زکریا بھی کسی قدر مطمئن ہوگیا۔ ایک نے زکریا سے کہا۔ "اچھا تو صبح بات ہوجائے گی۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا صفی الدین کا مہمان تو ہی تھا اور صفی الدین نے تجھ ہی کو اپنی بیٹی ناہید کے لیے پسند کرلیا تھا؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "میں وہ نہیں ہوں، تمہیں میری بابت غلط فہمی ہوئی ہے۔"
تیسرے نے پوچھا۔ "کیا سنان پاشا نے سلطان سلیم کے نام تجھے کوئی خط نہیں دیا؟"
زکریا نے انکار کیا۔ "نہیں نہیں، میں نے کہہ جو دیا کہ تم تینوں کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔"
وہ تینوں خاموشی سے نکل گئے۔ زکریا نے احتیاط کے ساتھ کمرے کو اندر سے بند کرلیا اور بستر پر گر کر ان تینوں کی بابت غور کرنے لگا۔ اس کو یہ تینوں ینی چری کے نہیں معلوم ہوتے تھے پھر یہ کون تھے؟ یہ بڑا الجھا دینے والا سوال تھا۔ صفی الدین اور ناہید کا ان کی زبان سے ذکر بڑا معنی خیز اور الجھن کا مسئلہ تھا۔ وہ پوری رات نہیں سو سکا۔ ابھی رات کا ایک پہر باقی تھا کہ وہ سرائے سے باہر نکلا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر دریائے سقریہ کے کنارے کنارے چلنے لگا۔
رات کو دریا پار جانے کے لیے کوئی کشتی بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں اداپزاری کی طرف بڑھتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اداپزاری میں داخل ہوگیا۔ یہاں بحیرۂ اسود کے ساحل پر کشتیاں تیار کھڑی تھیں۔ یہ ان میں سے اس کشتی میں بیٹھ گیا جو سب سے پہلے روانہ ہونے والی تھی۔ کشتی میں مسلمان، عیسائی اور یہودی مسافر شانے سے شانہ ملائے سفر کررہے تھے۔ انہوں نے زکریا کو بڑے غور سے دیکھا۔ انہیں اس کے چہرے پر معلوم نہیں کیا نظر آرہا تھا۔
زکریا دوسروں سے کٹا ہوا الگ الگ سفر کرتا رہا۔ کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنے کے بعد وہ حیدر پاشا کے سامنے سے گزر کر باسفورس میں داخل ہوگیا۔ اب اس کے سامنے قسطنطنیہ تھا۔ وہ سب سے پہلے سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ کشتی نے اسے قسطنطنیہ کے ساحل پر اتار دیا۔ ساحل پر کیچڑ تھا، یہ اس میں سے گزر کر ساحلی چوبی مکانوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ات میدان میں داخل ہوگیا۔ اب اس کو ینی چری کی اقامتی درس گاہ کی عمارتیں صاف نظر آنے لگیں۔ اس نے ات میدان میں نوعمر اور نوآموز ینی چری طلبا کو گھوڑے دوڑاتے دیکھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ کمرے کا خدمت گار زکریا کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ "زکریا! تم کب آئے؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی، جاؤ استاد ارسلان کو بتادو کہ زکریا آگیا ہے اور اسی وقت سلطان سے ملنا چاہتا ہے۔"
خدمت گار بھی بھاگ کر استاد ارسلان کو بلالایا۔ استاد نے اپنے شاگرد کو سینے سے لگالیا اور اشارتاً سوال کیا۔ "کیا اکیلا ہی آیا ہے تو؟"
زکریا نے جواب دیا۔ "ہاں استاد محترم! میں اکیلا ہی آیا ہوں۔"
استاد ارسلان نے مذبذب لہجے میں پوچھا۔ "کیا تو اسی وقت سلطان سے ملنا چاہتا ہے اور اس کام کا کیا ہوا جس کے لیے تم سب کو بھیجا گیا تھا؟"
زکریا نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے کپڑے

نکالنے لگا، بولا۔ ”سلطان جو کچھ چاہتا تھا ہو گیا۔ نہایت کامیابی سے۔ سلطان اقبال مند ہے۔ ہر کام اس طرح ہو گیا کہ اپنی کامیابی پر ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔“

استاد ارسلان نے دبدبے سے پوچھا۔ ”سلطان کے نام کسی کا کوئی خاص پیغام؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”ہاں سنان پاشا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

استاد ارسلان نے بے چینی سے کہا۔ ”وہ پیغام کہاں ہے، میں دیکھ تو لوں۔“

زکریا نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں وہ پیغام آپ کو نہیں دکھا سکتا استاد محترم۔“

استاد ارسلان کھسیا گیا۔ ”اچھا پھر تو غسل کر کے دوسرا لباس پہن لے، اس کے بعد ہم دونوں سلطان کے پاس چلیں گے۔“

زکریا نے غسل کر کے لباس بدلا۔ اس کے دائیں بازو پر سنان پاشا کا مختصر خط اس وقت بھی تعویذ کی طرح بندھا ہوا تھا۔ اس نے اس تعویذ نما خط کو چھو کر دیکھا اور خاموش رہا پھر یہ دونوں سلطان کی خدمت میں چل پڑے۔

سلطان اپنے دوسرے صحن والے دیوان میں بیٹھا اپنی رعایا کے مقدمات چلا رہا تھا۔ صحن کے دربانوں نے ان دونوں کو سلطان کے قریب ترین آدمیوں میں جان کر مروت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ایک دربان نے ان دونوں کو نہایت احترام اور ادب سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں انتظار کے لیے ایک کمرے میں بٹھا کر خود سلطان کے پاس چلا گیا۔ سلطان نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا جس کا مطلب یہ تھا کہ بقیہ مقدمات کل زیرِ غور آئیں گے۔

اس کے فوراً بعد استاد ارسلان اور زکریا کو طلب کیا۔ دونوں نے اندر داخل ہوتے ہی سلطان کے قریب پہنچ کر اس کی لٹکی ہوئی عبا کو بوسہ دیا اور ادب سے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس وقت زکریا نے اپنے داہنے بازو سے سنان پاشا کا خط کھولا اور سلطان کے حوالے کر دیا۔ سلطان نے نہایت اطمینان سے خط کھول کر پڑھا اور پوچھا۔ ”زکریا! جب تو وہاں سے چلا تھا تو کیا واقعی ترکی سرحدوں پر آباد منافقوں کا قلع قمع کر دیا گیا تھا؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”جی سلطان محترم! اس نامے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، وہ اس تفصیل کی اجمال ہے جو جھیل وان کے کنارے منافقوں کے ساتھ پیش آیا۔“

سلطان نے کہا۔ ”سنان پاشا نے اپنے اس خط میں تو کچھ بھی نہیں لکھا جبکہ ہمیں اس کا ایک خط جو کل مل چکا ہے، ہمیں معرکے کی بڑی تفصیل بتا چکا ہے۔“

زکریا کا دل ڈوبنے لگا۔ ”کیا سنان پاشا کا کوئی دوسرا خط اس سے پہلے ہی سلطان کو مل چکا ہے؟“

سلطان نے جواب دیا۔ ”ہاں کل ہی، اب تو جا سکتا ہے۔“ پھر استاد ارسلان سے کہا۔ ”ارسلان! اس کو بتا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کو میرا قرب کتنی آسانی سے میسر آ جاتا ہے۔ ایک غیر معمولی شخص کسی غیر معمولی شخص ہی کو اپنا قرب بخش سکتا ہے۔“

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم کے حکم کی تعمیل ہو گی۔“

اس دن ان دونوں کو سلطان کا قرب چند لمحوں کے لیے میسر آیا تھا۔

☆☆☆

استاد ارسلان نے زکریا سے وہ سارے واقعات سنے جو... جھیل وان کے کنارے پیش آئے تھے لیکن اس نے صفی الدین اور ناہید کے بارے میں وہ سب نہیں بتایا جو ان دونوں کی نسبت سے پیش آیا تھا۔ استاد ارسلان نے.... بے دلی سے کہا۔ ”زکریا! جب تجھے بار بار منع کیا گیا تھا کہ تو اپنے کام سے کام رکھے گا اور عشق و محبت سے گریز کرے گا تو یہ تیری بابت کیا سنا جا رہا ہے کہ تو نے ایک لڑکی سے عشق شروع کر دیا تھا۔“

زکریا کو ذرا سی پریشانی ہوئی کیونکہ جس بات کا اس نے استاد ارسلان سے ذکر ہی نہ کیا تھا اس کا انہیں کس طرح علم ہو گیا؟ اس نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں نوجوان ہوں اور میرے سینے میں نہایت حساس اور جذباتی دل ہے اگر میں ناہید کی طرف متوجہ نہ ہوتا تو خود مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ استاد محترم! میں نے سلطان کی خاطر وہ کچھ کیا جو کسی دوسرے نوجوان کے بس کا نہیں ہے۔“

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ”صاحبزادے! سلطان کی چاکری، سلطان کی محبت میں مرنا اور سلطان کی خواہش اور مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا، یہ سارے ہی غیر معمولی کام ہیں۔ ہم سب غیر معمولی کام انجام دے رہے ہیں۔“

زکریا نے دل برداشتہ ہو کر عرض کیا۔ ”استاد محترم! جھیل وان کے کنارے مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا ہے، وہ کانٹے کی نوک کی طرح دل میں چبھ گیا ہے اور وقتاً فوقتاً کانٹے کی یہ نوک مجھے تڑپاتی جلاتی رہتی ہے۔“

استاد ارسلان نے کہا۔ ”زکریا! تو خوش قسمت ہے کہ

اس ماحول سے نکلنے کا موقع تو مل گیا۔ ایک میں ہوں کہ جب سے یہاں آیا ہوں، بس دو بار کہیں اور آیا گیا ہوں۔ اے کاش! میں بھی کہیں آ جا سکتا۔"

زکریا کو استاد ارسلان کی باتوں نے زندہ رہنے اور سلطان کی خدمت کرتے رہنے کا شاندار درس دیا تھا۔ اب زکریا کو پہلے سے زیادہ محنت و مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ صبح فجر کی نماز سے دو گھنٹے پہلے بستر چھوڑ دیتا تھا اور باہر نکل کر ادھر ادھر بھاگتا دوڑتا رہتا۔ اس میں اس کے چند ہم عمر، ہم سفر بھی ہوتے۔ یہ سب دو گھنٹے مسلسل بھاگتے رہتے۔ اس کے بعد ستا کر غسل کرتے اور وضو کر کے نماز فجر ادا کرتے۔ نماز کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر زکریا ات میدان میں گھڑ سواروں کی مشق میں مشغول ہو جاتا۔ اس سے فارغ ہوتا تو اپنے کپڑے خود دھوتا اور انہیں دھوپ میں پھیلا کر یار دوستوں میں نکل جاتا اور ان سے خوش گپیاں کرنے لگتا۔

جمعے کی نماز کے بعد زکریا نے اپنے استاد ارسلان سے پوچھا۔ "استاد محترم! اب کیا صورت حال رہے گی؟"

زکریا کا یہ فقرہ ابھی پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا کہ ایک شخص نمازیوں کو پھلانگتا ہوا استاد ارسلان اور زکریا کے پاس پہنچ گیا اور پھر ان دونوں سے باری باری کان میں کہا۔ "آج ظہر کے بعد سلطان معظم نے آپ دونوں کو یاد فرمایا ہے۔ اس لیے اس وقت کسی کام میں نہ الجھ جانا۔"

زکریا نے استاد ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "سلطان معظم سے عرض کر دینا کہ یہاں کس کی اتنی مجال ہے کہ سلطان کا پیغام سن کر بھی ان سنی کر دے۔"

وہ شخص کہتا ہوا چلا گیا۔ "مجھے یہی پیغام اوروں کو بھی دینا ہے اس لیے چلتا ہوں۔"

استاد ارسلان کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی آہستہ سے کہا۔ "احمق! اگر تو یہ نہ بھی کہتا میں تب بھی تجھ کو پکڑ نہ لیتا۔"

نماز کے فوراً بعد یہ دونوں دوسرے صحن کی طرف چلے گئے۔ دوسرے صحن کے بڑے دیوان میں ساٹھ ستر آدمی موجود تھے جنہیں سلطان کا قرب حاصل تھا اور سلطان ان پر اعتبار کرتا تھا۔ ان میں فوجی بھی تھے اور اقامتی درس گاہ کے استاد بھی، زیر تعلیم طلبا بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جن کے مشورے، تجربوں کے بعد ثقہ، صائب اور قابلِ قبول ٹھہر چکے تھے۔ سلطان کی جگہ خالی تھی۔

زکریا نے ان لوگوں میں شناسا چہرے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان میں کئی ایسے آدمی موجود تھے جنہیں وہ وان جھیل کے کنارے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ انہی میں وہ نامہ بر بھی موجود ہو گا جو غداروں کی بیخ کنی کی... خوشخبری لے کر اس سے پہلے ہی سلطان تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہ غیر معمولی بات بھی محسوس کر لی کہ حاضرین میں سے اکثر لوگ زکریا کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے اور دیکھ چکنے کے بعد ہنستے مسکراتے چہرے آپس میں باتیں کرنے لگتے۔

ایک شخص دوسروں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا زکریا کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا۔ "کیوں میاں صاحبزادے! یہ میں اپنے سامنے کس شخص کو دیکھ رہا ہوں؟"

زکریا نے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ ناچیز سے باتیں کرنا پسند کریں گے؟"

اس نے عاجزی سے جواب دیا۔ "میں تو یہاں تیرے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ میں تجھ سے باتیں کرنے کی عزت حاصل کروں۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "جناب! میں نے تو ایسا کوئی بھی کام نہیں کیا جس سے آپ لوگوں سے عزت اور حرمت حاصل کر سکوں۔ ابھی تو میں طالب علمی کی زندگی بسر کر رہا ہوں پھر میرا ذکر آپ تک کس طرح پہنچ گیا؟"

اس شخص نے کہا۔ "جو نوجوانی میں کسی کا عاشق ہو کر خود پر قابو رکھے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں اپنی محبوبہ کا خیال نہ کرے تو وہ نوجوان دوسروں سے بڑا ہی ٹھہرے گا۔"

زکریا جھینپ گیا، سر جھکا کر بیٹھا رہا لیکن اب وہ خوش ضرور تھا کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا بڑا شہرہ تھا اور اسے بہت سراہا جا رہا تھا۔

اتنے میں سلطان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور لوگ احتراماً اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سلطان کے دیوان میں داخل ہوتے ہی آہستہ سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور چپ ہو گئے۔ سلطان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔ پورے دیوان میں اتنی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ بس کسی کسی لمحے کسی کی زور زور سے سانسیں لینے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ زکریا نے سلطان کے آس پاس موجود لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ان میں وہ تین نوجوان بھی موجود ہیں جو اسے ادا پڑاری سے پہلے دریائے ستریہ کی ایک ساحلی سرائے میں ملے تھے۔ وہ تینوں نوجوان تو اسے کہیں بھی نظر نہیں آئے لیکن سلطان کے بائیں جانب سنان پاشا کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔ سنان پاشا کو تو وہ جھیل وان کے کنارے چھوڑ آیا تھا پھر وہ اتنی جلدی یہاں کیسے آ گیا۔

سلطان نے عنان پاشا کو حکم دیا کہ وہ حاضرین کو

ایران کے بادشاہ اسمٰعیل صفوی کی شرارتوں اور ارادوں سے باخبر کرے۔ سنان پاشا نے اپنا منہ حاضرین کی طرف کرلیا اور پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''ایران کا بادشاہ اپنی عقل اور قوت کے بارے میں غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہوگیا ہے۔ جب وہ کسی سے جنگ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف عیاری اور سازش کا ماحول تیار کرتا ہے۔ گویا وہ اپنے مخالف کے چاروں طرف سازشوں کا جال پھیلا دیتا ہے اور جب اس کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اگر اب وہ اپنے دشمن پر تیغ اور تفنگ سے حملہ آور ہوگا تو سازشوں کے جال میں اس کا پھنسا ہوا دشمن مقابلے کی تاب نہیں لا سکے گا اور بہ آسانی سرنگوں ہوجائے گا، تب وہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اس نے ایک ایسا ہی جال سلطان معظم کے خلاف تیار کیا تھا جس کو بحمد للہ تار تار کردیا گیا ہے۔ اب سرحد پار سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ اسمٰعیل صفوی حملے کی تیاریاں کررہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطان معظم کے بھتیجے ترکی پر حکومت کے اصل حق دار ہیں اور انہیں حکومت ملنی چاہیے حالانکہ خدا کی نظر میں جو حکومت کا حقدار تھا، حکومت اس کے حوالے کردی گئی۔ اب ایران کے بادشاہ یا کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ خدائی فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر دے اور اگر ایسا کوئی کرے گا تو خدا کے غضب کا نشانہ بنے گا۔''

سلطان، سنان پاشا کی اس مختصر سی تقریر سے بہت خوش ہوا اور حاضرین سے خود مخاطب ہوا۔ ''چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ خدائی فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیرنے والے جاہل اور گستاخ کو سزا دوں اور یہ میں اس لیے بھی کروں گا کہ اس کام کے لیے خدا ہی نے مجھ کو مامور کیا ہے۔''

پیری پاشا سلطان کے داہنی طرف کھڑا تھا۔ بوڑھا جہاں دیدہ تجربہ کار وزیراعظم۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''سلطان معظم! آپ کو جو کچھ کرنا ہے، اس طرح کیجیے جس طرح خدا کرتا ہے۔ قدرت کرتی ہے، فطرت کرتی ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''یعنی؟ وضاحت بیان کر۔''

پیری پاشا نے کہا۔ ''خدا جو کچھ کرتا ہے اس کا کسی کو وقت سے پہلے علم نہیں ہوتا پھر بعد میں کیا ہونے والا ہے، اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سارے کام انتہائی کامیابی اور تسلسل سے جاری ہیں لیکن اگر خدا اپنے ارادوں اور فیصلوں کا قبل از وقت ہی اعلان کردیا کرے تو سلطان معظم خود ہی غور فرمالیں کہ اس کے کاموں میں کیسا خلل پیدا ہونے لگے گا۔''

پیری پاشا کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔ اس نے تحسین آمیز نظروں سے پیری پاشا کی طرف دیکھا، بولا۔ ''خدا نے اس بوڑھے کو غیر معمولی عقل دے دی ہے۔ اس کی عزت تو کرنا ہی پڑے گی۔''

ایک فوجی سردار نے سوال کیا۔ ''کیا سلطان معظم نے ایران پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے؟''

پیری پاشا نے سلطان کی طرف سے جواب دیا۔ ''اگر تیری بات کا یہ جواب دیا جائے کہ ایران پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں تو، تو کیا کرے گا؟''

فوجی سردار نے جواب دیا۔ ''اگر میری بات کا جواب ہاں میں ملے گا تو میں جنگ کی تیاری شروع کردوں گا، اگر جواب نہ میں ملا تو میں معمول کے مطابق رہوں گا۔''

پیری پاشا نے کہا۔ ''تیرا یہ اندازِ فکر غلط ہے۔ ہم سب کو ہر وقت چوکنا اور چوکس رہنا چاہیے کیونکہ ہمیں کچھ پتا نہیں کہ ہم پر ہمارا دشمن کب حالتِ جنگ مسلط کردے۔ جب تک ہم زندہ ہیں حالتِ جنگ میں ہیں۔''

سلطان نے پیری پاشا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کردیا، بولا۔ ''زیادہ عقل مند ہونا بھی خطرناک ہے کیونکہ عقل چیں وچناں میں مبتلا کرکے قوتِ عمل کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ میں سیدھی سادی بات جانتا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ایران پر حملہ کردوں کیونکہ جنگی معاملات میں جارح، دافع سے زیادہ فائدے میں رہتا ہے۔ میں اسمٰعیل صفوی کو اس کے گھر سے نہیں نکلنے دوں گا۔''

سلطان کا خیال تھا کہ اس تجویز کا جوش وخروش سے استقبال ہوگا اور پُرمسرت اور ولولہ انگیز چہرے اس کی تائید کریں گے لیکن اس نے دیکھا حاضرین فکر مند ہوگئے تھے اور تشویش اور اندیشے ان کے چہروں سے ہویدا تھے۔

سلطان نے ایک بار پھر حاضرین میں جوش پیدا کرنا چاہا۔ ''اسمٰعیل کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ اس کی نظریں ایشیائے کوچک پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ ہمارے علاقے کو ہتھیانا چاہتا ہے۔ وہ یہاں ناقابلِ برداشت ذہنی اور عقائدی انقلاب لانا چاہتا ہے اور میں شاہ ایران کو اس کے ارادوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے قطعی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ شاہ ایران سے دو دو ہاتھ کروں۔ میں مذبذب اور متردد لوگوں کو اپنی صفوں سے نکال باہر کروں گا۔ مجھے ایسے آدمی درکار ہیں جو ابراہیم خلیل اللہ کی طرح آگ میں بے خطر کود پڑنا جانتے ہوں۔ ایسے سرفروش جنہیں کاندھوں پر اپنے سر دبال محسوس ہوتے ہوں۔''

حاضرین کے چہروں پر تشویش بدستور موجود رہی۔

اسی عالم میں حاضرین کی آخری صف میں ایک شخص ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ سلطان کی تیز نظروں نے اس ہاتھ کو دیکھ لیا اور حکم دیا۔ ''اس شخص کو آگے آنے دیا جائے۔''

یہ شخص جب سلطان کے قریب آیا تو اسے سبھی نے پہچان لیا۔ یہ سلطان کا دربان عبداللہ تھا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں اور میرے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ سلطانی جھنڈے تلے شاہ ایران کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں گے جب تک کہ فتح نہ حاصل کرلیں گے یا پھر سلطان پر اپنی جانیں نثار کردیں گے۔''

سلطان نے عبداللہ کی پیش کش پر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''شاباش جواں مرد بہادر اور جاں نثار اسی طرح بات کرتے ہیں۔''

عبداللہ چند قدم اور بڑھ گیا اور سلطان کے روبرو گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ سلطان نے پیری پاشا کو حکم دیا کہ عبداللہ کو ایک ضلع کا حاکم بنادیا جائے۔

اسی وقت عجلت میں ایک ضلع کی حکومت کا پروانہ تیار کیا گیا اور عبداللہ چشم زدن میں دربان سے سنجاق (حاکم ضلع) بن گیا۔ حاضرین کو اچانک احساس ہوا کہ ایک دربان ان پر سبقت لے گیا ہے۔ ہر طرف ہاتھ اٹھنے لگے اور جاں نثاری کا اعلان ہونے لگا۔ زکریا بھی آگے بڑھا اور گزارش کی۔ ''سلطان معظم! میری خدمات تو ہر وقت ہی حاضر ہیں اور میں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ جاں نثاری کا نیا عہد یا اعلان کروں۔ میں تو حضور کے خانہ زادوں میں سے ہوں جو حکم ملے گا، اس کی تعمیل اپنا ایمان سمجھوں گا۔''

استاد ارسلان کو بھی کچھ خیال آگیا۔ عرض کیا۔ ''سلطان عالی شان! گو کہ یہ ناچیز ابھی تک تدریس و تربیت کے فرائض انجام دیتا رہا ہے لیکن اب یہ خانہ زاد عسکری خدمات دینا چاہتا ہے۔''

سلطان نے زکریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تیری جاں نثاری مسلم اور ثابت، مجھے تیرے جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے کیونکہ میری نظر میں وہ نوجوان منفرد اور یکتا ہے جو اپنے فرائضِ منصبی پر اپنی محبت اور محبوب تک کو قربان کردے لیکن اس سے بھی بڑی یہ بات ہے کہ عشق کا روگ لگایا ہی کیوں جائے۔ کام...... کام...... کام...... بس یہی نصب العین ہونا چاہیے۔ جہاں تک عشق کا تعلق ہے، یہ کسی ہانڈی کے ابال جیسی شے کا نام ہے۔ اس کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو روکا نہ جائے تو اس ابال میں انسان کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ جاہل عاقبت نااندیش اور اس کے مضر نتائج سے بے خبر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔''

اس کے بعد ارسلان تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ حاضرین دم بخود سلطان کی سحر انگیز باتوں میں گم تھے۔ آخر سلطان استاد ارسلان کی طرف مخاطب ہوا۔ اس نے ارسلان کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ سلطان کے قریب پہنچا تو حاضرین سے کہا۔ ''جب ارسلان جیسے معلم جاں نثاری کا اعلان کردیں تو مجھے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔'' پھر ارسلان سے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے کام سے مطمئن نہیں ہے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے فرائض منصبی کی یکسانی اور یک رنگی سے پریشان ہوں اور یہ کہ میں نے سالہا سال سے اپنے اس ماحول کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میں باہر نکل کر سلطان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے اعلان کیا کہ معلم ارسلان کو سہ رکنی وزراء میں شامل کرلیا جائے پھر پیری پاشا سے کہا۔ ''اور یہ تقرری ابھی اسی وقت ہونا چاہیے۔''

استاد ارسلان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ وہ وزارت کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ قسطنطنیہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ وہ سنان پاشا، زکریا اور اسی قسم کے دوسرے عہدیداروں کی طرح دور دراز علاقوں میں جانے کا خواہش مند تھا اور یہ کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سلطان کی نظر میں وزیر کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ پیری پاشا کے سوا کوئی بھی وزیر اپنی وزارت سے خوش نہیں تھا۔ سلطان سے قربت رکھنے کی وجہ سے وزیر کے سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکی رہتی تھی۔

استاد ارسلان نے دیکھا پیری پاشا جلدی جلدی پروانۂ وزارت کی تیاری میں مشغول ہے تو اس نے سلطان کی خدمت میں عاجزی سے درخواست کی۔ ''سلطان معظم! میں خود کو وزارت کا اہل نہیں پارہا۔''

سلطان ایک دم برہم ہوگیا، تیوریوں پر بل پڑ گئے اور ناک پھولنے لگی۔ مشتعل لہجے میں بولا۔ ''معلم ارسلان! تجھے کچھ ہوش بھی ہے کہ تو نے کیا کہا ہے۔ میں تجھے منصب وزارت بخش رہا ہوں اور تو یہ کہہ کر میری پیشکش کو ٹھکرا رہا ہے کہ تو اس کا اہل نہیں ہے۔ گو میری نظریں تجھے اور تیری اہلیت و لیاقت کو سمجھنے اور پرکھنے سے قاصر رہی ہیں؟ میں

تیری یہ گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔''
استاد ارسلان نے گزارش کی۔ ''حضور والا! میری یہ منشا ہرگز نہ تھی جو غلط فہمی میں سمجھی گئی ہے۔ میں کسی ایسے منصب کا طلب گار ہوں جس کا تعلق میدان جنگ سے ہو۔ دشمن کے ملک سے ہو یا کوئی ایسا کام ہو جو سیکڑوں یا ہزاروں میل دور رہ کر انجام دیا جاسکتا ہو۔''
سلطان نے پیری پاشا سے پوچھا۔ ''کیا پروانہ تقرری تیار ہو گیا؟''
پیری پاشا نے جواب دیا۔ ''جی سلطان معظم...... تیار ہے۔''
سلطان نے حکم دیا۔ ''اس کے حوالے کیا جائے۔''
استاد ارسلان نے رحم کی التجا کی۔ ''سلطان معظم رحم، مجھے منصب وزارت نہیں چاہیے، میں وزیر بننا نہیں چاہتا۔ مجھے تو معمولی مگر بیرونی دنیا سے متعلق منصب عطا فرمایا جائے۔''
سلطان نے عبداللہ دربان کو آواز دی۔ ''عبداللہ! گو تو سنجاق ہو چکا ہے مگر اس وقت تجھے اپنی سابقہ خدمت انجام دینا ہوگی۔ تو اپنے چند ساتھیوں کو یہیں بلالے تاکہ اس معلم کو منصب وزارت قبول کرنے پر آمادہ کیا جاسکے۔''
حاضرین کو پتا نہ تھا کہ سلطان استاد ارسلان کو اس قسم کی سزا دے گا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا کہ سب ہی متذبذب رہے۔ دربان عبداللہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر دوبارہ حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اس کو حکم دیا۔ ''عبداللہ! اپنے ساتھیوں سے کہہ دے کہ وہ اس معلم کو دبوچ لیں اور دو تو معلم کو دبوچے رہیں اور ایک معلم کے دونوں پاؤں پکڑ لے۔''
عبداللہ کے ساتھیوں نے اٹل موت کی طرح استاد ارسلان کو دبوچ لیا اور ایک نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ سلطان نے اپنا کوڑا دربان عبداللہ کی طرف پھینک دیا۔ معلم کے دونوں تلوے کوڑے کے سامنے کر دیے گئے۔
سلطان نے حکم دیا۔ ''معلم کے تلووں پر اس وقت تک کوڑے لگائے جاتے رہیں جب تک یہ منصبِ وزارت قبول کرنے کا اعلان نہ کر دے۔''
استاد ارسلان کے دونوں تلووں پر کوڑے برسنے لگے۔ اس کی کرب ناک چیخوں سے حاضرین کی طبیعتیں مکدر ہو گئیں۔ استاد ارسلان چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔ ''مجھے منصبِ وزارت قبول ہے، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔''
اس کے دونوں تلوے لہولہان ہو گئے۔ جب استاد ارسلان بے دم ہو گیا تو سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔
سلطان نے استاد ارسلان سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جوان؟ کیا تجھے منصب وزارت پسند نہیں ہے؟''
استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''مجھے منصبِ وزارت دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔''
پیری پاشا نے اسی وقت استاد ارسلان کو پروانہ وزارت عطا کیا لیکن شرم کے مارے استاد ارسلان اپنی نظریں نہیں اٹھا رہا تھا۔ سلطان نے حاضرین کو متنبہ کیا۔ ''مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میرے آدمی دون ہمتی کا مظاہرہ کریں جو جس مقام پر ہے جسے جو مقام بخشا گیا ہے، وہ اس پر پورا اترے اور کام چوری کرے۔''
سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''اس ناچیز نے تو اپنی زندگی سلطان کو دے دی ہے۔ میں ہر وقت اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔''
سلطان نے حاضرین کو حکم دیا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔ میں عنقریب اپنی افواج کو ملک کے مشرقی حصوں میں پہنچا دوں گا۔ تم سب اپنے اپنے محاذ سنبھالنے کی تیاریاں کرو۔''
حاضرین دل برداشتگی سے اٹھے اور سلطان کی طرف پشت کیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

☆☆☆

زکریا کو اپنے استاد ارسلان کی بڑی فکر تھی، اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ اب اس کا تعلق براہِ راست سنان پاشا سے ہو گیا تھا۔ سلطان کے حکم کے مطابق سلطانی فوجیں درہ دانیال کے سامنے یورپی ساحلی شہر میں جمع ہونے لگیں۔ زکریا کا میدانِ جنگ میں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کا خیمہ سلطان کے چاروں طرف نصب خیموں میں شامل تھا کیونکہ ینی چری سلطان کے معتمد ترین لوگ تھے۔
سنان پاشا نے زکریا کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور اس کو بتایا کہ سلطان کا حکم ہے کہ اب وہ سنان پاشا کے پاس ہی رہے گا۔ زکریا نے دیکھا سنان پاشا کے خیمے میں اس جیسے چند نوجوان اور موجود تھے اور ان سب کو زکریا کی طرح سنان پاشا کے قریب ہی رہنا تھا۔ زکریا کو سنان پاشا پسند نہیں تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سنان پاشا کے پاس رہنے سے انکار کر دیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس انکار کا نتیجہ کیا نکلے گا۔
سنان پاشا، زکریا اور دوسرے نوجوانوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا اور رات گئے تک واپس نہیں آیا۔ ان لوگوں نے سنان پاشا کی عدم موجودگی میں کھانا کھایا اور سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ اس سرزمین پر

حشرات الارض کی کثرت ہے۔ یہ بات زکریا اور اس کے ساتھی نوجوان کو بھی معلوم تھی۔ انہیں سونے کے لیے بستر زمین پر ہی بچھانا تھا لیکن زکریا اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنا بستر لکڑیوں کے ایک چوکھٹے میں موٹے ڈورے سے سی دیا اور اس چوکھٹے کو خیمے میں جھولے کی طرح معلق کر دیا۔

سنان پاشا رات کے پچھلے پہر سلطان کے خیمے سے واپس آیا اور زکریا کو جھولے میں سویا دیکھ کر بہت ہنسا۔ اس نے زکریا کو بیدار کر دیا اور کہا۔ ''تجھے میری واپسی تک بیدار رہنا چاہیے تھا۔''

زکریا نے آنکھیں ملتے ہوئے سنان پاشا کو دیکھا تو فوری طور پر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے کون مخاطب ہے۔ اس نے سنان پاشا کی بات بھی اچھی طرح نہیں سنی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے سنان پاشا کو پہچان لیا تو بوکھلا کر نیچے اترنے لگا۔ عجلت اور بوکھلاہٹ میں خود کو نہ سنبھال سکنے کی وجہ سے وہ نیچے گر گیا۔ سنان پاشا کو ہنسی آ گئی لیکن اس نے ہنسی کو بہ مشکل ضبط کیا اور پوچھا۔ ''سونے کا یہ کون سا انداز ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا! مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہاں حشرات الارض کی فراوانی ہے۔ میں زمین پر بستر بچھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔''

سنان پاشا نے کہا۔ ''ہم جنگ کے لیے نکلے ہیں۔ اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لے کر...... پھر یہ خوف کیا معنی؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن زندگی کو اس وقت تک قیمتی اور قابل حفاظت سمجھتا ہوں جب تک جان دینے کے لیے کوئی بڑا مقصد سامنے نہ ہو۔ بے مقصد، خوامخواہ حشرات الارض میں اپنی زندگی گنوا دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟''

سنان پاشا نے منہ بنایا۔ ''ارسلان نے تجھے باتیں بنانے کا ماہر کر دیا ہے۔ بظاہر تو نے مجھے لاجواب کر دیا ہے لیکن میں ان نوجوانوں کو ناپسند کرتا ہوں جو خطرات سے کھیلنا نہ جانتے ہوں۔''

زکریا نے بھی منہ بنایا اور بے زاری سے جواب دیا۔ ''خطرات کو آنے دیجیے۔ اس وقت میں دوسروں سے آگے آگے نظر آؤں گا کیونکہ میں بزدل نہیں ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنی قیمتی زندگی سلطان پر نچھاور نہ کر سکوں۔''

سنان پاشا نے خیمے کے محافظ کو طلب کیا اور اس سے تمام نوجوانوں کی بابت سوال کیا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ سب سوئے ہوئے ہیں۔ سنان پاشا نے حکم دیا۔ ''ان سب کو جگا دیا جائے۔''

چنانچہ ان سب کو جگا دیا گیا اور ان سب کو ایک بڑے خیمے میں اکٹھا کر دیا گیا۔ سنان پاشا نے ان کو بتایا کہ انہیں سفر کی تیاریاں کرنا ہیں کیونکہ سلطان نے صبح تک روانگی کا حکم دے دیا ہے۔

لیکن جب ان نوجوانوں میں بے چینی سی پیدا ہو گئی اور وہ سفر کی تیاریاں کرنے کے لیے جانے لگے تو سنان پاشا نے انہیں روک دیا اور کہا۔ ''پہلے میری باتیں بغور سن لو۔''

تمام نوجوان گوش برآواز ہو گئے۔ زکریا کو سنان پاشا کی ہر بات بری لگتی تھی لیکن مجبور تھا۔ سنان پاشا نے کہا۔ ''ہم سب ایران جا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم فاتح رہیں گے اور فتح مندی کا نشہ شراب سے زیادہ تیز اور آپے سے باہر کر دینے والا ہوتا ہے۔ تم سب نوجوان ہو اور تم سلطان کے معتمدین میں شمار ہوتے ہو۔ ایران میں دولت اور عورت تمہارے اختیار میں ہوں گی۔ اس لیے تمہارا یہ فرض ہوگا کہ خود کو ان دونوں سے محفوظ رکھو لیکن تم نے نہیں سنا کہ سلطان نے نوجوانی کے جوش و خروش کی مثال کس شے سے دی ہے اگر نہیں سنا تو مجھ سے سن لو۔ نوجوانی میں عشق لازمی ہے۔ سلطان نے کہا تھا کہ عشق ہانڈی کے ابال جیسی شے کا نام ہے اور اس کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو روکا نہ جائے تو اس ابال میں انسان کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔''

زکریا نے کہا۔ ''پاشا! آپ کے بقول ہمیں اپنے سفر کی تیاریاں کرنا ہیں۔ اس وقت ہم سب کو روانگی سے پہلے اپنا سامان سمیٹنا چاہیے، یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔''

سنان پاشا ایک دم گرم ہو گیا۔ ''زکریا! اپنی حد میں رہ۔ میں سلطانی فوج کا افسر اعلیٰ ہوں اور تم سب میرے تابع ہو تمہیں میرا حکم ماننا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔'' پھر نوجوانوں سے کہا۔ ''دوستو! زکریا گستاخ ہے لیکن اس کی بڑی بڑی اور بری بری باتیں ہم اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ اس نے معاملات عشق میں بھی سلطان کا خیال رکھا ہے۔ تم سب کو اس معاملے میں اس کی اتباع کرنی ہے۔''

زکریا حیران رہ گیا، وہ سنان پاشا جو اسے کبھی پسند نہیں آیا، دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔ صفی الدین کے قتل اور ناہید سے دستبردار ہو کر وہ خاصا شرمندہ ہوا تھا مگر اب مختلف سمتوں سے جب اس کے اس فعل کو بار بار سراہا جا رہا تھا تو اسے اپنے کیے پر ندامت نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ خود کو ایک غیر معمولی اور دوسرے نوجوانوں کے لیے ایک

قابلِ تقلید نوجوان محسوس کرنے لگا تھا۔

سنان پاشا نے زکریا کو تخلیے میں طلب کر کے سمجھایا۔ ''زکریا! میرے دل میں تیری بڑی عزت ہے کیونکہ سلطان بھی تیری عزت کرتا ہے۔ یہ جوانی کے جذبوں سے سرشار نوجوان تیری ہی اتباع کریں گے۔''

اب زکریا سنان پاشا کے ہاتھوں مفتوح ہو چکا تھا۔ جب فوج نے یہاں سے کوچ کیا تو زکریا نے ذہنی طور پر سنان پاشا کو اپنے استاد ارسلان کی جگہ دے دی تھی اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ سنان پاشا سے کچھ سیکھنے اور حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

گھوڑے کی تین دموں والا پرچم سنان پاشا کے ساتھ حرکت کرتا تھا اور سلطان کی سپاہ کے اسی ہزار گھوڑے جب مشرق کی طرف بڑھے تو گویا زلزلہ سا آ گیا۔ گرد و غبار کا طوفان زمین سے اٹھ کر فضائے بسیط میں پھیل گیا اور آبادیاں مٹیالے غبار میں چھپ گئیں۔ ان کے ہتھیاروں کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ خودوں میں چھپے ہوئے چہرے بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ کئی دن بعد یہ فوج دریائے سقریہ کے غربی ساحلی شہر اسکی میں داخل ہو گئی۔ یہاں فوج کے کچھ حصے نے قیام کیا اور بقیہ دریا کو عبور کر کے ایاس میں داخل ہو گیا۔

سنان پاشا والی فوج ایاس میں ٹھہر گئی اور سلطان اپنی فوج کو لے کر دریائے قزل ارماق کے کنارے کنارے قیصریہ کی طرف بڑھا۔ اس نے سنان پاشا کو حکم دیا تھا کہ وہ چند دن ایاس میں ٹھہر کر دریائے قزل ارماق کو عبور کرے گا اور سیدھا سیواس پہنچ کر دم لے گا پھر سلطان کا یہ عظیم الشان لشکر دریائے قزل ارماق کے دونوں ساحل پر قیصریہ سے سیواس تک پھیل جائے گا۔

سیواس جانی پہچانی جگہ تھی۔ یہاں زکریا پہلے بھی آ چکا تھا۔ اس نے سیواس والوں کو سلطانی لشکر سے خوف زدہ محسوس کیا۔ یہاں سنان پاشا نے زکریا کو حکم دیا کہ وہ اپنے جیسے نوجوانوں کو لے کر ادھر ادھر مشتبہ لوگوں کو تلاش کرے کیونکہ اسے یقین تھا کہ سلطانی لشکر کے آس پاس کسی نہ کسی شکل میں شاہ ایران کے جاسوس سرگرم عمل ضرور ہوں گے۔ زکریا اور اس کے ساتھی نوجوان لشکر سے نکل کر عام شہریوں کے لباس میں گھومنے پھرنے لگے۔

کئی دن سیواس کے سامنے دریائے قزل ارماق کے ساحلی علاقوں میں گھوم پھر کر وہ غربی ساحل پر اتر گیا۔ اسی ساحل پر قیصریہ تھا جہاں سلطان اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ قیصریہ سے ذرا فاصلے پر وہ اپنے پرجوش نوجوانوں کے ساتھ شکار کھیلنے لگا۔ اس نے ذرا سی تگ و دو کے بعد کئی جانور شکار کر لیے۔ شام سے پہلے پہلے وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہو گیا۔ لوگ سلطانی افواج سے خوف زدہ تھے۔ اسی خوفزدہ حالت میں جب وہ بستی میں داخل ہوا تو بستی والوں نے ان کو بہ مشکل قبول کیا۔ انہیں یہ شبہ تھا کہ زکریا اور اس کے ساتھ مشتبہ لوگ ہیں لیکن زکریا نے انہیں یقین دلایا کہ اس کا یلغاری سپاہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ سیواس کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے اور یہ اس کے دوست احباب ہیں۔ بستی کے تاجر نے انہیں مہمان بنا لیا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ زکریا نے رات کو اس تاجر کی چوپال میں بیٹھ کر سلطان اور اس کی سپاہ کو خوب برا بھلا کہا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ سلطان حملہ آور ٹھہرے گا اور شاہ ایران اس حملہ آور کو بالآخر وہ دندان شکن جواب دے گا کہ سلطان عمر بھر یاد رکھے گا۔

تاجر کو زکریا کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اس کے ساتھ خاندان کے اور لوگ بھی تھے اور یہ سارے ہی تاجر تھے۔ جنگی ماحول نے ان کا کاروبار بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایران سے سامانِ تجارت لا کر ترکی کے شمالی اور مغربی علاقوں میں نکل جاتے تھے اور وہاں سے خوب کماتے۔ اب سلطانی افواج نے ان کے کاروبار کو ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا۔

تاجروں کے شکوہ شکایت سے متاثر ہو کر زکریا نے اپنی روداد سنائی، اس نے انہیں بتایا کہ وہ سیواس کے ایک جاگیردار کا بیٹا ہے اور سلطان سلیم اس کے باپ پر یہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے علاقے سے سلطان کے لیے آدمی بھرتی کرے۔ جب کہ نام نہاد جاگیردار سلطان کی جابرانہ کوششوں میں اس کا ساتھ دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ وہ اپنے باپ سے اجازت لے کر چند دنوں کے لیے سیواس سے فرار ہو گیا ہے۔ جب سلطان آگے ایران کی سرحد تک پہنچ جائے گا تو زکریا اپنے گھر واپس چلا جائے گا۔

تاجروں کی چوپال میں زکریا اور اس کے ساتھیوں کی شاندار ضیافت ہوئی اور ضیافت کے بعد علاقائی رقص و موسیقی کا اہتمام ہوا۔ خاندان کے بزرگوں نے انہیں زیادہ پسند نہیں کیا کیونکہ ان کی لڑکیاں ان میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگی تھیں۔ تاجروں کی کنیزوں نے مہمانوں کو اپنے بہترین رقص اور گیتوں سے بہت محظوظ کیا۔

نصف رات تک یہ محفل جمی رہی۔ اس کے بعد لوگوں کو نیند آنے لگی۔ زکریا اور اس کے ساتھیوں کو ایک پورا

مکان دے دیا گیا۔ اس میں بستر لگا دیے گئے اور میزبان شب بخیر کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہوں میں گھس گئے۔ زکریا جس مقصد سے یہاں آیا تھا، اس کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا۔ ''ہمارے میزبان زیادہ لائق اعتبار نہیں ہیں۔ ہمیں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ یہ تاجر کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔''

رات کے پچھلے پہر جبکہ صبح زیادہ دور نہیں تھی، کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اندر چربی کے چراغ جل رہے تھے اور ان کی مدھم روشنی اور رات کے سناٹے نے ماحول کو پراسرار بنا رکھا تھا۔ زکریا کا ایک ساتھی اٹھا اور دروازے کی طرف جانے لگا لیکن زکریا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور اپنے پاس بلا لیا۔

اتنی دیر میں دوبارہ دستک دی گئی۔ زکریا نے اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔ ''رات کے پچھلے پہر کی دستک بڑی معنی خیز ہوتی ہے، اس لیے دروازہ کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

تیسری بار پھر دستک دی گئی اور کسی نے باہر سے آواز دی۔ ''سیواس کے جاگیردار زادے! دروازہ کھول، تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

زکریا اپنے ساتھی کو لے کر دروازے کے پاس چلا گیا اور خود ایک ستون کی آڑ میں چھپ کر ساتھی سے دروازہ کھلوا دیا۔ دروازہ جیسے ہی کھلا، مکان میں تین آدمی داخل ہو گئے۔ انہوں نے زکریا کے ساتھی سے پوچھا۔ ''تیرا دوست جاگیرزادہ کہاں چلا گیا؟''

زکریا نے انہیں خالی ہاتھ دیکھا تو ذرا اطمینان ہوا اور ان کے سامنے پہنچ گیا۔ پوچھا۔ ''دوستو! کیا بات ہے؟''

ایک نے آگے بڑھ کر زکریا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور چراغ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! ذرا ادھر چراغ کی طرف چلو، وہاں تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

زکریا کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ پوچھا۔ ''چراغ کی طرف جانے کی کیا ضرورت ہے، تمہیں جو بات کرنا ہے یہیں اس جگہ کر لو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''یہاں نیم تاریکی میں باتیں کر کے مزہ نہیں آئے گا۔ روشنی میں اس کا بھی امکان ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر باتیں کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں آپس میں صورت آشنا نکل آئیں۔''

زکریا گھبرا گیا۔ ''لیکن تم مجھے کس طرح پہچان لو گے؟ میں سیواس کے جاگیردار کا بیٹا اور تم لوگ ٹھہرے تاجر...... دونوں میں کوئی قدر مشترک ہے ہی نہیں پھر ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''نوجوان! میں پچھلے سال سیواس کے جاگیردار کے پاس تجارتی سامان لے کر گیا تھا۔ وہاں میں نے اس کے بیٹوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ میں اس کے خاندان کے بیشتر افراد سے واقف ہوں۔''

زکریا نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ''تو تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے تمہیں وہاں نہیں دیکھا تھا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''نہیں، یہ بات بھی نہیں ہے کیونکہ جب میں سیواس کے جاگیردار کے عزیزوں اور رشتے داروں سے مل رہا تھا تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اس کے دو بیٹے اور ہیں جو شکار کھیلنے گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے تم ان دو میں سے ایک ضرور ہو گے۔''

اب زکریا کی جان میں جان آئی پھر بھی اس نے مزید وضاحت چاہی۔ ''لیکن دوست! تم نے مجھ کو شام کو اور پھر رات کو تو دیکھ ہی لیا ہوگا پھر یہاں پہچاننے کی کون سی رسم باقی رہ گئی تھی۔''

اس نے کہا۔ ''جناب والا! میں آج رات ہی کو یہاں واپس آیا ہوں۔ دراصل دو ماہ قبل میں نے اشیائے تجارت لے کر ایران کا رخ کیا تھا۔ وہاں ابھی فروخت کا خیال تھا لیکن خدا بھلا کرے سلطان کا کہ وہ ایران پر لشکر کشی کا قطعی ارادہ کر چکا ہے اور وہ مہم میں کامیاب اور کامران رہے گا، چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔''

زکریا کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے مخاطب کے ساتھ چراغ کی طرف چلا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔ اس شخص کے دونوں ساتھی بھی چراغ ہی کے پاس چلے گئے۔ زکریا نے بھی ان دونوں کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن پہچان نہیں سکا کیونکہ تینوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کو پہلے دیکھا ہو۔

زکریا کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ تینوں تاجر اس پر کسی قسم کا شک نہیں کر رہے ہیں تو اس نے تینوں سے کہا۔ ''ہاں جناب! اتنی رات گئے آپ تینوں کی تشریف آوری کا مطلب؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''سیواس کے جاگیردار کے بیٹے! کیا تو یہ جانتا ہے کہ جاگیرداروں کے بیٹے کس قسم کے ہوا کرتے ہیں اور یہ کہ سیواس کے جاگیردار نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی پھر یہ اس کے بیٹے کہاں سے آ گئے؟''

زکریا سٹپٹا گیا بولا۔ ''میرا اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں

کہ میں تمہیں جھٹلاؤں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ انسان کو اس وقت جھوٹ بولنا چاہیے جب اس کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ جس شخص کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے، وہ اس سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔"

ایک نے کہا۔ "تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم تینوں تم سے ذرا بھی واقف نہیں۔"

زکریا نے جواب دیا۔ "شاید یہ بات بھی درست ہو۔"

ان تینوں میں سے ایک شخص ان دونوں کو پیچھے ہٹا کر زکریا کے سامنے جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ "نوجوان! تم ایک بات تو بتاؤ۔"

زکریا نے کہا۔ "پوچھو، ایک نہیں دس باتیں پوچھو۔ میں جواب ضرور دوں گا۔"

اس شخص نے ایک بار پھر زکریا کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ تو سیوا اس کے جاگیردار کا لڑکا نہیں ہے تو، تو کیا کرے گا؟ کیا کہے گا؟"

زکریا نے جواب دیا۔ "پھر میں دلیلوں کی مدد سے تیرے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کروں گا۔"

اس شخص نے مسکرا کر کہا۔ "شاید تو مجھے نہ جھٹلا سکے کیونکہ ہم کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔"

زکریا کو ان کی باتوں سے وحشت ہو رہی تھی چڑ کر بولا۔ "صاحبان! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور پھر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ تم تینوں نے ہمیں رات کے پچھلے پہر خوانخواہ بیدار کر دیا۔"

ان تینوں نے آپس میں اشاروں ہی اشاروں میں معلوم نہیں کیا کہا کہ ایک نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ "ساتھیو کیا خیال ہے؟ بات صاف صاف کر لی جائے؟"

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس شخص نے ایک بار پھر زکریا کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کے بعد کہا۔ "سیوا اس کے جاگیردار کے لڑکے! ہم اتنے سادہ لوح نہیں ہیں کہ زکریا کو بھی نہ پہچان سکیں۔ ہم زکریا اور اس کے ساتھیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

زکریا کو یوں لگا جیسے وہ بہت ہلکا ہو کر ہوا میں اڑا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پورے وجود میں خوف کی لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ آہستہ سے جھٹلانے کی ناکام کوشش کی۔ "کون زکریا...... تم کس زکریا کی بات کر رہے ہو؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "کم از کم میں اس زکریا کی بات کر رہا ہوں جو جھیل وان کے کنارے صفی الدین کا مہمان ہوا تھا اور جو صفی الدین کی بیٹی ناہید پر مرمٹا تھا اور پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ ناہید کا باپ اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کر دیا گیا اور زکریا، ناہید کو کچھ بتائے بغیر ہی اس طرح غائب ہوا کہ پھر کسی نے اس کی شکل تک نہ دیکھی۔"

زکریا کے دل پر آرا سا چل گیا۔ وہ اندرونی خلش سے تڑپ سا گیا، بے چینی سے پوچھا۔ "دوستو! تم معلوم نہیں کیا کہہ رہے ہو؟ کہیں شراب تو نہیں پی رکھی ہے؟ اگر ان باتوں سے تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہاں سے چلے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔"

اس شخص نے زکریا کا گریبان پکڑ لیا۔ "زکریا! اب اور بے وقوف نہ بنا۔ میں صفی الدین کی قوم کا آدمی ہوں، یہ سارے تاجر جن کا تو مہمان ہے صفی الدین ہی کی قوم کے لوگ ہیں۔ میں نے تجھے صفی الدین کے پاس دیکھا تھا لیکن تو مجھ سے واقف نہیں۔ میں نے صفی الدین اور اس کے گھر والوں سے سنا تھا کہ تو اس کی بیٹی ناہید سے محبت کرتا ہے اور ناہید بھی تجھ سے عشق کرتی ہے۔ جب صفی الدین اور میری قوم کے لوگ تیرے سالار سنان پاشا کے آدمیوں کے ہاتھوں ہلاک کر دیے گئے، میں اپنی تاجر برادری کے ساتھ ایران گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا اور اس المیے کا علم ہوا تو ہم سب بہت روئے۔"

اب زکریا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "پھر اب تو کیا چاہتا ہے؟ تو نے یا تیری قوم کے لوگوں نے ہمیں مہمان بنا رکھا ہے۔ ان سے ان کا مقصد؟"

اس نے جواب دیا۔ "زکریا! پہلے تو میرا نام سن لے، میرا نام خرم زاد ہے۔" پھر اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں میرے شریک کار ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ رات کو جب میں نے تجھے رقص و سرود کی محفل میں میر مجلس بنے دیکھا تو اسی وقت تجھ کو پہچان لیا تھا۔ میں چاہتا تو اسی وقت تیرا بھانڈا پھوڑ دیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سنان پاشا اور تیرے ہاتھوں جو کچھ ہو چکا تھا، اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ اب جبکہ میری پوری برادری سوئی ہوئی ہے، میں خاموشی سے تیرے پاس آ گیا ہوں۔"

زکریا نے پھر سوال کیا۔ "ان ساری باتوں کا لب لباب، مقصد...... تو شاید یہاں انتقامی کارروائی کرنا چاہتا ہے؟"

خرم زاد نے جواب دیا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ سلطان، سنان پاشا یا تم لوگوں نے میری دغاباز قوم

کے ساتھ جو سلوک کیا، اس میں تم سب حق بجانب ہو۔ غداروں اور دغا بازوں کو کب اور کس نے معاف کیا ہے؟''

زکریا کے دل پر اس کی باتوں کا بڑا اثر ہو رہا تھا، آہستہ سے پوچھا۔ ''ناہید کہاں ہے؟''

خرم زاد نے کہا۔ ''پہلے میری باتیں سن لو پھر ناہید کا پتا بھی بتا دوں گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''اب کون سی باتیں کرنا ہیں؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''زکریا! جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہم تاجر لوگ ہیں۔ ہمیں صفی الدین کی غلطیوں پر ندامت ہے۔ اب ہم سب سلطان کے وفادار ہیں۔ ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ جب تک جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں، ہم لوگ ہمیں اپنے لشکر میں تجارت کی اجازت دے دو۔ ہم لوگ اور کہیں جانے سے رہے۔ سلطانی عساکر ہی میں تھوڑا بہت کاروبار کرلیں گے۔''

زکریا نے کہا۔ ''پہلے مجھے سوچنے دو کہ میں کس طرح تمہارا کام کرسکوں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ ناہید کہاں ہے اور کیا اس سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''ہمیں اپنے لشکر میں لے چلو۔ جب میری برادری کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کو تیری ذات سے کاروباری فائدہ پہنچا ہے تو وہ تیری احسان مند ہو جائے گی اور اس احسان مندی میں ناہید کو بھی تجھ سے ملا دیا جائے گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''صبح ہونے دو۔ تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جائے گا۔''

خرم زاد نے سرگوشی میں سوال کیا۔ ''جب تو صفی الدین سے ملا تھا تو تیرا جو مقصد تھا، اس کا ہر کسی کو علم ہو چکا ہے لیکن کیا تو بتا سکتا ہے کہ اس برادری کے لوگوں سے دوبارہ ملاقات کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اس بار بھی تو اپنے بارے میں وہ نہیں بتا رہا جو ہے بلکہ کچھ اور ہی بتایا ہے۔ کیا اس بار بھی کوئی اسی نوع کا منصوبہ لے کر آیا ہے جو جھیل وان کے کنارے لے کر پہنچا تھا؟''

خرم کے اس سوال نے زکریا کو حواس باختہ کر دیا لیکن حاضر دماغی نے اس کی مشکل آسان کر دی، بولا۔ ''خرم زاد! تیرے سوال کا جواب پیچیدہ نہیں ہے۔ ہم لوگ سفر کرتے کرتے پریشان ہو گئے تھے۔ اس لیے سیر و تفریح کا منصوبہ بنا لیا۔ جب اس بستی میں داخل ہوئے تو اس خیال سے اپنی اصل حیثیت بستی والوں پر ظاہر نہیں کی کہ کہیں وہ سلطانی لشکر کے سپاہیوں کی آمد سے خوف زدہ نہ ہو جائیں اور دوسری یہ تشویش تھی کہ بستی کے لوگ معلوم نہیں سلطانی

اقدام کی تائید میں ہیں یا مخالفت میں۔ اس طرح میں اپنے اصلی تعارف سے انہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔''

خرم زاد نے سرد آہ بھری۔ ''آہ میری قوم! اب آدمیوں کو اپنے تمام پیشے چھوڑ کر محض سپاہی بن جانا چاہیے۔ ہمیں بھی تجارت سے دستبردار ہوکر عسکری زندگی اختیار کر لینا چاہیے۔ کیونکہ ایک سپاہی کو جو مقام اور مرتبہ حاصل ہے، تاجر اس سے محروم ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو تم لوگ عسکری زندگی اختیار کرلو۔ میں سلطان سے تمہاری سفارش کردوں گا۔''

خرم زاد نے کہا۔ ''میں تجارت ہی سے زندہ رہ سکتا ہوں۔ میرا تجربہ، میری عزت تجارت ہے۔ اگر ہم لوگ اپنی اس زندگی سے توبہ کرلیں اور عسکری زندگی میں داخل ہو جائیں تو اس میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں بڑی محنت کرنا ہوگی اور فی الفور ہم اس سے اتنا نہیں حاصل کرسکیں گے جتنا تجارت سے حاصل کر لیتے ہیں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ بات تو ہے۔ بہرحال اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہیں عسکری زندگی میں داخل کروا سکتا ہوں۔''

خرم زاد نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ زکریا نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو سلطانی لشکر میں کس طرح داخل کیا جائے؟

زکریا اپنے ساتھیوں کو لے کر علی الصباح قیصریہ کی طرف روانہ ہونے لگا جہاں عساکر سلطانی کے خیمے تھے۔ خرم زاد نے اسے تھوڑی دور تک پہنچا کر خدا حافظ کہا۔ زکریا نے رخصت ہونے سے پہلے خرم زاد سے وعدہ کرلیا کہ اگر اس نے ان تاجروں کا کام کردیا تو وہ زکریا سے ناہید کی ملاقات کروا دے گا۔

زکریا بڑے پس و پیش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سلطانی لشکر میں وہ کس سے رابطہ قائم کرے کہ یہ کام ہو جائے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سلطانی لشکر کو بہت سی چیزیں درکار ہوں گی، جنہیں یہ تاجر مہیا کرسکتے ہوں گے اور بظاہر یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا محسوس ہو رہا تھا۔

زکریا اور اس کے ساتھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار سلطانی عساکر کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ دوران سفر زکریا کو یہ خیال بھی پریشان کرنے لگا تھا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق سنان پاشا کی افواج سے تھا اور اب

جو وہ سلطانی عساکر میں جائے گا تو سلطان کو اس پر سخت اعتراض ہوگا اور یہ بھی ممکن تھا کہ زکریا کی اس حرکت پر سلطانی عتاب نازل ہوجائے۔ اگر بیچ میں ناہید کا ذکر نہ آجاتا تو شاید وہ اس معاملے میں اتنی دلچسپی بھی نہ لیتا۔

اس نے میلوں دور سے خیموں کا شہر دیکھ لیا۔ یہاں دور دور تک مکانات کے آثار نہیں تھے۔ اس نے ایک خیمے پر گھوڑے کی تین دموں والا پرچم دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس خیمے کی طرف بڑھا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ پرچم کسی اعلیٰ منصب دار کے خیمے ہی پر لگ سکتا تھا۔ خیمے کے سامنے سپاہیوں کا پہرا تھا۔ ان سپاہیوں نے زکریا اور اس کے ساتھیوں کو روک لیا۔ وہ سلطانی سپاہ کو اس کے لباس اور وضع قطع سے پہچان سکتے تھے مگر حالتِ جنگ میں یہ شناخت بھی مشتبہ ٹھہرتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟''

زکریا نے سیدھا سچا جواب دیا۔ ''ہمارا تعلق سنان پاشا کی افواج سے ہے۔ میں تمہارے فوجی سردار سے ملنا چاہتا ہوں۔''

ایک محافظ نے انہیں حکم دیا کہ وہ سب خیمے سے اس وقت تک دور رہیں جب تک کہ انہیں پاس آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

چند محافظوں نے زکریا کا راستہ روک لیا اور ایک محافظ اپنے سردار کے خیمے میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب وہ اندر سے نمودار ہوا تو ایک اور شخص اس کے ساتھ تھا۔ یہ پاشا کے لباس میں تھا۔ زکریا نے اس کو دیکھا تو چونک گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا پھر دوڑ کر اس شخص سے چمٹ گیا اور بے اختیار بولا۔ ''استادِ محترم! آپ...... آپ یہاں کہاں؟''

یہ استاد ارسلان تھا، اس نے بھی زکریا کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تو یہاں کہاں؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ تجھے سنان پاشا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔''

زکریا نے بھی گلوگرفتہ آواز میں جواب دیا۔ ''استادِ محترم! میں نے آپ کو بہت تلاش کیا۔ لوگوں سے آپ کی بابت سوالات کیے مگر کسی سے بھی کوئی ایسا جواب نہ ملا جس سے میں مطمئن ہوجاتا۔''

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ تو سنان پاشا کے حوالے کر دیا گیا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ درست ہے مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''سلطان کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کے ملازم وہاں نہ نظر آئیں جہاں انہیں کھڑا کر دیا گیا ہو۔ تجھے تو سنان پاشا کے آس پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ تجھ کو یہاں دیکھ کر برہم ہوجائے گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''استادِ محترم! مجھے اندر لے چلیے اور پہلے میری بات سن لیجیے اس کے بعد نصیحتیں کیجیے۔''

استاد ارسلان نے زکریا کے ساتھیوں کو باہر ہی کھڑا رہنے دیا اور خود زکریا کے ساتھ اپنے خیمے میں داخل ہوگیا۔ جب یہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے تو استاد ارسلان نے کہا۔ ''ہاں زکریا! اب اپنی روداد سنا تاکہ اس روداد کی روشنی میں تجھ کو کوئی مشورہ دیا جاسکے۔''

زکریا نے ساری روداد سنادی اور آخر میں کہا۔ ''استادِ محترم! ہمیں تو مشتبہ اور جاسوس صاحبان کی تلاش تھی لیکن ہمیں مل گئے تاجر۔ یہ لوگ بھی صفی الدین کے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں ہمگران میں ایک خاص صفت ہے۔ یہ جب کبھی بھی کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں تو اس سے روگردانی نہیں کرتے۔ یہ اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھتے ہیں۔''

استاد ارسلان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بس دوسری باتیں کرو۔''

زکریا نے اصرار کیا۔ ''استادِ محترم! خرم زاد نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے کہ اگر میں نے بحیثیت تاجر اس کی قوم کو سلطانی عساکر میں گھوم پھر کر سامان بیچنے کی اجازت دے دی تو وہ اس کے عوض مجھے ناہید سے ملوا دے گا۔'' پھر استاد ارسلان سے پوچھا۔ ''استادِ محترم! ناہید کون ہے؟ کچھ سمجھے آپ یا نہیں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''سمجھا کیوں نہیں، جھیل وان کے کنارے آباد صفی الدین کی بیٹی، تیری محبوبہ۔ میں اس کا ذکر سن چکا ہوں۔ یہ وہ لڑکی ہے تو نے جس کی محبت کی پروا کیے بغیر صفی الدین کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اس کا سلطان پر اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ اس نے تیرے اس حزم و احتیاط کا بار بار ذکر کیا ہے اور لوگوں کو تیری مثال دے کر یہ باور کروا دیا ہے کہ مرد کو زکریا کی اتباع کرنا چاہیے۔''

زکریا نے درخواست کی۔ ''استادِ محترم! اگر خرم زاد کے ہم قوم تاجروں کو سلطانی عساکر میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے تو میرا کام بن سکتا ہے۔ میں ناہید تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

استاد ارسلان نے اس کو سمجھایا۔ ''زکریا! نادانی نہ کر،

تو بار بار ناہید کا ذکر نہ کر کیونکہ جب تو نے اس کو بھلا دیا تو اب اس کا بار بار ذکر کیوں؟''

زکریا نے عرض کیا۔''استاد محترم! میں کس طرح آپ کو یہ یقین دلاؤں کہ ابھی تک مجھ میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ میں اب بھی اپنا سب کچھ سلطان کے حکم اور اپنے نصب العین پر قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن جب سلطان کا حکم اور میرا نصب العین دونوں ہی آڑے نہ آ رہے ہوں تو میں ناہید کو کس طرح بھلا سکتا ہوں۔''

استاد ارسلان کچھ دیر کے لیے پھر خاموش ہو گیا آخر پوچھا۔''ہاں تو خرم زاد صفی الدین اور اس کی قتل ہو جانے والی قوم کی بابت کیا کہہ رہا تھا؟''

زکریا نے جواب دیا۔''وہ ہلاک ہو جانے والوں کو دغا باز اور غدار کہہ رہا تھا۔ وہ سلطان کو حق بجانب قرار دے رہا تھا۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس کی قوم کے لوگ تجارت چھوڑ کر سلطان کے زیر سایہ عسکری زندگی اختیار کرنے کو تیار ہیں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔''اچھا، میں یہ کرتا ہوں کہ خرم زاد اور اس کی قوم کو یہاں اپنے لشکر میں بلوائے لیتا ہوں۔ میں ان کی نگرانی کر کے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی قوم کو دغا باز اور غدار کہنے والا کس حد تک ان کا اپنا جاں نثار اور وفادار ہو سکتا ہے۔ جو اپنی قوم کا نہ ہو، وہ کسی اور کا کس طرح ہو سکتا ہے۔''

لیکن زکریا کو بس ایک ہی بات یاد تھی، بولا۔''استاد محترم! آپ مجھ پر اعتماد کیجیے۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔ زیادہ وقت نہ لیجیے اور خرم زاد کی تاجر قوم کو سلطانی افواج میں تجارت کرنے کا حکم دے دیجیے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔''زکریا! تو ابھی تک ناتجربہ کار ہے۔ بہرحال خرم زاد اور اس کی قوم کے لوگوں کو میرے پاس لے آ۔ میں ان سے باتیں کرنے کے بعد کچھ کروں گا۔ اس سے پہلے تو میں وعدہ تک نہیں کروں گا۔''

زکریا نے اسی وقت واپس جانے کی اجازت طلب کی جو نہیں دی گئی۔ استاد ارسلان نے اس کو روک لیا، کہا۔''زکریا! تو کافی دنوں بعد ملا ہے۔ اب کچھ دیر میرے پاس رہ۔ کیا تجھ کو سلطان کی وہ بات یاد ہے جو ہانڈی کے ابال اور تو جوان کے جوش و خروش کی بابت کہی گئی تھی؟''

زکریا نے جواب دیا۔''جی استاد محترم! مجھے وہ بات اچھی طرح یاد ہے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔''لیکن افسوس کہ تو ناہید کے ... سلطان کی نظروں سے گرنے والا ہے۔''

استاد ارسلان نے زکریا سے بڑی باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ زکریا اس کے مرتبے اور اعزاز سے بہت خوش تھا۔ بولا۔''استاد محترم! اب آپ جس مقام پر فائز ہیں اس سے میں بہت خوش ہوں۔''

استاد ارسلان نے افسردگی سے جواب دیا۔''لیکن میں نے جس منصب یا جس نوع کے منصب کی خواہش کی تھی افسوس کہ وہ میں حاصل نہیں کر سکا۔ میں چاہتا تھا کہ میں کوئی ایسا منصب حاصل کر لوں جس سے میں سلطان سے دور آزادانہ زندگی گزار سکوں۔ میں اقامتی درس گاہ کے ماحول سے تنگ آ چکا تھا لیکن سلطان نے مجھ کو سہ رکنی وزراء میں شامل کر لیا۔'' پھر نظریں جھکا کر شرمندگی سے کہا۔''اور یہ تماشا تو ہر اس شخص نے دیکھ لیا جو وہاں موجود تھا کہ سلطان نے میرے تلووں کو لہولہان کر دیا تاکہ میں اس کی عطا کردہ وزارت سے بھاگ نہ سکوں۔''

زکریا نے آہستہ سے کہا۔''سلطان آخر سلطان ہے، اس کی ہر بات میں ایک شان ہے۔''

استاد ارسلان نے زکریا اور اس کے ساتھیوں کو اس دن خرم زاد کے پاس نہیں جانے دیا لیکن دوسرے دن نماز فجر کے فوراً بعد روانہ کر دیا اور زکریا سے کہا۔''تو خرم زاد کو یہ یقین دلا دے کہ میں اس کی سلطان سے ملاقات کروا دوں گا اور وہ جو کچھ چاہتا ہے سلطان سے اس کی منظوری دلوا دی جائے گی لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ناہید کو تجھ سے پہلے ہی ملوا دے۔''

زکریا چلا گیا۔ اس دن قیصریہ گرد و غبار میں ڈوبا ہوا تھا۔ تیز ہواؤں میں دھول اتنی زیادہ اڑ رہی تھی کہ زکریا کو اپنے سامنے کی دس بیس قدم دور کی چیزیں بھی صاف نظر نہیں آتی تھیں۔ زکریا کے ساتھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر رومال ڈال لیے تھے تاکہ آنکھیں گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔

زکریا نے دریائے قزل ارماق کے ساحل پر کچھ لوگوں کو منتظر دیکھا۔ یہ خرم زاد اور اس کے ساتھی تھے۔ خرم زاد نے آگے بڑھ کر زکریا کا استقبال کیا اور بہ آواز بلند پوچھا۔''دوست! میں تو مایوس ہو چلا تھا کیونکہ مجھے شبہ گزرا تھا کہ تیری بابت سب کچھ معلوم ہو جانے کے بعد کہیں تو خوف یا شرم سے راہ فرار نہ اختیار کر لے۔''

زکریا نے جواب دیا۔''خرم زاد! میں تیرے کام سے گیا تھا اور اس وقت تک میرا واپس آنا فضول تھا جب تک کہ تیرا کام نہ ہو جاتا۔''

خرم زاد نے بے اختیار پوچھا۔ ''کیا وہ کام ہوگیا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں ہوگیا مگر میں اس وقت تک تجھے سلطان کے پاس نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ تو مجھ کو ناہید سے نہیں ملوادے گا۔''

خرم زاد نے فکر و تشویش سے کہا۔ ''میں نے وعدہ کیا ہے کہ تجھ کو ناہید سے ضرور ملوادوں گا لیکن اس کے لیے تجھ کو وقت دینا ہوگا۔ ناہید یہاں نہیں ہے، وہ کہیں دور ہے۔ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔''

زکریا اداس ہوگیا۔ اس کو خرم زاد کی ہیرا پھیری پر بڑا غصہ آیا بولا۔ ''خرم زاد! یہ کیا مذاق ہے؟ تیری نسبت میرا کام بہت مشکل تھا لیکن میں کر آیا۔ افسوس کہ تجھ کو اس وقت تک سلطان کے پاس نہیں لے جاؤں گا جب تک کہ تو مجھے ناہید سے نہ ملوادے۔''

خرم زاد نے چاپلوسی اختیار کی اور خوشامدانہ لب ولہجہ اختیار کیا۔ ''زکریا! تو میرے ساتھ چل، میری قوم کے لوگ تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کررہے ہیں۔ ہم سب کی تجارتی موت زندگی تیری کوششوں پر منحصر ہے۔ تو ایک ناہید کی بات کررہا ہے، ہم اپنی دس ناہید تیرے حوالے کرنے کو تیار ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ انہیں تمہارے گھروں میں باعزت مقام حاصل ہو۔ تو میرے ساتھ میری قوم میں چل وہیں ساری باتیں طے پاجائیں گی۔''

زکریا اپنے ساتھیوں سمیت خرم زاد کی تاجر برادری میں چلا گیا۔ ان کے جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں زکریا کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ زکریا کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہیں۔

خرم زاد نے انہیں اسی مکان میں ٹھہرادیا جہاں وہ ایک رات پہلے بھی بسر کرچکے تھے۔ زکریا کے سامنے لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ایک بوڑھا دونوں ہاتھوں سے بھیڑ کو چیرتا ہوا زکریا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک زکریا کی صورت کو بغور دیکھتا رہا اس کے بعد طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تو یہ تو ہے زکریا۔ تو میرے بھائی صفی الدین کا مہمان بن کر اس کی تباہی اور بربادی کا سبب بن گیا۔ اب تو ہم میں سیوا اس کے جاگیر دار کا بیٹا بن کر آگیا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب تیرے کیا ارادے ہیں؟''

خرم زاد نے بوڑھے کو بولنے سے روک دیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''محترم! اب سابقہ باتیں بھلا دیجیے۔ زکریا نے جھیل وان کے کنارے جو کچھ کیا، وہ سلطان کے حکم پر کیا اور پھر یہ بھی تو سوچیے کہ سلطان اپنے غداروں اور دغابازوں سے شفقت آمیز سلوک کیوں کرتا۔ زکریا نے جو کچھ بھی کیا، اب اس کی یوں تلافی ہوتی جارہی ہے کہ اس نے ہمارے لیے سلطانی عساکر میں تجارت کا راستہ کھول دیا ہے۔ جو کچھ ہوا اس کو بھول جائیے۔''

بوڑھے نے خرم زاد کا ہاتھ اپنے منہ پر سے زبردستی ہٹادیا اور بدستور برہمی سے بولا۔ ''خرم زاد! تم نئی نسل کے ہو اس لیے اپنے دشمن سے مفاہمت کرسکتے ہو مگر میں نہیں کرسکتا۔ میں تو اس کا خون پی جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر بوڑھا زکریا پر حملہ آور ہوگیا مگر خرم زاد اور دوسرے نوجوانوں نے اس بوڑھے کو پکڑلیا اور گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لے گئے۔ خرم زاد نے خود تو بوڑھے کو چھوڑ دیا اور دوسرے نوجوانوں کو حکم دیا۔ ''انہیں کسی کوٹھری میں بند کردو کیونکہ یہ بڑے میاں ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیں گے۔''

خرم زاد دروازے سے ہی واپس آگیا اور زکریا سے معذرت کرنے لگا۔ ''دوست! صفی الدین ان بڑے میاں کا بھائی تھا۔ ظاہر ہے انہیں اس بات کا بڑا صدمہ ہوا ہے۔ جب ہم سب نے تمہاری زیادتی کو فراموش کردیا ہے تو تمہیں بھی ان بڑے میاں کے پاگل پن کو معاف کردینا چاہیے۔''

زکریا عام حالات میں تو شاید اس ناخوشگوار واقعے کا گہرا اثر لیتا لیکن ناہید کے خیال سے وہ مفاہمت کرتا جارہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''خرم زاد! یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ تم لوگوں کا صفی الدین سے تعلق ہے، میرا یہ فرض ہے کہ میں سلطان کو صحیح صورت حال سے مطلع کردوں۔''

خرم زاد نے خوشامد کی۔ ''زکریا! اس بوڑھے کو نظر انداز کردو کیونکہ اگر سلطان کو ہماری بابت معلوم ہوگیا تو وہ ہمیں تباہ و برباد کردے گا۔''

ایک عورت نے آگے بڑھ کر زکریا کو ملامت کی۔ ''اگر تو نے یہی طے کرلیا ہے کہ ہمیں بھی تباہ و برباد کردے تو جو تیرے جی میں آئے کر۔ ایک طرف تو ناہید کی محبت کا دم بھرتا ہے، دوسری طرف اس کی قوم کی تباہی کے درپے ہے۔''

خرم زاد نے کہا۔ ''زکریا! اگر تم ہمیں سلطان سے مراعات نہیں دلانا چاہتے تو کوئی بات نہیں لیکن ہمیں تباہ و برباد تو نہ کرو، رحم کرو۔''

زکریا نے تلخی سے جواب دیا۔ ''خرم زاد! پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہے ورنہ میں نے تو تم سب کے لیے بات کررکھی ہے اور پھر میں ناہید کی خاطر اپنے ضمیر کے خلاف بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں۔''

خرم زاد نے کہا۔ ''تب پھر ناہید ہی کے طفیل ہمیں معاف کردو۔''

ایک دوسرے تاجر نے مداخلت کی۔ ''خرم زاد! زکریا سے کیا ہوا وعدہ پورا کردو اور ناہید کی ملاقات کروادو۔ یہ سلطانی عساکر میں تجارتی راہ کھلوادیں گے۔''

خرم زاد نے پوچھا۔ ''اچھا زکریا! اب یہ بتاؤ کہ سلطان کے پاس کب چلنا ہے؟''

زکریا نے بھی سوال کردیا۔ ''اور خرم زاد تم بھی یہ بتاؤ کہ میری ناہید سے ملاقات کب ہورہی ہے؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''سلطانی مراعات حاصل کرنے کے فوراً بعد...... یہ میرا وعدہ ہے۔''

زکریا نے کہا۔ ''تب پھر تم میری بات بھی سن لو، میں تمہاری ملاقات سلطان کے ایک وزیر سے کرواؤں گا۔ وہ تمہیں سلطان تک پہنچادے گا لیکن سلطان تک پہنچنے سے پہلے ہی تمہیں ناہید سے ملاقات کروانا ہوگی۔ اگر تم اپنا وعدہ پورا نہ کرسکے تو میرا وعدہ بھی ادھورا ہی رہے گا۔''

خرم زاد نے اپنی قوم کے بزرگوں کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں کوئی سوال کیا۔ خرم زاد کی جگہ ایک اور تاجر بولا۔ ''زکریا! یہ بات ہے بڑی بے غیرتی کی کہ ہم لوگ اپنی قوم کی ایک لڑکی ناہید کے عوض تم سے اپنا معاملہ کررہے ہیں۔ اگر ہماری قوم سلطان کی معتوب نہ ہوتی تو ہم تم سے یوں گفتگو نہ کرتے۔ اب جبکہ ہم نے بے غیرتی کا یہ لبادہ پہن ہی لیا ہے تو تم سے ایک اہم سوال ضرور کریں گے۔''

زکریا نے کہا۔ ''ضرور سوال کرو، کیا سوال ہے تمہارا؟''

تاجر نے کہا۔ ''اگر ناہید تمہیں پسند ہے تو تم اس سے ملاقات کرنے کے بعد کیا کروگے؟ یعنی اس سے ملنے کا مقصد کیا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ میں ناہید کو پسند کرتا ہوں۔ اگر اجازت مل گئی اور کسی طرف سے مزاحمت نہ ہوئی تو میں ناہید کو دلہن بناسکتا ہوں۔''

تاجر نے خرم زاد کی طرف دیکھا اور کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں ناہید سے ملاقات کروانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

اس کے بعد انہوں نے زکریا اور اس کے ساتھیوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ ان کی عورتوں نے زکریا کے لیے اچھے اچھے لذیذ کھانے پکائے اور ان کے مردوں نے زکریا اور اس کے ساتھیوں کو وہ عزت بخشی جو کوئی محکوم کسی حاکم کو بخشتا ہے۔

زکریا نے دوسرے دن سہ پہر کو خرم زاد اور اس کے دو ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور استاد ارسلان کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔ اس وقت اس کے ذہن وخیال میں ناہید کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ جب وہ یہ سوچتا کہ گمشدہ ناہید اس کو اتنی آسانی سے مل رہی ہے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

استاد ارسلان نے انہیں وہ عزت نہیں بخشی، جس کی توقع لے کر خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھی وہاں پہنچے تھے۔ استاد ارسلان نے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ایک خیمے میں بٹھادیا اور کہہ دیا جب تک انہیں بلایا نہ جائے، وہ اس خیمے سے باہر نہ نکلیں۔ اس کے بعد وہ زکریا کو اپنے خیمے میں لے گیا۔ زکریا کے ساتھی دوسرے خیموں میں پہنچادیے گئے۔

استاد ارسلان نے زکریا سے کہا۔ ''ہاں زکریا! اب تو ان لوگوں کی بابت تفصیل سے بتا۔ اس کے بعد کوئی اور بات ہوگی کیونکہ مجھے اس میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! جیسا کہ میں پہلے ہی بتاچکا ہوں کہ یہ صفی الدین کی قوم کے لوگ ہیں۔ ناہید انہی کے پاس رہ رہی ہے۔ یہ لوگ صفی الدین اور اپنی قوم کی غداری اور دغابازی پر شرمندہ ہیں اور کہتے ہیں کہ تباہ وبرباد ہوجانے والوں میں یہ لوگ شامل نہیں تھے کیونکہ یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں اور یہ لوگ اس وقت بھی اپنی قوم سے الگ تھلگ تھے اور اب بھی الگ تھلگ ہیں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''تو تیری کیا رائے ہے؟ سلطان سے ان کی سفارش کردی جائے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اگر یہ کام ہوگیا تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

استاد ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زکریا! کیا تو جانتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اگر انسان کو کسی جال میں قید کرنا ہو تو اس کے لیے کون سا چارا کارآمد ثابت ہوگا؟''

زکریا نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا استاد محترم۔''

استاد نے جواب دیا۔ ''عورت کو، عورت مرد کے لیے ایک بہترین چارا ہے۔ میں خوف زدہ ہوں کہ کہیں یہ تاجر لوگ ناہید کو تیرے خلاف چارے کی طرح تو نہیں استعمال کررہے ہیں؟''

زکریا نے کہا۔ ''استاد محترم! شاید ایسی کوئی بات نہیں۔ اتنی بڑی بربادی کے بعد وہ لوگ اپنی بربادی کا نیا انتظام نہیں کریں گے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''تب پھر تو انہیں بتادے کہ ان کی بات سلطان سے تفصیل سے ہوگئی ہے اور سلطان نے یہ وعدہ کرلیا ہے کہ اگر یہ تاجر لوگ اس کو یہ یقین دلادیں گے کہ ان کی نیت صاف ہے اور وہ اس سلسلے میں کوئی اور ہی منصوبہ نہیں رکھتے تو سلطان ان سے باتیں کرکے مطمئن ہوجانے کے بعد انہیں سلطانی عساکر میں تجارتی مراعات ضرور دے گا لیکن پہلے سلطان ان سے باتیں کرے گا۔ سلطان ان سے چھپ کر ملے گا اور اس ملاقات کا کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔''

زکریا نے کہا۔ ''میں انہیں یہ ساری تفصیلات بتا کر... وفاداری کا عہد لے لوں گا۔ جہاں تک میں نے انہیں سمجھا ہے، میں ان کی بابت یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ قابلِ اعتبار لوگ ہیں۔''

زکریا سے باتیں کرنے کے بعد استاد ارسلان خرم زاد کے پاس چلا گیا اور اس سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔

شام کو سلطان کا فرمان پہنچا کہ دوسرے دن عساکر سلطانی کوچ کریں گے اس لیے سفر کی تیاریاں اسی وقت سے شروع ہوجانا چاہئیں۔

استاد ارسلان نے اسی رات خرم زاد کی سلطان سے ملاقات کا اہتمام کردیا۔ وہ زکریا سے بار بار یہی کہتا تھا کہ سلطان اس بات سے خوش نہیں ہے کہ غداروں اور دغابازوں کے پس ماندگان کو رعایتیں دی جائیں لیکن زکریا کی سفارش پر یہ رعایتیں ضرور دی جائیں گی۔

استاد ارسلان کے خیمے سے دور ایک وسیع وعریض خیمے میں سلطان اور خرم زاد کی ملاقات کا انتظام کردیا گیا۔ استاد ارسلان زکریا سے بار بار یہی کہہ رہا تھا۔ ''زکریا! کہیں ایسا نہ ہو کہ اب تک ہم نے جو اعتماد حاصل کیا ہے، وہ ذرا سی بھول چوک میں ضائع چلا جائے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استادِ محترم! آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ہمیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی اور ہم بہت سرخرو رہیں گے۔''

استاد ارسلان زکریا اور چند محافظوں کو لے کر اس خیمے کے در پر جا کھڑا ہوا جہاں سلطان اور خرم زاد کی ملاقات متوقع تھی۔ اندر خیمے میں کیا تھا، کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔ یہیں استاد ارسلان نے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو طلب کرلیا۔ اس نے ان تینوں سے کہا۔ ''صاحبان! میں تمہیں نہیں جانتا لیکن میں نے زکریا کی خواہش پر سلطان سے ملاقات کا اہتمام کیا ہے۔ کچھ دیر بعد تم سلطان کے روبرو کھڑے ہوگے۔''

خرم زاد نے استاد ارسلان اور زکریا کا شکریہ ادا کیا۔

استاد ارسلان نے خرم زاد کے کان میں کہا۔ ''خرم زاد! اندر سلطان تنہا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کی یہاں موجودگی کا علم کسی اور کو ہو، وہ تم لوگوں سے باتیں کرکے فوراً ہی واپس چلا جائے گا۔ سلطان کی خواہش ہے کہ اس کی موجودگی کا علم چند اشخاص کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔''

خرم زاد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطان نے جو کچھ کہا ہے، اس کی پابندی کی جائے گی۔''

سلطانی خیمے کے در پر محافظوں اور پہرے داروں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس سے ملحق خیمے میں استاد ارسلان اور زکریا بیٹھ گئے۔ استاد ارسلان نے خرم زاد کو حکم دیا۔ ''اندر جا کر سلطان سے مل لے۔''

خرم زاد فوراً ہی اندر چلا گیا۔ اس کے دونوں ساتھی خیمے کے در سے ذرا فاصلے پر ہی کھڑے رہے کیونکہ انہیں خرم زاد کے ساتھ اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ استاد ارسلان نے انہیں باتوں میں لگالیا اور خود ان کی حرکات وسکنات سے معلوم نہیں کیا اخذ کرنے لگا۔

زکریا کا دل دھک دھک کررہا تھا۔ وہ سلطان کی درشت مزاجی سے خائف تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر خرم زاد نے سلطان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو معاملہ الٹ جائے گا اور سلطان سے کسی قسم کی مراعات حاصل کرنے کے بجائے جو کچھ حاصل ہے، اسے بھی گنوا دیا جائے گا۔

استاد ارسلان نے زکریا سے کہا۔ ''زکریا! خدا کا شکر ادا کر کہ تیری مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ اگر میری جگہ یہاں کوئی اور ہوتا تو یہ ملاقات نہ ہوسکتی۔ اب دعا مانگ کہ سلطان اور خرم زاد کی بات چیت بخیر وخوبی انجام کو پہنچے۔''

زکریا نے کہا۔ ''استادِ محترم! میری ناقص رائے میں آپ کو بھی وہیں موجود ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ بات میری سمجھ میں کبھی بھی نہ آئے گی کہ خرم زاد تاجر سلطان سے بحسن وخوبی بات چیت کرسکے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''میں نے سلطان سے یہ خواہش کی تھی کہ دورانِ گفتگو مجھ کو بھی پاس ہی بٹھالیا جائے مگر سلطان نے میری یہ بات نہیں مانی۔''

زکریا نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ خرم زاد اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا؟''

استاد ارسلان نے چونکا دینے والا جواب دیا۔ ''زکریا! تو کیسی بات کررہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خرم زاد قیامت تک

اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر مجھ کو اس کی کامیابی کا شبہ تک ہوتا تو میں اس ملاقات کا اہتمام تک نہ کرتا۔''

زکریا نے دل برداشتہ ہوکر پوچھا۔ ''استاد محترم! آپ کیا فرما رہے ہیں؟''

استاد نے جواب دیا۔ ''اگر تو میری بات سمجھنا ہی چاہتا ہے تو سن لے۔ تو نے اب تک جتنے بھی کام کیے ہیں، ان سے تو نے سلطان اور میرا زبردست اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ سلطان غائبانہ تیری مثالیں دیا کرتا تھا۔ میں تجھ پر فخر کرتا رہا ہوں لیکن آج ناہید کے عشق میں تو نے جو غلط قدم اٹھایا تھا، وہ تیرے سارے کاموں پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی تھا۔ تو خوش قسمت ہے کہ تیری غلطی اور غفلت کا علم میرے سوا کسی کو بھی نہیں۔''

زکریا استاد ارسلان کی باتیں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ پوچھا۔ ''استاد محترم! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان کی اقبال مندی میں کوئی شبہ نہیں۔ اس پر سات ولیوں کا سایہ ہے ورنہ اس بار سلطان کے خلاف جو سازش ہوئی تھی، اس سے اسمٰعیل صفوی کو بڑا فائدہ پہنچتا اور سلطان اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہتا۔''

زکریا گم صم استاد ارسلان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ استاد ارسلان نے مزید کہا۔ ''مجھے کسی کا انتظار ہے، اس کے بعد ہر بات تیری سمجھ میں آجائے گی۔''

اس کے بعد استاد ارسلان اٹھا اور خرم زاد کے دونوں ساتھیوں کی بابت اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ ''انہیں قید کردیا جائے اور سلطانی حکم کا انتظار کیا جائے۔''

محافظوں نے حکم پاتے ہی دونوں کو بے بس کر کے باندھ دیا اور کسی دوسرے خیمے میں پہنچادیا۔ زکریا نے احتجاج کیا۔ ''استاد محترم! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے انہیں تحفظ کا یقین دلا رکھا ہے۔''

استاد ارسلان نے کوئی جواب دیے بغیر اپنے محافظوں کو حکم دیا۔ ''اندر خرم زاد کے پاس جاؤ اور دیکھ کر بتاؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے؟''

وہ محافظ خیمے کے اندر چلے گئے اور کچھ دیر بعد واپس آکر استاد ارسلان کو مطلع کیا۔ ''منصوبے پر کامیابی سے عمل درآمد ہو چکا ہے اور اندر آپ کو یاد فرمایا جارہا ہے۔''

استاد ارسلان نے زکریا سے کہا۔ ''میرے ساتھ تو بھی اندر چل کر وہ تماشا دیکھ لے جو میں خاص کر تجھے ہی دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ ایسے تماشے زندگی میں بار بار دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔''

زکریا استاد ارسلان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ ایک ترک سردار کرسی پر تنا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کئی آدمی اکڑے ہوئے کھڑے تھے اور یہ سب تنومند اور بڑے جاندار تھے۔ ان کے پاس ہی خرم زاد بندھا بیٹھا تھا۔ زکریا چیخ اٹھا۔ ''استاد محترم! یہ میرے معزز مہمان کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے؟ سلطان کہاں ہے اور یہ کہ خرم زاد کو کس جرم میں اس طرح باندھ کر بٹھایا گیا ہے؟''

استاد ارسلان نے تالی بجا کر حکم دیا۔ ''ذکی وحیدی کو پیش کیا جائے۔''

اسی لمحے ایک محافظ نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو استاد ارسلان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ زکریا نے اسے بغور دیکھا تو یاد آیا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ زکریا کو اپنے حافظے پر زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ اس شخص کو اس نے خرم زاد کے تاجروں میں دیکھا تھا۔ استاد ارسلان نے زکریا سے پوچھا۔ ''کیا اس شخص کو تو پہچانتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس شخص کو خرم زاد ہی کے خاندان میں دیکھا ہے۔''

استاد ارسلان نے ذکی وحیدی کو حکم دیا۔ ''ہاں تو ذکی وحیدی! خرم زاد اور اس کے منصوبے سے متعلق ساری باتیں ایک بار پھر دہرا دے۔''

ذکی وحیدی نے عرض کیا۔ ''جناب والا! جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ خرم زاد اور اس کے ساتھیوں نے سلطان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے تو میں بہت پریشان ہوگیا۔ اس طرح یہ لوگ صفی الدین اور اپنی قوم کی بربادی کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے بہانے سلطان تک رسائی حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خرم زاد یا اس کا کوئی بھی ساتھی جیسے ہی سلطان کے قریب پہنچتا، کسی دھار والے آلے سے پے در پے وار کرکے اس کا کام تمام کردیتا۔ ان کی اس سازش میں ان کا پورا خاندان شامل تھا۔ ایک میں اس لیے ان کی اس سازش میں شامل نہیں ہوا تھا کہ میں اپنی قوم کو گمراہی کی فضا سے نکال کر امن وعافیت کی آغوش میں ڈال دینا چاہتا تھا۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''زکریا! خرم زاد اور اس کے ساتھی سلطان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا ہی چکے تھے کہ ان ہی کے ایک شخص نے اس نامعقول اور گھناؤنی سازش کا پردہ چاک کردیا۔''

زکریا کو اب بھی استاد ارسلان اور ذکی وحیدی کی

باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

استاد ارسلان نے ایک بار پھر بہ آوازِ بلند کہا۔ ''جو کچھ ہوا اس پر ہمیں خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

زکریا کا سر چکرانے لگا، بولا۔ ''خرم زاد! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

خرم زاد نے اکڑ کر ذکی وحیدی کی طرف دیکھا اور غصے میں کہا۔ ''غداروں نے ہمیشہ اپنوں کو نقصان پہنچایا ہے لیکن یاد رکھ، میری قوم کے لوگ تجھ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' پھر زکریا سے کہا۔ ''اور تو بھی یاد رکھ کہ ہماری فہرست میں تیرا نام بھی موجود ہے۔ تو اپنے کیے کی سزا پا کر رہے گا۔''

اب زکریا کا سر گھومنے لگا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ سب کیا، کیوں اور کس طرح ہو گیا؟ زکریا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے استاد ارسلان کا شانہ پکڑ لیا۔ اس کو چکر آرہا تھا۔

استاد ارسلان نے محافظوں کو حکم دیا۔ ''خرم زاد کو جلد از جلد سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا اس لیے اس کی سختی سے نگرانی اور حفاظت کی جائے۔''

استاد ارسلان یہ حکم دے کر باہر آگیا۔ زکریا نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔ ''استاد ارسلان! اس کی قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟''

استاد نے جواب دیا۔ ''اس کی قوم کو بربادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

ذکی وحیدی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے زکریا سے بطورِ خاص کہا۔ ''نوجوان! میں حیران ہوں کہ ان دنوں تیری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا میری قوم کے لوگ اپنی بیٹی ناہید تیرے حوالے اتنی آسانی سے کر دیں گے؟''

زکریا نے کوئی جواب نہیں دیا اس بار ذکی وحیدی استاد ارسلان سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے سلطان کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے بدلے میں اپنی قوم کی جاں بخشی کا طالب ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا اس کے صلے میں اپنی قوم کا تحفظ چاہتا ہوں۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''تیری یہ درخواست سلطان کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔''

سلطان نے کوچ کا حکم دے دیا تھا مگر جب اس کے سامنے خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کا مقدمہ پیش ہوا تو سلطان سناٹے میں آگیا۔ اس نے زکریا سے پوچھا۔ ''لیکن میں حیران ہوں کہ ان احمقوں نے اتنا بڑا اقدام کس طرح کر لیا؟''

استاد ارسلان نے دبی آواز میں کہا۔ ''سلطان معظم! ذکی وحیدی اور زکریا ہماری عزت اور احترام کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ انہی کی کوششوں سے اتنا بڑا کام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اگر ہمیں ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس وقت معلوم نہیں کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔''

سلطان نے ذکی وحیدی اور زکریا کو بڑے غور سے دیکھا اور شوخی سے کہا۔ ''اور زکریا یہاں بھی موجود ہے؟ اس نے یہاں بھی حقِ نمک ادا کیا، بہرحال میں اس سے بہت خوش ہوں۔'' اس کے بعد ذکی وحیدی سے کہا۔ ''تیرا کیا نام ہے؟ کچھ بتایا تو تھا، جا میں نے تیری قوم کی جاں بخشی کی اور ان سے کہہ دے کہ وہ نڈر اور بے دھڑک انداز میں اپنا اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔''

سلطان کے روبرو خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔ سلطان انہیں بغور دیکھتا رہا۔ آخر کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''تیرا نام کیا ہے؟ شاید خرم زاد؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''ہاں میرا نام خرم زاد، اپنی قوم کا ایک غیرت مند جوان۔''

سلطان نے کہا۔ ''تیری غیرت مندی تو یہیں سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ تیری قوم کے بڑوں نے خود کو اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو غداری کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ دغاباز اور فریبی تھے۔''

استاد ارسلان نے خرم زاد کو ڈانٹا۔ ''خرم زاد! یہاں زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ تجھ سے جو کچھ پوچھا جائے تو بس اس کے جواب کی حد تک رہ۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''اگر تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو کیا کرتا؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''میں سلطان کو قتل بھی کر سکتا تھا اور اگر میں ناکام رہتا تو سلطان کی فوج کے راز حاصل کر کے ایران چلا جاتا کیونکہ جو کام میں خود نہیں کر سکتا تھا، اس کو شاہِ ایران سے کروالیتا۔''

سلطان نے طنزاً پوچھا۔ ''اور آج کل تو کیا کر رہا ہے؟''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''اپنی قوم کے لیے جاسوسی۔''

سلطان نے پھر پوچھا۔ ''تیرا اپنے انجام کی بابت کیا خیال ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''شاید مجھے قتل کر دیا جائے۔''

سلطان نے کہا۔ ''اگر میں تجھ کو قتل کر دوں تو اس سے مجھے فائدہ کیا پہنچے گا؟''

زکریا چند قدم آگے بڑھا اور سلطان سے درخواست کی۔ ''سلطان معظم! اگر فیصلہ ان کی گردن زدنی کا ہو تو جہاد کی

خدمت مجھ سے لی جائے کیونکہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو جتنے پیار سے میں ماروں گا، کوئی دوسرا نہیں مار سکتا۔“

خرم زاد نے قہر کی نظروں سے زکریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”زکریا! اپنے حوصلے نکال لے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن میں نے بھی تیرا وہ انتظام کر دیا ہے کہ جب تک تو زندہ ہے اس کو یاد رکھے گا اور کڑھتا جلتا رہے گا۔“

زکریا نے اس کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا، خاموش رہا۔

سلطان نے پوچھا۔ ”ہاں تو خرم زاد! تو زکریا کو کیا سزا دے گا؟ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ یاد رکھ اگر تو نے میرے اپنے کسی آدمی کو دکھ دیا تو اس نوع کا اس سے زیادہ دکھ خود تجھے جھیلنا پڑے گا۔“

خرم زاد نے کہا۔ ”سلطان معظم! میں خرم زاد کچھ عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ زکریا کو کوئی ایسی سزا دی جائے جس کے اثرات یہ ہمیشہ محسوس کرتا رہے۔ چنانچہ میری قوم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی ناہید سے ملاقات تو ضرور کرا دی جائے مگر اس کو پاس نہ جانے دیا جائے۔“

زکریا نے سلطان کی موجودگی سے مرعوب لب و لہجے میں کہا۔ ”سلطانِ معظم! میں ہانڈی کے ابال کو حتی المقدور روکتا رہوں گا۔ میں نے آپ کی بات گرہ سے باندھ لی ہے۔ ناہید میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ میری زندگی کا مقصد سلطان معظم کی خدمت ہے۔ یہ خرم زاد مجھ کو ذلیل نہیں کر سکتا۔“

سلطان نے استاد ارسلان کو حکم دیا۔ ”خرم زاد کو کھول دیا جائے۔“

استاد ارسلان کو شبہ گزرا کہ شاید غلطی سے یہ حکم دیا گیا ہے، اس نے پوچھا۔ ”سلطان معظم! مکرر ارشاد فرمایئے۔“ سلطان نے پھر حکم دیا۔ ”خرم زاد کو کھول دیا جائے۔“

استاد ارسلان نے اپنے ہاتھ سے خرم زاد کو کھول دیا۔

سلطان نے کہا۔ ”میں خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اس لیے قتل نہیں کروں گا کہ اس سے میں حاصل کیا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ خرم زاد اور اس کے ساتھی شاہِ ایران کے پاس میرا ایک خط لے جائیں۔ میں ان سے اپنا ایک ضروری کام لینا چاہتا ہوں۔“

استاد ارسلان اور زکریا کو سلطان کے فیصلے سے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دونوں ہی خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو قتل کر دینے سے متفق تھے۔ سلطان نے ان کی جذباتی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ اس نے استاد ارسلان سے کہا۔ ”ارسلان! یہ ضروری نہیں ہے کہ لوگ میرے ہر فیصلے سے اتفاق ہی کریں لیکن میں لوگوں کی مرضی یا خیال کا تابع تو نہیں ہوں۔ میں وہی کرتا ہوں جو مجھے بہتر نظر آتا ہے۔ میں خرم زاد اور اس کے ساتھیوں کو اپنا قاصد بنا کر شاہِ ایران کے پاس بھیج رہا ہوں۔ شاہِ ایران میرا خط پڑھ کر عالم غیظ و غضب میں ان تینوں کو قتل کروا سکتا ہے۔ اگر ان تینوں کی موت ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں اور پھر میں کیوں ماروں۔ اور اگر یہ نہ مارے گئے اور شاہ ایران کا جواب لے کر واپس آ گئے تو دیکھا جائے گا۔“ پھر زکریا سے کہا۔ ”اور ہاں زکریا ناہید کہاں ہے؟ کچھ پتا ہے تجھ کو؟ اگر وہ یہیں کہیں ہے تو اس کو قابو میں لے لیا جائے اور اگر وہ یہاں کہیں نہیں ہے تو پھر وہ کہاں ہے اس کو تلاش کیا جائے۔“

زکریا کو بڑی امید بندھی۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ناہید ان تاجر گھرانوں ہی میں کسی کے پاس موجود ہے۔ اگر سلطان معظم چاہیں تو اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

سلطان ایک دم مشتعل ہو گیا، ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”زکریا! تو میرے سامنے کھڑا ہے۔ فضول باتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ ناہید تلاش کر کے تیرے حوالے کر دی جائے گی تو تجھے زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے۔“ پھر ایک دم استاد ارسلان سے مخاطب ہو گیا۔ ”ارسلان! اس نوجوان کو سمجھا دے کہ کسی فرماں روا سے یوں بات نہیں کی جاتی۔“

استاد ارسلان نے زکریا کو آہستہ سے سمجھایا۔ ”زکریا! صبر سے کام لے وقت کا انتظار کر۔ سلطان کی برہمی سے خوف زدہ رہ۔“

سلطان نے اسی وقت استاد ارسلان کو حکم دیا کہ کاغذ اور قلم دوات لائی جائے تا کہ وہ شاہ ایران کو خط لکھوا سکے۔

جب قلم دوات اور کاغذ استاد ارسلان کو مہیا کر دیے گئے تو سلطان نے شاہ ایران کے نام ٹہل ٹہل کر ایک خط لکھوایا۔ استاد ارسلان نے سلطان کی طرف سے لکھا۔

”میں سلطنتِ عثمانیہ کا سلطان، بہادروں کا سردار، بت پرستوں اور حق کے دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے والا سلیم خان بن سلطان بایزید خان بن سلطان محمد خان (فاتح قسطنطنیہ) بن سلطان مراد خان تجھ سے، یعنی لشکر ایران کے سردار اسمٰعیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ تو اپنے دل و دماغ سے حرص و ہوس کو نکال دے۔ تو نے میرے بھتیجوں کو قید کر رکھا ہے، انہیں میرے حوالے کر دے۔ اگر تو نے میرے حکم پر عمل نہ کیا تو پھر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ لباس شاہانہ کو اتار کر پھینک دوں اور اس کی جگہ زرہ بکتر پہن

لوں۔ اپنے اس جھنڈے کو جو کبھی سرنگوں نہیں ہوا، میدانِ جنگ میں تیرے روبرو نصب کردوں۔ میں انتقام لینے والی تلوار کو غیظ وغضب کی میان سے نکال کر اپنے ناقابلِ شکست سپاہیوں کے ساتھ تجھ پر حملہ آور ہوجاؤں۔ میرے ان سپاہیوں کی تلواریں کاری زخم لگاتی ہیں۔ ان کے تیر دشمنوں کے سینوں سے پار ہوجاتے ہیں۔ میں شہزادہ مراد اور اس کے دوسرے بھائیوں کو تیری قید سے رہائی دلانے آگیا ہوں۔ اگر تو نے اپنی بہادری اور قوت کے نشے میں شیوۂ ظلم اور ناانصافی کو ترک نہ کیا تو، تو جلدی اپنی آنکھ سے یہ عبرت ناک منظر دیکھ لے گا کہ تمام میدان ہمارے خیموں سے پٹ جائیں گے اور ہم اپنی شجاعت کے عجیب وغریب تماشے دکھائیں گے۔''

یہ خط سلطان نے خرم زاد کے حوالے کردیا اور اس کے دونوں ساتھی بھی رہا کردیے گئے۔ سلطان نے انہیں گھوڑے بھی دیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ اسی وقت شاہِ ایران کے پاس روانہ ہوجائیں۔

جب یہ تینوں سلطان کے پاس سے روانہ ہورہے تھے تو سلطان نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کردیا اور کہا۔ ''اگر اسمٰعیل میرے خط کے جواب میں میرے بھتیجے مراد کو میرے پاس بھیجنا چاہے تو پھر اس کا یہ فرض ہوگا کہ شہزادہ مراد کو باندھ کر میرے آدمی کے حوالے کردے۔''

جب یہ چلے گئے تو سلطان نے استاد ارسلان کے ماتحت ایک دستہ تاجروں کی بستی میں روانہ کردیا۔ اس میں زکریا کو بھی شامل کردیا گیا۔ سلطان نے استاد ارسلان سے کہا۔ ''خرم زاد کی قوم اس کا انتظار کررہی ہوگی تو تاجروں کی پوری بستی کو حراست میں لے لے اور ان سب کو میرے پاس لے آ۔'' پھر زکریا سے کہا۔ ''اور زکریا تیرا کام یہ ہے تو ان میں ناہید کو پہچان کر الگ کرلے اور اس کو بطورِ خاص میرے پاس لے آ۔ میں اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں کیا وہ واقعی اتنی ہی حسین ہے یا محض تیرا حسنِ نظر ہے...... فریبِ نظر کیونکہ نوجوانی میں نوجوانی کا انتخاب کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔''

استاد ارسلان نے کئی سو آدمیوں کو ساتھ لیا اور تاجروں کی بستی کی طرف چل پڑا۔ زکریا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ زکریا نے استاد ارسلان سے کہا۔ ''استاد محترم!''

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے زکریا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہم نے تاجروں سے وعدہ کرلیا تھا کہ انہیں ہمارا تحفظ حاصل ہے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''تب پھر تو کہنا کیا چاہتا ہے، ذرا صاف صاف کہہ۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان سے نرمی سے پیش آئیں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''زکریا! اس معاملے میں تو خاموش رہ کیونکہ سلطان کا جو حکم ہے میں اس پر پوری دیانت داری سے عمل کروں گا۔''

زکریا نے کہا۔ ''میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ آپ اس پر دیانت داری سے عمل نہ کریں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان سب کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر سلطان کے حوالے کردیں۔ ان میں اگر ناہید موجود ہو تو اس کو......''

زکریا معلوم نہیں کیا کہنا چاہتا تھا جو کہہ نہیں سکا۔ وہ اس وقت زبردست جذباتی دباؤ میں تھا۔

استاد ارسلان نے تاجروں کی بستی کو محاصرے میں لے لیا اور ایک بلند جگہ پر کھڑے ہوکر انہیں سلطان کا فرمان سنادیا۔ جس میں انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ مزاحمت کے بغیر سب کے سب سلطان کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔

ان لوگوں نے استاد ارسلان کے پاس ہی زکریا کو کھڑے دیکھا۔ ان میں وہ بوڑھا بھی موجود تھا جو خود کو صفی الدین کا بھائی کہتا تھا اور زکریا پر بری طرح برس چکا تھا۔ اس نے ہجوم سے نکل کر ایک بار پھر زکریا کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ ''بخدا تم لوگ مومن نہیں ہو کیونکہ مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ میں اس ذلیل نوجوان کی بابت پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ فریبی، دھوکے باز اور غدار ہے۔ تم لوگوں نے اس پر ایک بار پھر بھروسا کرلیا تھا۔''

استاد ارسلان نے بڑے میاں کو نرمی سے سمجھایا۔ ''محترم بزرگ! آپ کو ہمارے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضری دینا ہے اس لیے اب ان فضول باتوں سے آپ کو حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔''

بڑے میاں نے پوچھا۔ ''اچھا وہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''انہوں نے سلطان کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ اس لیے وہ سلطان کا ایک خط لے کر ایران گیا ہوا ہے۔ شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کے پاس۔''

کوئی اور شخص آگے بڑھا اور ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔ ''اچھا جناب! اگر ہم لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کردیں

تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔" آپ لوگ جائیں گے تو خیر ضرور ہی لیکن پتا نہیں سلطان آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔"

زکریا نے استاد ارسلان کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔" استاد محترم! ناہید...... ناہید۔"

استاد ارسلان نے اعلان کیا۔" تاجر صاحبان! ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے صفی الدین کی بیٹی ناہید کو الگ کر لیں۔ سلطان اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہے۔"

بوڑھے نے چیخ کر کہا۔" ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو ہم سب کو قتل کرنے کے بعد ہی ہماری عورتوں میں جا سکتا ہے۔" پھر اپنی تاجر برادری سے کہا۔" اے میری تاجر قوم کے جوانو...! تمہاری غیرت کہاں چلی گئی؟ کیا اب یہ ترک تمہاری عورتوں اور لڑکیوں کے چہروں پر سے چادریں ہٹا ہٹا کر ناہید کو تلاش کریں گے؟ شرم شرم شرم۔"

بوڑھے کے ورغلانے پر چند نوجوان آگے بڑھے اور استاد ارسلان کا راستہ روکنا چاہا لیکن استاد ارسلان کے آدمیوں نے انہیں خوف زدہ کر کے پیچھے ہٹا دیا۔

استاد ارسلان نے ان سب کو وہاں سے نکال کر سلطانی عساکر میں پہنچا دیا لیکن ان میں ناہید کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ ان کے مردوں کے سینے بے عزتی کی دہشت سے پھٹے جا رہے تھے۔ سلطان نے اس دن ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ اب اس کے دل و دماغ پر شاہ ایران اسمٰعیل صفوی کا خیال تھا۔ وہ شاہ ایران کو ہزیمت دینے کے لیے بہت بے چین تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن سلطان نے زکریا سے پوچھا۔" کیا ان میں ناہید موجود ہے؟"

زکریا نے جواب دیا۔" سلطان معظم! مجھ کو نہیں معلوم۔"

سلطان نے بگڑ کر کہا۔" کیا مطلب؟ کیا میں نے تجھ کو ارسلان کے ساتھ نہیں بھیجا تھا؟"

زکریا نے جواب دیا۔" بھیجا تھا لیکن استاد ارسلان نے مجھے خواتین کے چہرے نہیں دیکھنے دیے۔ وہ کہنے لگے کہ سلطان نے ابھی ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔"

سلطان نے کہا۔" ارسلان بہت اچھا انسان ہے۔ شاید میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا۔" پھر اسی وقت تالی بجا کر استاد ارسلان کو طلب کر لیا۔ جب وہ آ گیا تو سلطان نے کہا۔" ارسلان! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

استاد ارسلان نے کہا۔" یہ ناچیز حضور کا مطلب نہیں سمجھا؟"

سلطان نے جواب دیا۔" کیا میں نے زکریا کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ خواتین میں گھس کر ناہید کو نکال لائے۔ اس حکم کی تعمیل کیوں نہیں ہوئی؟"

استاد ارسلان نے عرض کیا۔" سلطان معظم نے اگر کوئی ایسا حکم دیا تھا تو میں اس کے سن نہ سکنے کا گناہ گار ہوں کیونکہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کوئی ایسا حکم سنا ہو۔"

سلطان نے کہا۔" اچھا اب تو تاجروں کی خواتین میں یہ اعلان کر دے کہ اگر ان میں صفی الدین کی بیٹی ناہید موجود ہے تو اس کو سلطان کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر وہ یہ کام بخوشی نہیں کریں گے تو ان میں زکریا کو داخل کر دیا جائے گا اور زکریا ناہید کو زبردستی نکال لائے گا۔"

استاد ارسلان نے عرض کیا۔" سلطان معظم کے حکم کی اسی وقت تعمیل ہوگی۔"

لیکن ان میں ناہید نہیں تھی۔ تاجروں نے صاف صاف بتا دیا کہ ناہید کو تبریز بھیجا جا چکا ہے۔ زکریا کو ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ تاجر خواتین سلطان سے جھوٹ بول رہی ہیں۔ اس نے سلطان سے درخواست کی کہ اس کو خواتین میں داخل ہو کر ناہید کو تلاش کرنے کی اجازت دی جائے لیکن سلطان نے یہ اجازت نہیں دی۔

چند دنوں بعد سلطان نے عساکر میں یہ اعلان کر دیا کہ ایران کی طرف سفر شروع کر دیا جائے۔

اس نے چند ہراول دستے آگے روانہ کر دیے تاکہ وہ شاہ ایران کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ سنان پاشا کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور خود قیصریہ سے سیواس روانہ ہو گیا۔ اس نے تاجروں کو سیواس میں رہا کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں مگر سلطان کی نظروں سے دفع ہو جائیں۔ وہ سب اس طرح رفوچکر ہوئے، کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ زکریا کو ان کے چلے جانے کا بڑا ملال رہا کیونکہ اس کو آخر وقت تک یہی یقین رہا کہ ان میں ناہید موجود ہے۔ وہ وقتی طور پر پریشان ہو گیا مگر وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ سلطان نے اگر اس کی پریشانی محسوس کر لی تو وہ سخت ناراض ہوگا۔

سلطان اپنی افواج کو دریائے فرات کے دوسری طرف لے گیا اور آگے بڑھ کر دریائے دجلہ کے مغربی ساحل پر دیار ابی بکر کے میدانوں میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اب اس کے سامنے ایران کا آذربائیجان تھا۔ یہیں تبریز میں شاہ ایران خاموش بیٹھا سلطان کو پریشان کرنے کے منصوبے

بنا رہا تھا۔ جب خرم زاد اپنے دونوں ساتھیوں اور سلطان کے ایک نمائندے کے ساتھ اسمٰعیل صفوی کے دربار میں پیش کیا گیا تو خرم زاد کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسمٰعیل صفوی کے چہرے پر موجود طمانیت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ترکی کے سلطان سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہے۔

خرم زاد نے سلطان کا خط اسمٰعیل صفوی کے حوالے کردیا اور زبانی عرض کیا۔ ''صفوی شاہ! شاہ کی وفاداری نے مجھے اور میرے خاندان کو بڑے دکھ دیے ہیں۔'' اس کے بعد اس نے صفی الدین کی تباہی و بربادی کی پوری داستان سنادی اور آخر میں بولا۔ ''صفوی شاہ! بخدا! میں بہ مشکل یہاں تک آیا ہوں ورنہ مجھے ہر ہر قدم پر ایسا لگتا تھا کہ میں قتل کردیا جاؤں گا۔''

اسمٰعیل صفوی نے تالی بجائی اور خدام کو حکم دیا کہ خرم زاد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرادیا جائے۔

سلطان کے ایلچی نے پوچھا۔ ''اور جناب والا! میری بابت کیا حکم ہے؟''

شاہ کے برابر ہی سلطان کا بھتیجا مراد بیٹھا تھا۔ شاہ نے سلطان کے ایلچی سے کہا۔ ''تو خوامخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ تیرا آقا تیرے سامنے بیٹھا ہے وہی کوئی حکم دے گا۔'' اس کے بعد شہزادہ مراد سے کہا۔ ''شہزادے! یہ تمہارا آدمی ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو شاہی مہمان خانے میں روانہ کردیا ہے۔ تم اپنے آدمی کو جہاں مناسب سمجھو بھیج دو۔''

شہزادہ مراد اٹھا اور سلطان کے ایلچی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر اس کی صورت دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''کیا تو نے مجھے پہچانا؟''

سلطانی نمائندے نے نفی میں گردن ہلائی۔ مراد مشتعل ہوگیا اور اپنی تلوار نیام سے کھینچ لی، بولا۔ ''یعنی تو اپنے سلطان کو نہیں جانتا۔ میں تیرا سلطان ہوں۔ چچا سلیم غاصب ہیں۔ میں انہیں ترکی میں داخل ہوتے ہی تاج و تخت سے دستبردار کردوں گا۔''

سلطانی نمائندے نے حیرت سے کہا۔ ''یعنی آپ سلطان ہیں...... آپ؟ آپ کا تاج و تخت کہاں ہے؟''

مراد نے جواب دیا۔ ''میں تاج و تخت سے ہمیشہ کے لیے دور نہیں ہوا۔ سلطانی نمائندے! اس جرم میں کہ تو اپنے حقیقی سلطان کو نہیں پہچانتا، میں تجھے جہنم واصل کیے دے رہا ہوں۔''

اتنا کہہ کر مراد نے اپنی تلوار کے پے در پے وار سے شاہی نمائندے کے ٹکڑے کردیے۔ شاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ تیسرے دن خرم زاد اور اس کے ساتھیوں کو شاہ نے پھر طلب کرلیا۔ شاہ نے سلطان کے خط کا جواب ایک بند بستے میں رکھ کر خرم زاد کے حوالے کردیا۔ اس کے بعد خرم زاد کو ایک چوکور ڈبا تھماتے ہوئے کہا۔ ''خرم زاد! افسوس کہ یہ کام تجھی کو انجام دینا ہوگا۔ خط کے ساتھ ہی یہ ڈبا بھی سلطان کے حوالے کردینا۔''

خرم زاد نے ڈبے کو آنک کر دیکھا، یہ کئی سیر وزن کا تھا۔ شاہ نے ایک اپنا آدمی بھی ساتھ کردیا اور خرم زاد سے کہا۔ ''دیکھ، یہ خط اور ڈبا سلطان کے حوالے کردینے کے بعد اس سے کہہ دینا کہ اگر اس کا جواب دینا ہے تو یہ میرا آدمی حاضر ہے۔ اس کو دے دینا، مجھ کو جواب مل جائے گا۔''

اس کے فوراً بعد ہی شاہ نے ایران کے سرحدی حصوں کے باغات اور سبزے کو جلادینے کا حکم دیا تاکہ سلطان اپنی ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ کو دانے پانی سے محروم پائے۔

شب و روز سفر کرتا ہوا جب خرم زاد ایرانی حدود سے نکل کر ترکی علاقے میں داخل ہوا تو اس نے حدِ نظر تک سلطانی سپاہ کو خیمہ زن دیکھا۔ سلطان کے سپاہی بڑی مستعدی سے آنے جانے والوں پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خرم زاد، اس کے دونوں ساتھیوں اور شاہ کے ایلچی کو دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑ کر انہیں پکڑ لیا اور جب خرم زاد نے یہ بتایا کہ وہ شاہ کا ایک ضروری پیغام لے کر سلطان کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہے تو انہیں نہایت عزت اور احترام سے سلطان کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ سلطان خرم زاد کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پوچھا۔ ''تیرا نام میں پھر بھول رہا ہوں، شاید خرم زاد ہے تیرا نام۔''

خرم زاد نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''ہاں، میرا نام خرم زاد ہے۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''اور وہ میرا آدمی یا میرا نمائندہ؟''

خرم زاد نے کوئی جواب نہیں دیا، سلطان نے سختی سے کہا۔ ''میں اپنے آدمی کی بابت تجھ سے پوچھ رہا ہوں خرم زاد۔''

خرم زاد نے جواب دیا۔ ''حضور والا! شاہ نے اس کو آپ کے بھتیجے مراد کے حوالے کردیا تھا اور مراد نے اس کے کئی ٹکڑے کرڈالے۔''

سلطان سناٹے میں آگیا پھر پوچھا۔ ''میرے خط کا جواب ہے؟ کہاں ہے وہ؟''

خرم زاد نے خط اور ڈبا دونوں ہی ایک ساتھ سلطان کے حوالے کردیے۔

اس وقت سلطان کے آس پاس استاد ارسلان، زکریا اور سلطان کے دوسرے امراء موجود تھے۔ سلطان نے شاہ

صفوی کا خط استاد ارسلان کے حوالے کر دیا اور اسے حکم دیا۔ ''شاہ کا خط بہ آوازِ بلند پڑھ کر سنایا جائے۔''

استاد ارسلان نے خط کھولا اور اسے زیرِ لب پڑھنے لگا۔ اس نے چور نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا اور پھر خط پر نظریں جما دیں۔ سلطان نے محسوس کیا کہ ارسلان خط پڑھنے سے کترا رہا ہے۔ سلطان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''میں کیا کہہ رہا ہوں، تو خط پڑھتا کیوں نہیں؟''

استاد ارسلان نے آہستہ سے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! افسوس کہ مجھ سے یہ خط نہیں پڑھا جا رہا۔ اس کو اگر آپ خود ہی پڑھ لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔''

سلطان نے استاد ارسلان سے خط لے کر خود ہی پڑھنا شروع کر دیا، اس میں لکھا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس قدر ناخوش کیوں ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ خط افیون کے نشے میں لکھا گیا ہے، اگر آپ جنگ کے لیے آمادہ ہیں تو میں تیار ہوں۔ خدا کو کیا منظور ہے، اس کا اظہار بھی بہت جلد ہی ہو جائے گا۔ جب ہم دونوں میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوں گے تو یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آجائے گی کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ افیون کا ایک ڈبا بھیج رہا ہوں تاکہ آپ کا نشہ برقرار رہے اور بہکی بہکی باتیں بھی ہوتی رہیں۔''

سلطان خط پڑھ کر بے قابو ہو گیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خرم زاد سے پوچھا۔ ''شاہ کا کوئی نمائندہ بھی آیا ہے یا نہیں؟''

خرم زاد نے شاہ کے نمائندے کو سلطان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سلطان نے زکریا کو حکم دیا۔ ''زکریا! شاہ کے ایلچی کو اسی وقت جہنم رسید کر دے۔''

زکریا نے آگے بڑھ کر ایلچی کی گدی پر تلوار سے وار کر دیا۔ ایلچی چیخ مار کر سلطان کے قدموں میں گر گیا۔ اس کی گردن شانے سے لگی رہ گئی تھی اور اس کی گردن سے جاری ہونے والے خون کا فوارہ زکریا اور کئی دوسرے درباریوں کے کپڑوں کو تر کر گیا۔ سلطان نے خرم زاد کو حکم دیا۔ ''خرم زاد! تو اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت نظروں سے دور ہو جا ورنہ میں تجھے بھی ٹھکانے لگوا دوں گا۔''

خرم زاد اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔

سلطان بہت برافروختہ تھا۔ اس نے اسی وقت کوچ کا حکم دیا۔ وہ جلد از جلد تبریز میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ شاہ کو ایسی عبرت ناک سزا دینا چاہتا تھا کہ آئندہ وہ کسی سے اس قسم کی باتیں نہ کر سکے۔

اسّی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے زمین کو روندتے ہوئے ایرانی حدود میں داخل ہو گئے۔ سلطان نے ایرانی حدود میں ہر طرف آتش زنی کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ کھیت، باغات اور ہریالی کو تباہ و برباد کیا جا چکا تھا۔ سبزے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ یہیں سلطان کے ہراولی دستے نے پریشانی کے عالم میں ملاقات کی۔ اس دستے کا سردار ہمدان پاشا نامی ایک شخص تھا۔ ہمدان پاشا سلطان کا ہم سبق اور بچپن کا ساتھی تھا اور سلطان اس وقت اس کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ وہ اپنے ہراولی دستے کے ساتھ ایران میں کافی اندر تک جا چکا تھا۔ یہاں گھوڑوں کے لیے چارے کا کوئی سامان نہ تھا۔ سلطان نے ہمدان پاشا کو طلب کیا اور پوچھا۔ ''ہمدان پاشا! جب تو ایرانی حدود میں داخل ہوا تو کیا صفوی کی فوجوں نے تیرا راستہ نہیں روکا؟''

ہمدان پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے اپنے تین طرف آگ کے شعلے دیکھے تھے اور ایرانی فوج کو اس حال میں دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی...... اور آگ کے شعلے بھی اس کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔''

سلطان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تو اس کا مطلب ہے کہ میرے گھوڑے اور دوسرے مویشی سبزہ نام کی کوئی شے بھی یہاں سے نہیں حاصل کر سکیں گے۔ گویا شاہ صفوی نے براہِ راست متصادم ہوئے بغیر ہمیں شکست دینے کی کوشش کی ہے، اور اس کے خیال میں میں گھاس اور دانے کے بغیر اپنے عساکر اندرونِ ایران دور تک نہیں لے جا سکتا۔''

ہمدان پاشا نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! میں بہت دور تک اندر گیا ہوں۔ وہاں دور تک ہر طرف راکھ کا ڈھیر ہے اور فصلوں اور سبزوں کی جگہ سیاہ نشانات کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے۔ باغات اور درختوں کی جگہ ٹنڈ منڈ درختوں نے لے لی ہے۔''

سلطان نے زیادہ اندر جانے کے بجائے یہیں سرحد پر قیام کیا اور اپنے امراء اور سرداروں سے مشورہ طلب کیا۔ ''صاحبان! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ہمدان پاشا نے رائے دی۔ ''سلطان معظم! جو کچھ میں آذربائیجان میں دور تک دیکھ آیا ہوں، وہ بہت پریشان کن اور حوصلہ شکن ہے۔ کیا ایک لاکھ بیس ہزار نفری لشکر کو کچھ کھلائے پلائے بغیر شاہ صفوی کے آسودہ لشکر سے لڑایا جا سکتا ہے؟ میری ناقص رائے میں ہرگز نہیں۔''

سلطان نے ناگواری سے کہا۔ ''تیری رائے کا بھرم

تو یوں ہی کھل چکا ہے کہ تو اپنی رائے کو ناقص کہہ کر خود ہی مسترد کر چکا ہے۔'' اس کے بعد استاد ارسلان سے پوچھا۔

''ارسلان! تو کیا کہتا ہے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔''سلطان والا! صورتِ حال غیر معمولی ہے۔ اس پر پورے غور و خوض کی ضرورت ہے۔''

سلطان نے حکم دیا۔''سنان پاشا کو یہیں بلا لیا جائے۔''

سلطانی ہرکارے سنان پاشا کو لینے چلے گئے۔

سلطان نے اپنے محافظ دستے کو لے کر آذربائیجان کا جائزہ لیا۔ شاہ صفوی نے ہر طرف ہر وہ شے جلوا دی تھی جو مویشیوں کی غذا کے کام آسکتی تھی۔ سلطان بغیر لڑے ہی ہار چکا تھا کیونکہ اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ آتش زدگی کے آثار کہاں تک موجود ہیں۔ سلطان نے فوری طور پر پانچ ہزار سپاہی الگ کر دیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ ترکی کی حدود میں خچروں اور اونٹوں کی مدد سے مویشیوں کے لیے دانے اور گھاس کا انتظام کریں اور اس کے عساکر کو پہنچاتے رہیں۔

اس حکم پر فوراً ہی عمل شروع ہو گیا۔ اس دوران سنان پاشا بھی حاضر ہو گیا۔ سلطان نے اپنے امراء اور مدبرین کو ایک وسیع و عریض خیمے میں جمع کیا اور ان کے سامنے شاہ صفوی کی جنگی حکمتِ عملی رکھ دی۔ پوچھا۔''ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

سنان پاشا نے عرض کیا۔''مشکلات ہوتی ہی اس لیے ہیں کہ ان پر قابو پایا جائے۔''

استاد ارسلان نے سنان پاشا کی تائید کی مگر یہ بھی کہہ دیا۔''اب رہا یہ سوال کہ ان مشکلات پر قابو کس طرح پایا جائے گا؟ اگر شاہ صفوی ہمارے بھوک اور فاقوں سے نڈھال گھوڑوں والی فوج پر اپنے ندرت اور آسودہ گھوڑوں کی فوج سے حملہ کر دے تو آپ ہی بتائیے ہم اس کا کس طرح مقابلہ کریں گے اور اس مشکل پر کس طرح قابو حاصل کریں گے؟''

ہمدان پاشا کو امراء اور فوجی سرداروں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ ہمدان پاشا کو سرگوشی میں سمجھا رہے تھے۔''ہمدان پاشا! تو سلطان کا ہم سبق اور بچپن کا ساتھی رہ چکا ہے سلطان تیری عزت بھی کرتا ہے تو سلطان پر دباؤ ڈال کر یہ یقین دلا دے کہ ان حالات میں جنگ کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم سب تباہ و برباد ہو جائیں۔ شاہ صفوی جو حقیقی معنی میں اپنی جنگی حکمتِ عملی سے سلطان کو لڑے بغیر ہی شکست دے چکا ہے، جب وہ ہتھیاروں کی جنگ میں فیصلہ کن شکست دے گا تو تعاقب کرتا ہوا ترکی کی حدود میں داخل ہو جائے گا جس سے سلطنتِ عثمانیہ ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

ہمدان پاشا نے جواب دیا۔''مگر یہ یاد رہے کہ سلطان خودسر اور ضدی ہے، کیا وہ ہماری بات مان لے گا؟''

ایک نے کہا۔''ہم سب سلطان کی مخالفت کریں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ جب سلطان پر ہر طرف سے دباؤ پڑے تو وہ ہماری بات نہ مانے۔''

سلطان نے بہ آوازِ بلند سبھی کو مخاطب کیا۔''تب پھر کیا طے پایا حاضرین؟ سردست ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ شاہ ہمیں کہاں ملے گا اور وہ ہم سے کس جگہ مقابلہ کرے گا؟''

کئی سردار اور مدبر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور باری باری اختلافِ رائے کا اظہار کیا۔ آخر میں ہر شخص ایک ہی بات کہتا تھا۔''فی الحال واپسی اختیار کی جائے اور مقابلے کو آئندہ سال تک ملتوی کر دیا جائے۔''

سلطان نے تلملا کر کہا۔''آخر کیوں؟ آخر کیوں؟''

ایک سردار نے جواب دیا۔''بھوکے پیاسے مویشیوں والی فوج بالآخر تباہ و برباد ہو جائے گی۔''

بہت سی آوازیں ایک ساتھ گونجیں۔''واپسی..... واپسی، شکست اور ناکامی سے دوچار ہوئے بغیر باعزت واپسی۔''

سلطان نے سنان پاشا کی طرف دیکھا۔''یہ انہیں ہو کیا گیا ہے؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔''سلطانِ والا! یہ سب اپنی اپنی عقل اور حوصلوں کے مطابق بات کر رہے ہیں۔''

ارسلان نے عرض کیا۔''اور یہ بات بھی ہے کہ ان میں نمود ایک بھی نہیں، یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بر بنائے خلوص کہہ رہے ہیں۔''

سلطان نے کن انکھیوں سے زکریا کی طرف دیکھا، اس نے عرض کیا۔''سلطان معظم! یہ ناچیز تو بس ایک بات جانتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص جو بھی مقام حاصل کرتا ہے اپنی عقل، حوصلے اور صلاحیت کے اعتبار سے، حاضرین میں کوئی توپچی باش (افسر توپ خانہ) ہے کوئی توپ عربجی باش و آتشی اسلحے کا افسر ہے، کوئی جبجی باش وسلاح خانے کا افسر ہے اور کوئی لاغچی باش و قلعہ شکنوں اور سرنگیں بچھانے والوں کا افسر ہے لیکن ان سب میں سلطان معظم کی ذات ان سب سے الگ اور برتر و اعلیٰ ہے۔ اس موقع پر میں ایک گزارش کروں گا کہ سلطان والا کی رائے اور عمل ان سب سے الگ اور برتر و اعلیٰ ہونا چاہیے کیونکہ عقل، تدبر اور حوصلوں میں سلطان اور ان افسروں میں فرق ہونا بہت ضروری ہے۔''

ہمدان پاشا آہستہ آہستہ سلطان کی طرف بڑھا اور

قریب پہنچ کر درخواست کی۔ ''سلطان والا! میں ہراولی دستے کا افسر ہوں اور مجھے سلطان کے ہم سبق ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ میں نے حضورِ والا کے بچپن میں ان کے ساتھ ہونے کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ ان اعزازات اور خصوصیات کے پیشِ نظر میں سلطان کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے آہستہ سے اجازت دے دی۔ ''بیان کر، اجازت ہے۔''

ہمدان پاشا نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں اپنے ہراولی دستے کے ساتھ آذربائیجان میں بڑی دور تک جا چکا ہوں، میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے دہشت زدہ ہو گیا ہوں۔ میں نے وہاں ہر طرف ویرانہ دیکھا۔ آبادیوں کے آثار کھنڈرات کی شکل میں دیکھے۔ شاہ نے ہر طرف تباہ کاریوں اور بربادیوں کے ملبے چھوڑے ہیں۔ سبزہ جلا دیا گیا۔ باغات پھونک دیے گئے۔ درختوں کو خاک سیاہ کر دیا گیا۔ ان حالات میں اگر میں یہ کہوں کہ شاہ نے اپنی زبردست جنگی حکمتِ عملی سے ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے تو شاید غلط نہ ہو گا۔''

سلطان نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں تو میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

ہمدان پاشا نے عرض کیا۔ ''صرف یہ کہ ان سنگین اور خطرناک حالات کی موجودگی میں اور اپنے جملہ افسرانِ فوج کی متفقہ خواہش کے پیشِ نظر اگر اس مہم کو امسال ملتوی کر دیا جائے تو بہتر رہے گا۔''

اسی وقت دوسرے افسر نے بھی ہمدان پاشا کی تائید میں آواز بلند کی۔ ''ان حالات میں پیش قدمی کا صریح مطلب یہ ہو گا کہ ہم سب اپنی اپنی موت کی طرف قدم بڑھائیں گے۔''

سلطانی خیمے کے باہر ینی چری سپاہ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ ''پیش قدمی کو اس سال ملتوی کر دیا جائے۔ ہم امسال جنگ نہیں کریں گے۔ ہم خود کو تباہی اور بربادی کے حوالے نہیں کریں گے۔''

سلطان غصے میں کھڑا ہو گیا اور ہمدان پاشا سے پوچھا۔ ''کم سے کم لفظوں میں بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟''

ہمدان پاشا نے جواب دیا۔ ''التوا اور واپسی۔''

سلطان کی تلوار فضا میں بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے ہمدان پاشا کا سر سلطان کے قدموں میں گر گیا۔ سلطان نے اپنے افسروں کو مخاطب کیا۔ ''ینی چری کے سردارو! میری باتیں توجہ سے سن لو، میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ ناکام واپس جاؤں۔ میں ان سے مخاطب ہوں جو بہادر ہیں اور اپنی شرافت کی وجہ سے بزدلی اور نامردی کے عیب کو اپنے لیے گوارا نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو تیر اور شمشیر کے زخموں سے ہراساں نہیں ہوتے، یہ سب میرا ساتھ دیں گے لیکن وہ لوگ جو نامرد ہیں اور اپنی جان کو اپنی عزت سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے ہیں وہ لوگ جو صعوبتوں کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، انہیں میں اجازت دے رہا ہوں کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اگر تم میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو میرا ساتھ دے اور تم سب نامردوں میں شامل ہو چکے ہو تو میں تنہا ہی آگے بڑھ جاؤں گا اور معرکۂ جدال و قتال کے بغیر ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔''

اس کے بعد سلطان نے حاضرین پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور حکم دیا۔ ''وہ لوگ جو مرد ہیں کوچ کی تیاری کریں اور وہ لوگ جو بزدل ہیں اور واپس جانا چاہتے ہیں اپنی منحوس شکلوں کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے پاس سے چلے جائیں۔''

ینی چری کے افسران خاموشی سے باہر نکلے اور کوچ کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو واپس جانے کی ہمت کر سکتا۔ یہ لوگ چاق و چوبند اور زیادہ عزم و حوصلے سے تبریز کی سمت بڑھے۔ دورانِ سفر کاکیشیا کے ایک مسیحی سردار نے غلہ، گھاس اور مویشیوں کے لیے چارے کی وافر مقدار سلطان کی خدمت میں روانہ کی۔ سلطان کے ہزاروں سپاہی خچروں اور اونٹوں پر عسکری رسد بڑی تندہی سے پہنچا رہے تھے۔ سلطان اپنے لشکر کو بڑی تیزی سے آگے بڑھائے چلا جا رہا تھا اور اس کو برابر یہ خبریں مل رہی تھیں کہ شاہ اپنی سپاہ کو پیچھے ہٹاتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ تبریز اور سلطانی عساکر کے درمیان کا فاصلہ صرف چالیس میل رہ گیا۔ سلطان نے وادی خالدران میں اپنی سپاہ کو روک دیا اور اس کے مغربی ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ سلطان نے اپنے سامنے شاہ کی سپاہ کو میلوں میں پھیلے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اسی وقت اپنی فوج کو یہ خوش خبری سنا دی کہ سفری صعوبات کا خاتمہ ہوا اور جنگی مہارت اور استادی دکھانے کا موقع ملنے ہی والا ہے۔

سلطان نے بڑی تیز رفتاری سے اپنی سپاہ شاہ کی فوج کے مقابل پہنچا دی۔ شاہ کے سپاہی ترکوں کو دیکھ دیکھ کر ہنس

رہے تھے۔ سلطان کے ساتھ ایک توپ خانہ بھی تھا جس سے ان کا حریف محروم تھا۔

شاہ کی تیز فہمی نے سلطان کو ستانے کا ذرا سا بھی موقع نہیں دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سلطانی سپاہ تھکی ہوئی ہے اور خود اس کی اپنی سپاہ تازہ دم چست... اور مستعد ہے۔

سلطان نے سنان پاشا کو داہنا بازو (میمنہ) دیا اور حسین پاشا نامی جرنیل کو بائیں بازو (میسرہ) پر متعین کر دیا۔

دوسری طرف شاہ صفوی نے اپنے اسی ہزار سواروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، چالیس ہزار کو خود سنبھالا اور چالیس ہزار کو اپنے مشہور جرنیل بوعلی کی کمان میں دے دیا اور بقیہ کو ترکوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس نے بوعلی کو حکم دیا کہ جب سامنے کی فوج سلطانی سپاہ کو جنگ میں الجھالے تو وہ خود داہنی طرف سے اور بوعلی بائیں جانب سے ترکوں پر حملہ آور ہوگا۔ اس طرح سلطان کی تھکی ہاری فوج کو چشم زدن میں پیس کر رکھ دیا جائے گا۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر شاہ نے جنگ شروع کر دی۔ ترک شاہ کی فوج سے نبرد آزما تھے ہی کہ خود شاہ اپنے چالیس ہزار سواروں سمیت حسین پاشا پر حملہ آور ہوا اور تباہ کاری مچادی۔ دوسری طرف بوعلی نے سنان پاشا...... پر حملہ کر دیا لیکن توپ خانے نے شاہ کے میسرے کو اس سے پہلے ہی اپنی زد میں لے لیا تھا۔ توپ خانے کے منہ کھل گئے اور میدانِ جنگ قبرستان میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ سلطان اپنی سپاہ کے قلب میں موجود جنگی احکامات دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی خود لڑنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ وہ شطرنج کے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے سوار اور پیادے ہٹاتا بڑھاتا رہا۔ اس کا توپ خانہ فیصلہ کن کردار ادا کر رہا تھا۔ بہت جلد ہی دونوں طرف کے ماہرین جنگ کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں کون فاتح ہے اور کون مفتوح۔

سلطان نے حکم دیا۔ ''شاہ کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اس کو زندہ گرفتار کیا جائے۔''

سلطان کو مطلع کیا گیا کہ سنان پاشا نے اپنی سمت کے حملہ آوروں کو مغلوب کر لیا ہے لیکن حسین پاشا کمزور پڑ رہا ہے۔ سلطان اپنے ینی چری دستے کو لے کر حسین پاشا کی مدد کو پہنچ گیا اور آناً فاناً اپنے حریف کو مغلوب کر لیا۔

جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ شاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ کو پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ شاہ کا ایک دوست مرزا سلطان علی آگے بڑھا اور اعلان کیا۔ ''میں شاہ صفوی ہوں۔ اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔''

عثمانی سپاہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے مرزا سلطان علی کو

اپنے گھیرے میں لے لیا۔

مرزا سلطان علی نے شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوست! اگر یہ شریف عثمانی فوجی تجھے چھوڑنا گوارا کریں تو میری طرف سے میری برسرِ پیکار فوج کو حکم دے دے کہ جنگ ختم ہوگئی، ہتھیار ڈال دیے جائیں۔"

ترکوں نے شاہ کو معمولی آدمی سمجھ کر چھوڑ دیا اور مرزا سلطان علی کو شاہ سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ شاہ نے رہائی پاتے ہی اپنے گھوڑے کو تبریز کی راہ پر ڈال دیا۔

سلطان نے مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد شاہی خیمے کو محاصرے میں لے لیا۔ مرزا سلطان علی کو جب سلطان کے روبرو پیش کیا گیا اور شاہی خیمے کی خواتین کو اس کی شناخت کے لیے کہا گیا تو انہوں نے صاف صاف بتا دیا۔ "یہ شاہ نہیں ہے بلکہ شاہ کا دوست مرزا سلطان علی ہے۔"

سلطان نے حیرت سے کہا۔ "لیکن اس نے تو خود ہی یہ بتایا تھا کہ یہ شاہ ہے اور اپنے ایک ساتھی کو یہ حکم دے کر بھیجا تھا کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لیے اس کے برسرِ پیکار لوگ ہتھیار ڈال دیں۔"

مرزا سلطان علی مسکرا دیا۔ "سلطان! وہ شخص جسے میں نے رہائی دلوادی، شاہ تھا اور میں اس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ میں خوش ہوں کہ شاہ قید کی ذلت سے بچ گیا۔"

سلطان نے کہا۔ "لیکن کیا یہ بھی جانتا ہے کہ خود تیرا کیا حشر ہوگا؟"

مرزا نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔ میں قتل کردیا جاؤں گا۔"

سلطان نے حکم دیا۔ "اس کو قید میں رکھا جائے۔ فیصلہ بعد میں سناؤں گا۔"

شاہ عجلت میں اپنا سفری خزانہ اور اپنی چہیتی بیوی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاسکا تھا۔ یہ چیزیں سلطان کے قبضے میں آگئیں۔ سلطان چودہ دن اس وادی میں مقیم رہا۔ اس کے بعد وہ تبریز روانہ ہوگیا۔ شاہ نے سلطان کی آمد کی خبر سنی تو خراسان چلا گیا اور سلطان نے تبریز پر قبضہ کرلیا۔

اس دوران سلطان چپ چپ رہا کیونکہ فتح مندی کی خوشی میں یہ ملال بھی شامل تھا کہ اس کی فوج نے ہمت ہار دی تھی اور اس مہم کو اگلے سال پر موقوف کر رہے تھے۔ اس کو یہ نہایت تلخ تجربہ ہوا تھا اس کے ساتھ ہی وہ سنان پاشا اور استاد ارسلان اور زکریا سے خوش تھا جو آخر تک اس کے ہم خیال اور مطیع و فرماں بردار رہے۔

سلطان نے شاہ کی بیوی کو احتیاط و احترام سے رکھا۔

سلطان کے محافظ یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ شاہ کی بیوی سے کیسا سلوک کرے گا لیکن سلطان نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کررکھی تھی۔ سلطان نے آٹھ دن تبریز میں قیام کیا۔ اس کے بعد وہ شمال کے ایک خوشگوار مقام قرہ باغ۔۔۔ چلا گیا اور وہاں قیام کیا۔ یہ سرمائی مقام اسے بہت پسند آیا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اپنی آئندہ مہم کے منصوبے بنانا چاہتا تھا۔ یہیں اس کی خدمت میں ایک تیموری شہزادے نے حاضری دی۔ سلطان نے اس کی بڑی عزت کی اور نہایت احترام سے پیش آیا۔

قرہ باغ سے سلطان نے اماسیہ کا رخ کیا۔ نہروں اور باغات کا شہر اماسیہ جہاں سلطان نے اپنے جانبازوں اور جاں نثاروں کو انعامات دیے۔ یہیں سلطان کی خدمت میں شاہ صفوی نے اپنے ایلچی بھیجے۔ سلطان کو شاہ سے بے انتہا نفرت تھی۔ شاہ کے ایلچیوں کی آمد نے سلطان کو برہم کردیا اور مزاج میں چڑچڑاپن آگیا۔ اس کے امراء کا خیال تھا کہ شاید سلطان، شاہ کے ایلچیوں کو شرفِ باریابی بخشے بغیر ہی واپس کردے گا لیکن سلطان نے انہیں شرفِ ملاقات بخش دیا۔

شاہ کے ایلچی نہایت احترام اور ادب سے سلطان کے روبرو پیش ہوئے۔ انہوں نے سلطان کی خدمت میں شاہ کا ایک خط پیش کیا۔ سلطان نے یہ خط استاد ارسلان کی طرف بڑھا دیا اور حکم دیا کہ اس کو بآوازِ بلند پڑھ کر حاضرین کو سنایا جائے۔

اس میں شاہ نے لکھا تھا۔

"ایک فرماں روا کا خط دوسرے فرماں روا کے نام۔ خالدران کی جنگ میں سلطان کو فتح اور مجھ کو شکست نصیب ہوئی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس سے فاتح خوش اور مفتوح آزردہ ہو کیونکہ جب دو لشکر لڑتے ہیں تو ان میں سے ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوتی ہے۔ یہ تقدیرِ الٰہی ہے اور تقدیرِ الٰہی کو خندہ۔۔۔ پیشانی سے قبول کرلینا مردوں کی شان ہے۔ جو کچھ ہوا ہم دونوں کو اسے بھلا دینا چاہیے اور اب دوستوں کی طرح رہنے کا عہد کرنا چاہیے۔ میں دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ امید ہے سلطان بھی اس کا جواب مثبت رویوں میں دے گا۔

"میری بیوی ناہید سلطان کے قبضے میں ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ براہِ کرام اسے میرے ایلچیوں کے حوالے کردیجیے تاکہ وہ اسے میرے پاس پہنچادیں۔ اس نوازش کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

سلطان نے ایلچیوں سے صاف صاف کہہ دیا۔ "شاہ سے کہہ دینا کہ جس دشمنی کی بنیاد اس نے ڈالی تھی، میں اسے برقرار رکھوں گا۔ میں شاہ کو نہ تو اچھا دوست سمجھ سکتا ہوں، نہ اچھا دشمن۔ رہی اس کی بیوی ناہید...... تو وہ اسے نہیں واپس کی جائے گی۔

آئندہ اس قسم کے خط وکتابت کی جسارت نہ کی جائے۔“

ناہید کے نام نے زکریا کو چونکا دیا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ شاہ کی بیوی ناہید کے بارے میں پوچھتا۔

شاہ کے ایلچیوں کو دربار سے بے نیل ومرام واپس کر دیا گیا۔ سلطان کی طبیعت کا انقباض حاضرین کو خوفزدہ کیے ہوئے تھا۔ وہ سلطان کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتے تھے۔ آخر سلطان نے خود ہی حکم دیا۔ ”سنان پاشا، استاد ارسلان اور زکریا کے سوا سبھی چلے جائیں۔“

جب بالکل تخلیہ ہو گیا تو سلطان نے بولنا شروع کر دیا۔ ”جس نے مروت نہیں کی، اس سے مروت نہیں کی جائے گی۔ جس نے اخلاقیات کا خیال نہیں رکھا، اس سے اخلاقی برتاؤ نہیں ہوگا۔“ پھر اچانک سوال کیا۔ ”شاہ کی اس وقت کیا عمر ہوگی؟“

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ”یہی کوئی سینتیس اڑتیس سال۔“

سلطان نے کہا۔ ”خوب!“ پھر اچانک سوال کیا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنے اقتدار اور بیوی کو ایک ساتھ کھو دینے کے بعد محض بیوی کو یاد رکھے اور اس کی تمنا کرتا رہے؟“

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ”سلطان معظم! دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔ کچھ کے لیے اقتدار بڑی چیز ہے اور کچھ کے لیے اس کی چہیتی بیوی۔ شاہ کو اقتدار سے زیادہ اپنی بیوی عزیز ہوگی۔“

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ”حضور والا! شاہ ایک صوفی کی نسل سے ہے اور صوفی لوگ اس اٹل حقیقت کے قائل ہوتے ہیں کہ جنس کو کسی حال میں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ حسن پرست ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ چونکہ خود حسین ہے اس لیے یہ حسن کو پسند کرتا ہے۔ شاہ کی بیوی یقیناً غیر معمولی حسین ہوگی اس لیے وہ اقتدار کو تو بھول گیا مگر حسین بیوی کو نہیں بھلا سکا۔“

سلطان نے اچٹتی نظروں سے زکریا کی طرف دیکھا۔ زکریا سمجھ گیا کہ سلطان اس سلسلے میں اس کی رائے بھی جاننا چاہتا ہے چونکہ ابھی تک زکریا نے سلطان پر پُراعتماد نقش چھوڑا تھا اور سلطان اس کی عدم موجودگی میں اس کی تعریفیں کرتا رہا تھا اس لیے زکریا نے سلطان کی مدح سرائی شروع کر دی، بولا۔ ”سلطان معظم! جب سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ شباب اور ہانڈی کے ابال میں زیادہ فرق نہیں ہے میں نے عورتوں اور لڑکیوں کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا ہے اور میں خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگا ہوں۔“

سلطان نے کہا۔ ”لیکن جوانی میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“ پھر پوچھا۔ ”اور صفی الدین کی بیٹی ناہید کا بھی کچھ پتا ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟“

زکریا نے جواب دیا۔ ”جناب والا! صفی الدین کی بیٹی جہاں کہیں بھی ہوگی خوش ہوگی۔ اللہ نے اس کو بڑا حسن دیا ہے۔“

سلطان نے پوچھا۔ ”کیا تیرے دل میں اس کی محبت کی رمق اب بھی پائی جاتی ہے؟“

زکریا شرما گیا، بولا۔ ”حضور والا! اب میں اپنی جوانی کے وقتی اور عکاسی جذبے کو محبت کس طرح کہہ دوں؟ اور پھر میں صفی الدین کی بیٹی ناہید کا گناہ گار بھی تو ہوں۔ اگر وہ مجھے مل بھی جائے تو میں اس سے نظریں تک نہیں ملا سکوں گا۔“

سلطان نے کہا۔ ”خدا کرے تیرے یہ احساسات زندہ و برقرار رہیں۔ عورت ایک سراب کی طرح ہے کہ زندگی بھر دھوکے میں رکھتی ہے۔“

زکریا نے عرض کیا۔ ”اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس سراب سے دور اور محفوظ ہوں۔“

زکریا یہ سب سلطان کی خوشنودی اور اپنی شیخی میں کہہ رہا تھا ورنہ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ ناہید نے اس کے دل ودماغ تک کو تہ وبالا کر رکھا تھا۔

سلطان نے تالی بجائی اور جب کئی خادم ایک ساتھ سلطان کے آس پاس آن موجود ہوئے تو سلطان نے انہیں حکم دیا۔ ”شاہ کی بیوی ناہید کو پیش کیا جائے۔“

اس حکم نے سب سے زیادہ زکریا کو پریشان کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد صفی الدین کی بیٹی اور شاہ کی بیوی ناہید سلطان کے روبرو کھڑی کر دی گئی۔

سنان پاشا اور استاد ارسلان نے اس ماہ پارے کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ سلطان نے ناہید سے کہا۔ ”بیٹھ جا! کیا تو اس نوجوان سے واقف ہے؟“

یہ کہتے ہوئے سلطان نے زکریا کی طرف اشارہ کیا مگر ناہید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زکریا پر نیم مدہوشی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ناہید سے نظریں ملا سکتا۔

سلطان نے ناہید سے پوچھا۔ ”صفی الدین کی بیٹی! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو شاہ کی بیوی کس طرح بن گئی؟“

ناہید نے زکریا کی طرف بڑے جذباتی انداز میں اشارہ کیا۔ ”جب اس فریبی نے دھوکے سے میری قوم کے لوگوں کو تباہ وبرباد کر دیا اور میرے باپ کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا تو میں بے بس اور مجبور ہو گئی تھی اور میرے خاندان کے بڑوں نے مجھے پناہ کے لیے شاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ شاہ نے مجھے دیکھا تو شادی کی خواہش کر دی اور میری مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ اب وہ مجھے چھوڑ کر خراسان جا چکا ہے اور

میں سلطان کی تحویل میں آچکی ہوں۔"

سلطان نے کہا۔"بہرحال! اب تجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

ناہید نے ایک بار پھر زکریا کی طرف دیکھا اور بگڑ کر سلطان سے بولی۔"سلطان معظم! اس فریبی اور دھوکے باز نوجوان کو یہاں سے ہٹادیں ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی قوم کے مقتول اور اپنا باپ یاد آجاتا ہے۔"

سلطان نے زکریا سے کہا۔"زکریا! تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا اور یوں بھی اب تیری کوئی ضرورت نہیں۔"

زکریا باہر چلا گیا۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان دونوں ہی سلطان سے نظریں بچا بچا کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

سلطان نے ناہید سے کہا۔"شاہ کے ایلچی آئے ہوئے ہیں اس نے تجھے بلوایا ہے، کیا خیال ہے؟ کیا میں تجھے ان ایلچیوں کے حوالے کردوں؟"

ناہید نے احتجاج کیا۔"نہیں سلطان معظم! اب میں شاہ کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

سلطان نے کہا۔"تب پھر تو یہاں کس کے پاس اور کس طرح رہے گی؟"

ناہید نے جواب دیا۔"حضور والا! اب میں کسی قیمت پر شاہ کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

سنان پاشا نے عرض کیا۔"سلطان معظم! کیا حرم سرا میں ایک حسین لڑکی کے لیے کوئی جگہ نہیں؟"

سلطان گرم ہوگیا۔"احمق! کیا میری غیرت یہ گوارا کرے گی کہ شاہ کی بیوی کو اپنے حرم میں ڈال لوں؟ میں اس کا کچھ بھی کروں مگر حرم میں نہیں ڈال سکتا۔"

استاد ارسلان نے اپنے شاگرد کی سفارش کی۔"سلطان معظم کو شاید ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ زکریا، ناہید سے والہانہ حد تک عشق کرتا ہے۔ یہ جوڑ کیسا رہے گا؟"

سلطان نے دونوں کو ہی ڈانٹ دیا۔ دونوں ہی خاموشی سے باہر نکل گئے۔ وہاں زکریا عالم کرب واضطراب میں چرخ کی طرح ٹہلنے میں مشغول تھا۔

زکریا نے سرگوشی میں پوچھا۔"اندر کیا ہورہا ہے؟ سلطان نے اس لڑکی کی بابت کیا فیصلہ کیا؟"

استاد ارسلان نے جواب دیا۔"ابھی کچھ بھی نہیں لیکن یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ناہید سے متعلق تیرا ذکر بھی نہیں ہوگا۔ سلطان اور ناہید دونوں ہی نے تجھے بڑی بے رحمی سے مسترد کردیا ہے۔"

زکریا نیم پاگل ہورہا تھا، بے چینی میں بڑبڑانے لگا۔"تو شاید اس کا یہ مطلب ہوا کہ سلطان خود ناہید پر عاشق ہوچکا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔ سلطان کو کم از کم اپنی بات کا تو پاس ہونا ہی چاہیے۔ سلطان ایک طرف تو یہ کہتا ہے کہ عورت ایک سراب ہے اور دوسری طرف اس سراب کو گلے لگانے کے لیے تیار نظر آتا ہے......"

استاد ارسلان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"پاگل! یہ کیا اول فول بک رہا ہے۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھ، ورنہ ہمدان پاشا کی طرح تیرا سر بھی سلطان کے قدموں میں پڑا ہوگا۔"

زکریا سہم کر چپ ہوگیا۔ سلطانی خدام اسی وقت ناہید کو لے کر باہر نکلے اور اس کو سلطانی حرم سے متعلقہ ایک خیمے میں پہنچادیا۔ ایک دوسرے خادم نے ان تینوں کو مطلع کیا۔"سلطان یاد فرمارہے ہیں۔"

جب یہ تینوں سلطان کے روبرو پہنچے تو سلطان نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات سے ان کے دلوں کی کیفیات سمجھنے کی کوشش کی اور بطور خاص زکریا سے کہا۔"ناہید کے سلسلے میں یہ بتادینا بہت ضروری ہے کہ وہ میرے لائق نہیں ہے۔ میں اتنا ارزاں اور بدمذاق ہرگز نہیں کہ شاہ کی بیوی اور ایک ناپختہ کار نوجوان کی پسند کو اپنا ہم معیار قرار دوں۔ اللہ نے چاہا تو ناہید شاہ کے سوا کسی کو بھی دی جاسکتی ہے۔"

زکریا کے مایوس دل میں امید کی کرنیں بکھر گئیں اور ڈوبتا ہوا دل پھر اسی شان سے دھڑکنے لگا جس طرح ناہید کے آنے سے پہلے دھڑک رہا تھا۔

سلطان نے زکریا سے کہا۔"بس اب تو جاسکتا ہے، تجھ سے بس اتنی سی بات کہنا تھی جو کہہ دی۔"

زکریا سلطان کے خیمے سے اس طرح نکلا جس طرح سلطان وادی خالدران سے فاتحانہ انداز میں نکلا تھا۔ خوش، مطمئن اور مستغنی۔

(جاری ہے)

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ اسلام — اکبر شاہ خان نجیب آبادی
تمدن عرب — ڈاکٹر گستاؤلی بان
تاریخ ایران — مقبول بیگ بدخشانی
تاریخ الخلفاء — جلال الدین سیوطی
فرماں روایان اسلام — اسٹینلے لین پول
الکامل — ابن اثیر

ابلیسی

کاشف زبیر

محبت کرنے والے ہمیشہ اپنے مطلوب کو حفاظت کے حصار میں قید رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف اسے بلکہ خود کو بھی ممکنہ اذیتوں سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر... وہ تھی کہ محبتوں کو سمجھے بغیر اپنی ہی ڈگر پر چلنے کی قائل تھی۔ ایسے میں زمانہ ایک آزمائش بن کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا... جب انسان حقیقت تسلیم کرنے پر مائل نہ ہو تو روح گھائل ضرور ہوتی ہے... اور وہ بھی اگر بھٹکتی روحوں کے درمیان گم ہو گئی تھی تو ٹھوکر تو لگنی ہی تھی۔

ساکت جسموں اور سیلانی روحوں کے تصادم پر مشتمل ایک پراسرار کہانی

سونیا آج بہت خوش تھی کیونکہ آج وہ یونیورسٹی جارہی تھی۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اس نے کئی اچھے کالجز اور یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواست بھیجی تھی اور اسے بالٹی مور کی ایک یونیورسٹی کی طرف سے داخلے کی پیشکش آگئی تھی۔ اس کے شاندار اسکول ریکارڈ کی وجہ سے اس کی فیس میں ستر فیصد کمی کی گئی تھی البتہ دوسرے اخراجات اسے پورے ادا کرنے تھے لیکن وہ اس کے لیے فکر مند نہیں تھی کیونکہ اس کی بڑی بہن رونیا بہت اچھی جاب کر رہی تھی۔ وہ فزیوتھراپسٹ تھی۔ ایک اسپتال میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ نجی پریکٹس بھی کرتی تھی اور اس کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ ماں باپ کے

بعد اسی نے سونیا کو پالا اور پڑھایا تھا۔ وہ صرف دس برس کی تھی جب گھر میں آگ لگنے سے اس کے ماں باپ دونوں جل کر ہلاک ہو گئے۔ وہ خوش قسمتی سے بچ گئی۔ جب یہ واقعہ ہوا تو... رونیا جاب کے لیے واشنگٹن میں تھی۔

حادثے کی اطلاع سن کر رونیا آئی اور ماں باپ کی تدفین کے بعد وہ سونیا کو اپنے ساتھ واشنگٹن لے گئی۔ اس وقت سونیا پانچویں گریڈ میں تھی مگر اسے اپنی تعلیم دوبارہ شروع کرنے میں ایک سال لگا تھا۔ درمیان میں بھی اسے کچھ مسائل رہے تھے لیکن اس نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور بہت اچھے نمبروں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ آگے تعلیم کے لیے اس نے جس مضمون کا انتخاب کیا تھا وہ دنیا کی پراسرار تاریخ تھی۔ اس میں مذاہب بھی آتے تھے اور قدیم دنیا کے وہ پراسرار رسم ورواج بھی جن کے بارے میں آج عام لوگ کچھ نہیں جانتے۔ رونیا نے شروع میں مخالفت کی تھی، اس نے سونیا سے کہا۔ ''تم کیوں یہ مضمون لے رہی ہو؟ دورِ حاضر میں اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔''

''مجھے شوق ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی ڈگری سے مجھے فائدہ بھی ہوگا۔''

''تم کوئی اور مضمون لے سکتی ہو۔''

''نہیں، مجھے یہی مضمون پسند ہے۔'' سونیا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' رونیا نے کہا۔ ''لیکن تم اپنا پورا خیال رکھو گی۔ وہاں جا کر خود سے کوئی بے پروائی نہیں دکھاؤ گی؟''

''بالکل بھی نہیں۔''

''منشیات سے دور رہو گی اور لڑکوں سے بھی ہوشیار......''

''او کے مام۔'' سونیا اس کی بات کاٹ کر بولی اور ہنس دی۔ جب رونیا اس سے اس طرح پیش آتی تو وہ اسے مام کہتی تھی۔ رونیا نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ عمر میں سونیا سے دس سال بڑی تھی لیکن دلکشی میں اس سے زیادہ ہی تھی۔ سونیا بھی خوب صورت اور پھر نوجوان تھی لیکن اس کا چہرہ ستا ہوا لگتا تھا اور عام طور سے اس کی آنکھوں کے نیچے بھاری پن موجود رہتا تھا۔ وہ کسی قدر طویل قد اور چھریرے جسم والی لڑکی تھی اور اس کا پیٹ نمایاں تھا۔ وہ کھانے پینے میں احتیاط کرتی تھی مگر اس کا پیٹ اندر نہیں جاتا تھا۔ اس پیٹ کی وجہ سے اس کا جسم اوپر سے لے کر نیچے تک ایک جیسا نظر آتا اور اس کی نسوانی دلکشی نمایاں نہیں ہوتی تھی۔ بالٹی مور واشنگٹن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گرے ہاؤنڈ کی ایک بس نے چند گھنٹوں میں اسے وہاں پہنچا دیا۔ اتفاق سے یونیورسٹی بس اسٹاپ سے زیادہ دور نہیں تھی۔

سیمسٹر کا آغاز نومبر میں ہو رہا تھا اور اس وقت یہاں.... بے پناہ سردی تھی۔ بس کے گرم ماحول سے نکل کر وہ کانپ اٹھی.... بہ مشکل اپنے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اسے پہیوں پر کھینچتی ہوئی وہ یونیورسٹی کے ہاسٹل ایریا میں داخل ہوئی۔ یہاں بے شمار عمارتیں تھیں جو باہر سے آنے والے طالب علموں کی رہائش کے لیے مخصوص تھیں۔ داخلے کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے کاغذات کے ساتھ ہاسٹل میں اس کی رہائش کے لیے مخصوص کمرے کی چابی بھی بھیجی گئی تھی۔ اب چابی کے لیے اسے الگ سے کسی دفتر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ عمارتوں کے درمیان حیران پریشان کھڑی تھی کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس عمارت میں جانا ہے؟ یہاں ساری عمارتیں ایک جیسی تھیں۔ ایک جیسا سرخ رنگ، ایک جیسا ڈیزائن اور ایک جیسی کھڑکیاں۔ اس نے دو تین لڑکے لڑکیوں سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر گزر گئے۔ سونیا خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد اپنے کمرے تک پہنچ جائے اور اس سردی سے نجات مل جائے جو دن میں بھی اس کے رگ وپے میں گھسی جا رہی تھی۔ اچانک کسی نے اس کے پاس آکر کہا۔

''تم نئی ہو؟''

سونیا نے چونک کر دیکھا۔ یہ کسی قدر چینی نقوش والی نوجوان اور دلکش لڑکی تھی۔ اس نے اپنے کسی قدر بھاری جسم پر ٹائٹ جینز اور موٹا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ اس لباس میں اس کا جسم نمایاں تھا۔ ''ہاں مجھے اپنے ہاسٹل کی تلاش ہے۔''

لڑکی نے اس کے ہاتھ میں موجود لیٹر پر پتا دیکھا اور ہنسی۔ ''تم بالکل ٹھیک جگہ کھڑی ہو، یہی عمارت ہے۔''

لڑکی نے سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا گیٹ فولادی سلاخوں سے بنا ہوا تھا اور اوپر پرانے طرز کا لالٹین جیسا لیمپ تھا۔ اس میں طاقتور مرکری بلب لگا ہوا تھا۔ سونیا نے پلٹ کر لڑکی کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ پوری سڑک پر کہیں نہیں تھی۔ سونیا حیران ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کہاں چلی گئی؟ بہرحال اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ سوٹ کیس کھینچتی ہوئی عمارت میں آئی اور گراؤنڈ فلور پر آکر اس نے لفٹ کا بٹن دبایا مگر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ کئی بار دبانے پر اسے یقین ہو گیا کہ لفٹ خراب یا کسی وجہ سے بند ہے۔

اتنے میں اوپر سے ایک ٹولہ نیچے آیا۔ لڑکا چھوٹے قد کا ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ سانولی رنگت والی لڑکی تھی۔ دوسرا لڑکا جو کسی قدر پیچھے تھا، وہ خاصا ہینڈسم اور

خوش شکل تھا۔ وہ سب اسے دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ لڑکے دونوں سفید فام تھے اور لڑکی انڈین لگ رہی تھی۔ سونا کی یہ سوچ کر حالت خراب ہونے لگی کہ اسے بھاری سوٹ کیس تیسری منزل تک لے جانا ہوگا جہاں اس کا کمرا تھا مگر جانا تو تھا۔ وہ بادلِ ناخواستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور ایک ایک سیڑھی پر سوٹ کیس کھینچ کر اوپر جانے لگی تھی کہ اچانک کسی نے اس کا سوٹ کیس اچک کر اٹھایا اور تیزی سے اوپر بڑھ گیا۔ وہ ذرا آگے جا کر رکا۔ یہ وہی خوش شکل لڑکا تھا۔ سونا اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے معذرت کی۔ ''سوری، میں ذرا شوخ ہوگیا تھا۔ تمہیں مشکل ہو رہی تھی اس لیے میں نے سوٹ کیس اٹھالیا...... اب آجاؤ۔'' اس نے بدستور سونا کو رکے پا کر کہا تو وہ جھینپ کر آگے بڑھی۔ تیسرے فلور پر آ کر اس نے لڑکے کا شکریہ ادا کیا۔

''مجھے واقعی مشکل ہو رہی تھی۔''

''اسی لیے میں واپس آیا۔ میرا نام مارکس ہے۔''

''سونا۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔ مارکس نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور واپس چلا گیا۔ سونا سوٹ کیس گھسیٹ کر کمرے تک لائی اور لاک کھول کر اندر آئی۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور اسے کہیں روشنی کا سوئچ اور گرمائش کے لیے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ کمرے میں ایک درمیانے سائز کا بستر تھا۔ ایک طرف الماری تھی جس کے دروازے پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ تین الگ الگ پٹ والی کھڑکیاں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں اور ان کے خلا والے حصے میں چھوٹا سا فکس صوفہ تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ بستر کے ساتھ پائپوں کی جالی لگی تھی۔ سونا سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کا سر بھی چکرا رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور اس میں سے گولیوں کی ایک شیشی نکال کر اس سے دو گولیاں لے کر بنا پانی کے نگل لیں۔ پھر اس نے سوٹ کیس سے اونی شال نکالی اور اسے اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ وہ حیران تھی کہ یہاں بجلی نہیں تھی اور اس سردی میں گرمائش کا نظام بھی نہیں تھا۔ وہ یہاں کیسے رہے گی؟ دوا اثر کرنے لگی اور اس کا ذہن پرسکون ہوتا چلا گیا۔ اچانک دروازہ کھلا اور وہی چینی نقوش والی لڑکی اندر آئی۔

''اندھیرے اور اتنی سردی میں بیٹھی ہو؟''

''یہاں لائٹ اور گرمائش کا نظام نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔'' اس نے دروازے کے ساتھ ستون پر ہاتھ مارا اور بٹن دباتے ہی کمرے میں روشنی ہو گئی۔ پھر وہ بیڈ کے برابر میں لگے فولادی پائپوں کی طرف آئی اور اس نے ان کے پیچھے سے ہتھوڑی نکال کر اس کے وال پر ماری تو فوراً اس سے گرم بھاپ برآمد ہونے لگی۔ ''چند منٹ میں تم کو لگے گا کہ کسی ٹروپیکل علاقے میں ہو۔''

''میں سونا ہوں۔''

''ماریا۔'' لڑکی نے اس سے ہاتھ ملایا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہاں سونا کے داخلے کے کاغذات رکھے تھے۔ اس نے اٹھا کر دیکھے اور بولی۔ ''تم ہمارے شعبے میں آئی ہو؟''

''تم بھی اسی شعبے میں ہو؟''

''ہاں، صرف میں نہیں میرے ساتھی بھی ہیں۔'' ماریا نے کہا اور دوا کی شیشی اٹھائی تھی کہ سونا نے بے تاب ہو کر کہا۔

''پلیز! یہ ذاتی چیز ہے۔''

مگر ماریا نے دیکھ لیا تھا، وہ مسکرائی۔ ''پریشان مت ہو، بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہ دوا استعمال کرتے ہیں۔ منشیات اور جنس کی وجہ سے انہیں ذہنی سکون کے لیے استعمال کرنا پڑتی ہے۔''

''میرے ساتھ مسئلہ دوسرا ہے۔'' سونا نے آہستہ سے کہا۔

''تم نئی آئی ہو کیا خیال ہے ہمارے گروپ میں شامل ہوگی؟ اتفاق سے ہم سب اسی فلور پر رہتے ہیں سوائے مارکس کے۔''

''مارکس تمہارے گروپ میں ہے؟''

''بالکل۔'' ماریا کھڑی ہوگئی اور ایک منٹ بعد سونا اس کے ساتھ عمارت کے برابر والے حصے میں آئی۔ وہ اسے اس کے کمرے کے بالکل سامنے والے کمرے میں لائی جو بہت سجا ہوا تھا۔ یہاں لیدر کے صوفے تھے۔ دیواروں پر سرخ پردے لہرا رہے تھے اور جابجا مومی شمعیں روشن تھیں۔ کھڑکی کے ساتھ اندر کی طرف چھوٹے چھوٹے گملے رکھے تھے جن میں عنابی پتیوں اور باریک ڈنڈیوں والا کوئی چھوٹا جھاڑی نما پودا لگا ہوا تھا۔ وہاں وہی چھوٹے قد والا لڑکا تھا اور اس کے ساتھ انڈین نقوش والی لڑکی بھی تھی۔ ماریا نے تعارف کرایا۔ ''یہ بیگل ہے اور یہ نتاشا ہے۔ مارکس سے تم واقف ہو۔ دوستو! یہ سونا ہے۔ ہمارے شعبے میں آئی ہے اور یہ اس کا پہلا سیمسٹر ہے۔''

''واقعی تم کو پراسرار ماضی سے دلچسپی ہے؟'' بیگل نے اچھل کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔ نتاشا نے سونا کو بھی ایک بوتل تھمادی۔ وہ ایک طرف ٹک گئی۔

''کیا تمہیں نہیں ہے؟''

بیگل نے جواب میں صرف شانے اچکائے۔ نتاشا بولی۔ ''مجھے ہے کیونکہ دنیا میں سب سے پراسرار ماضی اور سب سے پراسرار رسومات میرے ملک انڈیا میں پائی جاتی ہیں۔''

''لوگ مصر کو سب سے پراسرار کہتے ہیں۔''

''مصر کو اس لیے پراسرار کہتے ہیں کہ اس کا ماضی چھپا ہوا ہے لیکن میرے ملک میں آج بھی وہ سب کچھ ہوتا ہے جسے لوگ جادو کہتے ہیں۔''

''کیا تمہیں ان چیزوں سے دلچسپی ہے؟'' ماریا نے پوچھا۔

''صرف ڈگری کی حد تک۔'' سونیا نے کہا۔ ''ویسے ہمیں صرف یہی تو نہیں پڑھایا جائے گا؟''

''ہاں لیکن سب سے دلچسپ حصہ یہی ہے۔''

مگر اگلے دن جب وہ پراسرار تاریخ کی پروفیسر گلوریا ریناٹ کی کلاس میں پہنچی تو وہاں سوائے مارکس کے ان تینوں میں سے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ مارکس کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ مسکرایا تھا مگر لیکچر جاری ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکا۔ پروفیسر اتفاق سے قدیم مذاہب کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈال رہی تھی جو جادو ٹونے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ قدیم وسطی امریکی تہذیب کے بارے میں لیکچر دے رہی تھی۔ مارکس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا۔ ''ویلکم۔'' سونیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے جواباً اپنی نوٹ بک میں لکھا۔ ''تھینک یو۔''

لیکن شام کو جب وہ اسکائپ پر رونیا سے بات کر رہی تھی تو اس نے ان چاروں کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ رونیا اسے بہت محتاط رہنے کا کہہ رہی تھی۔ ''اس دنیا میں ایسے افراد کی کوئی کمی نہیں ہے جو سیدھے اور معصوم لوگوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔''

''میں نہ سیدھی ہوں اور نہ معصوم۔'' سونیا نے کہا۔

''تمہارا کمرا زیادہ اچھا نہیں ہے۔'' رونیا نے موضوع بدل دیا۔ ''خاص طور سے وال پیپر بہت فضول لگ رہا ہے۔''

''یونیورسٹی کی طرف سے لگایا گیا ہے۔'' سونیا نے کہا تو اسے بیگل کے کمرے کا خیال آیا۔ وہ تو بہت اچھے انداز میں ڈیکوریٹ تھا۔ وہ صوفے پر تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو اسے بیگل کھڑکی میں نظر آیا، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سونیا نے غیر محسوس انداز میں پردہ آگے کر دیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''تم کہہ کر اسے بدلوا لو۔''

''میں بات کروں گی۔'' سونیا نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ اسے بھی گہرے نیلے سرمئی رنگ کا ابھری لائنوں والا وال پیپر اچھا نہیں لگا تھا جو دیوار کے تین فٹ اوپر سے چھت تک لگا ہوا تھا۔ تین فٹ تک دیوار پر میرون کلر تھا۔ رونیا سے بات کر کے اسے خیال آیا کہ اس نے اب تک اپنے کپڑے اور سامان الماری میں نہیں لگایا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا اور کپڑے بستر پر ڈھیر کرنے لگی۔ وہ زیادہ لباس نہیں لائی تھی۔ البتہ رونیا نے اسے رقم دی تھی کہ وہ اس سے اپنے لیے چند نئے اور اچھے جوڑے خرید لے۔ وہ الماری کی طرف بڑھی تھی کہ اس کا ہینڈل ہلا۔ سونیا رک گئی۔ اس نے خود سے پوچھا کہ ہینڈل سچ مچ ہلا تھا یا اسے وہم ہوا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے الماری کا دروازہ کھولا تو اندر ہینگر پر ایک سرخ فراک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کا اوپری حصہ ڈوریوں پر مشتمل تھا جو شانے پر آتیں۔ سونیا نے آج تک ایسا لباس نہیں پہنا تھا کیونکہ یہ اس کی جسامت پر سوٹ نہیں کرتا تھا۔ شاید یہ یہاں پہلے رہنے والی لڑکی کا تھا۔ اس نے سوٹ ہٹا دیا تو اسے نیچے ایک چھوٹا... فوٹو فریم دکھائی دیا۔ اس نے اٹھایا۔ اس میں ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی۔ اس نے فوٹو فریم پلٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ''دانلا'' لکھا تھا۔

کیا یہ اس لڑکی کا نام ہے؟ اس نے سوچا اور فوٹو فریم سامنے دیوار پر بنے چھوٹے سے ریک پر رکھ دیا۔ رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے سردی کا احساس ہوا اور اس نے ہتھوڑی اٹھا کر فولادی وال پر ماری تو فوراً اس سے بھاپ نکلنے لگی۔ مگر ساتھ ہی اسے لگا جیسے کوئی لڑکی چلائی ہو۔ آواز مدھم تھی۔ البتہ کچھ دیر بعد آنے والی آواز واضح تھی اور اس کے ساتھ ایک مردانہ آواز بھی تھی۔ آواز نزدیک سے آرہی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو اسے بیگل کے کمرے کی کھڑکیاں روشن نظر آئیں مگر ان پر پردے تھے۔ دونوں کھڑکیوں کے درمیان بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ نسوانی چیخ زیادہ بلند تھی اور اس میں کرب نمایاں تھا۔ سونیا کو اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی، یہ معاملہ کچھ اور تھا۔ اس نے جیکٹ پہنی اور باہر آگئی۔ وہ گھوم کر عمارت کے دوسرے حصے میں آئی اور بیگل کے کمرے تک پہنچی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ اس نے پہلے واپسی کا سوچا مگر پھر ہمت کر کے دستک دی تو دروازہ ذرا سا کھل گیا۔ اندر بہت زیادہ موم بتیاں روشن تھیں۔ اچانک ہی بیگل جھری میں نمودار ہوا اور اس نے پوچھا۔

''کیا ہے؟''

''وہ...... آوازیں؟'' سونیا نے گھبرا کر کہا۔

''سوری، اب میں خیال رکھوں گا۔'' اس نے کہا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد اندر سے تیز میوزک کی آواز آنے لگی۔ سونیا نے گہری سانس لی اور واپس پلٹ آئی۔

اگلے دن ماریا اس کے ساتھ کیفے ٹیریا میں ناشتے کی میز پر تھی۔

اس نے اچانک پوچھا۔ ''تم کیا سمجھ کر آئی تھیں؟''
''تو اندر تم تھیں؟''
''ہاں مگر بیگل میرے پیروں کا مساج کر رہا تھا۔ سردی میں بہت تکلیف ہو جاتی ہے۔ اصل میں بچپن میں مجھے دونوں پیروں میں بہت بری چوٹ لگی تھی، اب بھی سردی میں ابھر آتی ہے۔ بیگل کے مساج سے مجھے بہت فرق پڑا ہے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اس سے مساج کراتی ہوں تو دو تین دن سکون سے گزر جاتے ہیں۔''
''وہ اس کام کا ماہر ہے؟''
''وہ نہ جانے کن کن کاموں کا ماہر ہے۔'' ماریا فخر سے بولی۔ ''وہ خاص چائے بناتا ہے جو آدمی کو اسمارٹ بناتی ہے۔ وہ ایسا فیس ماسک تیار کرتا ہے کہ ایک بار کے استعمال سے زمین آسمان کا فرق آجاتا ہے۔''
ماریا اور نتاشا دونوں کی جسامت کا تناسب بہترین تھا اور ان کے چہرے کی جلد یوں نرم ملائم تھی جیسے کسی بچے کی ہوتی ہے۔ ماریا نے تصدیق کی۔ ''ہم بیگل کی بنائی چائے استعمال کرتے ہیں۔ پہلے میں بہت اوور ویٹ تھی۔''
ماریا نے اسے موبائل میں اپنی پرانی تصویریں دکھائیں۔ وہ واقعی ان میں بہت موٹی تھی اور اب اس نے اپنا وزن خاصا کم کر لیا تھا۔ ''تم واقعی اسمارٹ ہو گئی ہو۔''
''یہ بیگل کی چائے کا کمال ہے۔'' ماریا نے ترغیب دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم ٹرائی کر سکتی ہو۔''
وہ ہچکچائی۔ ''میں سوچوں گی۔''
اس رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے اس لباس کا خیال آیا جو الماری میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر لباس نکالا اور پھر اسے پہن کر دیکھا مگر بڑھے ہوئے پیٹ اور کمر کے ساتھ یہ اس پر عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے فراک اتار کر اپنا نائٹ پاجامہ اور شرٹ پہن لی۔ اسے ماریا کی بات یاد آئی اور وہ بیگل کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ نزدیک آکر اس کے اندر ہچکچاہٹ آنے لگی۔ وہ واپس جانے کے ارادے سے پلٹی تھی کہ اپنے بالکل سامنے ایک سفید چہرہ اور اس پر سیاہ ترین آنکھیں دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی اور ایک منٹ بعد وہ بیگل کے کمرے میں بیٹھی خود پر قابو پا رہی تھی۔ اس نے نتاشا کو دیکھا تھا جس نے چہرے پر بالکل سفید کسی چیز کا بنا ہوا موٹا لیپ کیا ہوا تھا۔ ایسا ہی لیپ بیگل اور ماریا کے چہرے پر بھی تھا۔ وہ سرخ شراب پی رہے تھے۔ خود پر قابو پانے کے بعد سونا نے پوچھا۔
''یہ وہی ماسک ہے؟''
''ہاں، وہی ماسک ہے۔''
چند منٹ بعد سونا بھی ماسک لگائے ہوئے ان کے ساتھ سرخ شراب سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور اس نے ایسے ذائقے والی شراب آج تک نہیں پی تھی۔ یہ ذائقے میں تیز نہیں تھی مگر اس نے ایک ہی پیگ میں سونا کا دماغ اڑا دیا۔ وہ ہنس رہی تھی اور بول رہی تھی مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیوں ہنس رہی ہے اور کیا بول رہی ہے۔ باقی سب نارمل تھے مگر ہنسنے بولنے میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کب وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں آئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو اس کا ذہن صاف لیکن چہرے پر ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ باہر روشنی ہو رہی تھی، صبح ہو چکی تھی۔ وہ اٹھی تو اسے سامنے آئینے میں اپنا چہرہ سرخ زخم نما دھبوں سے بھرا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ جھپٹ کر آئینے کے سامنے آئی۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا بس یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی کھال چہرے سے الگ ہو گئی ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رخسار سے پکڑ کر کھال کھینچی تو وہ اترتی چلی گئی۔ مگر اس کے نیچے اسے صاف ستھری جلد دکھائی دی۔ پھر وہ جلدی جلدی نوچ کر یہ کھال نما ماسک اتارنے لگی۔ ایک منٹ میں اس نے سب اتار دیا اور اب آئینے میں اس کا بہت صاف، نرم اور دمکتا ہوا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے کا بھاری پن بھی غائب تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ آئینے نے کبھی اسے اتنا خوب صورت نہیں دکھایا تھا۔ واش روم میں اس کا سامنا ماریا اور نتاشا سے ہوا تو وہ بھی حیران رہ گئیں۔
''ماسک نے تم پر کتنا اثر کیا ہے۔''
''بیگل نے کمال کر دیا ہے۔'' سونا نے دل سے کہا۔ ''میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتی تھی۔''
''تب ہربل ٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
سونا نے اکثر انہیں یہ چائے جیسی رنگت والی چیز پیتے دیکھا تھا اور اس نے سوچا کہ آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شدید برف باری کی وجہ سے یونیورسٹی ایک ہفتے کے لیے بند کر دی گئی تھی۔ یہ ایک ہفتہ سونا نے ان تینوں کے ساتھ گزارا تھا۔ مارکس ہاسٹل میں نہیں رہتا تھا بلکہ اس کی رہائش بالٹی مور کے مضافات میں کہیں تھی۔ اس لیے وہ اس ہفتے ان کے پاس نہیں آیا۔ سونا باقاعدگی سے ہربل ٹی پی رہی تھی اور اس کا ذائقہ بھی چائے جیسا ہی تھا۔ اس کا حیرت انگیز اثر ہوا تھا اور اس کا پیٹ اندر چلا گیا تھا۔ کمر پتلی ہو گئی تھی اور اب وہ چست لباس پہنتی تو اس کی جسامت نمایاں ہوتی۔
ایک ہفتے بعد جب یونیورسٹی کھلی اور وہ جانے کے لیے نکلنے

لگے تو بیگل نے کہا۔ ''آج میں تم سب کو ایک نئے راستے سے باہر لے جاؤں گا۔''

''کس راستے سے؟''

''بس تم دیکھنا۔''

وہ انہیں تہ خانے میں لے آیا۔ یہاں گرمائش کے لیے بوائلرز لگے ہوئے تھے جو نہ صرف عمارت کو گرم کرتے تھے بلکہ واش رومز میں گرم پانی بھی مہیا کرتے تھے۔ وہ ان بڑے بڑے بوائلرز کے درمیان سے گزرنے لگے۔ بوائلرز میں جمع ہونے والا اضافی پریشر بھاپ کے ساتھ خارج ہو رہا تھا اس لیے وہاں فضا دھند آلود تھی اور چند قدم کے فاصلے پر بھی مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ وہ سب آگے تھے اور سونا پیچھے تھی۔ ایک جگہ وہ رکی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے پکارا ہو۔ آواز نسوانی تھی اور اس نے واضح طور پر اس کا نام لیا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلی تھی۔ اس نے گھبرا کر بیگل کو آواز دی۔ پھر ماریا اور نتاشا کو پکارا۔ ''تم سب کہاں ہو...... جواب کیوں نہیں دیتے؟''

مگر وہاں خاموشی تھی۔ کوئی جواب نہیں آیا تو سونا آگے بھاگی۔ یہاں ہر طرف بوائلرز سے نکلنے والی بھاپ کی دھند تھی۔ اچانک وہ ایک چھوٹی راہداری میں داخل ہوئی اس کے سامنے دیوار تھی اور دائیں طرف سرخ رنگ کا دروازہ تھا۔ سرگوشی نما آواز نے اسے اندر آنے کو کہا اور وہ پلٹ کر بھاگی۔ راستہ اسی طرف تھا اور وہ تینوں اسی سمت جا سکتے تھے۔ بوائلرز کے درمیان سے گزر کر وہ ایک طویل راہداری میں آئی جس میں دیوار کے ساتھ گرم پانی اور ہوا لے جانے والے پائپ گزر رہے تھے۔ اس نے پھر ان تینوں کو آواز دی۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ رک گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر چلے جائیں۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ خاص طور سے جب کسی نے اس کا نام پکارا تھا اور جب اسے سرخ دروازے سے اندر آنے کو کہا تب اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے راہداری کے دوسرے سرے کی طرف بھاگ رہی تھی اور جیسے ہی نزدیک پہنچی، دوسری طرف سے کوئی اچانک سامنے آیا۔ سونا کی چیخ نکل گئی۔ آنے والی نتاشا تھی۔ اس کے پیچھے ماریا اور بیگل تھے، وہ تینوں ہنس رہے تھے۔ پھر اس کا غصہ دیکھ کر وہ خاموش ہوئے اور اس سے معذرت کرنے لگے۔ بیگل انہیں تہ خانے والے راستے سے باہر لے آیا... سونا کا موڈ باہر آتے ہوئے بہتر ہو گیا مگر اس نے خبردار کیا۔

''آئندہ میرے ساتھ اس قسم کا مذاق مت کرنا۔''

سونا نے ان سے کہا نہیں لیکن اس کے خیال میں سرگوشی نما آواز بھی وہی لوگ نکال کر اسے ڈرا رہے تھے۔ طوفان کے بعد ہر طرف برف کے ڈھیر تھے اور اس کی صفائی کی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کیفے ٹیریا طلبا سے بھرا ہوا تھا اور ایک ہفتے کی چھٹی کے بعد بھی اکثر طلبا کا کلاسوں میں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ مارکس ایک طرف بیٹھا تھا۔ اس نے سونا کو دیکھا تو جیسے سحر زدہ رہ گیا۔ ''سونا! تم بالکل بدل گئی ہو۔''

وہ شرمائی۔ وہ سب اسی میز پر آ گئے۔ سونا نے کہا۔

''یہ سب بیگل کے ماسک اور ہربل ٹی کا کمال ہے۔''

''نہیں، یہ تمہاری اصل خوب صورتی ہے جو اب ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔'' مارکس نے اصرار کیا۔ ''آج رات ڈانس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

سونا مان گئی تو سب خوش نظر آنے لگے۔ ان کا بیشتر وقت کیفے ٹیریا اور پھر لاؤنج میں گزرا۔ انہوں نے صرف پروفیسر گلوریا کی کلاس لی تھی۔ آج ان کا موضوع قدیم تہذیبوں میں روح کا خیال تھا۔ سونا بے خیالی میں بیٹھی تھی اور لیکچر اس کے سر سے گزر رہا تھا لیکن کچھ فاصلے پر ماریا... تن دہی سے نوٹس لے رہی تھی۔ اس کی اورنج کلر کی نوٹ بک کھلی ہوئی تھی اور اس کا پین مسلسل چل رہا تھا۔ سونا نے اکثر یہ نوٹ بک اس کے پاس دیکھی تھی۔ وہ کلاس سے نکل رہی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔ ''سونا...... یہ تم ہو؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے شعبے کی کیرن تھی۔ وہ سونا کے ہاسٹل میں مقیم تھی۔ کیرن سنہری بالوں والی خوب صورت لڑکی تھی۔ سونا کی اس سے اچھی ہیلو ہائے تھی مگر ان کے درمیان کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ حیرت زدہ سی اس کے پاس آئی۔ ''تم بالکل بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔''

''کیا تبدیلی آئی ہے مجھ میں؟''

''تمہارا چہرہ بہت پیارا ہو رہا ہے۔ تم نے اپنا پیٹ اور وزن بھی کم کر لیا ہے۔''

''ہاں، یہ سچ ہے۔''

کیرن نے اس بار سرگوشی میں کہا۔ ''کیا تم ان لوگوں سے زیادہ مل رہی ہو؟'' اس کا اشارہ ذرا آگے موجود بیگل، نتاشا اور ماریا کی طرف تھا۔

''ہاں، یہ میرے اچھے دوست ہیں۔''

''یہ تمہارے دوست نہیں ہیں۔'' کیرن بدستور سرگوشی میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''ان سے بہت ہوشیار رہنا۔''

سونا کو غصہ آ گیا۔ ''ایک منٹ کیرن...... تم کیا مجھے بہکانے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے کمرے میں پہلے رہنے والی لڑکی وائلا کے بارے میں بتایا؟''

''نہیں۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''کیا ہوا تھا اسے؟''

''وہ ان کے ساتھ ہوتی تھی اور اچانک غائب ہو گئی۔''

''غائب ہو گئی...... کیا مطلب؟''

کیرن نے شانے اچکائے۔ ''مطلب یہ کہ غائب ہو گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ مجھے یقین ہے اسے غائب کرنے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے۔ تم اچھی لڑکی ہو، اس لیے تم کو خبردار کر رہی ہوں۔''

کیرن اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔ سونا اس کی باتوں سے الجھن میں پڑ گئی تھی۔ اچانک ماریا کی آواز آئی۔ ''یہ کیا کہہ رہی تھی؟''

سونا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کچھ نہیں۔''

ماریا اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔ ''اس کی باتوں پر زیادہ دھیان مت دینا۔ کچھ عرصے پہلے تک یہ مارکس کے چکر میں تھی۔''

سونا نے گہری سانس لی اور دل میں سوچا۔ تو یہ بات ہے، پھر ماریا سے بولی۔ ''تم فکر مت کرو، میں بچی نہیں ہوں جسے کوئی بہکا دے۔''

''رات کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں نے ابھی سوچا نہیں ہے۔''

''میں آؤں گی تمہارے پاس۔''

سونا سوچ رہی تھی کہ وہ کیا پہنے کیونکہ اسے اپنا ایک سوٹ بھی اس قابل نہیں لگ رہا تھا کہ اسے پہن کر کہیں جا سکے۔ ابھی وہ الجھ رہی تھی کہ ماریا آ گئی۔ اس نے سونا کے کپڑے دیکھے اور اس سے اتفاق کیا۔ ''ان میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے۔ میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''نزدیک ایک بہت اچھا گارمنٹ اسٹور ہے۔''

وہ دونوں گارمنٹ اسٹور آئے۔ یہاں ماریا نے اسے جدید فیشن کے کئی لباس دلوائے۔ اس نے چیک کر کے دیکھے اور ایک لباس جو جینز اور بلاؤز پر مشتمل تھا اسے بہت پسند آیا۔ اس نے یہی پہن کر جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ماریا کے ساتھ نائٹ کلب پہنچی تو وہاں ہیگل، مارکس اور نتاشا پہلے سے موجود تھے۔ وہ ایک گول کھڑی ہونے والی میز کے گرد تھے۔ ہیگل نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''ہے...... تم آج کی چائے بھول گئی تھیں۔''

''سوری، میرے ذہن میں نہیں رہا۔'' سونا نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں، میں لے آیا ہوں۔'' ہیگل بولا اور واٹر ڈسپنسر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک کاغذی گلاس اٹھایا اور اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکال کر اس میں ڈالی اور پھر اس میں گرم پانی بھرا۔ وہ گلاس لے کر سونا کے پاس آیا۔ ''یہ رہی تمہاری آج کی چائے۔''

سونا نے دیکھا کہ آج اس کا رنگ تیز تھا۔ اس نے سپ لیا تو اسے ذائقہ بھی تیز لگا۔ آخری گھونٹ لیتے ہی اس کا سر چکرانے لگا مگر یہ چکر مزے کے تھے۔ وہ چاروں اسے غور سے دیکھ رہے تھے اور جب سونا ہنسی تو وہ بھی مسکرانے لگے۔ مارکس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''ڈانس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

سونا بلا جھجک اس کی بانہوں میں آ گئی۔ وہ ڈانس کی شوقین نہیں تھی مگر آج مارکس کے ساتھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ کچھ دیر ہیگل کے ساتھ بھی رقص کیا مگر زیادہ وقت وہ مارکس کے ساتھ رہی۔ درمیان میں جام بھی چلتے رہے۔ مارکس اس کے لیے تیز شاٹس لا رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد وہ نائٹ کلب سے نکلے تو سونا سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا، مارکس اسے سہارا دیے ہوئے تھا اور پھر وہی اسے اس کے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ مگر چھوڑ کے جانے کے بجائے وہ بھی اندر آ گیا۔ سونا بستر پر گری تو اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ بس اسے ایک احساس تھا کہ مارکس بستر پر اس کے ساتھ ہے۔ درمیان میں اسے تکلیف کا احساس بھی تھا مگر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ وہ ہوش میں آ جاتی۔

اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی اور وہ کمرے میں اکیلی تھی اور اب اسے جسم کے مختلف حصوں میں ہلکی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے چادر ہٹا کر دیکھا۔ اس کے جسم کے نچلے حصوں پر عجیب سے زخموں کے نشانات تھے۔ ان میں سرخی تھی مگر یہ کچھ نہیں تھے۔ وہ ان زخموں کے بارے میں سوچتی ہوئی واش روم تک آئی تو اسے اندرونی حصے میں ہیگل، نتاشا اور ماریا کی دھیمی آوازیں سنائی دیں مگر ان کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سونا اچانک ان کے سامنے آئی تو وہ خاموش ہو گئے۔ ماریا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ پھر ہیگل سنبھلا اور معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔ نتاشا اور ماریا نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مگر

ماریا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ زبردستی ہنس رہی ہے۔ نتاشا نے پوچھا۔ ''رات کیسی گزری؟''

وہ جھینپ گئی۔ ''صبح سے یاد نہیں ہے۔ مجھے تو ہوش نہیں تھا، میں نے زیادہ ہی پی لی تھی۔''

''ہاں تمہیں ہوش نہیں ہے۔'' ماریا کہتی ہوئی اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔ سونا نے حیرت سے کہا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟''

''اسے چھوڑو۔'' بینگل نے کہا۔ ''اگر تم آج رات کو آئیں تو میں تمہیں اسپیشل چائے پلاؤں گا۔''

''تم جو پلاتے ہو، وہ اسپیشل ہی ہوتی ہے۔''

''نہیں، اس سے بھی زیادہ اسپیشل ہو گی۔''

سونا تیار ہو کر یونیورسٹی آئی۔ آج اس نے تمام کلاسز لینے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ چھٹیوں کی تلافی بھی کرنا تھی۔ آخری کلاس لے کر وہ نکلی تو تھک چکی تھی۔ اس نے ہاسٹل جانے اور آرام کرنے کا سوچا اور کسی سے ملے بغیر نکل آئی۔ جب وہ عمارت کے پاس پہنچی تو اسے لوگوں کے چلانے کی آواز آئی۔ کوئی نائن ون ون کو کال کر رہا تھا۔ ہاسٹل کی دونوں عمارتوں کے درمیان والے صحن میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ سونا اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی آگے آئی تو اسے سنہری بالوں کی جھلک دکھائی دی۔ وہ کیرن تھی۔ اس کے سر کے نیچے خون کا تالاب پھیل رہا تھا۔ سونا نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اس کے باوجود اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ ''کیرن۔''

''بے چاری اوپر سے گری ہے۔'' ایک لڑکے نے اسے مطلع کیا۔

اتنے میں اندر سے ماریا برآمد ہوئی۔ اس نے کیرن کی لاش دیکھی اور اس کا چہرہ ست گیا۔ پھر وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سونا اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اس نے اسے دوسرے فلور پر ا...... روک لیا۔ ''میری بات سنو۔''

''کیا بات ہے؟'' ماریا وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

''یہ وائلا کون تھی؟''

''وہ لڑکی جو تم سے پہلے اس کمرے میں رہتی تھی۔''

''وہ اب کہاں ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''وہ تمہارے ساتھ ہوتی تھی جیسے میں ہوتی ہوں۔''

ماریا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز اب مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔''

سونا پلٹ کر بینگل کے کمرے میں آئی۔ وہاں مارکس اور نتاشا بھی تھے۔ سونا نے جاتے ہی پوچھا۔ ''یہ وائلا کون تھی؟''

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے سونا سے اس سوال کی توقع نہ ہو پھر مارکس نے اعتراف کے انداز میں کہا۔ ''وائلا...... ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔''

''کس حیثیت سے؟''

نتاشا اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ''کیا بات ہے، تم پریشان ہو؟''

''کیا تم لوگ جانتے ہو کہ کیرن مر گئی ہے، وہ اوپر سے گری ہے۔''

''ہاں، جانتے ہیں۔'' بینگل سکون سے بولا۔ ''لیکن وہ مر چکی ہے اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔''

سونا نے ان لوگوں کو دیکھا اور پلٹ کر وہاں سے نکل آئی۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ کچھ غلط ہے۔ اس کے ساتھ اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔ مگر کیا غلط ہو رہا ہے، وہ اس بارے میں نہیں جانتی تھی۔ پولیس اور ایمبولینس آ گئی تھی۔ کیرن کی لاش اٹھانے سے پہلے اس کا جائزہ لیا گیا اور تصویریں اتاری گئیں۔ شام تک پولیس نے اسے خودکشی قرار دے دیا تھا کیونکہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملی تھی جس سے پتا چلتا کہ کیرن کو اوپر سے دھکا دیا گیا ہے یا اسے زبردستی پھینکا گیا ہے۔ اوپر جانے والا دروازہ باہر سے بند تھا اور ایسا صرف کیرن کر سکتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے خودکشی قرار دیا گیا۔ اگلے دن اس نے دو کلاسز لیں اور پھر ماریا کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان دونوں کلاسوں میں نہیں تھی جبکہ وہ باقاعدگی سے کلاس لینے والی طالبہ تھی۔ وہ اسے لاؤنج میں ملی۔ وہ ایک طرف اکیلی بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر پریشان کن تاثرات تھے۔ سونا اس کے سامنے جا بیٹھی۔ اس نے بلاتمہید کہا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''کیا سب کیا ہے؟''

''تمہارا رویہ......'' سونا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''جب سے مارکس میری طرف آیا ہے، تب سے تم مجھ سے اکھڑی ہوئی ہو۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' ماریا طنزیہ انداز میں بولی۔

''اب بھی وقت ہے، آنکھیں کھولو۔''

''میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔''

''نہیں، کیا تم نے کیرن کے انجام......''

''ماریا۔'' مارکس کی آواز نے اسے چپ کرا دیا۔ وہ پاس کھڑا ماریا کو گھور رہا تھا۔ ''میرے ساتھ آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

ماریا ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس نے مارکس کے ساتھ جانے سے پہلے جھک کر دھیمی آواز میں سونا سے کہا۔ ''جاگ

جاؤ، اب بھی وقت ہے۔''

مارکس اسے ذرا دور ایک الگ جگہ لے گیا۔ وہ اتنی دور تھے کہ سونا ان کی آواز سننے سے قاصر تھی مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ان میں شدید قسم کی بحث جاری ہے۔ دونوں کا انداز جارحانہ تھا۔ اچانک ماریا جانے لگی اور مارکس نے اسے روکنا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر چلی گئی۔ سونا اب تک انہیں دیکھ رہی تھی۔ ماریا کے جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ ماریا کی اورنج نوٹ بک وہیں رہ گئی تھی۔ مارکس اس کی طرف آرہا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے سونا نے نوٹ بک اپنی کتابوں اور نوٹ بک کے درمیان میں کرلی کیونکہ سب جانتے تھے کہ اورنج نوٹ بک ماریا کی ہے۔ مارکس نے نزدیک آکر معذرت کی۔ ''وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے۔''

''صرف مجھ سے۔'' سونا نے تلخ لہجے میں کہا اور کھڑی ہوگئی۔

''میری بات سنو۔'' مارکس نے اسے روکنا چاہا۔

''اب اس موضوع پر میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔''

ہاسٹل واپس آکر اس نے بیگ رکھا اور ماریا کی نوٹ بک لے کر صوفے پر آگئی۔ اس نے نوٹ بک کھولی تو پہلے صفحے نے اسے چونکا دیا۔ بہ ظاہر تو ماریا نے علامتوں کے ساتھ ساتھ لیکچر اتارے ہوئے تھے مگر غور سے پڑھنے پر وہ جادوگری کے سبق ثابت ہو رہے تھے۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ ایک مرجانے والے کی روح اور شخصیت کو ایک زندہ انسان میں کیسے منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ سراسر شیطانی فعل تھا اور شیطان کو خوش کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس میں جنسیت، منشیات اور جادوگری کی مخصوص علامات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جادوگری کی علامات اس شخص کے جسم پر اور اس کی کھال پر کاٹ کر بنائی جاتی تھیں جس میں روح اور شخصیت منتقل کرنا ہوتی تھی۔ نوٹ بک میں یہ علامات بنی ہوئی تھیں۔ سونا ان کا موازنہ اپنے جسم پر بنی علامتوں سے کرنے لگی تو وہ ہوبہو نوٹ بک کی علامتوں سے مل گئی تھیں۔ سونا نے ان صفحات کی اپنے موبائل سے تصویریں لیں۔

منشیات کے لیے ایک مخصوص قدیم پودے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پودے کی تصویر بھی نوٹ بک میں اسکیچ کی گئی تھی۔ نوٹ بک کے مطابق اس پودے کی پتیوں اور باریک ڈنڈیوں کو گرم پانی میں ابال کر استعمال کیا جاتا ہے۔ کم مقدار میں یہ چائے زیادہ اثر نہیں کرتی ہے لیکن اگر مقدار بڑھا دی جائے تو یہ بہت تیز نشہ پیدا کرتی ہے۔ پودا بالکل بیگل کے کمرے میں کھڑکی پر رکھے پودوں جیسا تھا۔ یاد آیا کہ بیگل نے کلب میں اسے جو چائے دی

تھی، اس کا رنگ اور ذائقہ دونوں بہت تیز تھے۔ اسے صبح سے پہلے ہوش نہیں آیا اور اسے قطعاً علم نہیں ہوا کہ بے ہوشی میں ہے۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے گودا گیا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیرن نے اسے درست خبردار کیا تھا اور اس کا انجام کیا ہوا؟ کیا اس کی موت خودکشی تھی یا پھر اسے قتل کیا گیا تھا؟ سوچتے ہوئے اس کا سر چکرانے لگا۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی سایہ سا تیزی سے اس کے پاس سے گزرا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھی تو نزدیک ہی ماریا کھڑی تھی۔ اس نے نرمی سے اپنی نوٹ بک اس کے ہاتھ سے اچک لی۔

''یہ اچھا نہیں ہوا کہ تم نے سب دیکھ لیا ہے۔''

''یہ سب کیا ہے؟ مجھ پر کس کی شخصیت تھوپی جارہی ہے؟''

ماریا نے کارنس پر رکھا فوٹو فریم اٹھایا اور اس کے سامنے کر دیا۔ ''ذرا غور سے دیکھو۔''

''یہ دانکلا ہے۔''

ماریا نے اسے پکڑ کر آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔

''اب اس سے اپنا موازنہ کرو۔''

سونا نے دیکھا اور حیران رہ گئی۔ اس کی صورت دانکلا سے بہت زیادہ مل رہی تھی۔ اس نے ماریا کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

مگر ماریا وہاں نہیں تھی۔ وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی جا چکی تھی۔ سونا کو بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کب کمرے سے نکل گئی۔ سونا کے چکر تیز ہوگئے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے پرس سے دوا نکال کر کھائی اور کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو اس نے اسکائپ پر رونیا سے رابطہ کیا۔ اس نے پہلی بار اسے مارکس، بیگل، ماریا اور نتاشا کے بارے میں بتایا۔ اگرچہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے مگر اس نے رونیا سے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ اسے نسوانی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور بعض اوقات بہت عجیب واقعات ہوتے ہیں۔ سونا کا خیال تھا کہ اس کی بہن پریشان ہوجائے گی مگر رونیا نے اس کی بات کا خاص اثر نہیں لیا۔ اس نے سونا سے کہا۔ ''تم ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔''

''یہ ڈاکٹر کا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''تم جانتی ہو، یہ ڈاکٹر کا مسئلہ ہے۔ ماما پاپا کے بعد تمہارے ساتھ مسئلہ رہا ہے۔''

''ہاں مگر موجودہ حالات کا تعلق اس مسئلے سے نہیں ہے۔''

''ڈیئر۔'' رونیا نے نرمی سے کہا۔ ''تعلق ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر ہی کرے گا۔''

''پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''

رونیا نے ان سنی کر کے کہنا چاہا۔ ''میں ڈاکٹر کو کال.....''

سونیا نے غصے میں آ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ رونیا نے اس کے موبائل پر کال کی مگر اس نے ریسیو نہیں کی۔ ان کے ماں باپ کی موت بہ ظاہر حادثہ تھی لیکن جس رات ان کے گھر آگ لگی، اس رات سونیا کے ماں باپ میں شدید لڑائی ہوئی تھی۔ ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں اور سونیا اپنے کمرے میں دبکی ہوئی یہ آوازیں سن رہی تھی۔ پھر اسے پتا نہیں چلا کہ کب وہ سو گئی اور اس کی آنکھ دم گھٹنے سے کھلی۔ کمرے میں دھواں بھر رہا تھا اور باہر فائر بریگیڈ کا سائرن گونج رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کھولی اور مدد کے لیے چلانے لگی۔ اس پر ایک فائر فائٹر نے سیڑھی لگا کر اسے نیچے اتار لیا مگر اس دوران میں مکان پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ بعد میں پولیس نے امکان ظاہر کیا کہ آگ جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔ کیونکہ آگ گیس لیکج کی وجہ سے لگی تھی اور اوون کے تمام گیس بٹن کھلے ہوئے تھے۔

سونیا بہت دن تک خوابوں میں چونکتی رہی اور جب اسے کوئی پریشانی ہوتی تو اسے چکر آنے لگتے تھے۔ اس وجہ سے اس کے اسکول کا ایک سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور وہ اب تک دواؤں سے علاج کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ رونیا کا اشارہ اس کے اسی مسئلے کی طرف تھا۔ سونیا نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو اسے مارکس اور نتاشا اپنے اپنے کمروں کی کھڑکی میں نظر آئے اور وہ اس کے کمرے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے پردے برابر کر دیے۔ اچانک والو سے تیز آواز کے ساتھ بھاپ نکلی اور چکنے وال پیپر پر پانی کی بوندیں نظر آنے لگیں۔ اگلی صبح اتوار تھا اور اسے سارے ہفتے کے کپڑے دھونے تھے۔ وہ تہ خانے میں لانڈری ایریا میں آئی اور واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر دھلنے کا انتظار کر رہی تھی کہ مارکس، ہیگل اور نتاشا وہاں آئے۔ ہیگل نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس نے ایک کپ سونیا کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ تمہارا ہے۔''

سونیا نے کپ لیا اور مشین کی طرف مڑی۔ ''اس میں کیا ہوتا ہے؟''

''اس میں چائے ہوتی ہے۔'' ہیگل نے مسخرے انداز میں کہا۔

''میرا مطلب ہے، تم اسے کس طریقے اور کسی چیز سے بناتے ہو؟''

مارکس آگے آیا۔ ''تم سوچو مت؟ پی لو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

سونیا جذباتی ہو گئی۔ ''یہ میرے لیے بہتر ہے؟ جب میں اسے پی کر جاگی تو میرے جسم پر ایسے نشانات تھے۔'' اس نے شرٹ ہٹا کر پیٹ پر بنا نشان دکھایا۔ ''ایسے ہی کئی نشانات میرے جسم کے دوسرے حصوں پر بھی ہیں۔''

مشین نے کپڑے دھل جانے کا بزر بجایا۔ سونیا نے اس کا خانہ کھول کر اس میں سے خشک ہو جانے والے کپڑے نکالے اور اپنی باسکٹ میں ڈال کر وہاں سے جانے لگی۔ مارکس اس کے سامنے آیا۔ ''سونیا! میری بات سنو۔ ہم تم سے محبت کرتے ہیں اور تمہاری فکر کرتے ہیں۔''

''تاکہ مجھ میں کسی کی روح اور شخصیت ڈالی جا سکے۔'' سونیا نے زہریلے لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی آئی۔ مارکس اس کے پیچھے آیا۔

''سونیا! میری بات سنو۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' وہ بولی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ مارکس بھی اندر آ گیا۔

''دیکھو، تمہیں یہ سب ماریا نے بتایا ہے لیکن تم جانتی ہو اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

''اس نے نہیں بتایا، میں نے اس کی نوٹ بک میں خود دیکھا ہے۔ جادوگری کے جو طریقے تم لوگ مجھ پر آزما رہے ہو مگر کس لیے۔'' اس نے کارنس سے وائلا کی تصویر اٹھائی۔ ''تاکہ اس کی روح اور شخصیت مجھ میں ڈال سکو۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ ماریا کے ذہن کی اختراع ہے۔ وہ اصل میں تم سے جیلس ہے کیونکہ میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی۔''

خود سونیا نے بھی یہی بات محسوس کی تھی۔ مگر اس کی نوٹ بک اور سونیا کے جسم پر بننے والے نشانات میں مماثلت تھی۔ ''تم ان نشانات کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''یہ قطعی اتفاق ہیں۔'' مارکس نے پرزور انداز میں کہا۔ ''مجھے یا کسی کو نہیں معلوم کہ یہ کیسے وجود میں آئے۔''

''اور وائلا؟''

''اس کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' مارکس نے فوٹو فریم ایک طرف پھینک دیا۔

''جھوٹ۔'' سونیا کے کانوں میں وہی نسوانی آواز گونجی۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''میرے پاس سوائے میرے جذبات کے اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' مارکس نے جواب دیا۔

''تب میں سوچوں گی۔'' سونیا نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

"پلیز سونا۔" مارکس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔
"بائے۔" اس نے دروازہ بند کردیا۔

☆☆☆

وہ پروفیسر گلوریا کے سامنے بیٹھی تھی۔ گلوریا ان صفحات کو دیکھ رہی تھی جو اس نے پرنٹ کیے تھے۔ یہ ماریا کی نوٹ بک کی تصاویر تھیں۔ سونا کا خیال تھا کہ وہ ان میں دلچسپی لے گی مگر اس کے انداز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ یوں انہیں دیکھ رہی تھی جیسے اپنے کسی شاگرد کی ٹیسٹ شیٹ دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے پرنٹس سونا کے سامنے ڈال دیے۔ "اس میں کیا چیز ہے جو تم مجھے دکھانا چاہتی ہو؟"

"یہ جادوگری کے طریقے نہیں ہیں کیا؟"

"بالکل ہیں اور میں پچاس سال سے ان کے بارے میں پڑھ رہی ہوں۔"

"تو آپ انہیں حقیقت نہیں......"

پروفیسر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں صرف ان کے سائنٹفک پہلوؤں پر غور کرتی ہوں۔ میں نے کبھی ان کے قابل عمل ہونے یا نہ ہونے پر تحقیق نہیں کی ہے۔"

"یعنی روح یا شخصیت کی منتقلی کوئی حقیقی چیز نہیں ہے؟"

"میرے خیال میں نہیں ہے۔"

"مگر کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوسکتا ہے۔"

اس نے شانے اچکائے۔ "یہ ان کی سوچ ہے۔ میرے خیال میں اگر کبھی ایسا ممکن تھا بھی تو اب نہیں ہے۔"

اگرچہ پروفیسر گلوریا نے اس کے حق میں فیصلہ دیا تھا اور بلاواسطہ اسے اطمینان دلایا تھا کہ اس میں کسی کی روح یا شخصیت منتقل نہیں ہوگی لیکن نہ جانے کیوں وہ اندر سے مطمئن نہیں ہو... پارہی تھی۔ واپسی میں اس نے ہاسٹل میں جانے کے لیے تہ خانے والا راستہ اختیار کیا۔ ایسا اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا لیکن جب وہ چونکی تو اس نے خود کو تہ خانے میں جانے والے دروازے کے سامنے پایا۔ وہ یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اسے کسی نے دروازے کی طرف دھکیل دیا اور اس نے... بے اختیار پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا جو اسے دھکا دیتا۔ شاید وہ خود ہی دروازے تک آئی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر آگئی۔ راہداری میں آتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کے آخری سرے پر کوئی سایہ تیزی سے گزرا ہو۔

وہ ڈر گئی اور اس نے واپس جانے کا سوچا مگر پھر رک گئی۔ اس نے خود سے کہا کہ اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھی اور جیسے جیسے وہ بوائلرز والے حصے کے نزدیک جارہی تھی، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔ یہیں کہیں وہ سرخ دروازہ تھا جہاں اسے آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ بعد میں سونا خود سے کہتی رہی تھی کہ سرخ دروازہ اس کا وہم تھا مگر اس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ سرخ دروازہ سچ مچ موجود ہے۔ بوائلرز آج زیادہ ہی بھاپ چھوڑ رہے تھے اور ماحول دھندآلود تھا۔ وہ رک رک کر چل رہی تھی۔ ہر چند قدم کے بعد وہ جائزہ لیتی تھی کہ آس پاس سرخ دروازہ تو نہیں ہے۔ ایک بار اس نے جائزہ لے کر قدم آگے بڑھایا تھا کہ سامنے سرخ دروازہ پاکر ششدر رہ گئی۔ اسے یقین تھا کہ کچھ دیر پہلے یہ سرخ دروازہ نہیں تھا اور اب اچانک ہی وہ کسی آسیب کی طرح نمودار ہوگیا تھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔

"اندر آؤ۔" نسوانی آواز نے سرگوشی میں کہا۔

"نہیں۔"

"میں کب سے تمہاری منتظر ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے چلا کر کہا اور پلٹ کر بھاگنے لگی تھی کہ کسی سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے چیخ نکلی۔

"آرام سے...... آرام سے۔" یونیفارم میں ملبوس بوائلر اٹینڈنٹ نے کہا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"وہ سرخ دروازہ۔" سونا نے ہانپتے ہوئے کہا اور پلٹ کر اشارہ کیا مگر وہاں اب سرخ دروازہ نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ نیلے رنگ کا بڑا سا بوائلر تھا۔

"یہاں کوئی سرخ دروازہ نہیں ہے۔"

"ہے...... میں نے خود دیکھا ہے۔ کوئی مجھے اس کے اندر بلا رہا تھا۔" سونا نے کہا اور آگے بڑھ کر بوائلر کے پیچھے جھانکا مگر وہاں سپاٹ دیوار تھی۔ اٹینڈنٹ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" سونا نے کہا اور تیز قدموں سے اوپر جانے والے راستے کی طرف بڑھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کیسے اوپر اپنے کمرے تک پہنچی اور بستر پر گر کر بے خبر ہوگئی۔ اس کی آنکھ شدید سردی سے کھلی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہتھوڑی اٹھائی تھی کہ اسی لمحے وال کے نوزل سے بھاپ خارج ہونے لگی۔ سونا کا سر چکرا رہا تھا اور اسے متلی جیسی کیفیت ہو رہی تھی۔ پھر یہ کیفیت اتنی بڑھی کہ اسے واش روم کی طرف بھاگنا پڑا اور واش بیسن پر جھکتے ہی اس کے منہ سے سیاہی مائل سیال کی بوچھاڑ ہوئی۔ اس سے بہت تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس کا دماغ خراب ہونے لگا۔ اس نے جھکتے ہوئے پھر الٹی

کی۔ تیسری بار الٹی کرنے کے بعد اس کے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کیا ایسی چیز کھائی تھی جو اتنی سیاہ اور بدبودار قے ہوئی تھی۔ اس نے صبح نارمل ناشتا کیا تھا اور دوپہر میں شیک لیا تھا۔ اس نے منہ دھویا اور کلی کر کے وہ باہر آئی۔ راستے میں اسے نتاشا اور بیگل ملے۔ بیگل نے کہا۔

''تم نے آنا چھوڑ دیا ہے۔''

''میں مصروف ہوں۔''

''لیکن چائے......''

''اب میں اس جیسی کوئی چیز نہیں پیوں گی۔'' سونیا نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بیگل اور نتاشا نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں مارکس وہاں آگیا۔

''کیا ہوا؟''

''اس نے چائے پینے سے انکار کر دیا ہے۔'' نتاشا نے کہا۔

''مجھے شبہ ہے کہ اس نے قے میں سب نکال دیا ہے۔'' بیگل نے کہا۔ ''جب ہم اندر آئے تو قے کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔''

بیگل کی اس بات پر مارکس فکر مند ہو گیا۔ ''یہ تو برا ہوا ہے۔ ساری محنت ضائع جائے گی۔''

''اسے بھی کیرن کی طرح......؟'' بیگل نے کہنا چاہا۔

''نہیں۔'' مارکس کا لہجہ سخت تھا۔ ''کیرن کی بات اور تھی۔ ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اسے کچھ دن کا وقفہ دو۔''

''اگر اس نے کسی سے کہہ دیا تو؟'' نتاشا نے سوال کیا۔

''وہ کسی سے نہیں کہے گی۔'' مارکس نے یقین سے کہا۔

''ماریا کا کیا کرنا ہے؟'' بیگل نے موضوع بدل دیا۔ ''اس کے تیور بدلے بدلے نظر آرہے ہیں۔''

''سونیا کو بھی اسی نے برگشتہ کیا ہے۔'' نتاشا بولی۔ ''جب تم پہلے وائلا کی طرف بڑھے تھے، تب بھی وہ اسی طرح کی حرکتیں کر رہی تھی۔''

''وہ حماقت کر رہی ہے۔'' مارکس کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''اس سے نمٹنا ہوگا لیکن پہلے سونیا کی واپسی لازمی ہے۔ یہاں ہمارے پاس یہ آخری موقع ہے۔''

''اگر ہم ناکام رہے تو؟'' بیگل نے پوچھا۔

''تو ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔'' مارکس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''بار بار ایک ہی واقعہ ہو تو دوسروں کو شک ہو جائے گا۔''

وہ اپنے حصے کی طرف آئے تو ماریا اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ بیگل آگے آیا۔ ''ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔''

''میں کام سے جا رہی ہوں۔''

''بات ابھی کرنی ہے۔'' مارکس کا لہجہ سرد تھا۔ ماریا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سب بیگل کے کمرے میں آئے۔ کمرے میں آکر مارکس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ماریا! تم جانتی ہو ہمارا مقصد بہت بڑا ہے اور ہم اس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔''

''تب اس کے لیے پہلے وائلا اور اب سونیا کیوں ضروری ہے؟''

''کیونکہ ہمیں تجربہ کرنا ہے۔'' مارکس کا لہجہ پھر سخت ہو گیا۔ ''کیا تم میں سے کوئی خود کو اس کے لیے پیش کر سکتا ہے؟''

''میں تو پہلے ہی تمہارے ساتھ ہوں۔'' نتاشا نے جلدی سے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ تھی جب تک تمہارے جذبات وائلا کے لیے بدلے نہیں تھے۔'' ماریا بولی۔

''میرے جذبات نہیں بدلے۔'' مارکس نے کہا لیکن اس بار اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ ماریا مسکرانے لگی۔

''اگر یہ بات ہے تو تم وائلا کو چھوڑ دو اور کیرن کا انتخاب کر لو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' مارکس بولا۔ ''کیرن کی لاش دفنائی جا چکی ہے اور ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے۔''

''ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔'' ماریا کا انداز چیلنج دینے والا تھا۔ ''تم ثابت کرو کہ تم وائلا کے لیے جذباتی نہیں ہو۔''

''ماریا......'' بیگل نے کہنا چاہا لیکن مارکس نے اسے روک دیا۔

''مجھے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں؟''

ماریا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''اوکے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم سچ پروجیکٹ کے ساتھ ہو۔''

وہ کہتے ہی پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ بیگل نے کہا۔ ''یہ نہیں مانے گی۔''

''یہ احمق ہے۔'' نتاشا بھی بولی۔

''وہ سمجھ نہیں رہی ہے۔'' مارکس نے گہری سانس لی۔ ''جب وائلا واپس آئے گی تو وہ ہماری معمول نہیں ہوگی۔ وہ ہماری ماسٹر ہوگی کیونکہ اس کے پاس دو انسانوں اور دو روحوں کی طاقت ہوگی۔''

''اس پر نظر رکھنا ہوگی۔'' ہیگل نے کہا۔
''میں سونا پر نظر رکھوں گی۔'' نتاشا نے اپنی خدمات پیش کیں۔
وہ بات کرتے ہوئے یوں سنجیدہ تھے جیسے انہیں ان باتوں پر پورا یقین ہو۔ مارکس نے سر ہلایا اور وہ بھی چلا گیا۔

☆☆☆

سونا لیپ ٹاپ پر سرچ کر رہی تھی اور جلد اس نے اپنے مطلب کی چیز نکال لی۔ اس نے موبائل سے نمبر ملایا اور بولی۔ ''ڈاکٹر شی بانہ۔''
''بات کر رہا ہوں۔''
''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''
''کس سلسلے میں؟''
''آپ جس علم کے ماہر ہیں اس سلسلے میں۔''
''ٹھیک ہے، آج شام پانچ بجے میرے آفس آجاؤ، پتا......''
''میرے پاس ہے۔'' سونا نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یونیورسٹی سے نکل کر وہ بس اسٹاپ تک آئی اور بس نے اسے نصف گھنٹے بعد بالٹی مور اسکوائر کے پاس اتار دیا۔ ڈاکٹر شی بانہ کا دفتر یہیں تھا۔ وہ جاپانی نژاد امریکی تھا مگر یہیں پیدا ہو کر یہیں پلا بڑھا تھا۔ اس کی ماں نے اسے امریکی... نظر بندی کیمپ میں جنم دیا تھا جہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران جاپان سے تعلق رکھنے والے تمام ہی امریکیوں کو قید رکھا گیا تھا۔ امریکا کے نزدیک ان کی حب الوطنی مشکوک تھی۔ سوائے نقوش کو چھوڑ کر ڈاکٹر شی بانہ ہر لحاظ سے امریکی تھا۔ اس کا دفتر سادہ تھا اور سونا کی توقع کے خلاف وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو روشنی ڈالتی کہ اسے روحوں اور حاضرات کے علم پر اتھارٹی ہے۔ اس نے گرم جوشی سے سونا کا استقبال کیا اور اس کے بات شروع کرنے سے پہلے سوال کیا۔
''تمہارے ساتھ نفسیاتی مسئلہ رہا ہے؟''
''اس کا اس مسئلے سے تعلق نہیں ہے۔'' سونا تیز لہجے میں بولی۔
''اس کا مطلب ہے رہا ہے۔ اوکے آگے بات کرو۔ میں صرف تصدیق چاہ رہا تھا۔''
سونا کو غصہ آنے لگا۔ ''اب تم میری بات پر اعتبار نہیں کرو گے۔''
''اس کے برعکس اب میں تمہاری بات پر زیادہ اعتبار کروں گا۔'' وہ بولا۔ ''اس سلسلے میں نشانہ وہی بنتے ہیں جن کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ اسے ایسا ہی سمجھ لو کہ کمزور قوت مدافعت والے وائرس کا آسان شکار ہوتے ہیں۔''

سونا کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''بات کرنے سے پہلے میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔''
اس نے شرٹ اوپر کر کے اپنے پیٹ کا نشان دکھایا جس کا زخم بھر گیا تھا مگر نشان باقی تھا۔ ڈاکٹر شی بانہ نے دلچسپی سے دیکھا اور زیر لب بولا۔ ''ابلیس کا نشان۔''
''صرف یہی نہیں، میرے جسم پر اور نشانات بھی ہیں۔''
''وہ بھی دکھاؤ۔''
کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ سونا نے اسے اپنی رانوں پر بنے نشانات بھی دکھائے۔ ڈاکٹر شی بانہ اب سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارے جسم پر یہ نشان کس نے بنائے؟''
سونا نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور یہ نشان کیسے بنے۔ وہ غور سے سن رہا تھا اور اپنے پیڈ پر نوٹس بھی لے رہا تھا۔ اس کے فراخ ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب سونا نے بات ختم کی تو اس نے کہا۔ ''بات بہت آگے جا چکی ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''تم بیک وقت دو قوتوں کے زیر اثر آ چکی ہو۔ ایک جادو جو یہ کر رہے ہیں اور دوسری قوت ان کے مخالف ہے۔''
''دوسری قوت کون سی؟''
''جو آواز کی صورت میں تم سے رابطہ کرتی ہے۔''
سونا چونکی۔ ''وہ ان کی مخالف کیوں ہے؟''
''یہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے لگ رہا ہے، ایسا ہی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری طبیعت خراب ہوئی تھی؟''
سونا نے اسے قے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی قے میں سیاہ بدبودار پانی نکلا تھا۔ ڈاکٹر شی بانہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ''یہ اچھا ہوا۔ یوں سمجھ لو کہ جادو کے زیادہ اثرات تمہارے جسم سے نکل گئے ہیں۔''
''اور باقی؟''
''اس کے لیے تمہیں مخالف قوت سے رابطہ کرنا پڑے گا۔''
''وہ کیسے؟''
''میں نے کہا نا میں اس بارے میں نہیں جانتا مگر تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔''
''پلیز! کیا تم اس مسئلے سے نکلنے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟''
''میں اس سے زیادہ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ میں ان چیزوں کا ماہر ہوں لیکن عملیات میں صفر ہوں۔'' ڈاکٹر شی بانہ نے معذرت کی۔ اس نے کاغذ پر جو نوٹس اتارے تھے، انہیں پھاڑ کر نزدیک رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ''اصل

میں، میں اس چیز کو درست سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ میرے خیال میں شیطان انسان کی کمزوریوں کی وجہ سے اس پر حاوی ہوتا ہے اگر انسان اپنی کمزوریاں دور کرلے تو شیطان یا اس کے چیلے انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

سونیا ڈاکٹر شی ہانہ کے دفتر سے نکلی تو خوش بھی تھی اور فکر مند بھی۔ ڈاکٹر نے اسے امید دلائی تھی مگر وہ اس کی عملی مدد کے لیے تیار نہیں تھا۔ مخالف قوت سے رابطہ کرنے کا مشورہ اس کے لیے ایک اور مشکل کام تھا۔ وہ ابھی ایک چکر سے نہیں نکلی تھی اور دوسرے چکر میں پڑ جاتی۔ سوال یہ تھا کہ مخالف قوت کو اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی اور وہ کیوں اسے اپنے پاس بلا رہی تھی؟ سرخ دروازہ صرف اسے دکھائی دیتا تھا اور بوائلر اٹینڈنٹ کا کہنا تھا کہ وہاں کوئی سرخ دروازہ نہیں تھا۔ سونیا کو... کوخانے میں جانے کے خیال سے خوف آرہا تھا چہ جائیکہ وہ وہاں جاتی اور سرخ دروازے میں جانے کی کوشش کرتی۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ مخالف قوت سے کیسے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہاسٹل پہنچی تو شام ہوگئی تھی اور بہت تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر آکر داخلی دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ ایک طرف تاریکی سے ایک سایہ جدا ہو کر اس کی طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈر کر چیخ مارتی مارکس سامنے آگیا۔

"یہ میں ہوں۔"

"تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔" سونیا نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"سوری، تم کہاں سے آرہی ہو؟"

"ایک کام سے گئی تھی۔" وہ آگے بڑھی۔

"میں اس دن کی بات پر سوری کرنے آیا ہوں۔"

"کس بات پر؟"

"وہی جو ماریا نے تمہارے ساتھ کیا۔"

"تو سوری اسے کرنی چاہیے، تم کیوں کررہے ہو اور وہ تو ذرا بھی شرمندہ نہیں تھی۔"

"وہ پچھتائے گی۔ اس نے تمہارے اور میرے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اس نے سب جھوٹ نہیں کہا ہے۔" سونیا سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ "کچھ سچ میرے جسم پر ہے اور وہ شاید ہمیشہ رہے گا۔"

"سونیا پلیز! سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں اور میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

سونیا جھٹکے سے رکی۔ "تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو سچ سچ بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ اگر مجھے تمہارے کہنے پر اعتبار آگیا تو تمہاری محبت پر بھی اعتبار آجائے گا۔"

مارکس خاموش رہا۔ اس کا سر جھک گیا تھا..... سونیا ..... طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "پہلے اپنے اندر سچ بولنے کی ہمت پیدا کرلو پھر میرے پاس آنا۔"

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی تو مارکس نے اسے عقب سے پکارا اور وہ ان سنی کرکے اپنے کمرے میں آگئی۔ حسب معمول کمرا یخ ہو رہا تھا۔ سونیا نے غصے سے وال پر ہتھوڑی زیادہ ہی قوت سے ماردی اور نوزل سے بھاپ کا فوارہ خارج ہوا۔ اس کی گرمائش نے لمحوں میں کمرے کو گرم کردیا اور سونیا کو عجلت میں اپنے گرم کپڑے اتارنے پڑے۔ کچھ دیر بعد بھاپ نکلنا بند ہوئی تو درجۂ حرارت کم ہونے لگا۔ سرد دیواروں پر بھاپ پانی کی صورت اختیار کررہی تھی اور یہ پانی بہتا ہوا لکیروں کی صورت میں نیچے آرہا تھا۔ وال پیپر کی لکیریں اس سے مل رہی تھیں۔ سونیا کو ان لکیروں کی بدصورتی پر غصہ آنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل ہی یونیورسٹی انتظامیہ سے دوسرے کمرے کی درخواست کرے گی جہاں ڈھنگ کا وال پیپر لگا ہو اور گرمائش کے لیے بار بار ہتھوڑی نہ اٹھانی پڑتی ہو۔

اکثر رات میں بھاپ نکلنا بند ہوجاتی تھی اور کمرا یخ ہوجاتا۔ اسے نیند سے اٹھ کر ہتھوڑی مارنا پڑتی تھی۔ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اور میس جاتے ہوئے اسے خوف آرہا تھا کہ باہر نکلتے ہی ان لوگوں سے سامنا نہ ہوجائے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب ہر وقت اس کی نگرانی ہوتی تھی کیونکہ وہ جب کہیں جاتی یا کہیں سے آتی تو اسے ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی ملتا تھا۔ البتہ ماریا اسے کئی دن سے نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اس سے ملنے کا سوچ رہی تھی مگر یہاں ہاسٹل میں نہیں۔ اگلے دن وہ اسے یونیورسٹی میں دیکھتی رہی مگر وہ اسے نہ کلاس میں نظر آئی اور نہ لائبریری میں اور نہ ہی کسی لاؤنج میں۔ البتہ باقی سب موجود تھے۔ میس میں وہ تینوں ایک ہی ٹیبل پر بیٹھے تھے اور سونیا نے ان سے ذرا فاصلے پر ایک خالی میز پر اپنی ٹرے رکھی تھی۔ مارکس اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

"کیا اب تم ہمارے ساتھ بیٹھو گی بھی نہیں؟"

"میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"اتنا آگے آکر تم پیچھے ہورہی ہو۔"

"شاید اسی میں بہتری ہے۔" سونیا نے کہا اور اپنی ٹرے اٹھا کر ایک بڑی میز کی طرف بڑھ گئی جس پر زیادہ لڑکیاں اور لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اجازت لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مارکس اسے تشویشناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ واپس آیا تو ہیگل نے کہا۔

"یہ ہم سے دور ہوچکی ہے۔"

"ہمیں اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

مارکس نے سر ہلایا۔

''ورنہ نئے سرے سے سب کرنا ہوگا اور اس کے لیے کوئی دوسری لڑکی بھی تلاش کرنی ہوگی۔'' نتاشا بولی تو مارکس نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ اتنے زیادہ میچ کے ساتھ سونیا ہی ملی ہے ورنہ دوسری وائلا سے میچ نہیں کر رہی تھیں۔''

ہیگل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب راست اقدام کرنا پڑے گا۔''

☆☆☆

سونیا سو رہی تھی۔ اس کی نیند اچانک ہی ٹوٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں جاگ گئی ہے۔ پھر اس کی نظر تیزی سے خارج ہوتی بھاپ پر گئی۔ اس کی آنکھ بھاپ نکلنے کی آواز سے کھلی تھی۔ بھاپ نکل کر وال پیپرز پر پانی کی صورت میں جمع ہو رہی تھی اور یہ پانی لکیروں کی صورت میں بہہ کر نیچے تک آ رہا تھا۔ سونیا دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر اپنے بیڈ کے سرہانے ایک جگہ وال پیپر پر گئی۔ یہاں سے وال پیپر کا ٹکڑا سا نکل گیا تھا اور نیچے دیوار جھانک رہی تھی۔ لیکن نہیں صرف دیوار نہیں تھی بلکہ دیوار پر کچھ اور بھی تھا۔ سونیا نے نزدیک آ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے دیوار پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے وہاں سے وال پیپر پھاڑا تو نیچے سیاہ اور موٹے رنگ سے بنی ہوئی ایک لکیر سی سامنے آئی۔ اس نے مزید وال پیپر پھاڑا تو لکیر نمایاں ہو گئی۔

سونیا ساکت رہ گئی کیونکہ یہ ویسی ہی علامت تھی جیسی اس نے ماریا کی نوٹ بک میں دیکھی تھی۔ پھر وہ حرکت میں آئی اور پاگلوں کی طرح نوچ نوچ کر وال پیپر اتارنے لگی۔ جہاں جہاں سے وال پیپر اتر رہا تھا، وہاں دیوار پر بنی علامتیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ یہ علامتیں صرف اس کے بیڈ کے سرہانے والی دیوار پر نہیں تھیں بلکہ دیوار پر چھت تک جہاں جہاں وال پیپر لگا ہوا تھا اس کے نیچے دیوار پر یہ علامتیں اور قدیم طرز تحریر میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف یہی سب تھا اور وہ ان میں گھری ہوئی تھی۔ سونیا کا سر چکرانے لگا۔ اس نے سر تھام لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔ ان لوگوں نے کیوں یہ علامتیں یہاں بنائی ہیں؟ اس کی نظر وائلا کی تصویر پر گئی۔ اس سے پہلے وائلا یہاں رہتی تھی تو کیا یہ علامتیں اصل میں اس کے لیے بنائی گئی تھیں اور اب وہ ان کا شکار تھی؟ وائلا کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کہاں چلی گئی اور اب یہ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے تھے؟ وہ کیا کرے؟ کیسے خود کو بچائے؟ کوئی اس کی بات کا یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ سب اسے ذہنی مریضہ سمجھ کر نظرانداز کر دیتے۔ اچانک وہی نسوانی آواز آئی۔

''یہاں سے چلی جاؤ یا میرے پاس آ جاؤ۔''

''تم کون ہو؟'' سونیا نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ''تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟''

''میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔''

''مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

''جلد یا بدیر تمہیں میرے پاس آنا ہوگا۔''

''میں نہیں آؤں گی۔'' سونیا نے چلا کر کہا۔ ''سنا تم نے...... میں نہیں آؤں گی۔''

☆☆☆

سونیا بہت احتیاط سے اور بنا آہٹ کے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ آواز سے بچنے کے لیے اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ اگرچہ یہ خاصا وزنی تھا۔ وہ سنبھل کر آخری فلور تک آئی۔ ابھی صبح ہونے میں کچھ وقت تھا اور ہاسٹل کی عمارت میں مکمل خاموشی تھی۔ آخری سیڑھی سے نیچے آ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر آگے جانے والی تھی کہ عقب سے ہیگل کی آواز آئی۔ ''سونیا! کہاں جا رہی ہو؟''

وہ اچھل پڑی اور اس نے مڑ کر دیکھا تو ہیگل اور نتاشا ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ وہ کب اس کے پیچھے آئے، اسے قطعی علم نہیں ہوا۔ ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات تھے۔ سونیا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''وہ...... میں یونیورسٹی جا رہی تھی۔''

''اپنے سامان سمیت؟'' ہیگل نے نیچے آتے ہوئے کہا۔ نتاشا اس کے پیچھے تھی۔

''ہاں، وہ میری بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں چند دن کے لیے جا رہی ہوں۔'' سونیا کہتے ہوئے دروازے کی طرف مڑی تو اس نے وہاں سے مارکس کو آتے دیکھا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔ مارکس کے تاثرات بھی ویسے ہی تھے اور اسے ان تینوں سے یکساں خوف آ رہا تھا۔ مارکس نے کہا۔

''سونیا! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اوپر چلو۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے تند لہجے میں کہا۔

''اگر تم نہیں جاؤ گی تو ہم تمہیں لے جائیں گے۔''

ہیگل کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔ سونیا نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدہ تھے اور اس کی فرار کی راہ مسدود ہو گئی تھی لیکن اس موقع پر اس نے وہ کیا جس کی وہ لوگ توقع نہیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ باہر جانے کی کوشش کرے گی لیکن اس نے اچانک اپنا سوٹ کیس ہیگل پر دھکیلا اور سیڑھیوں کی

طرف بھا گی۔ جب تک وہ تینوں سنبھلتے، وہ ایک فلور اوپر جا چکی تھی۔ پھر وہ اس کے پیچھے لپکے۔ سونیا تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آخری فلور تک پہنچی۔ یہاں بیشتر کمرے خالی تھے اور اسے کہیں پناہ نہ ملتی۔ اب اس کے پاس چھت پر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ نیچے سے آتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس کے پیچھے آرہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی تو نہایت یخ بستہ ہوا چل رہی تھی اور برف کے روئی جیسے گالے اڑ رہے تھے۔ یہ چھترے کی طرح چہرے اور جسم کے کھلے حصوں پر لگ رہے ہیں۔ وہ خوف سے پہلے ہی کانپ رہی تھی۔ اب سردی سے لرز اٹھی۔

اس نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ یہاں سے کہاں جاتی؟ آسمان پر دن کی روشنی نمودار ہو رہی تھی مگر گہرے بادلوں کی وجہ سے یہ بہت نمایاں نہیں تھی۔ اچانک اسے ہنگامی حالات کی سیڑھیوں کا خیال آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس طرف آئی جہاں یہ سیڑھیاں تھیں مگر سیڑھیاں پانچویں فلور سے شروع ہو رہی تھیں اور وہ ایک منزل نیچے تھیں۔ فاصلہ دس فٹ سے زیادہ کا تھا اور دھات کی بنی سیڑھی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ گرتے ہوئے اس کا توازن برقرار نہ رہتا تو وہ زمین پر بھی گر سکتی تھی اور اس کے بعد اس کا وہی حشر ہوتا جو کیرن کا ہوا تھا۔ وہ ابھی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ چھت کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور وہ تینوں باہر آئے۔ اسے چھت کے کنارے کھڑے پاکر مارکس اس کی طرف لپکا۔ اسے آتے دیکھ کر سونیا بے ساختہ نیچے کود گئی۔ گرتے ہوئے اس کے پاؤں لوہے کی سیڑھی سے ٹکرائے اور وہ لڑکھڑا کر مزید نیچے گئی۔ گرتے ہوئے اسے چوٹیں لگی تھیں مگر یہ ایسی نہیں تھیں کہ وہ حرکت کے قابل نہ رہتی۔ جہاں سیڑھی مڑ رہی تھی، وہ وہاں رک گئی اور اس نے پلٹ کر اوپر دیکھا جہاں وہ تینوں جھانک رہے تھے۔ مارکس نے پہلے چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا مگر پھر شاید اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے دانت پیس کر گالی دی اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”چلو سیڑھیوں سے نیچے۔“

وہ تینوں غائب ہو گئے اور سونیا فوری حرکت میں آئی۔ وہ اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ جلدی کے چکر میں وہ کئی بار لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح وہ نیچے پہنچ گئی۔ یہ چھوٹی گلی تھی جو دائیں طرف سڑک پر نکلتی تھی اور اسی گلی میں تہ خانے والا راستہ بھی نکلتا تھا۔ نیچے آکر سونیا نے چند لمحے رک کر سانس درست کی اور پھر سڑک کی طرف بڑھی لیکن جیسے ہی اس نے گلی سے جھانک کر دیکھا، اسے وہ تینوں گیٹ سے نکلتے دکھائی دیے۔ اس کے پاس موقع نہیں تھا۔ وہ پلٹی اور بھاگتی ہوئی تہ خانے کے دروازے تک آئی اور بلاتکلف اندر گھس گئی۔ اندر اس کی چھوٹی سی چٹخنی تھی۔ اس نے وہ چڑھا دی اور راہداری میں آئی۔ فوراً ہی عقب سے دروازے کو دھکیلا جانے لگا اور سونیا جانتی تھی کہ یہ معمولی سی چٹخنی زیادہ دیر انہیں نہیں روک سکے گی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ وہ پلٹ کر سامنے والے راستے سے تہ خانے میں نہ آجائیں۔ وہ اندر ہی محصور ہو کر رہ جاتی اور اس سے پہلے اس کا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا کیونکہ اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ مگر جب بوائلرز والا حصہ آیا تو اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس پر سرخ دروازے کا خوف حاوی ہونے لگا۔ وہ دھند کے پاس آکر رکی۔ وہ ہمت جمع کر رہی تھی کہ اس میں داخل ہو سکے۔ اچانک عقب سے دھماکے کی آواز آئی۔ مارکس اور دوسرے کنڈی توڑ کر اندر داخل ہو گئے تھے۔ سونیا بے اختیار دھند میں داخل ہو گئی۔ اس وقت دھند اتنی زیادہ تھی کہ ایک فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بوائلرز سے رہ رہ کر آواز کے ساتھ بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ عقب سے مارکس اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ خود شرافت سے ان کے پاس آجائے کیونکہ وہ ان سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔

”میرے پاس آؤ۔“ سونیا کے کانوں میں نسوانی سرگوشی گونجی۔

”نہیں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”اگر تم بچنا چاہتی ہو تو میرے پاس آجاؤ۔“

”پلیز نہیں۔“ اس نے سسکی لی۔

”تمہارے پاس آخری موقع ہے۔“

”خدا کے لیے تم سب میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ وہ بولی۔ اس دوران میں وہ اندھا دھند آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی قسمت تھی کہ وہ ابھی تک کسی چیز سے ٹکرائی نہیں تھی۔

”میرے پاس آجاؤ، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

آواز کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے کہا۔ ”تم مجھے آزاد کرا سکتی ہو۔“

”کیسے؟“

”میرے پاس آؤ۔“

اچانک ہی سونیا نے خود کو سرخ دروازے کے سامنے پایا۔ یہاں دھند صرف اس حد تک کم تھی کہ اسے دروازہ نظر آجائے ورنہ

چاروں طرف بہت گہری دھند تھی۔ سونیا نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا مگر سرگوشی نے کہا۔ ”وہ نزدیک ہیں۔“

سونیا نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور ہینڈل تھام لیا۔ اس نے آہستہ سے اس کا لٹو گھمایا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن جیسے کسی قوت نے اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ خود بہ خود بند ہوگیا یہ ایک کمرا تھا۔ تقریباً بارہ بائی بارہ کے اس کمرے میں دیوار پر سرخ رنگ تھا اور اس پر سیاہ رنگ سے وہی علامتیں بنائی گئی تھیں۔ چھت پر پیلا بلب روشن تھا مگر دیواروں کی سرخی میں اس کی روشنی بھی سرخ لگ رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں فرش پر لکڑی کا تابوت پڑا تھا۔ اس کے اوپری حصے پر وہ تمام علامتیں اور نشانات بنے ہوئے تھے جو سونیا اب تک دیکھتی آئی تھی۔ تابوت دیکھتے ہی اس پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ واپس جانے کے ارادے سے پلٹی اور دنگ رہ گئی کیونکہ عقب میں اب سرخ دروازے کی جگہ سپاٹ دیوار تھی۔ اس نے بے ساختہ دیوار کو ٹٹولا اور یوں اسے چیک کرنے لگی جیسے دروازہ اس میں کہیں چھپ گیا تھا۔ وہ خود سے کہہ رہی تھی۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے...... دروازہ یہیں تو تھا...... وہ کہاں جا سکتا ہے؟“

”وہ دروازہ صرف تمہارے لیے تھا۔“ نسوانی سرگوشی نے کہا۔ ”وہ اب نہیں ہے۔“

”تو اب میں باہر کیسے جاؤں گی؟“

”دوسرے دروازے سے۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”تابوت کھولو۔“ آواز نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ سہم گئی۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”تمہاری اور میری نجات ہے۔“ سرگوشی نے کہا۔ ”وہ یہاں بھی آنے والے ہیں۔“

”کیسے؟“

”دوسرے راستے سے...... وہ اس سے واقف ہیں اور کوئی نہیں جانتا۔“

سونیا نے چاروں طرف دیکھا۔ ”وہ یہاں آنے والے ہیں تو میں کیسے ان سے بچوں گی؟“

”تابوت کھولو۔“

”نہیں۔“ اس نے انکار کیا تو کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا اور وہ بے ساختہ لڑکھڑاتی ہوئی تابوت تک آئی اور اس سے ٹکرائی تو اس کا اوپری تختہ سرک گیا۔ اندر سے بدبو کا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی سونیا کو چکر سا آ گیا۔ اسے لگا جیسے تابوت سے کوئی سایہ سا نکلا ہو اور پھر غائب ہوگیا۔ پھر سرگوشی نے کہا۔

”تمہارا شکریہ...... اب میں آزاد ہوں۔“

”تم آزاد ہو لیکن میرا کیا ہوگا؟“ سونیا تابوت میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ اس میں کیا ہے۔

”تم بچ جاؤ گی۔“

”کیسے؟“

”تابوت میں چلی جاؤ۔“

وہ اس خیال سے لرز اٹھی تھی۔ ”نہیں۔“

”تم اسی طرح بچ سکتی ہو۔“ سرگوشی نے کہا۔ ”تمہارے پاس وقت نہیں ہے، وہ آنے والے ہیں۔“

اسی لمحے ایک طرف دیوار پر جیسے کسی نے ضرب لگائی۔ سونیا ہراساں ہوگئی۔ ”یہ وہی لوگ ہیں؟“

”ہاں وہی ہیں۔“

سونیا جانتی تھی، اس کے پاس بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے خیال سے اس کی جان جا رہی تھی۔ دوسری طرف ایسا لگ رہا تھا کہ جلد یا بدیر وہ دیوار توڑ کر اندر آ جائیں گے۔ اس نے ہمت کر کے تابوت کا تختہ سرکایا اور بدبو سے بچنے کے لیے سانس روک لی مگر وہ اس لاش پر کس طرح لیٹتی جو اب سوکھ کر تقریباً ڈھانچے جیسی ہو گئی تھی۔ یہ وائلا کی لاش تھی۔ اچانک پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر اندر گرا اور اس کے بعد دیوار اندر کی طرف سرکنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دیوار کے اس حصے میں کوئی میکنزم بنایا گیا تھا اور اسے سیمنٹ لگا کر بند کر دیا تھا۔ ضرب لگانے سے سیمنٹ جھڑ گیا تھا اور دیوار اپنی جگہ سے سرک رہی تھی۔ چند منٹ میں اس میں اتنا بڑا خلا ہو گیا کہ ایک انسان آرام سے اندر آ سکے۔ سب سے پہلے مارکس آیا، اس کے پیچھے ہیگل تھا اور سب سے آخر میں نتاشا تھی۔ مارکس نے اندر آتے ہی چاروں طرف دیکھا اور ہیگل سے کہا۔ ”کہاں ہے وہ اور یہاں آنے کا کوئی اور راستہ کس طرف ہے؟“

ہیگل نے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا تھا، بوائلرز کے پاس...... وہ ایک دروازے سے اندر گئی تھی۔“

”تمہیں دھوکا ہوا ہے۔“ نتاشا نے کہا۔ ”اگر وہ یہاں ہوتی تو کہاں چھپ سکتی تھی؟“

”اس تابوت میں۔“ ہیگل نے اشارہ کیا تو مارکس نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

”احمقانہ بات، اس میں پہلے ہی وائلا کی لاش ہے۔“

”دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“ ہیگل تابوت کی طرف بڑھا تو نتاشا نے کہا۔

''اسے مت کھولنا۔ تم بھول رہے ہو وہ اس کے اندر قید ہے اور وقت سے پہلے اسے کھول دیا تو وہ پھر ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' مارکس نے تائید کی۔ ''واپس چلو، ابھی اسے بھی تلاش کرنا ہے۔''

''اور یہ جو دیوار کھول دی ہے۔'' نتاشا بولی۔ ''کیا اسے ٹھیک نہیں کرنا ہے؟''

''ہاں، پہلے اسے ٹھیک کرنا ہوگا۔'' مارکس بولا۔ ''چلو ہم سامان لاتے ہیں۔ اسے بوائلر اٹینڈنٹ کے آنے سے پہلے ٹھیک کرنا ہوگا۔''

''پھر اس کتیا کو بھی تلاش کرنا ہے۔'' نتاشا بولی۔ وہ چلے گئے اور کچھ دیر بعد وہ مرمت کا سامان لے کر آئے تو تابوت کا ڈھکن اپنی جگہ سے سرکا ہوا تھا۔

رونیا کمرے میں داخل ہوئی تو سونیا کھڑکی کی طرف منہ کرکے لیٹی ہوئی تھی۔ رونیا آگے آئی اور بو کے اس کے پاس رکھا۔ ''کیسی ہو...... اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''جھٹلائے جانے والے انسان کو کیسا محسوس ہو سکتا ہے۔'' سونیا نے تلخی سے کہا۔

''کوئی تمہیں نہیں جھٹلا رہا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم نے جو بتایا پولیس اس کی تصدیق نہیں کر سکی۔ تہ خانے میں ایک خفیہ کمرا ضرور نکلا اور وہاں ایک عدد تابوت بھی تھا مگر وہ خالی تھا۔ مارکس، ماریا، میکل اور نتاشا غائب ہیں۔ پولیس ان کو تلاش کر رہی ہے کہ تمہارے بیان کی تصدیق کی جا سکے۔ ان تینوں کے کمرے معمول کے مطابق پائے گئے۔ تمہارے کمرے کی دیواروں سے وال پیپر غائب ہے مگر اس پر کچھ نہیں لکھا ہے اور نہ ہی کوئی علامت بنی ہے۔ اسی طرح خفیہ کمرے کی دیواریں بھی سادہ پائی گئیں۔ اب تم بتاؤ پولیس کیسے یقین کرے گی۔''

''میں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وانلا کی لاش کے اوپر لیٹی رہی۔ میرے خدا! وہ وقت میں نے کیسے گزارا میں ہی جانتی ہوں۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ میں پاگل کیوں نہیں ہوئی۔''

رونیا اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''پلیز سونیا! اگر تم اس طرح کی باتیں کرتی رہو گی تو پھر تمہارے لیے ہی مشکل ہوگی۔''

''جو سچ تھا، میں نے بتا دیا ہے۔'' سونیا غصے سے بولی۔ ''اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو وہ چاروں کیوں غائب ہوئے؟ ظاہر ہے انہیں پکڑے جانے کا خوف تھا اس لیے وانلا کی لاش غائب کرنے اور تمام نشانات مٹانے کے باوجود وہ یہاں نہیں رکے۔ مجھے یقین ہے پولیس انہیں کبھی تلاش نہیں کر سکے گی۔''

''سونیا! ان کو چھوڑو اور اپنے بارے میں سوچو۔ اگر پولیس انہیں تلاش بھی کر لے تب بھی صرف تمہارے کہنے پر ان کے خلاف کوئی چارج نہیں لگے گا۔''

رونیا کی بات پر وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

رونیا خوش ہو گئی۔ ''اب تم نے سمجھداری کی بات کی ہے۔ ایک لحاظ سے اچھا ہوا کہ وہ غائب ہو گئے اور تمہاری جان چھوٹ گئی۔ تو تم اپنے الزامات پر زور نہیں دو گی؟''

سونیا نے سر ہلایا۔ ''بشرطیکہ پولیس مجھے کسی قسم کا الزام نہ دے۔''

''میں بات کر چکی ہوں۔ اگر تم اپنے الزامات پر زور نہیں دو گی تو پولیس معاملہ ختم کر دے گی۔''

''اور یونیورسٹی...... جو میرا داخلہ ختم کر چکی ہے۔''

رونیا خاموش ہوئی پھر اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔ جلد میں تمہیں کسی اور یونیورسٹی میں داخل کرا دوں گی۔''

رونیا اس کے ماتھے پر پیار کرکے رخصت ہوئی تو اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے پولیس کو سب بتا دیا تھا سوائے اس نسوانی سرگوشی کے جو اس کی راہنمائی کرتی تھی۔ یہ بات اس نے صرف رونیا کو بتائی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ چاروں اب کہاں ہوں گے؟

☆☆☆

کینیڈا، انٹاریو یونیورسٹی کے نئے سمسٹر کا آغاز تھا اور دور دراز سے طلبا یہاں پڑھنے کے لیے چلے آرہے تھے۔ ان میں ایک این جولین بھی تھی۔ وہ کیوبک صوبے سے یہاں آئی تھی۔ اس نے ماسٹر کے لیے قدیم مذاہب کا انتخاب کیا تھا۔ بس سے اترنے کے بعد وہ اپنا سوٹ کیس لے کر ہاسٹل ایریا میں داخل ہوئی اور اب اسے اس عمارت کی تلاش تھی جہاں اسے کمرا ملا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہاسٹل کیسے تلاش کرے۔ وہاں سب اس کی طرح اجنبی اور جلدی میں تھے۔ اچانک کسی نے پاس آکر کہا۔ ''ہے...... کیا تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟''

این نے دیکھا، جاپانی نقوش کی حامل لڑکی اس کے پاس کھڑی دوستانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

شیش محل

اسماء قادری

قسط:2

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار وتحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

ناٹا کے پاڑے پر آج غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ وہاں موجود اس کے چیلوں کے چہرے پر بھی دبا دبا سا جوش اور تجسس تھا۔ وہ رات کی دعوت کے انتظامات کرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں سرگوشیوں میں بھی گفتگو کررہے تھے۔ آج اس پاڑے پر ممبئی کے دو اہم داداؤں کے درمیان ملاقات طے پائی تھی اور ناٹا اس ملاقات کا میزبان اور ثالث ٹھہرا تھا۔ دونوں اڈوں کے درمیان ہونے والا جھگڑا طول نہ پکڑے، اس خیال سے ناٹا نے مصالحت کی ایک کوشش کے طور پر دونوں طرف کے لوگوں کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ ربن دادا کی طرف سے اس دعوت کو فوراً قبول کرلیا گیا تھا لیکن جو نے حیل وحجت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ کہتے ہوئے کہ وہ صرف ناٹا کی خاطر یہ ملاقات کرے گا، دعوت کو قبول کیا تھا۔ اس کے بگڑے ہوئے تیور سب ہی کو صاف نظر آرہے تھے جبکہ ربن دادا کے بارے میں بھی سب کو علم تھا کہ وہ متحمل مزاج ہونے کے باوجود اپنے اصولوں کے معاملے میں کتنا کٹر ہے۔ مان لینے والی بات پر بحث نہیں کرتا اور جو نہ ماننا چاہے اسے ہزار بحث کے بعد بھی نہیں مانتا۔

سب ہی کو تشویش تھی کہ ایسی دو پارٹیوں کے درمیان مصالحت کروانے میں ناٹا کس حد تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ ناٹا تھا تو بڑا جہاندیدہ آدمی۔ ہاتھ پیروں کے زور کے علاوہ اس نے اپنی فہم وفراست کے بل پر بھی ایک عرصے سے اپنے پاڑے کی گدی سنبھال رکھی تھی اور بڑی خوش اسلوبی سے یہاں کے معاملات چلا رہا تھا۔ جو اور ربن دادا کی ملاقات کے لیے بھی اس نے خاصا سوچ سمجھ کر پروگرام ترتیب دیا تھا۔ پرتکلف کھانے کے بعد ناچ گانے کی محفل کا انتظام تھا جس میں شہر کی سب سے طرح دار طوائف کو بلوانے کے ساتھ ساتھ دیسی اور ولایتی دونوں طرح کی شرابوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ان انتظامات کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ناٹا کو تمام تر وضع داری کے ساتھ اپنا حقِ میزبانی ادا کرنے کی فکر تھی، دوسرے وہ چاہتا تھا کہ دونوں فریقین کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ان کے درمیان تناؤ کسی حد تک کم ہوجائے۔ ایک دسترخوان پر کھانا کھانے اور پھر رقص وسرور کی محفل میں شرکت کرنے سے یہ مقصد پورا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ہم نوالہ و ہم پیالہ آدمی کو اختلافات پر بات کرنے کے لیے بھی آنکھوں میں کچھ نہ کچھ مروت تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔

ناٹا کے آدمی متجسس تھے کہ دیکھو ناٹا کے ان انتظامات کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اپنی اپنی ذمے داریاں پوری مستعدی سے نبھاتے ہوئے وہ فریقین کی آمد کے منتظر تھے۔ حسب معمول ربن دادا نے وقت کی پابندی کی روایت کو برقرار رکھا اور ٹھیک آٹھ بجے ایک ٹم ٹم میں سوار اپنے آدمیوں کے سنگ ناٹا کے پاڑے کے سامنے اترا۔ اس کے ساتھ وہاں آنے والوں میں فاروق، رامو اور کمو شامل تھے۔ ٹم ٹم کو چلانے والا بھی یقیناً ربن دادا کا ہی کوئی وفادار رہا ہوگا لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ پاڑے کے دروازے سے اندر داخل نہیں ہوا تھا بلکہ ان ٹوکروں کو اتارنے میں مصروف ہو گیا تھا جن میں مختلف انواع کے پھل، مٹھائیاں اور دیگر اشیا موجود تھیں۔

ناٹا نے پاڑے کے دروازے پر ہی ربن اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کیا۔ ربن دادا سے وہ باقاعدہ بغل گیر ہوا۔ رامو اور کمو نے اس کے پیر چھوئے جبکہ فاروق نے ذرا سا سر کو خم دے کر آداب بجالانے پر اکتفا کیا۔ ناٹا نے سب کو حسب مراتب خوش دلی سے خوش آمدید کہا اور اپنے ساتھ لے کر اس بڑے سے ہال میں پہنچ گیا جہاں آج کی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ربن کو اس نے اپنے پہلو میں اونچی چوکی پر بٹھایا جبکہ فاروق اور اس کے ساتھیوں کو چاندنی پر دائیں جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیروں کو جوتیوں کی قید سے آزاد کر کے سفید براق چاندنی پر رکھے مخملیں گاؤتکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ربن اور ناٹا کے درمیان رسمی سی گفتگو ہونے لگی جبکہ وہ تینوں احتراماً خاموشی سے بیٹھے رہے۔

"تیرے زخم کا کیا حال ہے فاروق استاد؟" کچھ دیر میں ناٹا نے خود ہی اس طرف توجہ کی۔

"ٹھیک ہے ناٹا، آپ کی دعاؤں سے تقریباً بھر چکا ہے۔" فاروق نے حسب عادت احترام سے جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر ناٹا ہنس پڑا اور ربن کو مخاطب کر کے لطف لینے والے انداز میں بولا۔

"یہ تو نے اپنے اڈے پر اچھے بھانت بھانت کے نمونے جمع کیے ہیں۔ اس چھوکرے کی زبان سن کر کدھری سے لگتا ہے کہ یہ اڈے کی دنیا کا بندہ ہے۔ اسے تو کسی اسکول، کالج کا استاد یا دفتر کا بابو ہونا چاہیے تھا۔"

"اس کی زبان پر مت جاؤ ناٹا، باقی گنوں میں یہ پورا ہے۔ من چاہے تو کسی بھی سورما کے سامنے کھڑا کر کے آزما لو۔ چاقو، بلم، طمنچہ سب اچھی طرح چلانا جانتا ہے اور ایسا جانتا ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔" ربن دادا

کے لہجے میں فاروق کے لیے ایک محسوس کیا جانے والا فخر تھا۔

''کیوں نہ ہوگا ماہر۔ آخر شاگرد کس کا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ربن دادا کے چھونے سے مٹی کا آدمی بھی سونے چاندی کا ہو جاتا ہے تو اس میں کچھ غلط تو نہیں ہوگا اور اس چھوکرے نے تو تن تنہا جامو اور سورتی جیسے سور ماؤں کے دماغ ٹھکانے لگا کر اپنی برتری ثابت بھی کر دی ہے۔ آدمی میں گن ہو تبھی تو ایسا کارنامہ دکھاتا ہے۔'' نانا کے لہجے میں واضح ستائش تھی۔ وہ فاروق کے خوب صورت چہرے کو بہت نرم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''لگتا ہے نانا پر بھی اپنے فاروق بھائی کی صورت کا جادو چل گیا ہے۔'' نانا کا انداز دیکھ کر کمو نے رامو کے کان میں سرگوشی کی جس پر رامو نے محض ہلکا سا مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ویسے وہ خود بھی اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ سفید کرتہ شلوار کے ساتھ سرمئی واسکٹ پہنے فاروق آج جچ بھی تو بہت رہا تھا۔

''مجو دادا ابھی تک نہیں آیا۔'' نانا نظریں پھیر کر ایک بار پھر ربن سے محو گفتگو ہوا تو فاروق نے پہلو بدل کر سرگوشی میں رامو سے کہا۔

''صورت حرام اپنی اہمیت جتانے کو جان کر دیر سے آئے گا۔'' رامو نے دانت کچکچاتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اسی وقت نانا کے کارندے تھال میں مشروب کے گلاس اور مٹھائی کی قابیں سجائے اندر چلے آئے اور بہت سلیقے سے انہیں یہ چیزیں پیش کی جانے لگیں۔ کھانے کے وقت اگرچہ ان اشیائے خورونوش کو پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن دوسرے فریق کی آمد میں تاخیر سے پیدا ہونے والی ناگواری کو ہلکا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ شغل تو جاری رکھنا ہی تھا۔ وہ سب اس بات کو سمجھ رہے تھے اور جانتے تھے کہ موجودہ صورتِ حال کے لیے نانا کسی طور قصوروار نہیں اس لیے اپنی ناگواری کو چھپائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اسی وضع داری کو نبھانے کے لیے انہوں نے مشروبات اور مٹھائی کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا اور ہاتھ ہلکا رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ اپنے معدوں میں منتقل کر لیا۔ تقریباً سوا گھنٹے بعد نانا کے آدمیوں نے مجو کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

''انہیں عزت سے یہاں لے آؤ۔'' نانا نے اپنے نائب کو حکم دیا۔ واضح طور پر مجو کی تاخیر سے اس کی طبیعت کبیدہ ہو گئی تھی اسی لیے اس نے ربن کی طرح دروازے تک جا کر اس کا استقبال کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے نائب نے اس کا موڈ دیکھتے ہوئے پھرتی سے باہر کا رخ کیا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ نانا اپنے خراب موڈ کے باوجود بہرحال مجو کو رعایت دینا چاہتا تھا۔ ذرا دیر میں مجو کلف لگے کرتے اور دھوتی میں ملبوس اپنے پانچ آدمیوں کے جلو میں اندر داخل ہوا۔ ربن دادا نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرنے میں پہل کی۔ اس کی تقلید میں فاروق، رامو اور کمو بھی فوراً کھڑے ہو گئے، البتہ نانا نے کچھ تاخیر کا مظاہرہ کیا۔

''شما چاہتا ہوں نانا! بس عین وقت پر ایک لفڑے میں پڑ گیا تھا۔ اسے نمٹا کر آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔'' نانا سے مصافحہ کرتے ہوئے مجو بہ ظاہر معذرت کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے کے سرسری پن اور چہرے کی بے نیازی سے ظاہر تھا کہ اسے اس تاخیر پر کسی قسم کی شرمندگی نہیں ہے اور رامو کے خیال کے عین مطابق وہ محض اپنی اہمیت جتانے کے لیے تاخیر سے پہنچا ہے۔

''اپنے ربن دادا کو تو بہت انتظار کرنا پڑا ہوگا۔'' نانا کے بعد ربن سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کچھ طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔

''دادا تو میرے دیے ہوئے ٹائم پر ٹھیک آٹھ بجے ہی ادھر پہنچ گیا تھا۔'' نانا نے اسے مطلع کیا۔

''ہاں سنا ہے ادھر وقت کی سختی سے پابندی ہوتی ہے۔'' مجو کا لہجہ اب بھی طنزیہ ہی تھا۔

''وقت کی پابندی کرنے میں ہی بندے کی بھلائی ہے کیونکہ وقت تو آدمی کا پابند کبھی نہیں ہوا۔'' اس بار ربن نے تدبر سے اس کی بات کا جواب دیا۔ پھر وہ سب نانا کے کہنے پر بیٹھ گئے۔ مجو کو بھی نانا نے اپنے ساتھ ہی چوکی پر جگہ دی تھی۔ مجو درمیانی قامت کا بھاری بدن کا آدمی تھا جس کی رنگت خاصی دبی ہوئی تھی۔ اچھے نقوش کے ساتھ یہ دبی ہوئی رنگت بھی شاید مناسب معلوم ہوتی لیکن چیچک کے داغوں کے ساتھ ٹھوڑی اور ماتھے پر موجود پرانے زخموں کے نشانات نے مل کر اسے خاصا کریہہ المنظر بنا ڈالا تھا۔ اس پر سے اس کی ہمہ وقت پان چباتے کی عادت نے دانتوں کا الگ بیڑا غرق کر دیا تھا۔ وہ بولنے کے لیے منہ کھولتا تو اس کی شکل دیکھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے فاروق کے تصور میں یکایک ثریا بانو کا سراپا لہرایا... متناسب قد و قامت کی ثریا بانو کو اگرچہ اس نے برقعے میں دیکھا تھا پھر بھی نقاب سے جھانکتی اس کی غزالی آنکھوں اور اجلی رنگت نے گواہی دے دی تھی کہ وہ کیسی حسین عورت ہے۔ خود اس کے مطابق لوگ اسے چاند کا ٹکڑا کہا کرتے تھے۔ مجو ایسا

شخص اس چاند کے ٹکڑے کا زبردستی طلب گار بنا بیٹھا تھا تو یہ کہاں کا انصاف تھا۔ ان کی تو عمروں میں بھی آدھے سے زیادہ کا فرق تھا۔ کہاں بائیس تیئس سال کی ثریا بانو اور کہاں یہ ادھیڑ عمر بجو۔ دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا تھا۔ اگر بجو کچھ معقولیت کا مظاہرہ کرتا تو پھر بھی اسے دل کی بے اختیاری کی رعایت دی جاسکتی تھی۔ آدمی کا دل تو اسے اپنی حیثیت سے ہٹ کر کہیں بھی اٹکا دیتا ہے جیسا کہ فاروق خود جولیٹ کے عشق میں مبتلا تھا لیکن دل کی بے اختیاری بے راہ روی اور غنڈا گردی بن جائے تو پھر کسی رعایت کی مستحق نہیں رہتی۔ بجو تو صاف غنڈا گردی دکھا رہا تھا اور بے چاری ثریا بانو پر زندگی تنگ کر کے رکھ دی تھی۔

''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ زمرد بائی اور اس کے سازندے بہت دیر کے آئے بیٹھے ہیں۔ انہیں اب اور دیر کروانا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' سب کے اپنی جگہ بیٹھتے ہی نانا نے کہا تو اس کے آدمی فوراً ہی حرکت میں آگئے۔ چاندنیوں پر سرخ مدرے کا طویل دسترخوان بچھا دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ دسترخوان انواع واقسام کے کھانوں سے بھر گیا۔ کمرے میں ہر سو ان کھانوں کی خوشبو چکرا کر معدوں کو مہمیز کرنے لگی۔ سلفچیاں اٹھائے کارندے مہمانوں کے ہاتھ دھلوا کر کمرے سے رخصت ہوئے تو مہمانوں نے.....
دسترخوان پر نظر ڈالی۔ ہر قسم کے گوشت کے پکوانوں کے علاوہ سبزیوں اور دالوں سے تیار کردہ بھی کئی پکوان دسترخوان پر موجود تھے۔ اس موقع پر نانا کے پاڑے کے بھی چند خاص لوگ شریکِ طعام ہو گئے۔ البتہ نانا سمیت ان سب کا دھیان کھانے سے زیادہ کھلانے پر تھا۔ وہ اچھے میزبانوں کی طرح دونوں طرف کے لوگوں کو ایک ایک چیز پیش کررہے تھے۔ مہمانوں کی پلیٹیں خالی ہونے سے پہلے ہی بہ اصرار بھری جارہی تھیں۔ نانا خود ربن دادا اور بجو پر خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ کھانا مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے خوب تھا۔ کھانے والے ناک تک سیر ہوگئے لیکن دسترخوان پر کسی شے کی مقدار میں کمی نہ ہونے پائی۔ اس کا سہرا ان مستعد افراد کو جاتا تھا جو مسلسل گرما گرم کھانا.....
دسترخوان پر پہنچانے میں مصروف تھے۔

اس پرتکلف طعام کو اختتام تک پہنچنے میں گھنٹا بھر سے اوپر ہی وقت گزر گیا۔ مہمانوں کے ہاتھ روک لینے کے بعد ہر کام کی طرح دسترخوان سمیٹنے کا کام بھی مستعدی و پھرتی سے انجام دیا گیا۔ ربن اور بجو دیر تک نانا کی اس مہمان نوازی کی تعریف کرتے رہے اور جواب میں نانا انکساری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ کھانے کے بعد بجو دادا کے اکھڑے اکھڑے تیوروں میں بھی خاصا فرق آگیا تھا۔ ربن دادا کو اگرچہ اب بھی وہ زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن نانا سے رویے میں واضح فرق آیا تھا۔ کھانے کے بعد گرانی دور کرنے کے لیے خوشبودار قہوے کا دور چلا۔ نانا کے مطابق یہ قہوہ غذا کو ہضم کرنے کے لیے مفید تھا چنانچہ سب نے پوری طرح سیر ہونے کے باوجود انکار نہیں کیا اور واقعی طبیعت میں خاصی خوش گواری محسوس کی۔ قہوہ نوشی کے دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن اصل موضوع کو نہ چھیڑا گیا۔ یہ کام نانا کو کرنا تھا چنانچہ اس بات کا تعین بھی وہی کرتا کہ گفتگو کے لیے مناسب وقت کون سا رہے گا اور نانا کا انداز یہ تھا کہ لگتا تھا اسے اپنے پاڑے پر آئے مہمانوں کی مدارت کے علاوہ کسی اور بات سے غرض ہی نہ ہو۔

قہوے کا دور ختم ہونے تک سازندوں نے اپنی جگہ سنبھالنا شروع کردی تھی۔ سازندوں کے پیچھے قدرے فربہ جسم کی پینتیس چھتیس سالہ زمرد بائی بھی وہاں چلی آئی اور جھک کر اہلِ محفل کو آداب کہا۔ وہ بہت خوب صورت تیکھے نقش کی مالک اجلی رنگت والی عورت تھی جس نے کم و بیش پندرہ برس تک تماش بینوں کو اپنا اسیر بنائے رکھا تھا لیکن ڈیڑھ دو برس پہلے اچانک ہی ناچنا گانا چھوڑ کر نائیکا کی گدی سنبھال لی تھی۔ اس کے چاہنے والوں کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ چاہتی تو ابھی مزید پندرہ برس پیروں میں گھنگرو باندھ کر سب کو اپنے اشاروں پر نچا سکتی تھی لیکن زمرد بائی نے جو ایک بار فیصلہ کیا، اس سے پیچھے نہیں ہٹی۔ رقص چھوڑ کر نائیکا کی گدی سنبھالنے سے اس پر صرف اتنا فرق پڑا کہ جسم پہلے کے مقابلے میں فربہ ہوگیا ورنہ دلکشی تو اب بھی وہی تھی جس کے اہلِ بمبئی گرویدہ تھے۔ اس کے عروج کے دور ہی کی طرح اس کے کوٹھے پر اب بھی سب سے زیادہ گاہک حاضری دیتے تھے کہ کہا جاتا تھا اس نے چن چن کر ہیرے جمع کررکھے ہیں۔

آج کل ایک نئی لڑکی چاند بانو کا بڑا شہرہ تھا۔ اس لڑکی کو زمرد بائی نے ابھی تک چند ایک بار ہی کچھ خاص گاہکوں کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ گواہی دیتے تھے کہ چاند بانو سچ مچ چاند کے مانند ہے جس کے محفل میں جلوہ گر ہوتے ہی دیگر طوائفوں کی ضوفشانی ستاروں کے مانند محسوس ہونے لگتی ہے اور بس چاند بانو ہی چاند بانو نظر آتی ہے۔

چاند بانو کے بارے میں ایک رائے یہ تھی کہ وہ متعارف تو زمرد بائی کی چھوٹی بہن کے طور پر کروائی جارہی ہے لیکن اس کے نقش پکارتے ہیں کہ وہ زمرد بائی کی کوکھ کے

سانچے میں ڈھل کر دنیا میں وارد ہوئی ہے۔ اسے زمرد بائی کی نوجوانی کے ایک ناکام عشق کی نشانی قرار دیا جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ سولہ کے سن میں زمرد بائی لکھنؤ سے آئے ایک نوجوان نواب زادے کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس عشق نے ہی یہ گل کھلایا تھا۔ زمرد بائی کی ماں مینا بائی نے بھی دونوں عاشقوں کو خوب دل بھر کر چھوٹ دی تھی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ سے آیا وہ نواب زادہ پوری طرح کنگال ہو گیا اور اس کے پاس زمرد سے ملاقات کے لیے پیش کرنے کو سوائے خوشامدوں کے کچھ نہ رہا۔ مینا بائی نے نواب زادے کے ورثا کو پیغام بھیجا کہ تمہارا لڑکا ہمارے کوٹھے پر آ کر دن رات خود بھی خوار ہوتا ہے اور ہمارا بھی دھندا خراب کرتا ہے چنانچہ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ نواب زادے کے بزرگ اور اہلِ خانہ اس پیغام پر فوراً حرکت میں آئے اور نیم دیوانگی کے عالم میں اسے اپنے ساتھ لکھنؤ واپس لے گئے۔ نواب زادے کی روانگی کے بعد مینا بائی نے زمرد کو بھی تبدیلیٔ آب و ہوا کے نام پر کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر روانہ کر دیا جہاں سے زمرد کئی ماہ کے وقفے کے بعد واپس آئی اور ماں کے احکامات کے مطابق محفلیں سجانے لگی۔ چاند بانو کو تین سال کے وقفے سے وہاں لایا گیا تھا لیکن قیاس یہی تھا کہ یہ زمرد کی محبت کی نشانی ہے جسے اس نے کسی پہاڑی بنگلے پر جنا تھا۔ اب معلوم نہیں حقیقت کیا تھی لیکن چاند بانو ایک نواب کا خون ہونے کی تہمت کے ساتھ اوروں ہی کی طرح محفل میں لا سجائی گئی اور ان دنوں ہر سو اسی کا چرچا تھا۔

نائکہ نے اپنے مہمانوں کو خوش خبری سنا دی تھی کہ زمرد بائی کے طائفے میں دیگر لڑکیوں کے ساتھ چاند بانو بھی ہے جسے اس کے خصوصی بلاوے پر پہلی بار کوٹھے سے باہر کہیں محفل سجانے کے لیے لایا گیا ہے۔ تقریباً سب ہی بمبئی کے اس نئے چڑھتے چاند کو دیکھنے کے مشتاق تھے لیکن زمرد بائی نے بھی پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہلِ محفل کے اشتیاق کو مضطرب رکھا اور پہلے دو دیگر طوائفوں کو اہلِ محفل کے سامنے پیش کیا۔ وہ دونوں لڑکیاں کم طرح دار نہیں تھیں۔ ان کے حسن اور اندازِ رقص میں بھی کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اپنے لچکیلے بدنوں کے ساتھ ساز پر برق کی طرح اِدھر اُدھر لپکتی پھر رہی تھیں۔ اہلِ محفل نے بھی وضع داری نبھانے کو ان پر نوٹوں کی برسات کر دی تھی لیکن یہ اشتیاق اپنی جگہ تھا کہ جب یہ ایسی ہیں تو وہ کیا خوب ہو گی جس کا اتنا شہرہ تھا۔ اہلِ محفل کی کیفیت کو سمجھتی زمرد بائی چپکے چپکے مسکرا رہی تھی لیکن چاند بانو کو بلانے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔

یہاں تک کہ رقص کرتی لڑکیوں کے نازک پاؤں تھکنے لگے اور اہلِ محفل کی نوٹوں کی برسات بہت دھیمی ہو گئی تو زمرد بائی نے اشارۂ ابرو سے لڑکیوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں حسبِ روایت آداب بجا لاتی ہوئی ذرا لڑکھڑاتے قدموں سے وہاں سے ہٹیں۔ ان کے باہر نکلنے کے چند ثانیے بعد گھنگروؤں کی چھن چھن سنائی دی۔ یہ چھن چھن اس لیے بھی نمایاں تھی کہ سازندوں نے اپنے ہاتھ روک رکھے تھے اور واحد موسیقی جو وہاں سنائی دیتی تھی، اسی چھن چھن کی تھی۔ یہ کوئی معمولی چھن چھن نہیں تھی بلکہ بڑے نپے تلے انداز میں پورے سر تال کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ آنے والی اندر آئی تو سب سے پہلے حاضرین کی نظر اس کے پیروں کی جانب ہی اٹھی۔ دودھیا کبوتر کی سی رنگت والے نرم ملائم پیروں کے ناخن مہندی کی سرخی سے رنگے تھے اور نظروں کو ایسا باندھ رہے تھے کہ پیروں سے اوپر اٹھنے کی جرأت ہی نہ پاتی تھیں۔

وہ بانکپن سے چلتی وسط میں آ کر رکی تو اس کے گھنگروؤں کی تال بھی تھم گئی اور اہلِ محفل کو ذرا ہوش آیا لیکن یہ کیا......؟ انہوں نے جس حسن کی دید کے اشتیاق میں نظریں اٹھائی تھیں، وہ تو ایک بے حد بھاری کامدار سرخ دوپٹے کی اوٹ میں اوجھل تھا۔ وہ اس کی سرخ بارڈر والی سفید بنارسی ساڑی اور سرو سی قامت کو ہی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی ہاتھ پیشانی تک لے جا کر آداب کہا تو اس کی مترنم آواز نے سب کو لوٹ پوٹ کر ڈالا۔ یہاں تک کہ فاروق جو اس قسم کی محفلوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور صرف آدابِ مہمانی نبھانے کو اب تک وہاں جما بیٹھا تھا، چونک سا گیا اور ایک اشتیاق سا اس کے دل میں بھی جاگا کہ اس سرخ گھونگھٹ کے پیچھے کون سا فتنہ چھپا بیٹھا ہے لیکن وہ فتنہ بھی اتنی آسانی سے سامنے آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہاں آتشِ اشتیاق کو ہوا دینے کے لیے خصوصی انتظامات تھے۔ چنانچہ آداب کے فوراً بعد اس نے اپنا رخ سازندوں کی طرف موڑ لیا۔ وہ گویا اس کے کسی اشارے کے منتظر تھے، فوراً ہی ساز جاگ اٹھے اور ان سازوں کے درمیان اس کی شہد سی آواز گونجی۔ ایسی رسیلی اور مترنم آواز ان میں سے کسی نے شاید ہی پہلے کبھی سنی ہو۔ وہ ان سب کی طرف سے رخ پھیرے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی گا رہی تھی لیکن بہتوں کے لیے خود کو باندھے رکھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ فاروق کو بھی اس کا یہ انداز بھایا اور وہ پوری دلچسپی سے گانا سننے لگا۔ پہلا گیت ختم کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ پر

کھڑی ہوگئی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی سازندوں نے سروں کی لے بدل ڈالی۔ اس بار اس کے ہونٹ خاموش رہے لیکن اعضا نے بولنا شروع کر دیا۔ لپکتے شعلوں کی طرح رقص کرتے ہوئے بھی اس کا گھونگھٹ نہیں ہٹا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اہلِ محفل نے اس کے گداز گورے ہاتھوں کا سنگھار اور پتلی کمر کی لچک کا نظارہ کرنے کی خوش بختی حاصل کر لی۔

''بس زمرد بائی! اب صبر نہیں ہوتا۔ اس چاند کا رخِ روشن دکھا ہی ڈالو۔'' اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتا مجو دادا اس وقت تو چلا ہی اٹھا جب وہ شعلہ جوالہ اس کے بالکل قریب سے ہو کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی رسائی میں آنے سے پہلے ہی چکنی مچھلی کی طرح پھسل گئی۔

''ذرا صبر کیجیے حضور، یہ کوئی عام چاند نہیں ہے جسے آپ جب چاہیں سر اٹھا کر آسمان پر چمکتا دیکھ لیں۔ یہ زمرد بائی کے کوٹھے کا چاند ہے جو اہلِ دل خوش نصیبوں کو ہی اپنا دیدار کراتا ہے۔'' اس کے اشتیاق پر قہقہہ لگاتی زمرد بائی نے ادا سے جواب دیا تو ربن اور نانا معنی خیزی سے مسکرا دیے۔ دوسری طرف مجو خود کو اہلِ دل ثابت کرنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے نوٹ لٹانے لگا۔ ان نوٹوں کو اپنے قدموں تلے روندتی چاند بانو پورے حساب کتاب سے ناچتی رہی۔ نوٹ لٹانے والوں میں ربن دادا اور نانا سمیت دیگر بھی شامل تھے لیکن جیسی بے صبری مجو کے انداز میں نظر آرہی تھی، وہ کہیں اور نہیں تھی۔

''انہیں گر یہ گھونگھٹ گراں گزرتا ہے تو لو ہم اسے الٹ دیتے ہیں۔'' محوِ رقص چاند بانو کے ساکت ہونٹ اچانک حرکت میں آئے اور اس نے سریلی آواز میں گاتے ہوئے عین مجو کے سامنے جا کر اپنا گھونگھٹ الٹ ڈالا۔ مجو کی مشتاق نگاہوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کرنا چاہا لیکن وہاں تو اب بھی سیاہ حریری نقاب نے نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ مجو نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اس نقاب کو اس کے چہرے سے کھینچ لے لیکن وہ برق کی طرح تڑپ کر اس سے دور ہٹی اور گاتی ہوئی فاروق کے سامنے گھٹنوں کے بل جا بیٹھی۔

''حسن تو بس محبوب کے آگے ہی بے حجاب ہونے پر سرخ رو ہوتا ہے۔'' اس کے یاقوتی ہونٹوں پر یہ مصرع تڑپ رہا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر موجود نقاب کو نوچ پھینکا۔ اس کی اس ادا پر سٹپٹایا فاروق ابھی سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ کی برق گراتی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اب وہ سب کی طرف یکساں توجہ مبذول کیے گاتی اور تھرکتی پھر رہی تھی۔ چنانچہ فاروق پر پہلی خصوصی توجہ نے دلوں میں جو تکدر پیدا کیا تھا، اس کا اثر زائل ہو گیا تھا اور ہر ایک اپنی جگہ بیٹھا یہ اعتراف کر رہا تھا کہ زمرد بائی کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ اس کے کوٹھے کا چاند تو آسمان کے چاند سے بھی زیادہ چمک دار اور حسین تھا کہ اس چاند میں تو ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ سولہ سترہ سال کی نوخیزی نے الگ ستم ڈھا رکھا تھا۔ بے شک وہ زمرد بائی سے مشابہت رکھتی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ تیکھی اور دلکش تھی۔ شاید کچھ اثر باپ کے خون نے بھی دکھایا تھا اور کچھ حسن وہاں سے بھی منتقل ہوا تھا۔ آخر کچھ تو تھا نا اس نواب زادے میں کہ زمرد بائی اپنی اولین جوانی میں عین عروج کے دور میں اس پر ریجھ گئی تھی۔ بعد میں جانے اس نواب زادے کا اس کے گھر والوں نے کیا بندوبست کیا کہ وہ پلٹ کر کوٹھے کی طرف نہ آسکا۔ باپ کے عاق کرنے کی دھمکی، خاندانی عزت کے واسطے، ماں کا حق دودھ طلب کرنا، بہنوں کے آنسو اور شادی کی ہتھکڑیاں، ایسے موقعوں پر سارے ہی حربے آزمائے جاتے ہیں اور شریف و اونچے خاندان کے سپوتوں کو اپنی محبت کی قربانی دیتے ہوئے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں کہ شرفاء کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں لیکن اکثر وہ اس حقیقت سے لاعلم رہتے ہیں کہ ان کی عزت تو اصل میں کوٹھوں پر نیلام ہوئی جا رہی ہے۔

چاند بانو بھی اس وقت نوٹوں کے ڈھیر کو اپنے پیروں تلے روندتی پھر رہی تھی۔ یہ نوٹ تلووں میں نہ آتے تو کہاں جگہ پاتے کہ ان پر محوِ رقص حسینہ اس ڈھیر سے اپنے لیے چٹکی بھر عزت خریدنے کی مختار نہیں تھی اور بغیر عزت کے تو ہیرے، جواہرات، سونے چاندی کے ڈھیر سب بیکار ہوا کرتے ہیں۔ انمول سی چاند بانو بھی بے مول دولت کے ڈھیر پر اپنی ادائیں لٹا کر بالآخر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اس کے پیچھے ہی سازندے اور زمرد بائی بھی رخصت ہو گئے۔ اس موقع پر اہلِ محفل نے دیکھا کہ مجو دادا کا ایک خاص گرگا پل بھر کے لیے اس کے قریب آیا اور اس کی سرگوشی سن کر سر ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس گرگے کی واپسی ذرا تاخیر سے ہوئی لیکن کسی نے دھیان اس لیے نہ دیا کہ سب ہی اپنی اپنی جگہ ابھی تک وجد میں آئے ساکت بیٹھے تھے۔ چاند بانو کا نشہ ایسا سر چڑھ کر بولا تھا کہ دیسی اور ولایتی شرابوں کی بوتلوں سے بھی بہت کم استفادہ کیا گیا تھا اور بن پیے ہی سب کچھ بہک سے گئے تھے۔ اس موقع پر نانا کی حکمتِ عملی کام آئی۔ ایک بار پھر قہوے کا دور چلا اور اس کے بعد نانا کے انداز سے لگنے لگا کہ وہ اصل

موضوع پر گفتگو چھیڑنے جا رہا ہے۔ آخرکار اس نے لب کشائی کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اپن نے آج یہ سارا بکھیڑا اس لیے پھیلایا ہے کہ یاروں کی طرح مل بیٹھ کر سارے لفڑے نمٹالیں اور کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ آپس کی سر پھٹول سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام دکھا سکے۔ بے شک اپنے اپنے علاقے کے تھانے داروں کو پابندی سے بھتا پہنچا کر اپن انہیں آنکھیں بند رکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن کبھی وہ بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہنگامہ زیادہ ہو تو اوپر والے لاٹھی چلا کر انہیں ہماری طرف ہانک دیتے ہیں۔ ایسے میں گرفتاریوں اور سزاؤں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اس لیے اپن کا تو یہی مشورہ ہے کہ جو بھی لفڑا ہے ادھر ہی بیٹھ کر آپس میں بول کر ختم کر دو۔ اپن سمیت کسی بھی پاڑے اڈے کے دادا کو یہ اچھا نہیں لگیں گا کہ پولیس حرکت میں آئے اور سکون خراب ہو۔'' کچھ نرم کچھ تلخ لہجے میں نانا نے دونوں فریقین کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دیا۔

''اپنی طرف سے کوئی پھڈا لفڑا نہیں ہے نانا! یہ ربن دادا کے لونڈے نے ہی میرے آدمیوں کے کام میں ٹانگ اڑا کر پھڈا کھڑا کیا ہے۔ ذرا جا کر دیکھو کیا حال ہو گیا ہے ان حرام جادوں کا۔ ابھی تک زخموں کو چاٹتے اسپتال میں پڑے ہیں۔ میرے سارے پٹھے بڑے غصے میں ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو اس حال تک پہنچانے والوں کو سبق سکھائیں پر میں نے ہی روک رکھا ہے۔''

مجو دادا کے خاموش ہوتے ہی نانا نے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

''تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن غلطی تو تمہارے آدمیوں ہی کی تھی۔ انہوں نے ربن کے علاقے میں جا کر بلا اجازت کارروائی کیوں ڈالی؟'' نانا نے ثالث کا کردار نبھاتے ہوئے مجو کو ٹوکا۔

''انہیں علاقے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ظاہر ہے جب ہمارے مجرم اس علاقے میں جا کر چھپے بیٹھے تھے تو انہیں وہیں جا کر ہی تو کارروائی ڈالنا تھی۔'' مجو پر نانا کے ٹوکنے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ہٹ دھرمی سے اپنے مؤقف پر قائم رہا۔

''اس چھ سال کے لونڈے نے ایسا کیا جرم کیا تھا جو تجھے اپنے ہٹے کٹے دو سانڈوں کو اسے اٹھانے کے لیے بھیجنا پڑا؟'' اس بار ربن نے سرد لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''جرم تو اس کے دادا، دادی اور ماں کا تھا لیکن لونڈے کو اٹھانے کا میں نے اس لیے بولا تھا کہ اس کے پیچھے وہ لوگ خود ہی چلے آئیں گے اور میں اپنے علاقے میں بیٹھ کر آرام سے ان کا فیصلہ کر سکوں گا لیکن تمہارے اس لونڈے نے خامخواہ میں بات بگاڑ دی۔'' مجو نے تنفر سے فاروق کی طرف اشارہ کیا۔

''بات اس نے نہیں تمہارے آدمیوں نے بگاڑی۔ یہ صرف زبانی بات کر رہا تھا اور انہوں نے چاقو نکال کر اسے زخمی کر ڈالا۔ اس کے بعد اس کے پاس اپنا چاقو نکالنے کے سوا کیا چارہ رہ گیا تھا۔'' ربن نے فاورق کی صفائی پیش کی۔ اس کی آواز مجو کی طرح بلند نہیں تھی لیکن انداز دوٹوک تھا۔

''چاقو پہلے اس نے نکالا تھا، میرے آدمی بعد میں مجبور ہوئے۔ اس پر تم لوگوں کی طرف سے یہ زیادتی ہوئی کہ کئیوں نے مل کر صرف دو کی درگت بنا کر رکھ دی۔ بہادر کیا اس طرح مقابلہ کرتے ہیں؟'' دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے مجو دادا نے ساری صورتِ حال ہی الٹ کر رکھ دی۔

''کس نے کیا، کیا اس کی گواہی دینے والے بہت مل جائیں گے۔ تم اگر گواہوں کو نہیں مانتے تو اپنے آدمیوں کو میرے سامنے لے آؤ۔ میں ان کے حلق سے سچائی اگلوا کر سب دودھ پانی الگ کر کے رکھ دوں گا۔'' ربن دادا کی تلخ لہجے میں کہی بات نے مجو کو پل بھر کے لیے خاموش کر دیا۔ ربن کی صلاحیتوں سے اس سمیت سب ہی واقف تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے آدمی ربن کے سامنے پیش کیے تو وہ واقعی ان سے سچ اگلوا لے گا اس لیے کنی کترا گیا اور منہ بنا کر بولا۔

''ان سالوں کو کچھ کہنے کے لائق چھوڑا ہی کدھر ہے تمہارے آدمیوں نے۔ منہ، ماتھا سب سوجا ہوا ہے۔ بولنا تو دور کی بات وہ تو روٹی چبانے کے لائق بھی نہیں رہے۔ دودھ اور یخنی پر زندہ ہیں سالے۔''

یہ ٹھیک تھا کہ جامو... اور سورتی دونوں کی ربن کے آدمیوں کے ہاتھوں ٹھیک ٹھاک دھنائی ہوئی تھی لیکن غالب امکان یہی تھا کہ جو حال مجو بیان کر رہا ہے، اس میں جھوٹ کی بے پناہ آمیزش ہے۔ اس موقع پر نانا نے بحث کو طول دینے کا موقع دینے کے بجائے درمیان میں دخل اندازی کی اور بولا۔

''دیکھو یارو! جو ہوا سو ہوا۔ اپن ہوئے پر بحث کرنے کے لیے ادھر جمع نہیں ہوئے ہیں۔ اصل بات ہے آگے کی۔ اب تم دونوں آگے کی سوچو کہ آگے کیسے اس جھگڑے کو نمٹانا ہے۔''

''میرے فراری دوشیوں کو میرے حوالے کر دو بات

ختم ہوجائیں گی۔" وہاں مرنے کی وہی ایک ٹانگ تھی۔

"پہلے اگر تمہارے آدمی اڈے پر آکر اپن کو اطلاع کردیتے تو یہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ پر اب تو اپن ان لوگوں کی ذمے داری لے چکے ہیں۔ بیٹی کہہ دیا ہے اپن نے اس لڑکے کی ماں کو۔ اب تو بس یہ ہی ہوسکتا ہے کہ تو اپن کو ان لوگوں کا جرم بتادے پھر انہوں نے تیرا جو بھی نقصان کیا ہوگا، وہ اپن پورا کردے گا۔" اس کا انداز دیکھ کر ربن دادا نے بھی صاف بات کرنا ہی مناسب سمجھا۔

"ایسے کیسے تم بیٹی بول کر سب بات ختم کرسکتا ہے۔ یہ اپن کے پیسے اور عجت دونوں کی بات ہے۔ رشتہ طے ہے اپن کا اس ثریا بانو سے۔" مجو گویا پھٹ پڑا۔

"تمہارا اور ثریا بانو کا رشتہ......" ربن نے جان بوجھ کر بے پناہ حیرت کا اظہار کیا۔ یہ حیرت اپنی جگہ خود مجو کو جتا رہی تھی کہ وہ کیسی عجیب بات کررہا ہے اور سننے والے کے لیے ناقابلِ یقین ہے کہ وہ اسے مان لے۔ کہاں وہ چاند کا ٹکڑا نوعمر ثریا بانو اور کہاں بدصورتی کا نمونہ ادھیڑ عمر مجو۔

"کس نے طے کیا تھا تمہارا رشتہ؟" حیرت کے فوری اظہار کے بعد ربن نے ایسے لہجے میں سوال داغا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کون تھا وہ عقل کا اندھا جس نے ایسے بے جوڑ رشتے کی کوشش کی تھی۔

"اس کے ماما مامی نے خود ہامی بھری تھی۔ اپن کا بڑا بھاری قرض ہے ان کے سر پر۔ قرض سے جان چھڑانے کے لیے انہوں نے اس رشتے کی منظوری دی تھی۔ اپن نے بھی کہا کہ چلو ٹھیک ہے ثریا بانو کا حقِ مہر جان کر قرضہ ماپھ (معاف) کردیتا ہوں لیکن ان لوگوں نے اپنے ساتھ دھوکا کیا اور راتوں رات گھر چھوڑ کر نکل گئے۔ لیکن اپن ایسے کیسے انہیں اپنی عجت مٹی میں ملا کر جانے دے سکتا ہے۔ اب تو یہ شادی ہوکر ہی رہیں گی۔" مجو سخت غصے میں تھا۔

"ایسے کیسے دادا؟ شادی بیاہ کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں۔ تمہاری بات سے خود پتا چل رہا ہے کہ قرض کی مجبوری کی وجہ سے ان لوگوں نے ہامی بھرلی تھی لیکن دل سے راضی نہیں ہوئیں گے اس لیے موقع دیکھ کر بھاگ نکلے۔ ابھی تم اس شادی وادی کی بات کو جانے دو اور اپنی بات توجہ سے سنو۔ اپن ثریا بانو کو بیٹی بولا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کسی کے ساتھ اس کی شادی نہیں بنا سکتا۔ ہاں اپن تمہارا قرض ضرور اتار سکتا ہے۔ بولو تمہارا کتنا رقم دینے کا ہے، وہ اپن نانا کو ضامن بنا کر ابھی کے ابھی دے دیتا ہے۔ اس کے بعد تمہارا ثریا بانو اور اس کے گھر والوں سے کچھ لینا دینا نہیں رہیں گا۔" ربن کی پیشکش یقیناً مجو کے لیے دھماکا خیز تھی۔ یقیناً وہ امید نہیں کررہا تھا کہ ایک اجنبی لڑکی کے لیے ربن اس حد تک چلا جائے گا۔ وہ کچھ پل کے لیے چپ ہو گیا لیکن پھر تلملا کر بولا۔

"تم اپن کی عجت کا سودا کررہا ہے۔ اپن بولا کہ ثریا بانو سے اپنا رشتہ طے ہے۔ اپن کا دل ہے اس کے اوپر۔ اپن اسے کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔"

"دل کی بات مت کرو دادا۔ تمہارے دل کا حال تو اپن نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی دیکھا۔ لوٹ پوٹ ہوئے جارہے تھے تم چاند بانو کے قدموں میں۔ محفل کے بعد بھی تم نے اپنے چیلے سے اسے پیغام بھجوایا تھا جس کا اس نے کوئی اچھا جواب نہیں دیا۔ اب بولو اپن جس لڑکی کو بیٹی بولا ہے، اسے تم ایسے دل پھینک آدمی کے نکاح میں کیسے دے سکتا ہے۔ پہلے تم سے کسی نے بھی ہامی بھرا ہو، پر اب اپن ثریا بانو کا باپ ہے اور ربن کو یہ رشتہ منظور نہیں۔ ویسے تو اپن کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہامی وامی کسی نے نہیں بھرا تھا۔ اپن یہاں آنے سے پہلے پوری جانکاری لے کر آئے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑو اور روکڑا لے کر یہ بات ادھری ختم کردو۔ ثریا بانو تک جانے کا راستہ تمہارے لیے بند ہے۔" اس بار ربن کے لہجے میں جو گھن گرج تھی، اس نے سب پر اس کے موڈ کو جتا دیا۔ نانا نے اسے تھوڑا نرم رہنے کی تنبیہ کے لیے خاموشی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر دھیرے سے دبایا۔

"یہ بات ہے تو اپن بھی دیکھتا ہے کہ کون مائی کا لال اپنے کو روک پاتا ہے۔ اپن بھی تمہیں ثریا بانو سے شادی بنا کر دکھائے گا۔" مجو اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ غصے کی زیادتی سے اس کے چہرے کی سیاہی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔

"ادھر آرام سے بیٹھ دادا۔ اپن نے جھگڑا ختم کرنے کے واسطے تم دونوں کو ادھر بلایا ہے۔ تم دونوں ایسی منہ ماری کریں گا تو معاملہ کیسے نمٹیں گا؟" نانا بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مجو کے شانوں پر زور دے کر اسے بٹھانے لگا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی اس کے ساتھ آئے چیلے بھی خطرناک تیوروں کے ساتھ کھڑے ہوگئے تھے۔

"اپن ادھر بیٹھ کر کیا کریں گا؟ تم اپنے ساتھ انصاف کی بات کرو تو اپن بیٹھتا بھی ہے۔" مجو کے تیور بدستور بگڑے ہوئے تھے۔

"تم ذرا ٹھنڈے دل، دماغ سے سوچو تو عقل اور انصاف کی بات تو یہی ہے کہ جو عورت تم سے شادی کرنا نہیں

مانتی، اس کی ضد چھوڑ دو۔ رضا مندی کے بغیر اسے اپنا کر تمہیں کیا ملیں گا۔ تو نے بزرگوں کا وہ قول نہیں سنا ہے کیا کہ عورت مانے تو آپ سے، ورنہ اپنے باپ سے بھی نہیں مانتی۔'' نانا اسے سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''اپن کی بدھی میں ابھی یہ سب نہیں آنے والا ہے۔ ربن دادا نے اپن کو چیلنج کیا ہے کہ اپنے کو ثریا بانو تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اپن یہ چیلنج قبول کرتا ہے۔ اپن بھی اس کی منہ بولی بیٹی سے شادی بنا کر دکھائے گا اور وہ بھی بہت جلد۔'' مجو نے اپنے شانوں پر سے نانا کے ہاتھ ہٹائے اور تن فن کرتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے اس طرح روانہ ہونے سے نانا نے توہین محسوس کی لیکن ربن اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھ آنے والے فاروق وغیرہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

''سالا بالکل جناور (جانور) ہے۔ انسان کا جنا تو لگتا ہی نہیں۔'' نانا غصے میں بڑبڑاتا ہوا اپنی جگہ پر واپس بیٹھا۔

''جانے دو نانا۔ اپن نے تو ادھر ہی بیٹھے بیٹھے اس کو پورا ناپ تول لیا تھا۔ اپن سمجھ گیا تھا کہ یہ سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ اتنی بات بھی اس سے صرف تمہاری خاطر کیا کہ تمہارے دل میں یہ شکوہ نہ آئے کہ ربن نے تمہاری بات کا پاس نہیں کیا اور تمہاری اتنی محنت اکارت کر دی۔'' اب ربن ملائم لہجے میں نانا کو سمجھا رہا تھا۔

''اپن اس کو ایسا نہیں سمجھا تھا۔ اپن نے سوچا تھا کہ وہ اپنے ساتھ پرانے تعلق کا خیال کریں گا۔ لیکن اس کی آنکھوں پر تو سور کا چربی چڑھ گیا ہے۔'' نانا اب بھی افسردہ تھا۔

''ہوتا ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی برسوں میں سامنے والے کو نہیں پہچان پاتا پر جب کسی دن اچانک اس کی اصلیت سامنے آتی ہے تو اپنی ہی سمجھ بوجھ پر شک کرنے لگتا ہے۔ تم نے زندگی میں بہت تجربے حاصل کیے ہوں گے، ایک یہ بھی سہی۔''

ربن اپنے مخصوص لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے کسی کو یہ اندازہ ہوتا کہ وہ مجو دادا کی دھمکی پر تشویش کا شکار ہے۔ مجو کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچھ دیر مزید وہاں بیٹھا پھر نانا سے اجازت چاہی۔ نانا نے اسی عزت و احترام سے انہیں رخصت کیا جیسے پاڑے آمد کے موقع پر استقبال کیا تھا۔ باہر ٹم ٹم ان کی منتظر تھی۔ ٹم ٹم والا بھی پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ وہ سب سوار ہو گئے تو اس نے ٹم ٹم آگے بڑھائی۔ ابھی ٹم ٹم نے رفتار نہیں پکڑی تھی کہ ایک آدمی بائیں جانب سے بالکل کونے پر بیٹھے فاروق سے یوں ٹکرایا جیسے چلتے چلتے اتفاق سے لڑکھڑا گیا ہو۔ فاروق نے چونک کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ آدمی خود ہی سنبھل کر فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد فاروق نے اپنی نظریں پھیریں تو اپنی گود میں گلابی رنگ کا ایک تہ کیا ہوا کاغذ پڑا دیکھا۔ وہ ٹپٹا گیا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف سے غافل اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ موضوعِ گفتگو نانا کی پرتکلف دعوت اور مجو کا رویہ تھا۔ قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے فاروق نے اس گلابی کاغذ کو چپکے سے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ان لوگوں کے ساتھ شاملِ گفتگو ہو گیا۔ گلابی کاغذ کے بارے میں بے پناہ تجسس کے باوجود اس نے کسی سے اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ وہ جس انداز میں اس تک پہنچایا گیا تھا، اس سے واضح تھا کہ یہ صرف اس کے لیے ہے اور اسے بھیجنے والے کی خواہش کا اتنا پاس تو رکھنا ہی تھا۔

☆☆☆

جولیٹ کی زندگی عجیب مصیبت میں آ گئی تھی۔ دلدار آغا کے انٹرویو کے لیے جانا اس کے لیے عذاب بن گیا تھا کیونکہ اس انٹرویو کے بعد وہ شخص جونک کی طرح اس کی جان سے چمٹ گیا تھا۔ تحائف، پیغامات اور ٹیلی فون کالز کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ تھا جس کا دلدار آغا کی طرف سے آغاز ہو گیا تھا۔ تحائف اور پیغامات عموماً گھر کے پتے پر آتے تھے جبکہ ٹیلی فون کالز دفتر میں کی جاتی تھیں اور اسے دونوں ہی جگہوں پر موجود لوگوں کی سوالیہ نظروں کا جواب دینا دوبھر ہو گیا تھا۔ ابتدا میں اس نے جوزفین پر کچھ ظاہر نہیں کیا لیکن ہر روز کے سلسلے نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسے سچائی بتا دے۔ جوزفین جو پہلی بار تحائف آنے پر ہی ٹھٹک گئی تھی، صورت حال سامنے آنے پر مزید متوحش ہو گئی اور اس نے جولیٹ کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں ثنا کو اپنے اعتماد میں لے کیونکہ بیوی کی حیثیت سے وہی دلدار آغا کو نکیل ڈال سکتی تھی۔

جولیٹ نے ماں کے اس مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ثنا کے میکے سے اسے اطلاع ملی کہ وہ واپس سسرال جا چکی ہے اور ظاہر ہے آغا ہاؤس میں اس سے رابطہ کرنا جولیٹ کے لیے آسان نہیں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے وہاں کا پوسٹل ایڈریس حاصل کیا اور ثنا کے نام ایک خط روانہ کر دیا۔ خط میں اس

نے دلدار آغا کی حرکتوں کے بارے میں تو کھل کر کچھ نہیں لکھا تھا لیکن اتنا ضرور جتایا تھا کہ اس کے شوہر کا انٹرویو لینے کے بعد وہ ایک بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے اور اس مشکل سے نجات کے لیے ثنا کی مدد کی طلب گار ہے۔ اس نے اپنے دفتر کا ٹیلی فون نمبر لکھ کر ثنا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سے فون پر رابطہ کرلے لیکن اس خط کے جواب میں نہ تو ثنا نے اسے فون کیا تھا اور نہ ہی کسی اور طرح کا ردعمل ظاہر ہوتا تھا جس سے یہ پتا چلتا کہ ثنا تک اس کا خط پہنچ گیا ہے۔ ثنا نے اس کا خط پڑھنے کے بعد اسے نظرانداز کردیا ہو اس بات کا امکان بہت کم تھا اور اسے یہی خدشہ تھا کہ خط کو ثنا تک پہنچنے ہی نہیں دیا گیا ہوگا۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے طرزِ زندگی سے اسے بھی واقفیت تھی۔ کہنے کو یہ لوگ کتنے ہی ماڈرن اور تعلیم یافتہ ہوتے اور اپنی بیویوں کو کتنی ہی آزادی دے دیتے لیکن بہرحال سارے اختیارات ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ ایسے میں بہت ممکن تھا کہ ثنا کے نام آنے والی ڈاک بھی چیکنگ کے مرحلے سے گزرے بغیر براہِ راست اس تک نہ پہنچتی ہو اور جولیٹ کے خط کو تو لازماً ہی روک لیا گیا ہوگا۔ موجودہ حالات میں جولیٹ کے پاس بس اتنا ہی اختیار تھا کہ اپنے نام گھر پر آنے والے تحائف اور پیغامات کو وصول کرنے کے بجائے جوں کا توں واپس لوٹا دے چنانچہ وہ یہی کررہی تھی لیکن بھیجنے والے کی طرف سے بھی بڑی مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔

اب تو یہ معاملہ جوزف کے علم میں بھی آگیا تھا لیکن وہ بھی ان ماں بیٹی کی طرح پریشان ہونے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ اس جیسے معمولی آدمی کی دلدار آغا کے سامنے حیثیت ہی کیا تھی کہ وہ اس کے خلاف کوئی ایکشن لے سکتا، ہاں اس نے یہ تجویز ضرور پیش کی تھی کہ وہ براہِ راست دلدار آغا سے مل کر اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ان جیسے غریب لوگوں کو اپنی ان عنایات سے محفوظ رکھے لیکن جولیٹ اور جوزفین دونوں نے ہی اس تجویز کو قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ دولت کے زعم میں مبتلا شخص کے لیے ایک غریب آدمی کی درخواست اس کے اظہارِ بے بسی سے زیادہ کوئی حیثیت نہ پاسکے گی اور وہ جوزف کو دلدار آغا کے سامنے بے عزت ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

فی الحال تو یہی سوچا گیا تھا کہ اس معاملے کو جوں کا توں چلنے دیا جائے، آخر ایک دن تو دلدار آغا مایوس ہوگا اور اس کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ پاکر پیچھے ہٹ جائے گا۔ دفتر میں آنے والے اس کے فون پر بھی جولیٹ نے دبے لفظوں میں اسے بہت کچھ باور کروادیا تھا لیکن کھل کر کوئی بات اس لیے نہیں کرسکی تھی کہ اتفاق سے ہر بار فون آنے پر رندھاوا اپنی سیٹ پر موجود ہوتا تھا اور وہ رندھاوا پر کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ آغا کو کھری کھری سنانے کی خواہش دل میں رکھنے کے باوجود ہر بار اس سے نرم لہجے میں بات کرنے پر مجبور ہوجاتی تھی۔ بات بھی کیا کرتی تھی بس اتنا ہی کہہ پاتی تھی کہ اس کی طرف سے جو کچھ بھی کیا جارہا ہے، وہ اس کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے پھر اپنی دفتری مصروفیت کا عذر کرکے سلسلہ منقطع کردیتی تھی۔ اس پر بھی اسے لگتا تھا کہ رندھاوا کی معنی خیز نظریں اس کے جسم کو چھید رہی ہوں۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ جولیٹ کے لیے دفتر میں آنے والی فون کالز کس کی ہیں لیکن ان کالز کی معنی خیزی کو تو سمجھتا تھا۔ جولیٹ کو رندھاوا کی ان جتاتی نظروں سے شدید الجھن ہوتی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ دلدار آغا کی طرح رندھاوا پر بھی اس کا کوئی زور نہیں تھا۔ آج بھی چپڑاسی کی طرف سے فون کی اطلاع سن کر وہ بے جان قدموں سے رندھاوا کے کمرے کی طرف گئی تو یہ دیکھ کر خوش ہوگئی کہ رندھاوا اپنی سیٹ پر موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ رندھاوا کی غیر موجودگی میں وہ کھل کر دلدار آغا پر اپنی بھڑاس نکال سکتی تھی۔ چنانچہ ذرا جوش سے ریسیور اٹھایا۔

''کیسی ہو جانِ من! تمہاری آواز سنے دو دن ہوگئے تھے اس لیے دل بہت اداس ہورہا تھا، سوچا فون ہی کرلوں۔'' دوسری طرف آغا اپنی پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ موجود تھا۔

''شٹ اپ۔ بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تم جیسا گھٹیا آدمی میں نے ساری زندگی نہیں دیکھا۔ کیا تمہیں اتنے دنوں میں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ مجھے تم سے یا تمہاری دولت سے کوئی غرض نہیں ہے اور میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو ایسی حرکتوں سے انسپائر ہوکر اپنا آپ کسی کے بھی حوالے کردیں۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔'' اس نے موقع ملتے ہی ایک سانس میں آغا کو بہت کچھ سناڈالا۔ جواب میں آغا ایسے ہنسا جیسے کسی بچے کی طفلانہ حرکت پر ہنسا ہو پھر بولا۔

''کیا بگاڑ سکتی ہو تم میرا؟ ثنا کے نام خط لکھ کر دیکھ تو چکی ہو۔ کیا نتیجہ نکلا اس خط کا؟'' آغا کی بات نے اسے باور کروادیا کہ اس کا ثنا کو لکھا گیا خط پکڑا گیا ہے۔

''مت بھولو میں ایک صحافی ہوں۔ میں اپنے قلم سے

تمہارے کرتوت دنیا کے سامنے کھول سکتی ہوں۔ میرے پاس ثنا کے میکے والوں کو تمہارے کردار سے آگاہ کرنے کا آپشن بھی ہے۔ خود سوچ لو کہ اگر میں نے ایسا کچھ کر دیا تو تمہاری کیا عزت رہ جائے گی۔'' جولیٹ نے نہایت سخت لہجے میں اسے دھمکایا۔

''اوہ کم آن بے بی۔ ان ساری بچکانا حرکتوں سے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ کسی اخبار کے مالک کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ میرے خلاف ایسی کوئی خبر چھاپ سکے، تم چاہو تو تجربے کے طور پر ایسی کوشش کر سکتی ہو۔ رہی ثنا کے میکے والوں کو مطلع کرنے کی بات تو وہ لوگ اتنی حیثیت نہیں رکھتے کہ مجھ سے کسی قسم کی باز پرس کر سکیں۔ انہوں نے کئی پروجیکٹس میں میرے ساتھ پارٹنر شپ کر رکھی ہے اور جانتے ہیں کہ اگر میں نے ان پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تو میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن ان کا دیوالیا نکل جائے گا۔ ویسے بھی ہماری جیسی فیملیز میں مردوں کو اس طرح کی باتوں پر سرزنش کرنے کا رواج نہیں ہوتا۔ تم ثنا کی فیملی کو مجھ سے زیادہ اچھی طرح نہیں جانتیں۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنی مرضی سے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں اور خاندانی بیوی اپنی جگہ ہے۔ چھوٹا کہنے کو بیچلر ہے لیکن گرل فرینڈز اور رکھیلوں کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسے لوگ کس منہ سے مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ مانو تو اس قسم کی حماقتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے میری آفر پر غور کرو۔ ساری زندگی عیش سے رہو گی۔'' وہ اس کی کسی بھی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر ڈھٹائی سے اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''کس آفر پر غور کروں؟ ساری زندگی خفیہ بیوی بن کر رہنے کی یا تمہارے لیے رکھیل کا کردار ادا کرنے کی؟'' جولیٹ نے غصے سے بل کھاتے اس سے دریافت کیا۔

''اگر تمہیں خفیہ بیوی بننا منظور نہیں تو میں کھل کر سب کے سامنے یہ شادی کر سکتا ہوں۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟'' وہ یوں اس سے مخاطب ہوا جیسے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہو۔

''شٹ اپ آغا..... شٹ اپ۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی ہی فرینڈ کی سوکن بننا قبول کر لوں گی۔ ویسے بھی میری کسی اور کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔ میں اپنا لائف پارٹنر سلیکٹ کر چکی ہوں اس لیے تم ایسی کسی غرض سے آئندہ مجھ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش بالکل مت کرنا۔'' غصے کی زیادتی کے باعث اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ البتہ آغا ہنوز پرسکون تھا۔ اب بھی اطمینان سے بولا۔

''شاید تم اپنے اس دو ٹکے کے کولیگ عارف کی بات کر رہی ہو جو اپنی چار عدد بدصورت بہنوں کو بیاہنے کے چکر میں خود بھی بوڑھا ہو جائے گا اور تمہاری جوانی کو بھی برباد کر دے گا۔ نہ میری جان! تمہارے جیسا حسن ایسے کنگلوں کے لیے برباد کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ تمہیں تو ہمارے جیسے کسی قدر دان کی ضرورت ہے۔'' اپنی گفتگو سے وہ ثابت کر چکا تھا کہ کسی قسم کی لعن طعن یا برے بھلے سے متاثر ہونے والا نہیں ہے اس لیے جولیٹ نے اس سے مزید گفتگو کو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور ریسیور پٹخ کر رندھا ہوا کمرے سے باہر نکل گئی۔ آغا سے ہونے والی گفتگو نے اس کا موڈ بے حد خراب کر دیا تھا اور چہرے پر محسوس کی جانے والی سرخی تھی۔ خود کو پرسکون کرنے کے لیے اس نے چپڑاسی سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا کر پیا۔ اس کے بعد کوشش کر رہی تھی کہ کام پر توجہ مبذول کر سکے کہ عارف اس کے سامنے آن بیٹھا۔

''اینی پرابلم؟'' اس کے چہرے کے تاثرات پر نظریں جمائے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نو...... نو...... کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ایوری تھنگ از آل رائٹ۔'' جولیٹ نے کوشش کی کہ اس کا لہجہ ہموار رہے۔ آغا والی پریشانی اس نے عارف کے ساتھ شیئر نہیں کی تھی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ پریشانی کی کسی بات کا ذکر عارف کے سامنے نہ کرے۔ وہ پہلے ہی اپنے ذاتی مسائل کی وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتا تھا اس لیے وہ اسے مزید پریشان کرنے سے گریز کرتی تھی۔

''پرابلم نہیں ہے تو یہ کون ہے جو آئے دن تمہیں فون کرتا رہتا ہے؟'' حسب عادت عارف نے استحقاق سے پوچھا۔ جولیٹ کو اس کا خود پر حق جتانا برا نہیں لگتا تھا لیکن اس وقت عارف کے لہجے میں حق کے ساتھ ساتھ شک کی بھی جھلک تھی جو اسے اچھی نہیں لگی لیکن بہرحال وہ ایک صلح جو لڑکی تھی جو بدمزگی کو بڑھانا پسند نہیں کرتی تھی اس لیے نرمی سے بولی۔

''یہ ڈیڈی کے کوئی ریلیٹو ہیں۔ برسوں سے ان کا ڈیڈی سے ملنا جلنا نہیں ہے۔ اب اچانک انہیں ڈیڈی کی یاد آگئی ہے اور کہیں سے دفتر کا فون نمبر بھی حاصل کر لیا ہے تو بار بار فون کر کے مجھ سے ریکویسٹ کرتے رہتے ہیں کہ میں ڈیڈی کو ان سے ملنے کے لیے راضی کر لوں لیکن ڈیڈی ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ اب بھی میں ان صاحب کو یہ بات سمجھا

رہی تھی لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے اس لیے مجھے تھوڑا سا غصہ آگیا اور بس۔'' جولیٹ نے اپنی طرف سے اسے مطمئن کرنے کے لیے ایک اچھی کہانی سنا ڈالی لیکن اگلے ہی لمحے عارف کے منہ سے نکلنے والے جملے نے اسے احساس دلایا کہ وہ کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔ عارف اپنی... بےپناہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''کمال ہے، ایسا کون سا خزانہ آگیا ہے تمہارے ڈیڈی کے پاس کہ برسوں بعد ان کے کسی رشتے دار کے دل میں ان کے لیے ایسی محبت جاگ اٹھی ہے۔ بغیر مطلب کے تو یہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا ہے۔ سچ بتاؤ کیا چکر ہے؟''

''چکر کیا ہونا ہے۔ جو بات تھی، وہ میں نے تمہیں بتا دی۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم مانو یا نہ مانو۔'' اس بار جولیٹ نے بھی ذرا بگڑ کر جواب دیا۔ اس کے بگڑنے پر عارف سنبھل گیا۔

''سوری یار! میرا مطلب تمہیں جھٹلانا نہیں تھا۔ میں تو بس دنیا کے چلن کی بات کررہا تھا کہ یہاں کوئی بنا مطلب کے کب کسی کو پوچھتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے ڈیڈی کے ان رشتے داروں نے تمہیں دیکھ لیا ہو اور سوچا ہو کہ اتنی خوب صورت لڑکی کو اپنی فیملی کا حصہ بنالینا چاہیے اسی لیے وہ تمہارے ڈیڈی کی اتنی خوشامدیں کررہے ہوں۔ ایسے میں، میں غریب تو مارا جاؤں گا نا۔'' مسمسی صورت بنا کر اس نے کچھ شوخ انداز میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن جولیٹ جو پہلے ہی دلدار آغا کی وجہ سے خاصے تکدر کا شکار تھی، زیادہ متاثر نہیں ہوسکی اور سنجیدہ تاثرات کے ساتھ بولی۔

''ایسی صورت میں بھی تمہیں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو ہمارے ہاں فرسٹ کزنز میرج کا رواج نہیں ہے اور بالفرض ہوتا بھی تو تم سے کمٹمنٹ کے بعد کیا میں ایسا کرنے کے لیے ایگری ہوسکتی ہوں، لیکن تم یہ بات شاید سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ تم مجھے ہی اچھی طرح نہیں سمجھتے ہو۔'' اتنے برسوں کے ان کے تعلق میں یہ پہلا موقع تھا جو جولیٹ، عارف سے ایسے سخت لب و لہجے میں بات کررہی تھی۔ اس میں کچھ ہاتھ دلدار آغا کی وجہ سے پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا تھا تو کچھ عارف کی بداعتمادی کا۔ عارف کو احساس ہوگیا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے اس لیے شرمندہ سے تاثر کے ساتھ بولا۔

''آئی ایم ویری سوری جولی۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا...

''اٹس او کے۔'' حسب مزاج جولیٹ نے بھی بات کو مزید بڑھانے سے گریز کیا لیکن اس کا شیشے کا سا دل کتنا متاثر ہوا ہے، یہ بات عارف نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اسی پر خوش تھا کہ بات ایک معمولی سی ''سوری'' پر ختم ہوگئی ہے۔

☆☆☆

فاروق حسب عادت صبح سویرے جاگ گیا تھا۔ برسوں کا صبح خیزی کا معمول رات نانا کے پاڑے پر ہو جانے والی تاخیر کے باوجود متاثر نہیں ہوا تھا۔ رات انہیں واپس آنے کے بعد بھی فوری طور پر سونے کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اڈے پر سب ہی ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے کہ مجو سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل جان سکیں۔ انتظار میں جاگنے والوں کے خیال سے واپس آنے کے بعد بھی کافی دیر تک محفل جمی رہی۔ ربن دادا نے اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات بھی جاری کیں۔ مجو کے تیور دیکھتے ہوئے وہ بہت محتاط ہوگیا تھا اور اپنے آدمیوں کو دن رات ہوشیار رہنے اور خصوصیت سے ثریا بانو کے گھر کے اطراف پہرا دینے کا حکم سنایا تھا۔ ان سارے معاملات سے نمٹنے کے بعد فاروق سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو اسے واسکٹ کی جیب میں پڑے گلابی رقعے کا دھیان تک نہیں تھا۔ صبح اٹھ کر بھی وہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگیا۔

گھڑی کی سوئی کے ساتھ بندھا وہ جولیٹ کی دفتر روانگی کے وقت تک نہا دھو کر تازہ دم ہو چکا تھا اور اس جھروکے میں جا کھڑا ہوا تھا جہاں سے وہ اسے گزرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ جلد ہی وہ اسے نظر آگئی۔ آج اس نے اسکرٹ کے بجائے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ لباس وہ بہت کم پہنتی تھی لیکن اس پر جچتا بہت تھا۔ آج بھی سانچے میں ڈھلے بدن پر آسمانی رنگ کی بالکل سادہ ساڑی غضب ڈھا رہی تھی۔ بال جوڑے کے انداز میں بندھے تھے۔ البتہ کچھ سیاہ لٹیں آزاد ہو کر گلابی رخساروں کو چومنے کا شرف حاصل کررہی تھیں۔ فاروق کے لیے اس کی خوب صورتی اور جامہ زیبی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ نیا وہ احساس تھا جو اس کے دل کو تشویش میں مبتلا کررہا تھا۔ بظاہر تر و تازہ اور شاداب نظر آنے والی جولیٹ کے چہرے پر آج کل اسے پریشانی کے سائے منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وہ کسی مسئلے کا شکار ہے۔ اس کی پریشانی کا خیال خود فاروق کے لیے سوہانِ روح تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح اس وجہ کو دور کردے جس نے اسے پریشان کر رکھا ہے لیکن مجبوری تھی کہ اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود وہ ایسا کوئی حق

نہیں رکھتا تھا کہ اس سے اس کی پریشانی کا سبب معلوم کر سکے بلکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ اسے بری طرح جھڑک کر رکھ دے گی۔ وہ جو اس کا اپنی راہ میں کھڑے ہونا گوارا نہیں کرتی تھی، مخاطب کیا جانا کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ سو برداشت فاروق کو ہی کرنا تھا اور اس اذیت کو خاموشی سے سہنا تھا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ جولیٹ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ اس اذیت کو سہتا اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ وہاں گولو باداموں والا دودھ لیے اس کا منتظر تھا۔

”یہ نہیں پیوں گا میں۔ میرے لیے چائے لے آؤ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو گولو نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اس کے تیور دیکھتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فاروق آنکھیں موند کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے طور پر جولیٹ کی پریشانی کی وجہ پر غور کرنے لگا لیکن سوچنے سے کیا ہوتا تھا۔ اسے جولیٹ کے حالات و معمولات سے واقفیت ہی کتنی تھی کہ وہ اس کی پریشانی کی درست وجہ کا تعین کر پاتا۔ بس ادھیڑبن میں بیٹھا رہا اور گولو چائے سمیت واپس بھی آگیا۔

”چائے پی لیں فاروق بھائی۔“ اس نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ گولو چائے ایک نزدیکی تپائی پر رکھ چکا تھا اور اب کھونٹی پر سے اس کے میلے کپڑے اتار رہا تھا۔ کمرے کی صفائی اس نے فاروق کی عدم موجودگی میں پہلے ہی کرلی تھی۔ اس کے تمام کام وہ اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا تھا اور اس بات کا پورا دھیان رکھتا تھا کہ دھوبی کے ہاں سے اس کے کپڑے پابندی سے دھل کر اور استری ہوکر آتے رہیں۔ کپڑوں کے ساتھ وہ چپلوں اور جوتوں کی صفائی اور چمک دمک کا بھی پورا خیال رکھتا تھا۔ یہ اس کی ہی مہربانی تھی کہ نفاست پسند فاروق کو کبھی ان معاملات میں ازخود زحمت نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس وقت بھی اس نے بڑی مستعدی سے میلے کپڑے جمع کر کے ان کی جیبوں کو چیک کیا اور ان سے نکلنے والی اشیا بستر کے سرہانے رکھی چھوٹی میز پر قرینے سے رکھ دیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ میلے کپڑے لے کر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو فاروق کی نظر اپنے بٹوے کے قریب رکھے گلابی رقعے پر پڑی۔ فطری تجسس کے تحت اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ رقعہ اٹھالیا۔ گلابی کاغذ پر نیلی روشنائی سے بہت خوب صورت لکھائی میں بس مختصر سی تحریر موجود تھی۔ آداب کے بعد اسے بنا نام کے مخاطب کیے بس اتنا لکھا تھا۔

”لوگ کہتے ہیں ہم جس محفل میں جائیں اسے لوٹ لیتے ہیں لیکن کل تو آپ کے ہاتھوں ہم خود لٹ گئے۔ کنیز کو کسی قابل جانیے تو کسی روز شرفِ ملاقات عنایت کیجیے۔ دل ونظر ہردم فرشِ راہ رہیں گے۔“

تحریر کے آخر میں بھی نام لکھنے کے بجائے بس ایک ننھا سا چاند بنایا گیا تھا۔ فاروق کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ تانا کے پاڑے پر برق کی طرح کوندتی چاند بانو کا پیام ہے۔ اس کے لیے ایسے کسی پیغام میں کوئی کشش موجود نہیں تھی۔ وہ چاند بانو کے حسن سے انکاری نہیں تھا لیکن سرِعام ناچنے والے حسن کی قدردانی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ عورت کا یہ روپ اس کے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں رہا تھا۔ چنانچہ چاند بانو کے پیغام کو کیا اہمیت دیتا۔ لمحہ بھر کے اندر ہی وہ گلابی کاغذ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر ردی کی ٹوکری میں پڑا تھا اور بے نیاز سا فاروق گولو کی لائی چائے کے گھونٹ لے رہا تھا۔

باقی کے دن میں بھی اس کے دل میں اس نامے کا خیال نہیں آیا البتہ جولیٹ کی شکل ضرور نظروں میں گھومتی رہی۔ کئی بار اس نے قدم اٹھائے کہ جاکر جولیٹ کے دروازے پر دستک دے اور اس کی ماں جوزفین سے مل کر کچھ جاننے کی کوشش کرے لیکن ہر بار ہی چند قدم چلنے کے بعد پیروں میں جھجک کی زنجیر پڑگئی اور وہ واپس پلٹ آیا۔ اڈے پر ربن کی الگ مصروفیت تھی۔ اس نے محلے کے چند بزرگوں کو مدعو کرنے کے بعد ان کے سامنے ثریا کا مسئلہ کچھ اس طرح رکھا تھا کہ وہ سب ہی اس مظلوم لڑکی سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ربن کے اس موقف کی تائید کررہے تھے کہ ثریا بانو کو تحفظ دینا ضروری ہے۔ البتہ وہ اس بات سے خوف زدہ تھے کہ کسی غنڈے سے مقابلہ کیونکر کرسکیں گے۔ اس سلسلے میں ربن نے انہیں اطمینان دلایا کہ اسے ان کا صرف اخلاقی تعاون درکار ہے، باقی ساری ذمے داری اس کی اور اس کے آدمیوں کی ہوگی۔ ان سب نے ربن کے ساتھ جاکر ثریا بانو کے ساس سسر سے بھی ملاقات کی۔ بستر سے لگا سسر بے چارہ تو مشکل سے ہی چند الفاظ بول پایا تھا لیکن پردے کے پیچھے موجود ساس نے خوب اپنی زبان کے جوہر دکھائے تھے۔ وہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنی بیوہ بہو کو کوسنے سے بھی باز نہیں آئی تھی کہ بقول اس کے ان کی ساری پریشانیوں کا سبب منحوس بہو ہی تھی۔ تاہم اس بات پر اسے بھی تسلی ہوئی تھی کہ اڈے والوں کے ساتھ ساتھ محلے والے بھی ان مشکل حالات میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس ساری کارروائی کا خاموشی سے جائزہ لیتے فاروق

کا دل چاہا کہ وہ دادا سے جولیٹ کی پریشانی کا بھی ذکر کرے کہ شاید دادا کے پاس کوئی حل موجود ہو لیکن بات وہی تھی کہ وہ دادا کو بتاتا بھی تو کیا بتاتا۔ خود اپنے احساس کے سوا اس کے پاس کہنے کو تھا ہی کیا، سو دل پر جبر کیے خاموش ہی رہا۔

''کیا ہے رے...... کچھ بات ہے کیا؟'' ربن نے ایک بار اس سے پوچھا بھی لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ ربن بھی زیادہ ہی مصروف تھا کہ اس سے اصرار کر کے پوچھ نہ سکا۔ یوں صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ پہرے پر موجود افراد کے علاوہ سب سونے کے لیے بستروں پر جا پڑے۔ فاروق نے بھی اپنا بستر سنبھال لیا لیکن گزشتہ رات کی... کم خوابی کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے دفتر سے واپسی میں بھی جولیٹ کو دیکھا تھا اور اندازہ لگایا تھا کہ وہ صبح کے مقابلے میں مزید پریشان اور دل گرفتہ ہے۔ اسے خیال گزرا کہ ممکن ہے پریشانی کا سبب کوئی دفتری مسئلہ ہو لیکن بے چینی تو اس جگہ بھی اور اس وقت تک رہنی تھی جب تک خود جولیٹ شانت نہ نظر آنے لگتی۔ وہ نیند سے محروم آنکھیں لیے وقت گزاری کے لیے ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ گو کہ لفظ اس کے ذہن پر کچھ نقش کیے بغیر خاموشی سے صفحہ در صفحہ گزرتے رہے لیکن وہ پوری استقامت کے ساتھ کتاب سے چمٹا رہا۔ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی چلی گئی۔ یک دم ہی رات کے اندھیرے میں ایک تیز سیٹی گونجی۔ وہ کتاب ایک طرف ڈال کر تیزی سے بستر سے اٹھا۔ یہ سیٹی بے مقصد نہیں تھی اور اس کے ساتھیوں میں سے ہی کسی نے خطرے کا اعلان کرنے کے لیے بجائی تھی۔ اس نے لپک کر اپنی قمیص پہنی اور چاقو جیب میں ڈال کر باہر نکلا۔ اس دوران مزید سیٹیوں کی آوازیں بھی بلند ہوئی تھیں اور پورے اڈے میں جگار ہو گئی تھی۔

وہ بیرونی دروازے سے باہر نکلا تو اس کے پیچھے کئی اور بھی موجود تھے۔ باہر نکل کر صورتِ حال معلوم کی تو پتا چلا دو طرف سے حملہ ہوا ہے اور اچھی خاصی تعداد میں افراد نے ثریا بانو کے گھر کی جانب بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اڈے کے لوگ ہوشیار نہیں ہوتے تو آنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے کیونکہ وہ بھرپور تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ لمحوں میں وہاں کہرام مچ چکا تھا، ہر طرف آوازیں تھیں۔ للکارتے، پکارنے، چیخنے، کراہنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں...... محلے والے بھی جاگ چکے تھے لیکن ڈر کے مارے دروازے بند کیے اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ویسے بھی ربن دادا نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہر طرح کی ہنگامی حالت سے وہ خود نمٹیں گے اور محلے والوں کو بس اتنا کرنا ہوگا کہ ثریا بانو اور اڈے پر انگلیاں اٹھانے سے گریز کریں۔ طے شدہ معاہدے کے تحت اب وہ لوگ خاموشی سے اپنے گھروں میں تھے اور اڈے والے اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ دوڑتا ہوا فاروق مسجد کے قریب پہنچا تو اس نے اکیلے بالی کو دو افراد سے گتھم گتھا پایا۔ وہ للکارتا ہوا ان دونوں کی طرف لپکا۔ وہ دونوں بھی زخمی بالی کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ دونوں کے ہاتھ میں کھلے ہوئے چاقو تھے لیکن دونوں ہی زیادہ دیر فاروق کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور ان کے چاقو زمین پر گر گئے۔ چاقو گر جانے کے بعد فاروق نے ان پر حملہ نہیں کیا اور انہیں بھاگ نکلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ خون خرابا خود اڈے والوں کے لیے بھی مفید نہیں تھا۔ مخالف پارٹی کا کوئی بندہ مارا جاتا تو جواب دہی اڈے والوں کو بھی کرنی پڑتی کہ پولیس کا اس صورت میں دخل دینا لازمی ہو جاتا۔ ربن دادا جیسے فہم و فراست والے آدمی نے اپنے بندوں کو یہ بات پہلے ہی سمجھا دی تھی کہ مجو کی طرف سے کوئی جارحانہ کارروائی ہونے کی صورت میں ہر ایک کو پورے ہوش و حواس سے کام لینا ہوگا اور کوئی ایک بھی پوری طرح ناپے تولے بغیر اپنے ہتھیاروں کا استعمال نہیں کرے گا۔ فاروق کو یقین تھا کہ اسی کی طرح ہر ایک نے ربن کے حکم کی تعمیل کی ہو گی۔

وہ سارے ربن کے تربیت یافتہ تھے اور اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ کسی سے کوئی غلطی ہو جائے۔ گزرتے لمحات نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی کہ دفاع کا کام طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق ہی انجام دیا گیا ہے۔ مجو کے آدمی اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے بعد پسپا ہونے لگے تو انہیں اس بات کا پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے گر جانے والے زخمی ساتھیوں کو بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جا سکیں۔ بہت تیزی سے انجام کو پہنچنے والی اس لڑائی کے خاتمے کے بعد پولیس وہاں پہنچی تو اس کے لیے چند زخمیوں کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا۔ زخمی ہونے والوں میں سے شدید گھاؤ صرف کمو کو آیا تھا۔ اس کی پسلیوں میں چاقو لگا تھا اور خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر کے حوالے کر کے باقی زخمی پولیس کے سامنے پیش ہو گئے تھے۔ ان سب نے پولیس کے سامنے ایک ہی موقف اختیار کیا کہ حملہ آور نامعلوم تھے اور ان کی آمد کا مقصد بھی اہل محلہ سمیت سب کے لیے نامعلوم تھا۔ اڈے والوں نے محض حقِ محلہ داری ادا کرنے

کے لیے دفاع کا فریضہ انجام دیا ورنہ ان کا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ان سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر پولیس ان کی گرفت کر سکے البتہ اگر دوسرے فریق کی طرف سے رپورٹ درج کروائی جاتی اور یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اڈے والوں نے ان کا کوئی جانی نقصان کیا ہے تو پھر پولیس کو یہ حق حاصل ہوتا کہ اڈے کے لوگوں کو گرفتار کرلے۔ ایسی صورت میں اڈے والے خود کورٹ کچہری سے نمٹ لیتے اور ثابت کردیتے کہ دفاع کے لیے ہتھیار اٹھانا کوئی جرم نہیں ہے۔ بصورتِ دیگر پولیس کو موقع پر جلد پہنچ کر خود حالات سنبھالنے چاہیے تھے۔

اڈے والوں کے اس مؤقف کی اہلِ محلہ نے بھی بھرپور حمایت کی اور شک ظاہر کیا کہ حملہ آور چور، ڈاکو یا لٹیرے تھے جنہوں نے بدنیتی سے محلے پر حملہ کیا تھا۔ اگر ایسے وقت میں اڈے والے ان کے سامنے سینہ سپر نہ ہو جاتے تو نہ جانے ان پر کیا گزر جاتی۔ ہر دو طرف سے یہ بیانات سن کر پولیس والے بہت جزبز ہوئے اور کوشش کی کہ زور اور دھمکی سے کام لے کر اصل حقیقت اگلوا سکیں لیکن سب کی زبانیں تالو سے لگی رہیں۔ تھانے دار نے کچھ روز قبل مجو دادا کے آدمیوں سے ہونے والی جھڑپ کے حوالے سے بھی حقیقت اگلوانے کی کوشش کی لیکن سب انجان بن گئے۔ ربن نے صاف کہہ دیا کہ اگر مجو دادا کی طرف سے ایسا کوئی دعویٰ کیا جاتا ہے تو پولیس کو حق حاصل ہوگا کہ مناسب کارروائی کرے لیکن ابھی تو وہ کسی طرح انہیں قصوروار قرار نہیں دے سکتی۔ اس بات پر تھانے دار بہت بگڑا، اسے بھی معلوم تھا کہ اس کیس میں کوئی مدعی سامنے نہیں آئے گا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مجو دادا شکایت لے کر تھانے پہنچ جاتا کہ اس کے حملے کی صورت میں ربن کے آدمیوں نے اس کے بندوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تو خود مجرم تھا اور اس کی پوزیشن ربن سے کہیں زیادہ خراب تھی۔ بیک وقت غصے اور بے بسی کا شکار تھانے دار اڈے کے چھ سات افراد کو پکڑ کر اپنے ساتھ تھانے لے گیا جس پر ربن نے خاص احتجاج نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے آدمی اتنے پکے ہیں کہ پولیس ان کی چمڑی بھی ادھیڑ دے تو زبان سے اس کی ہدایات کے خلاف ایک لفظ نہیں نکالیں گے پھر قانونی طور پر ان کی پوزیشن بھی مضبوط تھی چنانچہ وہ صبح ہی وکیل کے ساتھ تھانے جا پہنچتا تو پولیس والے گرفتار شدگان کو تھانے میں روک نہ پاتے۔ صبح اب دور ہی کتنی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''جولیٹ! ویک اپ بے بی۔ دیکھو کتنا ٹائم ہو رہا ہے تم آفس کے لیے لیٹ ہو جائیں گا۔'' کمرے کے دروازے پر دستک کے ساتھ سنائی دینے والی جوزف کی آواز نے جولیٹ کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ہڑبڑا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ واقعی آج اسے جاگنے میں معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی تھی اور یہ سارا کیا دھرا رات بپا ہونے والے ہنگامے کا تھا۔ رات دیگر اہلِ محلہ کی طرح وہ لوگ بھی نیند سے بیدار ہو گئے تھے اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس ہنگامے کے انجام کا انتظار کرتے رہے تھے۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ حملہ آور فرار ہو گئے ہیں اور پولیس پہنچ گئی ہے تو قدرے اطمینان ہوا لیکن دوبارہ نیند آتے آتے بھی کچھ وقت لگ گیا تھا اسی لیے اس کی آنکھ اپنے وقت پر نہیں کھل سکی تھی۔

''مام کدھر ہے؟'' کمرے سے نکل کر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے اس نے باورچی خانے میں جوزفین کی عدم موجودگی کو محسوس کر کے ڈائننگ ٹیبل پر موجود جوزف سے دریافت کیا۔

''وہ ذرا نیبرز سے رات کے ہنگامے کا اپ ڈیٹ لینے کے واسطے گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ جب تک یہ وومن لوگ مل کر کسی واقعے کو ڈسکس نہ کر لے انہیں سیٹسفیکشن نہیں ملتا ہے۔ تمہارا مام بھی اسی مشن پر ہے۔'' جوزف نے اسے ہنستے ہوئے بتایا۔ اسی وقت جوزفین گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے جوزف کا تبصرہ سن لیا تھا، اس لیے چہرے پر ہلکی سی خفگی تھی۔

''اوہ گاڈ! یہ تو بڑا گڑبڑ ہو گیا۔ اب ڈیوٹی پر جانے سے پہلے تمہارا مام کو منانے کا ڈیوٹی بھی انجام دینا پڑے گا۔'' بغیر کچھ کہے خاموشی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ جانے والی جوزفین کے تاثرات کو دیکھ کر جوزف نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا تو جولیٹ کو ہنسی آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جوزف سے جوزفین کی خفگی بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ وہ بیوی سے بے پناہ محبت کرنے والا ایک مثالی شوہر تھا چنانچہ اس کے لیے واقعی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ناراض بیوی کو منائے بغیر دفتر کا رخ کر سکے۔ بہرحال اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جوزف اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے گا۔ چنانچہ اسے باورچی خانے کی طرف جاتا دیکھ کر خود اطمینان سے غسل خانے میں گھس گئی۔ دفتر کے لیے پوری طرح تیار ہونے کے بعد جب وہ ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو حسبِ توقع ان دونوں کی دوستی ہو چکی تھی اور جوزفین پورے جوش و خروش

سے رات والے واقعے کے متعلق جوزف کو معلومات فراہم کر رہی تھی۔

''ہم سب تو محلے میں ان لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے لیکن اس مظلوم لڑکی کی خاطر اتنا سب کر کے انہوں نے محلے والوں کے دل جیت لیے ہیں۔ غلام چاچا تو بہت تعریف کر رہے تھے اڈے کے دادا ربن کی۔ کہہ رہے تھے بڑا ہی مہربان آدمی ہے۔ ثریا بانو کو اس نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ہمیشہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اس کی نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے محلے داروں نے بھی اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اڈے والے دیوار بن کر کھڑے نہ ہوتے تو کل رات وہ غنڈے اس بے چاری مظلوم لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے۔ یہ تو انہی لوگوں کا حوصلہ تھا کہ اتنا سب کر سکے ورنہ ہم میں سے کون ان مظلوموں کا ساتھ دے سکتا تھا۔ عام آدمی بھلا چاقو، چھریاں چلانا کیا جانے، خود ربن کے اڈے کے کئی آدمی زخمی ہوئے ہیں۔ اوپر سے پولیس نے بھی گرفتاریاں ڈالی ہیں لیکن غلام چاچا کہہ رہے تھے کہ پولیس زیادہ دن انہیں قید میں نہیں رکھ سکے گی۔ وہ سب بے قصور ہیں۔''

جولیٹ دیکھ رہی تھی کہ ماں کی کیسی کایا پلٹ ہو گئی ہے بلکہ ماں ہی کیا شاید سارے محلے کی رائے بدل گئی تھی ورنہ کل تک یہی محلے والے تھے جو محلے میں اڈے کے قیام پر جز بز تھے۔ اتنی جلدی بدلتی اس رائے پر کوفت کا شکار اس نے چائے کے ساتھ مشکل سے ایک سلائس حلق سے نیچے اتارا اور دفتر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ بیرونی دروازے تک پہنچ کر اس نے ابھی قدم باہر بھی نہیں رکھا تھا کہ ایک جانی پہچانی سی صورت دکھائی دی۔ یہ وہی شخص تھا جو دلدار آغا کی طرف سے بھیجے گئے تحائف اور پیغامات اس تک پہنچاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جولیٹ کو سامنے پا کر اس نے مسکراتے ہوئے گلدستہ اس کی طرف بڑھایا۔ جولیٹ نے اس کے ہاتھ سے گلدستہ لیا اور شدید طیش کے عالم میں اس کے منہ پر پوری قوت سے دے مارا۔ گلدستے کے کئی پھول نکل کر زمین پر بکھر گئے جن پر نظر ڈالے بغیر وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اسے دروازے تک رخصت کرنے کے

لیے آنے والی جوزفین نے بھی یہ منظر دیکھا تھا اور اپنی جگہ تھرا کر رہ گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک طاقتور سے جاری اس کی بیٹی کے اس مقابلے کا کیا نتیجہ نکلے گا لیکن اسے ڈر تھا کہ یہ نتیجہ خوفناک ہی ہوگا کیونکہ اس نے اب تک اس دنیا میں طاقتوروں کو ہی راج کرتے دیکھا تھا۔ ماں کی حالت سے بے خبر جولیٹ طیش زدہ تیز تیز آگے بڑھتی جارہی تھی۔ غصے کے باعث اس نے یہ بھی نوٹ نہیں کیا تھا کہ آج پھر فاروق اپنی مخصوص جگہ پر موجود ہے۔ اس کی وہاں موجودگی کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس نے اسے مخاطب کیا۔

''ایکسکیوزمی مس! کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' وہ بہت جھجک کر اور دبی آواز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ پل بھر کو تو جولیٹ کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ اس سے مخاطب ہے لیکن جب سمجھی تو تیور ضرور بگڑ گئے۔ گلی کے غنڈے کی اتنی جرأت کہ اسے مخاطب کرسکے۔ یہ سوچ ہی ماتھے پر بل ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

''میں محسوس کررہا ہوں کہ آج کل آپ کچھ پریشان ہیں۔ اگر اس پریشانی کے حل میں، میں کچھ مدد کرسکا تو مجھے خوشی ہوگی۔'' فاروق جو کئی دن کی جھجک کے بعد اسے مخاطب کرنے کی ہمت کرسکا تھا، اس کے تیور دیکھ کر بوکھلایا ہوا وضاحت پیش کرنے لگا۔

''کیوں، آپ نے خود کو اس محلے کا ٹھیکے دار سمجھ لیا ہے کیا جو سب کے پرابلمز آپ ہی سولو کریں گے؟'' اس کا یہ تیکھا انداز فاروق کے حوصلوں کو ڈھانے کے لیے کافی تھا چنانچہ شرمساری سے بولا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس میں نے آپ کو پریشان محسوس کیا تو ایسی بات کرڈالی۔ آپ نے برا مانا تو میں معذرت چاہتا ہوں۔'' اس کی طرف سے معذرت کے اس اظہار پر جولیٹ زبان سے تو کچھ نہ بولی لیکن اسے سخت نظروں سے گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ مقصد یہ جتانا تھا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی جرأت نہ کرے۔ اس کے آگے بڑھ جانے کے بعد فاروق نے اپنے ماتھے پر آیا پسینا خشک کیا۔ اس کے بعد پلٹ کر اندر جانے ہی لگا تھا کہ گلی کی سمت سے آتے آدمی کو دیکھ کر رک گیا۔ اس شخص کو اس نے کئی بار جولیٹ کے گھر تک جاتے دیکھا تھا اور اب اسے خیال آرہا تھا کہ جولیٹ بھی لگ بھگ اتنے ہی دنوں سے پریشان نظر آرہی ہے جتنے عرصے سے اس آدمی کی آمدورفت جاری ہے۔ اپنے اس تجزیے کی درستگی پر غور کرتے اس کی نگاہوں نے اس وقت تک اس آدمی کا پیچھا کیا جب تک وہ فاصلے پر کھڑی ایک موٹر گاڑی میں سوار نہ ہوگیا۔ ڈرائیور کی وردی پہنے ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ تو لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شخص اس موٹر کار کا مالک نہیں ہے لیکن یہ جاننا ذرا مشکل تھا کہ وہ خود اپنی کسی غرض سے جولیٹ کے گھر تک آتا ہے یا مالکوں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ یہ بات اس شخص سے پوچھ گچھ کرنے پر ہی معلوم ہوسکتی تھی۔ جولیٹ کی طرف سے نہایت سخت اور مایوس کن رویے کے باوجود اس نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ یہ شخص محلے میں نظر آیا تو اس سے بازپرس ضرور کرے گا۔ جولیٹ اس کے ساتھ کتنی ہی غیریت برتتی لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی شخص اس کی حسین جبین پر پریشانی کے بل ڈالنے کا سبب بنے۔

☆☆☆

محلے کے چند بزرگ اڈے پر آئے بیٹھے تھے۔ آمد کا مقصد کمو سمیت دیگر زخمیوں کی مزاج پرسی کرنا تھا۔ باقی زخمی تو خیر ٹھیک ٹھاک تھے لیکن کمو کا زخم گہرا ہونے کی وجہ سے وہ بستر پر لیٹنے پر مجبور تھا بلکہ ڈاکٹر کا تو خیال تھا کہ اسے اسپتال میں داخل رہنا چاہیے لیکن اڈے کی رونق کو چھوڑ کر کمو نے اسپتال کی تنہائی میں رہنا قبول نہیں کیا۔ اس کے مطابق اکیلے میں وہ خود کو اور بھی زیادہ کمزور اور بیمار محسوس کرتا اور ذہن اپنی تکلیف کی طرف ہی لگا رہتا جبکہ اڈے پر دل بہلانے کے لیے بہت سے لوگ تھے۔ اس کی دلیل تھی کہ مرہم پٹی ہوچکی ہے اور ڈاکٹر نے کھانے کی دوائیں بھی تجویز کردی ہیں تو پھر اسپتال میں رکنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسپتال کے بستر میں کوئی جادو تو ہے نہیں کہ وہ یہاں رہ کر زیادہ جلدی ٹھیک ہوجائے گا۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا کہ اسپتال میں رہ کر وہ عملے کی زیرنگرانی رہے گا اور ڈاکٹرز اس کی کیفیت سے باخبر رہیں گے لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ آخر اس کی ضد سے ہار کر اسے اسپتال سے فارغ کردیا گیا۔ البتہ ربن نے اتنا انتظام ضرور کردیا تھا کہ ڈاکٹر صبح شام آکر اسے دیکھ جائے۔ کچھ دیر قبل ہی ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر کے گیا تھا۔ زخم کے بارے میں اس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ مناسب حالت میں ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بھرتا جائے گا۔ جس زخم کو پورے سات ٹانکے لگا کر بند کرنا پڑا ہو، اس کے بھرنے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ ڈاکٹر کے چیک اپ کے وقت کمو کو ہلکا بخار بھی تھا جو ظاہر ہے تکلیف کے باعث چڑھا ہوا تھا۔ بخار کے سلسلے میں ڈاکٹر نے خاص ہدایت کی تھی کہ اگر بہت زیادہ تیز ہو تو بے پروائی نہ برتی جائے اور مریض کو اسپتال منتقل کردیا جائے۔ ربن نے اس سلسلے میں ڈاکٹر کو مکمل یقین دہانی کروائی تھی اور اب معززین

محلہ کے درمیان بیٹھا وہ عیادت کرنے والوں کو بھی ان تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ گولو اور بجو سمیت اڈے کے چند مزید افراد اہلِ محلہ کی خاطر مدارات کے لیے سرگرم تھے۔ اڈے کی صفائی ستھرائی، نظم و نسق اور ربن کا اندازِ گفتگو لوگوں کو متاثر کر رہا تھا جو پہلے کبھی وہاں اڈے کے قیام پر کبیدہ رہتے تھے اور دل سے خواہش مند تھے کہ کسی طرح یہ اڈا یہاں سے ہٹ جائے۔ صرف ایک واقعے نے اڈے والوں اور محلے داروں کے درمیان موجود فاصلے کو ختم کر دیا تھا اور وہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننے کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو ثریا بانو کا مسئلہ زیرِ بحث آنا لازمی تھا، سوزخمیوں کی مزاج پرسی اور گرفتار شدگان کی رہائی سے ہوتے ہوئے گفتگو اس نہج پر آ ہی گئی۔

''میرے خیال میں اس بچی کے مسئلے کا کوئی مستقل حل تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایسے ساری زندگی تو آپ اس کی پہرے داری کر نہیں سکتے پھر آئے روز کا ہنگامہ بھی کسی کے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ بات زیادہ بڑھی تو انسانی جانوں کا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔'' اہلِ محلہ کی قیادت کرتے غلام چاچا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ غلام چاچا ممبئی کے اصل رہائشی نہ تھے بلکہ حصولِ روزگار کے سلسلے میں برسوں پہلے یہاں آئے تھے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن حل کیا ہو یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' ربن نے ان کی تائید کرتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ دیکھیں اس بات کے پیچھے خود اہلِ محلہ کے ذہن میں کیا ہے۔

''حل تو ایک ہی ہو سکتا ہے۔ بچی کا کہیں نکاح کر دیا جائے۔ کسی کے نکاح میں آ جائے گی تو وہ مردود خود ہی اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔'' غلام چاچا نے جھٹ تجویز پیش کی۔ دیگر لوگوں کے سر بھی تائید میں ہلنے لگے۔

''ہاں، یہ ایک اچھا حل ہے لیکن پہلی بات تو یہ کہ ایسا لڑکا کہاں تلاش کیا جائے جو ایک بچے کی بیوہ ماں کو اپنانے کے لیے راضی ہو۔ دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ لڑکا ممبئی سے باہر کسی دوسری جگہ کا ہونا چاہیے تاکہ بجو دادا غصے میں کوئی انتقامی کارروائی نہ کر سکے۔ میرے بارے میں تو آپ اندازہ لگا ہی سکتے ہیں کہ اس قسم کے کاموں کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہمارا رہنا سہنا اور اٹھنا بیٹھنا اور طرح کے لوگوں میں ہے اور ثریا بانو کے لیے رشتہ شریفوں میں تلاش کرنا ہوگا جو میرے بس سے باہر ہے۔ میں تو بس اتنا کر سکتا ہوں کہ اس مظلوم بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پورے اسباب کے ساتھ رخصت کرنے کے انتظامات کر ڈالوں۔'' ربن بہت سبھاؤ سے ان لوگوں پر اپنی پوزیشن واضح کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی بیٹھا فاروق اس کے اس طرزِ گفتگو سے خوش تھا۔ ربن کی کوالٹی ہی یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال میں اپنا کردار بہترین طریقے سے انجام دیتا تھا۔ آٹھ برسوں کے ساتھ میں فاروق نے اس کی شخصیت کے بے شمار رنگ دیکھے تھے اور ہر بار اپنے دل میں تسلیم کیا تھا کہ وہ اڈوں پر بیٹھے دیگر داداؤں کے مقابلے میں بہت مختلف ہے اور ہمہ جہت ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا جادو ہی تو تھا کہ انہیں منہ نہ لگانے والے اہلِ محلہ آج ان کے ساتھ یوں شیر و شکر ہوئے بیٹھے تھے۔

''رشتہ ڈھونڈنے کی ذمے داری ہم محلے والوں کے سر ہے، ہم مل کر بچی کے لیے کوئی مناسب بر تلاش کریں گے۔ پٹنہ میں، میرے کئی رشتے دار اور دوست رہتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ وہاں بات بن جائے۔'' غلام چاچا نے یقین دہانی کروائی۔

''ایسا ہو گیا تو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ بس کوئی شریف آدمی ہو جو بچی کو اس کے بیٹے کے ساتھ اپنانے کے لیے راضی ہو جائے۔ ساس سسر کی ذمے داری میں خود سنبھال لوں گا۔ رکھنے کو میں بچے کو بھی رکھ سکتا ہوں لیکن ماں سے اولاد کو جدا کرنا بہت بڑا ظلم ہوگا اس لیے آپ رشتہ تلاش کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیے گا کہ جو بھی شخص ہو ثریا بیٹی کو بچے کے ساتھ خوش دلی سے اپنانے کے لیے رضامند ہو۔'' ربن نے یوں عاجزی سے درخواست کی جیسے اس کی سگی بیٹی ہی کا مسئلہ درپیش ہو۔ جواب میں غلام چاچا اور دیگر افراد نے بھی اسی پرخلوص انداز میں اسے تسلی دی۔ وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے تو ربن کافی حد تک مطمئن تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے فاروق کا شانہ تھپکا اور بولا۔

''دیکھتا ہے میرے ہیرو کہ وقت کیسے بدل جاوے ہے۔ اس لیے ہی کہتے ہیں کہ آدمی کو کبھی اچھی امید نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' فاروق سمجھ سکتا تھا کہ وہ اسے کس حوالے سے امید دلا رہا ہے چنانچہ منہ سے کچھ نہ بولا اور بس یونہی گردن ہلا دی۔ وہ کیسے ربن کو اس بے عزتی سے آگاہ کرتا جو آج صبح ہی اس نے جولیٹ کے ہاتھوں اٹھائی تھی۔ جولیٹ تو اس کی کتابِ زندگی کا وہ صفحہ تھی جس پر درج ہر تحریر کو وہ بس خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنا کچھ نہیں سمجھتی تھی لیکن اس کے لیے وہ بہت کچھ تھی اور وہ اپنے اندر اتنا حوصلہ رکھتا تھا کہ اس کی بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود بھی اسے چاہتا رہے۔ اس وقت بھی اسے اس بات کا اتنا دکھ نہیں تھا کہ جولیٹ نے اس کی پیشکش کے جواب میں تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔ اسے اصل دکھ یہ تھا کہ اس کی ذات جولیٹ کی

پریشانی دور کرنے کے لیے کسی کام نہیں آ سکی۔ اڈے کے تمام امور میں شریک رہ کر بھی وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ کل اور آج کی ہنگامہ خیز مصروفیت نے بھی اس کا دھیان اس طرف سے ہٹنے نہیں دیا تھا۔ جولیٹ میں ایسا کیا تھا کہ وہ اس سے یوں بندھ کر رہ گیا تھا؟ اس بات کا جواب خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ بے شک وہ خوب صورت تھی لیکن خوب صورتی کوئی ایسی عنقا شے بھی نہیں کہ ایک کے سوا کسی اور کے پاس نہ ہو۔ دیکھا جائے تو زمرد بائی کی بیٹی چاند بانو اس سے کہیں زیادہ حسین تھی لیکن اس کے حسن نے تو دل کو اس طرح نہ کھینچا تھا حالانکہ چاند بانو کی طرف سے تو گلابی کاغذ سے لپٹی ترغیب بھی اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اس محبت نامے پر کہاں متوجہ ہوا تھا بلکہ بڑی بے دردی سے اسے پھاڑ کر پھینک ڈالا تھا اور یہ حال تھا کہ دن بھر کی مصروفیت سے نمٹ کر سونے کے لیے بستر پر لیٹنے پر بھی وہ کسی طور دھیان سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ جولیٹ کچھ نہ بھی بتائے تو وہ اس کی پریشانی کی وجہ جاننے کی اپنی سی کوشش ضرور کرے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ سب سے پہلے آئے روز کار میں آنے والے ڈرائیور کو ٹٹولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ جب اگلی صبح کا سورج نمودار ہوا تو اسے جولیٹ کے دیدار کے علاوہ اس شخص کی آمد کا بھی انتظار تھا۔

جولیٹ اپنے مقررہ وقت پر گلی سے گزر کر دفتر کے لیے روانہ ہو گئی لیکن وہ شخص نہیں آیا۔ اس کا روز آنا ضروری بھی نہیں تھا۔ کسی کسی دن وہ نہیں بھی آتا تھا اور آج شاید اس کے نہ آنے کا ہی دن تھا۔ کوفت زدہ فاروق نے ناشتا کیا اور کچھ وقت کمو کے ساتھ گزارا۔ اس وقت اس کا بخار اتر چکا تھا اور وہ خاصا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ رہن اور رامو بھی اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد کہیں روانہ ہو گئے تھے۔ جانے سے پہلے رامو سب کو ان کی ذمے داریاں سونپ کر گیا تھا۔ فاروق کے لیے کوئی ہدایت نہیں تھی چنانچہ تھوڑی دیر میں ہی فراغت اور سناٹے سے گھبرا گیا۔ آج اڈے پر زیادہ سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ زخمی آرام کر رہے تھے اور باقی بھی اپنی جگہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو پہرے داری کے لیے چھوڑا گیا تھا۔ گلیوں میں ادھر ادھر گھومتے افراد کی طرف سے اگر کسی قسم کے خطرے کا سگنل ملتا تو یہ لوگ حرکت میں آتے۔ بہرحال ابھی تو ایسا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں حملہ کر کے منہ کی کھانے والے مجو دادا کے گرگوں میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ دن کی روشنی میں اس طرف کا رخ کر سکتے۔ فراغت سے اکتائے فاروق نے آخرکار لائبریری جانے کا فیصلہ کیا۔ لائبریری ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس کا ہر حال میں دل لگ جاتا تھا سو مناسب لباس زیب تن کرنے کے بعد وہ وہاں کے ارادے سے نکل پڑا۔ دھوپ میں ہلکی سی تمازت کے باوجود اس نے پیدل ہی وہاں تک جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ رہن دادا کی تربیت کا نتیجہ تھا جو سترہ سال تک نہایت نازو نعم میں پلنے والے فاروق کو اب میلوں پیدل چلنا بھی برا نہیں لگتا تھا۔ رہن دادا کا کہنا تھا کہ آدمی اگر خود کو فٹ رکھنا چاہتا ہے تو اس کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیدل چلے۔ وہ خود بھی ضرورت کے سوا سواری کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ فاروق نے بھی اس کا یہ طریقہ اپنا لیا تھا اور زیادہ تر پیدل ہی چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب بھی وہ پیدل ہی لائبریری پہنچا۔

''اس بار کئی دن کے ناغے کے بعد آئے ہیں۔''

لائبریرین نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔ وہ فاروق کو اس کی بردبار شخصیت کی وجہ سے خاصا پسند کرتا تھا۔

''جی بس ذرا مصروفیت رہی۔'' فاروق نے اسے جواب دیا اور اپنی پسند کی کتاب نکلوا کر اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں بیٹھ کر لوگ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس وقت لائبریری میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ زیادہ رش عموماً بہت صبح سویرے یا دوپہر کے بعد ہوتا تھا کیونکہ ان اوقات میں طلبا کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس وقت تو وہ عموماً اپنے تعلیمی اداروں میں مصروف ہوتے تھے اور عموماً مطالعے کے شوقین فارغ لوگ ہی لائبریری کا رخ کرتے تھے۔ فاروق بھی ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا اور کتاب میز پر رکھ کر کھول لی۔ وہ پوری طرح اس کتاب میں منہمک تھا کہ خوشبو کا ایک جھونکا سا اپنے قریب محسوس ہوا پھر فوراً ہی کوئی اس کے عین سامنے والی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔ بے اختیار ہی فاروق کی نظر اس کی طرف اٹھی۔ وہ برقعے میں ملبوس کوئی نقاب پوش لڑکی تھی۔ فاروق نے فوراً ہی اپنی نظروں کو پلٹانا چاہا لیکن اس عرصے میں لڑکی اپنا نقاب الٹ چکی تھی۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ سنگھار کے سارے لوازمات کے ساتھ اس چہرے کو ناٹا کے پاڑے پر دیکھے اتنا وقت تو نہیں گزرا تھا کہ اس کی یادداشت سے محو ہو جاتا۔ وہ یقیناً چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی چاند بانو ہی تھی جو اس دن کے مقابلے میں بالکل سادہ چہرے کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی لیکن سیاہ برقعے کے ہالے

میں چودھویں کے چاند کی طرح دمکتا اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ بنا سنگھار کے بھی وہ حسن کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ سچ ہے چاند کو بھلا کسی سنگھار کی ضرورت بھی کیا تھی۔

''آداب۔'' فاروق کی نظروں کو ٹکٹکاتا دیکھ کر اس نے اپنا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بے حد دھیمی آواز میں اسے آداب کہا۔ دودھ کی طرح شفاف ان ہاتھوں کے لیے بھی آج نیلم جڑی ایک انگوٹھی کے سوا کسی قسم کی آرائش کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' فاروق کے حلق سے بہ مشکل یہ جملہ نکل سکا۔ حقیقتاً وہ چاند بانو کو اپنے سامنے وہ بھی اس جگہ پا کر بوکھلا گیا تھا۔ اپنے طور پر تو وہ اس کے محبت نامے کو چاک کر کے قصہ تمام کر چکا تھا لیکن چاند بانو کی یہاں موجودگی سے عیاں تھا کہ قصہ ختم نہیں ہوا بلکہ شروع ہی ابھی ہوا ہے۔

''ہم نے آپ کو ایک پیغام بھیجا تھا۔ آپ نے اس کا جواب نہیں دیا سو جواب لینے ہم خود چلے آئے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے دھیمی لیکن مترنم آواز میں فاروق کے سوال کا جواب دیا۔

''آپ کو یہاں کا پتا کس نے دیا؟'' فاروق کی تیوری پر بل پڑے۔

''جنہیں چاہ ہو وہ اپنی راہ خود تلاش کر لیتے ہیں۔'' اس کے غصے کے جواب میں چاند بانو نرم نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گنگنائی۔

''دیکھیے خاتون! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آپ کو اپنے حسن اور اداؤں پر داد دے سکوں اس لیے بہتر ہوگا کہ آئندہ آپ مجھ سے ملاقات کی زحمت نہ کریں۔'' اس نے چاند بانو کو صاف جواب پکڑا دینا ہی مناسب سمجھا۔ حقیقتاً اس وقت وہ خاصا غصے میں تھا لیکن لائبریری کے احترام میں بلند آواز سے اجتناب کر رہا تھا۔

''یہ تو ہم نے آپ کے بتائے بغیر ہی جان لیا تھا اسی لیے تو آپ کی طرف کھنچے چلے آئے ورنہ تماش بینوں اور داد دینے والوں کی ہمیں کیا کمی ہے۔ ہمیں تو صرف ایک ایسے شخص کی چاہ ہے جو ہمیں ایک حسین طوائف کے بجائے انسان کی نظر سے دیکھ سکے۔'' اب وہ شوخی کے بجائے بہت سنجیدگی سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھی۔

''آپ کو اس بات کا یقین کیونکر ہوا کہ میں ہی آپ کا مطلوبہ شخص ہوں؟'' وہ مزید تلخ ہوا۔

''انسان کا تجربہ عمر کا محتاج نہیں ہوا کرتا۔ ہماری نظروں کو اس کم عمری میں بھی آدمی کی پرکھ ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن آپ کو رقعہ لکھتے وقت بھی ہمیں یقین تھا کہ آپ ہماری دعوت کو قطعی اہمیت نہیں دیں گے اسی لیے فوری طور پر اس کھوج میں لگ گئے تھے کہ آپ سے ملاقات کی کوئی صورت نکال سکیں۔ معلوم ہوا کہ آپ ان اوقات میں اکثر لائبریری آتے ہیں تو ہم بھی قسمت آزمانے یہاں آگئے اور قسمت کی زورآوری دیکھیے کہ پہلی ہی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔'' وہ اپنی کامیابی پر مسرور تھی۔ باوجود اس کی یہاں موجودگی پر ناراضی کے، فاروق نے اس بات کو خصوصیت سے نوٹ کیا کہ چاند بانو کے اندازِ تکلم میں بڑی شائستگی ہے ورنہ بمبئی کی طوائفیں اس انداز سے گفتگو نہیں کیا کرتی تھیں۔

''ٹھیک ہے آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں لیکن اس سے بڑھ کر آپ کیا کر سکیں گی؟ آپ کی یہاں آمد مجھے آپ کی دعوت قبول کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکے گی۔'' اس نے نہایت بےدردی سے چاند بانو کو حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''خدانخواستہ ہم آپ کو مجبور کرنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ تو ہمارے دل کی لگی ہے جو ہمیں مجبور کر کے یہاں تک لے آئی ہے۔'' وہ نظریں جھکا کر کچھ اس ادا سے بولی کہ فاروق کو چپ سی لگ گئی۔ اس سے بڑھ کر یک طرفہ محبت کے عذاب کو کون جانتا تھا۔ اگر چاند بانو بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو گئی تھی تو اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ اس کی ایسی تذلیل کرتا۔ بازار سے تعلق رکھنے والی ہی سہی، وہ تھی تو ایک عورت ہی نا جو بنیادی طور پر نرم و نازک جذبات کی مالک ہوتی ہے۔

''آپ غلط سمت میں قدم اٹھا رہی ہیں چاند بانو، مجھ جیسے تہی داماں سے آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔'' اس بار وہ نرمی اور بےبسی کی ملی جلی کیفیت میں اس سے مخاطب تھا۔

''ہمیں چند پل کی دید اور شرفِ کلام کے سوا کسی شے کی حاجت نہیں ہے اور اتنی عطا پر تو آپ یقیناً قدرت رکھتے ہیں۔'' لجاجت سے بولتی وہ اسے بالکل بےبس کیے دے رہی تھی۔ فاروق سوچ میں پڑ گیا۔

''ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا بار بار کا یہاں آنا آپ کے لیے ناپسندیدہ ہوگا اس لیے اپنے غریب خانے کو آپ کے لائق نہ پاتے ہوئے بھی آپ کو وہاں آنے کی دعوت دینے پر مجبور ہیں۔'' اس کی خاموشی سے شہ پا کر چاند بانو نے ایک بار پھر اپنا مدعا دہرایا۔

''ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا۔'' آخرکار فاروق کو

ہامی بھرنی ہی پڑی۔

''کب تشریف لائیے گا جناب بڑے'' چاند بانو جیسے جی اٹھی۔

''دیکھیے کب آنا ہوتا ہے۔'' وہ کوئی واضح وقت طے کرنے سے گریزاں تھا۔

''آج شام ہی آجائیے نا، ہم بہت شدت سے آپ کے منتظر رہیں گے۔'' اس کی عاجزانہ درخواست نے ایک بار پھر فاروق کو بے بس کیا۔

''اچھا، میں کوشش کروں گا۔''

''اور ہم دیدہ و دل فرشِ راہ کیے آپ کا انتظار کریں گے۔'' چاند بانو نے نہایت جذب سے کہا اور نقاب چہرے پر ڈال کر یک دم ہی کھڑی ہوگئی۔

''دیکھیے بھولیے گا مت۔'' جاتے جاتے بھی وہ اس سے اصرار کرنا نہ بھولی۔ فاروق نے دیکھا کہ اس کے کھڑے ہوتے ہی پچھلی میز پر موجود ایک آدمی بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ فاروق کو گمان ہوا کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے نانا کے پاڑے کے باہر اس تک چاند بانو کا رقعہ پہنچایا تھا۔ اس وقت وہ اس آدمی کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اتنا اندازہ تو تھا کہ چاند بانو کے لیے ایسی خدمات بجالانے والا رازدار کوئی ایک آدھ ہی ہوسکتا ہے کہ کوٹھوں کے بھی اپنے کچھ قاعدے قوانین ہوتے ہیں اور سخت گیر نائیکائیں اپنی زیرِ نگران لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں دیتیں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی سے بھی میل جول بڑھا سکیں۔ چاند بانو کو بھی اس تک پہنچنے کے لیے جانے کتنی مشکلات سے گزرنا پڑا ہوگا لیکن اس نے ٹھیک کہا تھا جہاں چاہ ہو وہاں راہ بھی نکل ہی آتی ہے۔

☆☆☆

''مجو کے چھ سات بندے ٹھیک ٹھاک زخمی ہوئے ہیں، باقی کو بھی چھوٹی موٹی چوٹیں آئی ہیں۔ نانا بتا رہا تھا کہ مجو بری طرح بلبلایا ہوا ہے۔ نانا کے سامنے بڑی گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا کہ ربن اور اس کے آدمیوں کو دیکھ لوں گا۔ ربن کے اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ دو بار کے تجربے کے بعد بھی سالے کی بدھی میں بات نہیں آئی ہے۔ خامخاہ (خوامخواہ) اپنے بندے ٹھکوانے پر تلا ہوا ہے۔'' ربن اور رامو دوپہر کے کھانے کے وقت اڈے پر واپس آئے تھے اور کھانے سے فراغت کے بعد رامو ان کے درمیان بیٹھا مزے لے کر تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہی انہیں علم ہوا تھا کہ وہ اور ربن نانا کے پاڑے سے ہو کر آرہے ہیں۔ نانا کو ربن نے ہی پیغام بھجوایا تھا کہ ذرا مجو کے اڈے کا چکر لگا کر وہاں کی صورتِ حال کی خبر لے۔ مجو کے تیور جان کر انہیں بھی اپنی آگے کی حکمتِ عملی طے کرنے میں مدد مل سکتی تھی اس لیے نانا کا یہ تعاون خاصا اہم تھا۔

''تو کیا مجو نے نانا کے سامنے قبول کرلیا کہ اس کے آدمیوں نے ثریا بانو کے اغوا کی خاطر رات کے اندھیرے میں حملہ کیا تھا لیکن ہمارے ساتھیوں کے چوکس ہونے کی وجہ سے منہ کی کھانی پڑی؟'' فاروق نے قدرے حیرت سے سوال کیا۔

''ایسے کیسے قبول کرسکتا تھا وہ...... یہ تو نانا کی نظروں کا کمال تھا کہ بنا اس کے بتائے بھی سب کھوج آیا۔ زخمیوں کو کدھری چھپاتا مجو۔ نانا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کسی کا ماتھا پھوٹا ہے تو کوئی لنگڑا ہوا بیٹھا ہے۔'' مجو کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے رامو نے مزے لے کر بتایا۔

''نانا نے مجو سے پوچھا تو ہوگا کہ اس کے بندے زخمی کیسے ہوئے؟'' تکیے کے سہارے بیٹھے کمو نے تجسس کا اظہار کیا۔ صبح ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرکے گیا تھا اور اس کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا تھا۔

''پوچھا تھا، پوچھتا کیسے نہیں پر سالا ٹال گیا۔ بس اتنا بولا کہ ایک پارٹی سے لین دین پر لفڑا ہوگیا تھا۔ نانا نے بھی زیادہ نہیں کریدا کہ اسے شک پڑ جاتا اور سوچتا کہ نانا ربن کی خاطر کھوج لگانے اس کے اڈے پر آیا ہے۔ وہ تو مجو سے وہی پرانی بات کرنے گیا تھا کہ ضد چھوڑ کر جامے میں آجائے اور اپنے بھائی بندوں سے جھگڑا ختم کرے۔ جواب میں مجو نے خوب گالیاں نکالیں اور بالکل آؤٹ ہو گیا۔ صاف بات ہے، اپنے آدمیوں کی ناکامی پر بری طرح بل کھایا ہوا ہے۔ سالا ہر کسی کے سامنے کھل کر بول بھی نہیں سکتا۔ بس یہی کہتا رہا کہ ربن نے اس کی ہونے والی بیوی کو قبضے میں رکھ کر اس کی غیرت کو چیلنج کیا ہے اس لیے وہ یہ دشمنی کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ نانا نے اسے آفر کیا کہ چار لوگوں میں بٹھا کر لڑکی سے بات کرلیتے ہیں۔ سب صاف ہوجائیں گا کہ لڑکی خود شادی پر راضی نہیں ہے یا ربن دادا زبردستی کررہا ہے لیکن اس گھٹیا آدمی کو اپنے کالے کرتوت معلوم ہیں نا اس لیے راضی نہیں ہوا۔ بولا اس بات کا فیصلہ اپنے طریقے سے ہی کرے گا۔''

''معلوم نہیں اس فسادی کے ذہن میں اب کیا ہے، دونوں طرف کے اچھے خاصے بندے زخمی کروا کر بھی اسے چین نہیں پڑا۔ اپنی ہوس کی خاطر خوامخواہ کا خون خرابا کروائے گا۔'' رامو کی بات سن کر فاروق نے ذرا پریشانی

سے تبصرہ کیا۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن غیر ضروری خون خرابے کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

"ابھی اپن کیا کرسکتا ہے۔ ٹھیک ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے اسے کرنے دو، ادھری اپن لوگ بھی کوئی چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھا ہوا۔" رامو نے شانے اچکا کر بے نیازی سے جواب دیا۔

"رامو استاد سولہ آنے ٹھیک بولے ہیں۔ اپن کے اڈے کے لوگ کوئی ہیجڑے نہیں ہیں جو بجو کی دھمکیوں سے ڈر جاویں گے۔ آنے دو سالوں کو ادھر پہلے سے جیادہ (زیادہ) مار کھا کر جائیں گے۔" سب کے درمیان بیٹھے گولو کو بھی جوش چڑھ گیا اور بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔

"بالکل ٹھیک...... بجو کے دو چار غنڈوں کو تو یہ اپنا گولو استاد ہی اکیلا پچھاڑ دے گا۔" اس کا جوش دیکھ کر وجے نے اسے چھیڑا۔ سب جانتے تھے کہ گولو لڑنا بھڑنا تو دور کی بات، چاقو بھی ڈھنگ سے نہیں پکڑ سکتا اس لیے وجے کے تبصرے پر سب زور سے ہنس پڑے۔

"آپ دیکھ رہے ہیں فاروق بھائی یہ سارے مل کر اپن کا مجاق (مذاق) بنا رہے ہیں۔" حسب عادت گولو روٹھ گیا۔

"کس کی مجال ہے جو گولو شہزادے کا مذاق اڑائے۔ مذاق اڑانے والے کی ناک میں رسی ڈال کر میں اسے ایک دم سیدھا نہیں کردوں گا کیا۔" فاروق نے فوراً اس کی دلجوئی کی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے خود سے قریب کرلیا۔ ساتھ ہی سب کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ اب ایسی کوئی بات نہ کہیں جو گولو کو بری لگے۔ اس کے اشارے کے احترام میں سب نے فوراً اپنی اپنی ہنسی ضبط کرلی۔ گولو سب کو عزیز تھا اور فاروق کی بات بھی کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔

"اپن نے بابا سے شکایت بول دیا نا تو یہ سب سالا ایک دم ٹھیک ہو جائیں گا۔" گولو کی مکمل طور پر تشفی نہیں ہوئی تھی اس لیے ان لوگوں کو ربن کی دھمکی دینا ضروری سمجھا۔ ربن ان کی محفل کا حصہ نہیں بنا تھا اور کھانے کے بعد قیلولے کے لیے چلا گیا تھا۔

"اب جانے دو نا یار! معاف کردو ان لوگوں کو۔ ایسے ہی مذاق میں ایک بات بول دی تھی وجے نے ورنہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ سب تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔" فاروق نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے سمجھایا تو وہ نرم پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے، آپ کے بولنے پر اپن معاف کردیتا ہے۔" اس نے گویا سب پر احسان کیا۔ اس کے بعد محفل منتشر ہوگئی اور سب اپنے مشغلوں میں مصروف ہوگئے۔

فاروق بھی اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سرہانے کی میز پر لائبریری سے لائی کتاب دھری تھی۔ اس نے کتاب اٹھا کر کھولی تو فوراً ہی چاند بانو کا چہرہ ذہن میں آگیا۔ وہ شام اسے اپنے بالاخانے پر آنے کی دعوت دے کر گئی تھی اور اس نے بھی ایک طرح سے وعدہ کرلیا تھا۔ جی نہ چاہنے کے باوجود اسے اس وعدے کو نبھانا ہی تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر مطالعہ کرنے اور کمر لگانے کے بعد کھڑا ہوگیا۔ الماری میں اس کے دھلے ہوئے اور استری شدہ کپڑے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اپنی کم ذہنی استعداد کے باوجود گولو ہر کام بڑے قرینے سے کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی اس نے بڑے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ کرتے، پاجامے، پتلون، قمیص سب الگ الگ حصوں میں ترتیب وار رکھی تھیں۔ فاروق نے چند لمحوں کے غور کے بعد ایک پتلون اور قمیص نکال لی۔ یہاں بمبئی میں بھی رواج تھا کہ لوگ... بالاخانوں پر جاتے ہوئے کرتے پاجاموں کا اہتمام کرتے تھے لیکن وہ کسی گاہک کی حیثیت سے اس کوچے کی طرف جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اس لیے اپنے لباس میں بھی ایسا اہتمام غیر ضروری جانا۔ مغرب سے ذرا پہلے وہ تیار ہو کر اڈے سے نکل پڑا۔ اس کی روانگی کی صرف گولو کو خبر تھی اور اسے بھی اس نے فقط اتنا بتایا تھا کہ ہواخوری کے لیے جارہا ہے ممکن ہے واپسی میں کچھ وقت لگ جائے۔ اسے طوائفوں اور بالاخانوں سے کبھی شغف نہیں رہا تھا اس لیے اس وقت بھی کسی کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ کسی طوائف سے ملنے... بالاخانے جارہا ہے۔ چاند بانو نے اسے جس انداز کا بلاوا دیا تھا، اسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے وہاں جانے کا سن کر سب یہی گمان کرسکتے تھے کہ چاند بانو کے بے تحاشا حسن نے فاروق جیسے پتھر میں بھی بالآخر جونک لگا ہی دی اور اسے اپنے بارے میں یہ رائے قبول نہیں تھی۔

تانگے میں سوار وہ اس بدنام کوچے میں پہنچا تو رات نے اپنے پر پھیلانا شروع کردیے تھے اور اسی حساب سے اس کوچے کی رونقیں بھی جاگنے لگی تھیں۔ پان والوں کی پکاریں، پھولوں کی مہک، بالاخانوں سے آتی ہنسی کی جھنکاریں، کہیں کہیں جھلک دکھاتے حسن کے جلوے...... لگا بندھا سا مخصوص ماحول تھا۔ فاروق تانگے سے اتر کر ایک پان کی دکان کی طرف بڑھا کہ پان والے سے زمرد بائی کے کوٹھے کا پتا معلوم کرسکے لیکن دکان پر پہنچنے سے قبل ہی ایک منحنی سے آدمی نے اس کا راستہ روک لیا۔ پینٹ شرٹ

میں ملبوس تقریباً چالیس بیالیس سالہ اس آدمی نے گلے میں سرخ رنگ کا رومال ڈال رکھا تھا اور ہونٹوں پر بھی پان کی سرخی رچی ہوئی تھی۔

''اپن کے ساتھ چلو بابو، ایک دم اے ون کوالٹی کا مال دلواؤں گا۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر فاروق کو پیشکش کی۔ فاروق کو اس کے وجود سے کراہیت محسوس ہوئی۔ وہ اس شے کا بیوپاری تھا جو اسے درکار ہی نہیں تھی بلکہ حقیقتاً اسے اس کے بکاؤ ہونے پر ہی بے پناہ افسوس تھا۔

''سوچتے کیا ہو بابو۔ دیارام سے بہتر دانہ دکھانے والا تمہیں اس پورے بازار میں کوئی نہیں ملے گا۔'' اسے خاموش پاکر مزید ترغیب دی گئی۔

''مجھے زمرد بائی کے کوٹھے پر جانا ہے۔'' آخر فاروق کے لبوں نے جنبش کی۔

''زمرد بائی کے پاس جا کر کیا کرو گے۔ وہاں سے اچھا مال اپنی مشتری بائی کے پاس ہے۔ ایک سے ایک کچا لڑکی اور ریٹ بھی کم۔'' وہ جس کوٹھے سے وابستہ تھا وہاں سے وفاداری نبھا رہا تھا۔

''زمرد بائی کے کوٹھے تک لے چلتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنا راستہ ناپو۔'' فاروق نے جیب سے ایک نوٹ نکال کر اس کے آگے لہراتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو اس کے ماتھے پر بل سے پڑ گئے لیکن ظاہر ہے وہ سامنے لہراتے نوٹ سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً رضامندی ظاہر کرتا ہوا بولا۔

''آپ کی یہی ضد ہے تو چلیے دکھا دیتا ہوں وہاں تک کا راستہ۔'' وہ بادلِ ناخواستہ ہی راضی ہوا۔ فاروق مشتری بائی کے کوٹھے تک چلنے پر راضی ہو جاتا تو وہ اس سے ملنے والے نوٹ کے علاوہ بائی سے بھی کمیشن پاتا۔

''اپنی لونڈیا کی شہرت پھیلا کر خوب گاہک سمیٹ رہی ہے زمرد بائی لیکن ہوشیار ایسی ہے کہ اونچی پارٹی دیکھے بغیر لونڈیا کو سامنے نہیں کرتی۔ آنے والا دید کی حسرت من میں لیے ہی واپس لوٹ جاتا ہے۔'' راہنمائی کا فریضہ انجام دیتا دیارام بڑبڑانے کے انداز میں اس کے کانوں میں معلومات انڈیل رہا تھا۔ مقصد یقیناً یہی رہا ہوگا کہ راستے میں ہی وہ اپنا ارادہ ملتوی کر کے اس کی پیشکش کے مطابق مشتری بائی کے کوٹھے پر چلنے پر راضی ہو جائے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے ساتھ چلتا جوان اس مزاج کا ہی نہیں ہے کہ حسن و ادا کی تلاش میں اس طرف آیا ہو۔ وہ تو کسی کی التجا پر بس انسانیت کے ناتے اس کوچے میں آنکلا تھا، سو کان لپیٹے چلتا رہا۔

''پان اور گجرے نہیں لو گے بابو؟'' ایک دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے دیارام نے ٹوکا تو وہ ٹھٹکا اور ایک پل کو سوچا کہ انکار کر دے۔ وہ کوئی گاہک کی حیثیت سے تو زمرد بائی کے بالاخانے پر نہیں جا رہا تھا۔ لیکن اگلے پل ہی اسے احساس ہو گیا کہ حقیقت کچھ بھی ہو، ظاہراً وہ اس ایک حیثیت سے ہی بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے۔ پھر ہر جگہ کے اپنے اصول و قواعد اور طور طریقے ہوتے ہیں جو آدمی کو چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اپنانے ہی پڑتے ہیں، سو دیارام کی مدد سے گجروں اور پان کا تکلف بھی پورا کر ڈالا۔

''یہ لو بابو یہ آ گیا، زمرد بائی کا کوٹھا۔ یہاں سے آپ خود ہی سیڑھیاں چڑھ جاؤ۔ اپن اس سے آگے نہیں جانے والا۔'' چند قدم مزید آگے چل کر دیارام نے روشنیوں سے جگمگاتے ایک دو منزلہ کوٹھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس نے اسے انعام دے کر رخصت کر دیا۔ بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے پیر جھجک رہے تھے۔ اسے کب عادت تھی ایسی جگہوں پر آنے کی۔ چاند بانو کے اصرار پر آ تو گیا تھا لیکن اب خیال آ رہا تھا کہ کیا زمرد بائی سے براہِ راست چاند بانو سے ملاقات کی فرمائش کرنا آسان ہو گا۔ پھر اس کا بھی تو آسانی سے رضامند ہونا مشکل ہی تھا۔ نانا کے پاڑے پر مجو دادا کی بے تابی پر اس نے اسے کیسا صاف جواب پکڑا دیا تھا۔ ممکن تھا کہ اسے بھی انکار کر دیتی، ایسے میں اس میں اور مجو میں بھلا کیا فرق رہ جاتا۔ خیال دل میں آیا تو سیڑھیاں چڑھتے قدم مزید سست پڑ کر تھم گئے۔ اسی وقت اوپر سے کوئی نیچے اترا۔ فاروق نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو صبح چاند بانو کے ساتھ لائبریری بھی آیا تھا۔

''آپ......'' وہ فاروق کو سامنے پا کر ٹھٹکا۔ ''میں آپ ہی کو دیکھنے نیچے بازار میں جا رہا تھا۔'' اس نے گویا فاروق کی ساری مشکلیں دور کر دیں۔

''آیئے، میرے ساتھ آیئے۔'' وہ پلٹ گیا تو فاروق اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کانوں نے ایک خوب صورت گیت کے بولوں اور موسیقی کے ساتھ گھنگروؤں کی جھنکار سنی۔ زمرد بائی کے کوٹھے پر محفل سج چکی تھی۔ اپنے راہنما کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے حریری پردے اور موتیوں کی لڑیوں سے سجے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے سمجھ لیا کہ محفل وہیں سجی ہے۔ اس کا راہبر اسے اپنے ساتھ لیے ایک

راہداری سے گزارتا سب سے آخری کمرے تک لے گیا اور ایک بند دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔

''آجاؤ مستان، دروازہ کھلا ہے۔''

جواب میں اندر سے چاند بانو کی مترنم آواز سنائی دی تو مستان کے نام سے پکارے جانے والے اس کے وفادار نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا اور مؤدب لہجے میں اطلاع دی۔ ''آپ کے مہمان تشریف لا چکے ہیں بے بی۔''

''ہائے اللہ۔'' چاند بانو ایک ادا سے کہتی دروازے کی طرف لپکی اور چاند کی طرح ہی فاروق کے سامنے طلوع ہوئی۔ سفید کرتے پاجامے پر سفید ہی چنا ہوا دوپٹا اوڑھے وہ سرتاپا چاندنی میں نہائی محسوس ہو رہی تھی۔ سنگھار کے نام پر اس کی آنکھوں میں پڑے کاجل کے ڈوروں کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن بنانے والے نے ہی اسے کچھ اس قدر سجا سنوار کر بنایا تھا کہ وہ یوں سادگی میں بھی سولہ سنگھار سے لیس نظر آتی تھی۔

''اندر آجائیے۔'' اپنے بے پناہ لمبے اور سیاہ بالوں والے سر کو آنچل سے ڈھانپتے ہوئے اس نے کپکپاتی آواز میں کہا تو اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر چھائے خوشی کے رنگ دیکھ کر فاروق کو خیال آیا کہ اگر وہ اپنا وعدہ ایفا نہ کرتا تو ان حسین رخساروں پر کھلتے گلاب زرد پڑ جاتے اور وہ بہار کو خزاں میں بدلنے کے جرم کا مرتکب ٹھہرتا۔

''ہمارا رُواں رُواں آپ کا منتظر تھا لیکن دل کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ جانے آپ آئیں یا نہ آئیں۔'' اسے ایک منقش کرسی پر بٹھاتے ہوئے چاند بانو نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''میں شاید اس کوچے کا رخ کبھی نہ کرتا لیکن آپ کے انتظار کا خیال ہی کھینچ لایا۔'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ہمارے انتظار کا اتنا خیال کیا۔'' چاند بانو کی آواز میں کھنک تھی۔ فاروق کی آمد کی خوشی اس کے نوخیز بدن کے انگ انگ سے چھلکی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے اپنے روبرو پا کر اس نے ہفت اقلیم کی دولت پا لی ہو۔ انسانی دل کی خوشی ہوتی بھی ایسی ہے۔ بڑے بڑے خزانے پا کر بھی نہ کھلنے والا دل کسی کی ایک جھلک پر ہی ناچ اٹھتا ہے۔

''یہ گجرے ہیں آپ کے لیے۔'' فاروق کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو ہاتھ میں تھامے گجرے ہی اس کی طرف بڑھا دیے۔

''ہمیں یقین ہے کہ آپ نے یہ گجرے کسی کے مشورے پر خریدے ہوں گے، خود آپ کے دل میں تو ایسا خیال آنا مشکل تھا۔'' اس نوعمر لڑکی کا اندازہ غضب کا تھا۔ فاروق جھینپ گیا۔ اس کے جھینپنے پر چاند بانو بڑے مربیانہ انداز میں مسکرائی اور اس کے ہاتھ سے گجرے لے کر بڑی نزاکت سے اپنی کلائیوں میں لپیٹنے لگی۔ گول بھری بھری کلائیوں سے لپٹ کر گجروں کی خوب صورتی یک دم ہی دوچند ہو گئی۔

''ان سے آپ کے ہاتھوں کی مہک آرہی ہے ورنہ اس سے پہلے ہم نے اتنی عمدہ خوشبو کبھی نہیں سونگھی۔'' کلائیوں کو ناک کے نزدیک لے جا کر چاند بانو نے پہلے ایک گہرا سانس لیا اور پھر سحرزدہ سے لہجے میں بولی۔ جواب میں وہ کیا کہتا بس خاموشی سے بیٹھا اسے دیکھتا رہا جس کی ایک جھلک ہی فرزانوں کو دیوانہ بنا دیتی ہو گی لیکن اس پل تو وہ خود دیوانگی میں مبتلا نظر آرہی تھی۔

''ارے...... ہم نے آپ کی کوئی خاطر مدارت تو کی ہی نہیں۔ آپ کی آمد نے اتنا بوکھلا دیا کہ آداب میزبانی ہی بھول گئے۔'' خاموشی کے لمحات میں چاند بانو کو اچانک ہی خیال آیا تو بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔ جھٹکے سے کھڑے ہونے کے باعث اس کا شریر آنچل سر سے ڈھلک گیا۔ چنے ہوئے دوپٹے کا آنچل یوں بھی کیا سر ڈھانپنے کا فرض ادا کر رہا تھا بس اتنا تھا کہ کناروں پر لگا پنج رنگی گوٹا اپنے رنگوں کا جو عکس اس کے چہرے پر برسا رہا تھا، وہ اس دوری پر ذرا خفا خفا سا نظر آنے لگا۔

''خاطر مدارت کے تکلف کو جانے دیجیے اور وہ گفتگو کیجیے جس کے لیے آپ نے دعوت دی تھی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کے انتظار کے احترام میں بار بار اس طرف کا رخ کر سکوں۔'' وہ چاند بانو کے روپ بدلتے رنگوں سے خوف زدہ اسے حقیقت سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کی بات سن کر چاند بانو کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ اس کے گلابی ہونٹوں نے کپکپا کر کچھ کہنے کی جسارت کرنی چاہی لیکن پھر یک دم ہی آپس میں پیوست ہو گئے۔ اسی وقت دروازے کی طرف بڑھتے تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے ذرا پریشان سے انداز میں زور سے دستک دی۔

''آجاؤ۔'' چاند بانو نے خود کو سنبھال کر باوقار لہجے میں کہا اور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

دروازہ فوراً ہی کھلا اور کھلے دروازے سے مستان اندر داخل ہوا۔

''کیا بات ہے مستان؟'' اس کے چہرے کے

تاثرات دیکھ کر چاند بانو نے قدرے تشویش سے دریافت کیا۔ فاروق نے بھی مستان کے چہرے کا غیر معمولی پن محسوس کرلیا تھا اور خود اس کے اندر کوئی الارم سا بجنے لگا تھا۔

''مجو دادا ایک انگریز افسر کے ساتھ آیا ہے۔ ساتھ میں اس کے کئی چیلے بھی ہیں۔ بائی جی سے ضد کررہا ہے کہ اپنے انگریز دوست سے آپ کی ملاقات کروانی ہے۔'' مستان نے سراسیمہ لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

''پھر......؟'' اس ایک لفظ میں بہت سے سوال تھے۔

''بائی جی انہیں سمجھا رہی ہیں کہ آپ تھکی ہوئی ہیں اور کسی صورت آج کوئی ملاقات یا محفل آرائی نہیں کرسکتیں لیکن وہ سمجھنے کو راضی نہیں۔ بس یہی دھمکیاں دے رہا ہے کہ اس کا دوست بہت بڑا افسر ہے اور اگر اس کا مطالبہ نہ مانا گیا تو بائی جی کے ہاتھوں سے یہ کوٹھا بھی جاسکتا ہے۔'' مستان نے حالات کی سنگینی کو واضح کیا۔

''بائی جی کو بتا دو مستان کہ آج ہم کسی بھی قیمت پر کسی سے ملاقات نہیں کریں گے۔'' چاند بانو کی پیشانی پر تشویش سے بل تو ضرور پڑے لیکن اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''لیکن بے بی...... اس طرح تو بہت نقصان......'' مستان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے چاند بانو...... آپ ان لوگوں سے ملاقات کرلیجیے۔ میں کسی اور وقت آجاؤں گا۔'' فاروق نے بھی رفع شر کے خیال سے اسے مشورہ دیا۔ ایک تو مجو خود اچھی خاصی فتنہ پرور شخصیت کا مالک تھا، دوسرے اس کے ساتھ انگریز افسر کی موجودگی کریلا وہ بھی نیم چڑھا کے مصداق تھی۔ ایسے میں چاند بانو کی ضد حالات کو بہت خراب کرسکتی تھی۔

''اس وقت ہم نفع و نقصان کی پروا کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔'' چاند بانو اپنی جگہ اٹل تھی۔ اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی کمرے کے دروازے سے زمرد بائی نمودار ہوئی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

''آداب۔'' فاروق کو دیکھ کر اس نے رکھی سے لہجے میں کہا اور فوراً چاند بانو کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''مستان نے تمہیں صورت حال بتا ہی دی ہوگی۔ اس وقت ہم بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔''

''آپ مشکلوں سے نکلنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ یہ مت بھولیے کہ آج کی شام کے لیے ہمارے اور آپ کے مابین پہلے ہی معاہدہ طے پاچکا ہے اور آج آپ ہمیں کسی بھی قسم کی زحمت نہ دینے کی پابند ہیں۔'' چاند بانو نے چڑھی تیوری کے ساتھ زمرد بائی کو جواب دیا۔

''ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے لیکن اس وقت ہم بہت مجبور ہوگئے ہیں۔ یہ اس کوٹھے کی بقا کا معاملہ ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کی زندگیاں داؤ پر لگا کر وعدہ وفا کرنے کے بجائے ہم تمہیں پیشکش کرتے ہیں کہ اس ایک شام کے بدلے جتنی چاہے شامیں مانگ لینا لیکن اس وقت مصلحت سے کام لو۔'' زمرد بائی کے لہجے میں بیک وقت حکم اور التجا تھی۔

''لالچ تو خوب ہے لیکن آپ ہی بتائیے کہ کیا دعوت دے کر بلائے گئے مہمان کو رخصت کردینا خلافِ آداب نہ ہوگا۔'' چاند بانو کا تیکھاپن برقرار تھا۔ اس مرحلے پر فاروق نے ایک بار پھر مداخلت کرنی چاہی لیکن باہر سے سنائی دینے والے ہنگامے نے اسے اپنی بات کہنے نہیں دی۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ کچھ لوگ اس طرف پیش رفت کرنا چاہتے ہیں اور زمرد بائی کے ملازم انہیں روکنے کی التجا آمیز کوشش کررہے ہیں۔ آوازیں سن کر زمرد بائی سراسیمہ سی باہر کی طرف لپکی۔ اسی وقت باہر سے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ بہت سی چیخوں کے ساتھ چاند بانو کے ہونٹوں سے بھی ایک سریلی چیخ بلند ہوئی۔ اتنی آوازوں میں اس بات کا تعین کرنا کہ گولی نے کسی کو ضرر پہنچایا ہے یا محض ہوائی فائر کیا گیا ہے، کافی مشکل تھا۔ صورت حال کو گمبھیر کرنے کے لیے گولی کی دہشت ہی کافی تھی۔ فاروق اگرچہ دہشت زدہ نہیں ہوا لیکن تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ حالات کا رخ بتا رہا تھا کہ اس کے لیے غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں ہوگا لیکن تصادم کی صورت میں اس کی پوزیشن بہت نازک ہوجاتی۔ باہر ایک ایسا دشمن جو پہلے ہی اس سے بے پناہ خار کھائے ہوئے تھا، اپنے متعدد چیلوں کے ساتھ موجود تھا اور اس پر طرہ یہ کہ وہاں ان کے روایتی ہتھیاروں کے علاوہ آتشیں ہتھیار کی موجودگی بھی ثابت ہوگئی تھی۔

''یہ کیا غضب کرتے ہیں سرکار...... اس لونڈی کے بالا خانے پر بھلا آپ کو اس موذی ہتھیار کے نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں کون ہے جو آپ کی خدمت سے انکار کرے۔ بے بی سو رہی تھی بس اسے جگانے میں ذرا وقت لگ گیا۔ آپ چل کر آرام سے بیٹھیے وہ ابھی تیار ہوکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتی ہے۔'' صورتِ حال کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے فاروق نے دروازے کی طرف پیش قدمی کی تھی کہ باہر سے زمرد بائی کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں خوف ضرور تھا لیکن یہ اندازہ بہر حال ہو رہا تھا کہ چلنے

والی گولی نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ گولی کسی کو لگ جاتی تو چیخ و پکار ہی الگ ہوتی۔ اپنے اندازے کی درستی کو جانچنے کے لیے اس نے دروازے سے ذرا سا سر باہر نکال کر جھانکا۔ مجو، اس کے ساتھ کھڑا ایک سوٹڈ بوٹڈ انگریز اور ان کے پیچھے موجود چار پانچ افراد فوراً ہی اس کی نظر میں آگئے۔ زمرد بائی کے ملازمین بھی دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ سمٹے ہوئے کھڑے تھے جبکہ بائی، مجو کے روبرو تھی۔ پل بھر میں اس پوری صورتِ حال کا جائزہ لے کر اس نے سر دوبارہ اندر کرلیا۔

''بہانے بناتی ہے...... کی بچی۔ صاف بول کہ اندر کسی اور یار کو لے کر بیٹھی ہے تیری لونڈیا۔'' مجو کو شاید اس کی جھلک دکھائی دے گئی تھی، سو زمرد بائی کی التجا کے جواب میں زور سے دہاڑا اور پھر شاید بائی کو دھکیلتا ہوا اس طرف بڑھا۔ فاروق کو معلوم تھا کہ مغلوب الغضب مجو نے اگر چاند بانو کے کمرے میں اسے دیکھ لیا تو کسی قسم کی رعایت نہیں کرے گا۔ وہ پھرتی سے اپنے دفاع کے لیے حرکت میں آیا اور...

کمرے کے وسط میں بچھی مسہری کے دوسری طرف کود کر یوں دبک گیا کہ اندر آنے والے کسی بھی مرد کی فوری طور پر اس پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ ثانیے بھر کے فرق سے مجو دادا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا جبکہ اس کے ساتھ موجود انگریز افسر کے ہاتھ میں پستول بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجو دادا کے چیلوں کے بھی خالی ہاتھ ہونے کا گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے میں اسے جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھل کر کرنا تھا۔

''کدھر ہے وہ تیرا یار؟'' کمرے میں آتے ہی مجو دادا نے چلا کر چاند بانو سے پوچھا، وہ جواب کیا دیتی کھڑی کانپتی رہی۔

''ریلیکس دادا ریلیکس۔ اتنی بیوٹی فل لیڈی سے اتنا لاؤڈ ہو کر بولنا نہیں مانگتا۔ یہ تو جسٹ لائک آ فل مون ہے۔ تم نے کیا نیم بولا تھا اس کا؟ چاند بانو...... ونڈر فل۔ اس پر یہ نیم بہت سوٹ کرتا ہے۔'' مجو کے ساتھ آئے انگریز افسر کو چاند بانو کے حسنِ بے مثال نے سحر زدہ کر دیا تھا چنانچہ اس نے ذرا سخت لہجے میں مجو کو ٹوکا اور پھر چاند بانو کی طرف قدم بڑھائے۔ قریب آ کر اس نے چاند بانو کا چہرہ اپنی انگلیوں سے چھونے کی کوشش کی تو وہ ناگواری سے ایک طرف ہٹ گئی۔ شراب کے نشے میں چور انگریز افسر جو اپنی ہی دھن میں تھا، اس کی اس حرکت پر ذرا سا لڑکھڑا گیا۔ مجو کسی غلام کی طرح اسے سنبھالنے کے لیے لپکا۔ یہ وہ لمحات تھے جب سب کی توجہ مکمل طور پر اس منظر کی طرف مبذول ہو گئی تھی چنانچہ فاروق نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور مسہری کے پیچھے سے نکل کر تقریباً اڑتا ہوا انگریز افسر تک پہنچ گیا۔ اس کا رفیق چاقو اس پل اس کی مشاق انگلیوں کے درمیان موجود تھا۔ کوئی اس کے خلاف کچھ کرتا، اس سے قبل ہی اس کا بایاں بازو انگریز افسر کو دبوچ چکا تھا اور اس کے چاقو کی نوک افسر کی شہ رگ پر ٹک گئی تھی۔

''یہ تو ہے حرام کے پلّے۔ آج تو یہاں سے زندہ نہ جا سکے گا۔'' اسے سامنے پا کر مجو دادا غصے سے پاگل ہونے لگا۔

''مجھ سے پہلے تمہارا یہ دوست اپنی جان سے جائے گا۔'' چاقو کا دباؤ کچھ اور بڑھاتے فاروق نے ٹھنڈے لہجے میں مجو کو آگاہ کیا۔

''کوئی مسٹیک مت کرنا دادا۔ یہ جیسا بولتا ہے سنو۔'' موت کو گردن سے لپٹا دیکھ کر انگریز افسر کا افسری اور شراب دونوں کا نشہ ہرن ہو گیا تھا چنانچہ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں مجو دادا کو سمجھانے لگا۔ اس کا وہ پستول جو کچھ دیر پہلے وہاں دہشت پھیلانے کا سبب بنا تھا، فاروق نے پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لیا تھا اس لیے اس کے غبارے سے ہوا مکمل طور پر نکل چکی تھی۔

''ہم غلاموں پر رحم کیجیے۔ اگر اس بالا خانے پر خون خرابا ہوا تو پھر یہاں کون سی محفل آباد ہو سکے گی۔'' مجو اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے کمرے میں لوٹ آنے والی زمرد بائی کی اپنی ہی فکریں تھیں چنانچہ وہ ہاتھ جوڑے سب سے بیک وقت التجا کر رہی تھی۔ اس کے برعکس چاند بانو کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اور وہ ستائشی نظروں سے فاروق کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ گھبرائیں مت مسٹر ولیم! اپن اس کل کے لونڈے سے بہت اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔'' اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتے مجو دادا نے انگریز افسر کا حوصلہ بلند کیا۔ اس کے ساتھیوں کے تیور بھی بتا رہے تھے کہ وہ بس دادا کی طرف سے ایک اشارے کے منتظر اپنے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہیں ورنہ انہیں فاروق کی تکا بوٹی کرنے میں چند لمحوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

''یہ تمہارے لیے بہت بڑا رسک ہو گا مسٹر ولیم! یہ سب مل کر بے شک میرا حشر کر سکتے ہیں لیکن ایسا اس وقت ہو گا جب تم خود لاش میں تبدیل ہو چکے ہو گے۔'' فاروق نے انگریزی میں اپنے بازو کے شکنجے میں موجود انگریز افسر کو آگاہ کیا جو بیک وقت اس کی انگریزی دانی اور دھمکی سے

متاثر ہو گیا اور دہاڑ سے مشابہ لہجے میں چیخا۔

''آئی سیڈ دادا! تم کچھ نہیں کرو گے، جو یہ بولے وہ سنو۔'' وہ یقیناً بڑا افسر تھا جو مجو دادا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کے آگے مجبور ہو گیا اور غضب ناک نگاہ سے فاروق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، ابھی ٹیم تمہارے ہاتھ میں ہے، بولو کیا بولنا مانگتا ہے؟''

''میں مسٹر ولیم کو اپنے ساتھ لے کر باہر جاؤں گا اور پھر پانچ منٹ کے اندر اندر تم اور تمہارے ساتھی بھی باہر ہونے چاہئیں۔ یاد رکھنا کہ یہاں کی کسی شے یا شخص کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ نتائج کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ میرا یقین ہے کہ یہ مردوں کی لڑائی ہے اور اس لڑائی میں تم عورتوں کو نقصان پہنچا کر اپنی مردانگی کی توہین نہیں کرو گے۔'' فاروق نے اپنے مطالبات اس کے سامنے رکھے۔

''ٹھیک ہے ابھی اپن تمہارا ہر بات مانے گا پر تم بھی یاد رکھو کہ ادھر والوں سے اپنا تم سے الگ پھڈا ہے۔'' وہ ایک طرح سے اسے باور کروا رہا تھا کہ فی الحال تو وہ اس کی ہر بات مان رہا ہے لیکن زمرد بائی اور چاند بانو سے اس کا معاملہ دیگر ہے۔

''جب تک تمہارا میرا سامنا نہیں ہوا تھا دونوں باتیں الگ الگ تھیں لیکن اب سے یہ دونوں میری پناہ میں ہیں اور انہیں پہنچنے والے کسی نقصان کو میں اپنا نقصان سمجھوں گا۔'' اس نے مجو دادا کو صاف جواب پکڑا دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کے ان جملوں کا مجو دادا سے زیادہ چاند بانو پر اثر ہوا ہے اور وہ کسی پھول کی طرح کھل اٹھی ہے۔

''اپنے قد سے بڑی باتیں مت کر لونڈے۔ یہ دشمنی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔'' مجو ایک بار پھر بری طرح تلملایا۔

''کس کا قد کتنا ہے، یہ تو وقت بتائے گا۔ فی الحال تم ابھی کی بات کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرا ہاتھ بہک جائے اور بے چارے مسٹر ولیم بیکار میں اپنی جان سے چلے جائیں۔'' مجو سے زیادہ بحث کرنا اسے وقت کے زیاں کے مترادف محسوس ہوا چنانچہ حالیہ صورتِ حال کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ اس کی دھمکی آمیز بات سن کر ولیم کانپ سا گیا اور جلدی سے اس کی تائید کرتا ہوا بولا۔

''دس مین رائٹ۔ ابھی ہم یہ سب فنش کرنا مانگتا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر ولیم! صرف آپ کی خاطر اپن پیچھے ہٹ جاتا ہے۔'' مجو راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ راستہ مل جانے پر فاروق اسی طرح ولیم کی شہ رگ پر چاقو کی نوک رکھے اسے ہلکے سے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھا۔ ان لمحات میں وہ پوری طرح چوکنا تھا اور اپنی دو آنکھوں سے دسیوں آنکھوں کا کام لے رہا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مجو اور اس کے چیلوں کی آنکھیں اسی پر جمی ہیں اور اگر وہ ذرا بھی چوک گیا تو وہ سارے کے سارے مل کر اسے چھاپ لیں گے۔

ولیم کو ڈھال بنا کر اس نے چاند بانو کے کمرے اور پھر بالا خانے سے باہر تک کا فاصلہ کامیابی سے طے کر لیا تو قدرے اطمینان محسوس کرنے لگا حالانکہ باہر بھی کوئی اچھا منظر نہیں تھا۔ زمرد بائی کے کوٹھے پر چلنے والی گولی کی آواز بازار کے ہنگاموں کے باوجود کئی لوگوں نے سنی تھی اور بہت سے لوگ صورتِ حال جاننے کے لیے نیچے جمع ہو گئے تھے اور ولیم کو چاقو کی زد میں لیے باہر آتے دیکھ کر کئیوں کے لبوں سے چیخیں نکل گئیں۔ ولیم کی شہ رگ پر جمے چاقو کے علاوہ اس کے بائیں ہاتھ میں پستول بھی موجود تھا اور یقیناً لوگوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ کوٹھے پر چلنے والی گولی اسی نے چلائی ہے۔ اس کے ساتھ بھی خوب ہی تماشا ہوا تھا۔ زندگی میں کبھی اس کوچے کی طرف رخ کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا اور اب پہلی بار ادھر آیا تھا تو جیسے اس کی آمد کا اشتہار لگ گیا تھا۔

اس ہجوم میں جانے کتنے لوگ تھے جو اس کی یہاں موجودگی اور پھر اس سارے ہنگامے کے چشم دید گواہ بن چکے تھے۔ اس نے کوشش کر کے خود کو اس صورتِ حال کی طرف سے بے نیاز کر لیا اور انتظار کرنے لگا کہ مجو اور اس کے ساتھی اس کی دی گئی پانچ منٹ کی مہلت میں باہر نکل آئیں۔ انتظار کے ان مختصر لمحات میں ایک الگ ہی اندیشے نے اس کے خیال میں سر اٹھایا۔ مجو بھی تو اس کی چال اسی پر لوٹا سکتا تھا۔ وہ بھی زمرد بائی اور چاند بانو کی شہ رگ پر چاقو رکھے باہر نکل آتا اور اسی کی طرح دھمکیاں دیتا ہوا ولیم کو چھوڑنے کی بات کرتا تو اس کے پاس کیا گنجائش رہتی۔ بے شک چاند بانو اور زمرد بائی سے اس کا کسی قسم کا جذباتی تعلق نہیں تھا لیکن بہرحال تھیں تو وہ دو بے قصور کمزور عورتیں۔ کیا وہ اپنی فتح کے لیے ان دونوں کی جان کی بازی لگانا منظور کر سکتا تھا؟ یقیناً نہیں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی بے بسی کے احساس نے اسے بری طرح مضطرب کر دیا۔ اضطراب کے اس عالم میں اس نے مجو کے آدمیوں کو بالا خانے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے دیکھا۔ ایک ایک کر کے مجو سمیت وہ سب نیچے اتر آئے تو اس کی جان میں جان

آئی۔ اس کے اندیشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ مجو کو یہ ترکیب ہی نہیں سوجھی تھی یا اس کے خیال میں بازار کی وہ عورتیں اس لائق نہیں تھیں کہ وہ انہیں گورے افسر ولیم کی برابری پر کھڑا کر کے سودے بازی کرتا۔ آدمی عموماً دوسرے کے بارے میں اپنے حال کے مطابق ہی قیاس کرتا ہے۔ مجو جس سطح کا آدمی تھا، اس کے نزدیک انگریز افسر ولیم اور چاند بانو وغیرہ کے درمیان کسی تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھلا افسر اور طوائف کے فرق کو ذہن سے نکال کر دونوں کو انسان کے درجے پر مساوی کیسے رکھ سکتا تھا اور یہی سوچ اس وقت فاروق کی مددگار ثابت ہوئی تھی ورنہ وہ کڑے امتحان میں پھنس جاتا۔

''تم سب پندرہ منٹ تک یہیں رکے رہو گے۔ میں مسٹر ولیم کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ آگے جا کر میں انہیں آزاد کر دوں گا۔ تم میں سے کوئی میرے پیچھے آنے کی غلطی مت کرنا۔'' ولیم سمیت قریب کھڑے ایک تانگے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں مجو اور اس کے ساتھیوں کو حکم دیا۔ زہرہ بائی پر افسرانہ شان سے آنے والا ولیم کسی بھیڑ کی طرح شرافت سے اس کے اشارے پر چلتا تانگے میں سوار ہو گیا۔ ان دونوں کے سوار ہوتے ہی تانگے والے نے گھوڑے کو چابک رسید کر کے آگے بڑھا دیا۔ تانگے والے کا چہرہ فاروق کے لیے شناسا سا تھا لیکن جن حالات میں وہ پھنسا ہوا تھا پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا کہ تانگے والے کے لیے شناسائی کا یہ احساس کیوں ہو رہا ہے۔

''کدھر چلنا ہے بابو؟ کہیں اور جانا ہے یا ادھر فاروقی مسجد کے پاس والے محلے میں لے چلوں؟'' تانگا بازار سے نکلا تو آگے بیٹھے کوچوان نے اس سے پوچھا۔ فاروق جو بیک وقت ولیم اور اپنے تعاقب پر دھیان رکھے ہوئے تھا کوچوان کے سوال پر چونکا۔ اسی وقت اسے یاد آ گیا کہ یہ وہی ہندو کوچوان ہے جس نے کچھ روز قبل لائبریری سے واپس آتے ہوئے اسے اڈے کے پاس اتارا تھا اور اس کی وہاں مجو کے دو آدمیوں سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ آج بھی وہ اسے ایسے ہی حالات میں ملا تھا کہ اس کی مجو اور اس کے ساتھیوں سے ٹھنی ہوئی تھی اور وہ انگریز افسر ولیم کو اپنے تحفظ کے لیے یرغمال بنا کر ساتھ لے جا رہا تھا۔

''وہیں چلنا ہے لالہ۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کوچوان کو جواب دیا اور خود اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسے ولیم کو اتارنے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ اسے وہ اڈے تک اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ اسے خود بھی معلوم تھا کہ ایک انگریز افسر کا اغوا کتنا نازک معاملہ ثابت ہوگا۔ اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، وہی بہت تھا۔ اب مزید... گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے تھی۔

''ذرا یہاں روک دو.....'' رات دیر گئے تک کھلے رہنے والے چائے خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کوچوان کو حکم دیا تو اس نے فوراً تانگا روک دیا۔

''آپ یہاں اتر سکتے ہیں مسٹر ولیم۔ یہاں سے آپ کو کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔'' تانگا رکوانے کے بعد اس نے شائستگی سے ولیم سے کہا تو اس کے سراسیمہ چہرے پر رونق دوڑ گئی۔ شہ رگ کے بعد اب سفر کے دوران پہلو سے لگے چاقو نے اس کی جان سولی سے لٹکائی ہوئی تھی اور وہ یوں فاروق سے تعاون کرتا رہا تھا کہ ذرا سی غلط جنبش پر یہ چاقو اس کی جان لے لے گا۔

''اسے بھی اپنے ساتھ لیے جائیے۔'' پروانۂ آزادی ملنے پر تیزی سے نیچے اترتے ولیم کو فاروق کی آواز نے چونکایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ فاروق اس کے پستول کا چیمبر خالی کرنے کے بعد پستول اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پستول تھام لیا جس کی حیثیت فی الحال لوہے کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ فاروق نے صرف اس خیال سے گولیاں نکال لی تھیں کہ کہیں ہتھیار ہاتھ میں آنے کے بعد ولیم کو مہم جوئی کا خیال نہ آ جائے۔ وہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے پستول کا استعمال کرنے بیٹھ جاتا تو مشکل ہو جاتی۔ اس کا پستول فاروق مال غنیمت کے طور پر بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ واقفیت رکھنے کے باوجود اس قسم کے ہتھیاروں کے استعمال میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ربن کے نزدیک چاقو جیسی کلاسیکل شے کے مقابلے میں آتشیں اسلحے کا استعمال سخت ناپسندیدہ تھا۔ اس کے مطابق یہ ہتھیار دہشت اور تباہی پھیلانے میں تو بے شک آگے تھے لیکن آدمی کی ہنرمندی کو چاٹ جاتے تھے۔ وہ چاقو بازی کو باقاعدہ ایک فن قرار دیتا تھا اور اس کے نزدیک فنکار کے ہاتھ میں وہی شے سجتی تھی جو اسے فنکار ثابت کر سکے۔ اپنا یہ فن اس نے فاروق میں بھی منتقل کیا تھا اور وہ چاقو کے بجائے پستول ہاتھ میں لے جا کر اپنے استاد کی دل آزاری نہیں کر سکتا تھا۔ ناگزیر حالات کی بات اور تھی۔

''چلو۔'' ولیم پستول ہاتھ میں لیے آگے بڑھ گیا تو اس نے کوچوان کو حکم دیا۔ تانگا ایک بار پھر حرکت میں

آ گیا۔ کمزور گھوڑے کے زور سے چلتے اس تانگے کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ گولو کو اپنے تاخیر سے آنے کا بتا کر اڈے سے چلا تھا اس لیے اس سلسلے میں فکر مند نہیں تھا کہ وہاں لوگ اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہوں گے بلکہ ایک طرح سے تانگے کی سست رفتاری اسے کچھ دیر قبل پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کرنے کا موقع فراہم کر رہی تھی۔

واقعات عجیب ہی طرح پیش آئے تھے۔ چاند بانو کے التجا نما بے حد اصرار پر اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کوٹھے کا رخ کیا تھا اور بڑا ہی انوکھا اتفاق تھا کہ اس کے مخالف مجو دادا نے بھی عین اسی شام اپنے ایک خاص مہمان سمیت اس طرف کا رخ کیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ چاند بانو تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اپنے وعدے اور فاروق کی وہاں موجودگی کے باعث زمرد بائی کو انکار کرنا پڑا۔ اس انکار کو مجو دادا نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور دندناتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت چاند بانو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں جو اس نے فاروق کو انکار کی وجہ کے طور پر دیکھا تو مزید مشتعل ہو گیا اور یکایک معاملات ایک طوائف کے حصول سے آگے نکل کر اپنے دشمن سے مقابلے تک پہنچ گئے۔ ان حالات میں اگر فاروق نے ہوش مندی اور پھرتی سے کام نہیں لیا ہوتا تو زمرد بائی کے کوٹھے سے صحیح نکلنا ممکن نہ ہوتا۔ اس سارے قصے میں انگریز افسر ولیم کے ملوث ہونے کے باعث اسے مستقبل میں مزید پیچیدگیوں کا بھی اندیشہ تھا۔ ابھی تو اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ولیم کس محکمے کا افسر ہے لیکن اس بات سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ افسر تو بہرحال وہ تھا اور اس کی خواہش پر پولیس سمیت کوئی بھی محکمہ فاروق اور اس کے دوستوں کے خلاف حرکت میں آ سکتا تھا اور یہی بات اس کے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سوں کو مشکل میں ڈال چکا ہے لیکن جو ہو چکا تھا اسے پلٹنا یا بھی نہیں جا سکتا تھا اور اس کے پاس ایک ہی حل رہ گیا تھا کہ وہ اڈے پر پہنچتے ہی ربن کو حالات سے بالتفصیل آگاہ کر دے۔ تجربے اور ذہانت دونوں میں ربن اس سے بہت آگے تھا اور اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے میں بہتر کردار ادا کر سکتا تھا۔ انہی خیالات میں گم وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بیٹھا تھا کہ تانگے کو لگنے والے اچانک جھٹکے نے چونکا دیا۔

"کیا ہوا...... تانگا کیوں روک دیا؟" اس نے کوچوان سے پوچھا۔

"راستہ بند ہے بابو۔" کوچوان نے وحشت زدہ لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ اس دوران اس کی نظروں نے بھی وہ جیپ دیکھ لی تھی جو تانگے کے بالکل سامنے رکی ہوئی تھی اور جس سے مجو کے آدمی چھلانگیں لگا کر اتر رہے تھے۔ اس کا بے ساختہ ہی اپنی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ یہ جیپ تو اس نے زمرد بائی کے بالا خانے کے قریب بھی کھڑی دیکھی تھی اور ظاہر ہے انگریز افسر ولیم کی ملکیت تھی لیکن اس نے دھیان ہی نہیں دیا اور اب اسے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ اس کی وہاں سے روانگی کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ اپنے پاس اس تیز رفتار سواری کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجو اور اس کے ساتھی اس کے بازار سے نکلنے کے بعد حرکت میں آئے ہوں گے۔ انہیں اس کی منزل کا تو معلوم ہی تھا چنانچہ انہوں نے اتنا فاصلہ برقرار رکھا ہوگا کہ اسے اپنے تعاقب کا علم نہ ہو سکے۔ بعد میں شاید انہیں چائے خانے کے قریب اتارا گیا ولیم بھی مل گیا ہو چنانچہ ان کے عزائم کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی اور وہ جیپ میں سوار ہو کر اس کے سر پر چڑھ آئے اور اب انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ ان کے خطرناک ارادے ان کے چہروں اور جسم کی ایک ایک حرکت سے چھلکے پڑتے تھے۔ فاروق جانتا تھا کہ تنہا ان سب کو شکست دے کر بچ نکلنا تقریباً ناممکن ہے پھر بھی اپنا چاقو ہاتھ میں لیے باوقار انداز میں تانگے سے نیچے اترا۔

"آج تیرے بدن پر اتنے گھاؤ لگیں گے کہ ربن دادا کو گنتی بھول جائے گی۔" اس کے عین مقابل کھڑے ہوتے ہوئے مجو نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اسے آگاہ کیا۔

"مجھے یقین ہے کہ دادا یہ دیکھ کر خوش ہوگا کہ میں نے ہر وار اپنے سینے پر روکا اور پیٹھ دکھا کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔" اس کی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہیں تھی۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ تیرے اندر کتنا دم خم ہے۔" مجو چاقو تھامے اس کی طرف لپکا۔

فاروق نے اپنی نظروں کو اس کے چاقو پر مرتکز کر دیا لیکن اسے معلوم تھا کہ یہاں ایک چاقو نہیں ہے۔ مجو کے ساتھی بھی پوری طرح تیار کھڑے ہیں اور اب تک مجو اور اس کے ساتھیوں کا جو کردار سامنے آیا تھا وہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان کی دنیا کے قاعدے قوانین کی پابندی کریں گے اور اس کے اور مجو کے درمیان فیصلہ ہو جانے تک اپنے

ہاتھوں کو باندھے رکھیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ اس نے خود پر حملہ آور مجو کے وار سے بچنے کے لیے جونہی پینترا بدلا اردگرد کھڑے کم سے کم تین آدمی مزید حرکت میں آ گئے۔ فاروق نے اپنے چاقو والے ہاتھ کو پھیلا کر دائرے کی صورت میں گھومتے ہوئے اتنی تیزی سے گردش دی کہ کوئی اسے چھو بھی نہیں سکا البتہ اس کے چاقو کی دھار نے ان میں سے ایک کے بازو کو نشانہ بنا کر اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔

''اسٹاپ۔'' اسی وقت فضا میں ایک دہاڑتی آواز گونجی اور ولیم رائفل بردار منظر میں شامل ہوا۔

''تم میں سے کوئی بھی حرکت میں آیا تو ہم اسے گولی مار دے گا۔'' اس نے بیک وقت فاروق اور مجو دادا کے چیلوں کو مخاطب کیا۔

''آپ ہٹ جائیں مسٹر ولیم! اپن خود اس سے نمٹ لے گا۔'' مجو دادا نے سینہ پھلا کر اپنی بہادری ثابت کرنا چاہی۔

''نو، کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ ہم خود اسے ہینڈل کرنا مانگتا ہے۔ یہ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن جائے گا اور وہاں ہم اپنے طریقے سے اس سے نمٹے گا۔'' ولیم نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا تو مجو کے چہرے پر مایوسی دوڑ گئی۔ ادھر فاروق نے بھی ایک گہرا سانس لیا۔ ایک انگریز افسر کی ناراضی کے شکار فرد سے پولیس اسٹیشن میں کیا سلوک کیا جا سکتا تھا، یہ کوئی اتنا ناقابل فہم نہیں تھا لیکن اب اس کے پاس کوئی جائے فرار بھی نہیں رہی تھی۔ رائفل تھامے ولیم کے تیور زرمردبائی کے کوٹھے کے مقابلے میں زیادہ خطرناک بھی تھے اور وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ چوکنا بھی نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

اپنی لمبی انگلیوں میں قلم تھامے جولیٹ کاغذ پر یونہی لایعنی سی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اتنی منتشر تھی کہ اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ دفتر سے چھٹی کا وقت ہو چکا ہے اور اس کے ساتھی اپنا اپنا سامان سمیٹ رہے ہیں۔ اس کی اس کیفیت کے پیچھے دلدار آغا کی طرف سے موصول ہونے والی آخری فون کال تھی۔ ہمیشہ اس سے عشق بگھارنے والے آغا کا لہجہ آج خاصا برہم تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے مسلسل رد کر کے جولیٹ نے اس کی حد سے زیادہ توہین کر ڈالی ہے چنانچہ اس نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ اس کے دل میں جگہ بنانے کی اپنی پرخلوص کوششیں ترک کر دے گا اور اپنی خواہش کے حصول کے لیے اب وہ [illegible] اختیار کرے گا جو جولیٹ کے لیے قطعی باعزت نہیں ہوگا۔ یہ دھمکی دیتے ہوئے اس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ جولیٹ سرتاپا لرز گئی تھی اور اسے اپنی ساری خوداعتمادی ہوا ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوف اور الجھن کی یہی کیفیت اسے دفتر سے باہر نکلنے سے بھی روک رہی تھی۔ اس لگ رہا تھا کہ باہر آغا کے شکاری کتے گھات لگائے بیٹھے ہیں اور وہ جیسے ہی یہاں سے باہر نکلے گی، وہ اسے دبوچ لیں گے۔

''کیا بات ہے آج گھر نہیں جانا ہے کیا؟'' اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر عارف نے اس کی میز کے قریب آ کر پوچھا تو وہ بری طرح چونکی۔

''آں..... کیا کہا تم نے؟''

''کن خیالوں میں گم ہو۔ سب لوگ دفتر سے نکل رہے ہیں اور تم ایسے بیٹھی ہو جیسے آج گھر جانے کا ارادہ ہی نہ ہو۔'' عارف نے اسے احساس دلایا تو وہ اپنی میز پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ چیزوں کو سمیٹتے ہوئے اس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ منتظر کھڑے عارف کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''آج میرے ساتھ میرے گھر چلو عارف، مام اور ڈیڈ کافی دنوں سے تمہیں یاد کر رہے ہیں۔'' اس کی پیشکش میں ایک التجا سی چھپی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اندر سے جتنا کمزور محسوس کر رہی تھی، اس کیفیت میں عارف کا ساتھ اسے سہارا دے سکتا تھا۔ عارف کو اپنے ساتھ گھر لے جانے میں یوں بھی کوئی قباحت نہیں تھی کہ جوزف اور جوزفین دونوں ہی اس سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ جولیٹ اسے اپنے مستقبل کے ساتھی کے طور پر منتخب کر چکی ہے۔ انہیں ان مسائل کا بھی علم تھا جن کی وجہ سے فی الحال وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس غیر یقینی سی صورتِ حال پر تشویش میں مبتلا ہونے کے باوجود انہوں نے بھی جولیٹ کے فیصلے سے اختلاف نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں جولیٹ کا اپنی زندگی پر زیادہ حق تھا اور اسے اس بات کی آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے لیے اپنی مرضی کا شریکِ حیات منتخب کرے۔ ویسے بھی وہ دونوں مالی استحکام سے زیادہ قلبی تعلق کے شادی کی بنیاد ہونے کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ جہاں دلوں کے درمیان تعلق مضبوط ہو، وہاں مسائل سے نمٹنا آسان ہوتا ہے۔

''سوری یار، آج تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ کل ایک عزیز کی ڈیتھ ہو گئی تھی اور مجھے رات کافی دیر تک وہاں رکنا پڑا تھا اس لیے نیند بھی ڈھنگ سے پوری نہیں

ہوئی۔ انکل اور آنٹی کو میری طرف سے سلام کہنا اور بولنا کہ میں دو چار دن میں ان سے ملنے کے لیے آؤں گا۔ آج بالکل بھی ہمت نہیں ہو رہی۔'' عارف کو نہ تو اس کی آنکھوں سے چھلکتا خوف دکھائی دیا اور نہ ہی پریشانی کی وہ لکیریں جنہوں نے اس کے چہرے پر ان دیکھا سا جال بنا دیا۔ ایسے میں جانے کیوں اسے وہ گلی کا غنڈا فاروق یاد آیا جس سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا پھر بھی وہ بھانپ گیا تھا کہ جولیٹ آج کل کسی الجھن کا شکار ہے اور اس نے ازخود اپنی مدد کی پیشکش کی تھی لیکن عارف جو اس کے ساتھ اتنے گھنٹے گزارتا تھا، جسے وہ پچھلے کئی سالوں سے جانتی تھی اور جو سب سے بڑھ کر اس کا محبوب تھا کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اسے معلوم تھا تو بس اتنا کہ آج وہ بہت تھکا ہوا ہے اور جلدی گھر جا کر آرام کرنا چاہتا ہے۔ ایسے جولیٹ کے رخصت ہوئے چین کی خبر ہی نہیں ہو سکی تھی۔

''میں نے عارف سے کچھ شیئر بھی کب کیا ہے جو وہ کچھ سمجھ سکے۔'' حسبِ عادت اس نے خود ہی عارف کو رعایت دیتے ہوئے کسی بھی الزام سے بری کر دیا۔

''اور فاروق...... کیا اسے تم نے کچھ بتایا تھا؟'' اس کے اندر سے کسی نے اس سے سوال کیا تو وہ جھنجلا اٹھی۔

''یہ آج بار بار اس غنڈے کا خیال میرے دل میں کیوں آرہا ہے؟ کیا اس لیے کہ دلدار آغا کی غنڈا گردی سے بچنے کے لیے میں اسی جیسے کسی شخص کی مدد کی خواہش کر رہی ہوں۔ ویری سیڈ، پریشانی نے میری ذہنی حالت کو کتنا تباہ کر دیا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خود کو سرزنش کرنے لگی۔

''اگر آج تمہارا دفتر چھوڑنے کا ارادہ نہیں ہے تو میں چلتا ہوں۔'' اس بار عارف نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا تو وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ اور عارف دفتر سے روزانہ ساتھ ہی روانہ ہوتے تھے۔ عارف کا گھر دفتر سے نسبتاً قریب تھا اور وہ راستے میں اتر جاتا تھا جبکہ جولیٹ کو مزید آگے جانا ہوتا تھا۔

''یہاں سے عارف میرے ساتھ ہوگا اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور آگے تو اپنا ہی علاقہ ہے۔ وہاں بھلا کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ویسے بھی میں خوامخواہ ضرورت سے زیادہ خوف زدہ ہوگئی ہوں۔ اتنی پبلک میں بھلا دلدار آغا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ آج ہی اپنی دھمکی پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ صرف مجھے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے لیکن میں کیوں اس سے ڈروں۔ میں اس کے خلاف پولیس کے پاس جاؤں گی اور رپورٹ لکھواؤں گی کہ دلدار آغا اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

ایک پل میں ہی بہت سے خیالات اس کے ذہن سے گزر گئے اور اس نے خود کو قدرے پُراعتماد محسوس کرتے ہوئے عارف کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے آج انہیں سواری جلد مل گئی۔ اس کے ساتھ بیٹھنے والی پارسی خاتون بے حد باتونی تھیں۔ دورانِ سفر انہوں نے اس سے اتنے سوالات کیے اور اپنے بارے میں اتنی معلومات فراہم کیں کہ اس کے ذہن سے دلدار آغا کا خیال ہی نکل گیا۔ موجودہ ذہنی کیفیت میں وہ خاتون ایک طرح سے اس کے لیے نعمت ثابت ہوئی تھیں۔ وہ جب اپنی مخصوص جگہ پر سواری سے اتری تو خاصی حد تک ہلکی پھلکی تھی اور اپنے سائے سے بھی بھڑک اٹھنے والی کیفیت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ خطرہ اس سے قریب بلکہ بے حد قریب ہے۔ وہ مگن سی نپے تلے قدم اٹھاتی اپنے جانے پہچانے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چونکی اس وقت جب ایک گاڑی کے انجن کی غراہٹ اپنے بے حد نزدیک سنائی دی۔ اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر بھاگنے کے ارادے پر عمل کرتی، پچھلی طرف کا دروازہ کھلا اور کسی نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر گاڑی کے اندر کھینچ لیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی لیکن دوسری چیخ نکلنے سے قبل ہی ایک آہنی ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اس بڑے سے سخت ہاتھ نے اس کے منہ کے ساتھ ساتھ ناک کو بھی دبا دیا تھا جس کی وجہ سے اسے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ خود کو چھڑانے کی کوشش میں ہاتھ پیر چلاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی کوشش حریف کی طاقت کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ سب سے بڑھ کر سانس نہ لے سکنے کی تکلیف اس کے لیے آزمائش تھی۔ اس آزمائش میں وہ زیادہ دیر کامیاب نہیں ہو سکی اور اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ بے ہوش ہونے سے قبل جو آخری خیال اس کے ذہن میں تھا، وہ یہ کہ دلدار آغا اپنی دھمکی پر عمل کر چکا ہے اور اب وہ ایک تیز رفتار گاڑی میں نامعلوم منزل کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

سچ کا سامنا

تنویر ریاض

انسانی ہاتھ کی بناوٹ قدرت نے بہت عجیب اور پُراسرار بنائی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ جب جب دوسروں پر ایک انگلی اٹھائی باقی انگلیوں نے اپنی ذات کی جانب اشارہ کیا جسے سمجھنا بہرحال عقلمندوں کا ہی ہنر ہے... اسے بھی یہ فلسفہ جس وقت سمجھ میں آیا تو اپنی ذات بہت چھوٹی محسوس ہونے لگی اور... چھوٹا بن کر جینا اسے گوارا نہ تھا لہٰذا وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے والے ایک مفرور مجرم کا ماجرا

اسٹیو، پانی پر نظریں جمائے دریا کے کنارے کھڑا ہوا، اپنے دادا کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے ہمیشہ اسے یہی سکھایا کہ چارے کو مضبوطی سے باندھو اور ڈور کو پانی میں پھینک دو۔ اس کام میں خاموشی ضروری ہے۔ ذرا سی آواز سے بھی مچھلیاں دور بھاگ جاتی ہیں۔ دریا بپھرا ہوا لگ رہا تھا کیونکہ کئی روز کی مسلسل بارش سے اس میں طغیانی آگئی تھی اور اس روز مچھلیاں نہیں پکڑی جاسکتی تھیں لیکن اسٹیو کئی سال سے مچھلیاں نہیں پکڑ رہا تھا۔ جب سے اس کی بہن گریس کی موت واقع ہوئی اور اس کے دادا کے پڑھائے ہوئے سبق بند ہوگئے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے لیکن ان کی یادیں اس کے ذہن میں روشن تھیں۔

اسٹیو صرف نو سال کا تھا جب اس کی بہن گریس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی لیکن اب بھی وہ کبھی کبھی اسے دریا کے کنارے زرد لباس میں کھڑا ہوا دیکھتا۔ اس کے بالوں میں لگا ہوا سبز رنگ کا ربن دریا کے پانی کی طرح چمک رہا ہوتا۔ وہ ان دونوں کو مچھلیاں پکڑتا دیکھ کر خوش ہوتی تھی گو کہ اس

کے دادا نے ہمیشہ اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی کیونکہ مچھلیاں شور سے خوفزدہ ہوکر دور چلی جاتی تھیں جبکہ وہ ہمیشہ سے ہی باتونی اور تھوڑی سی باعثِ زحمت واقع ہوئی تھی پھر وہ دنیا سے چلی گئی اور اس کی آواز خاموش ہوگئی۔

کبھی کبھی اسٹیو سوچتا کہ جارج ٹیبلے بھی اس روز وہاں موجود تھا اور کچھ فاصلے پر بیٹھا معمول کے مطابق مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ الگ تھلگ رہتا اور کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ جب ٹیبلے سے پوچھا گیا کہ اس نے کچھ دیکھا تھا تو اس نے نفی میں جواب دیا جو شاید سچ تھا اور جھوٹ بھی ہوسکتا تھا۔ اسٹیو اس گاؤں میں اپنی ماں کے مرنے پر واپس آیا تھا جو پندرہ دن پہلے اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کی ذمے داری تھی کہ وہ کاٹیج کو خالی کردے۔ وہ حیران تھا کہ ماں اتنا عرصہ زندہ کیسے رہ گئی کیونکہ اس کی روح تو اسی روز مرگئی تھی جب اس نے گریس کی موت کی خبر سنی تھی۔

کئی برس گزر جانے کے بعد اس ہولناک دن کا واقعہ دھندلا کر رہ گیا تھا لیکن ماں کے مرنے کے بعد کبھی کبھی یہ یادیں لوٹ آتیں۔ ایک لمحے کے لیے واضح ہوتیں اور پھر دھندلا جاتیں۔ وہ دیکھتا کہ جارج ٹیبلے اس کی بہن کی لاش پر جھکا ہوا ہے۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی ماں کے منہ سے ایک خاموش چیخ نکل رہی ہے۔ وہ دیکھتا کہ اس کی بہن کا زخمی سر صاف پانی سے دھو دیا گیا ہے اور وہ اپنی بے نور آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی ہے اور اس کے دادا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر بہہ رہے ہیں۔

اس واقعے کو گزرے پچیس سال ہوچکے تھے اور گاؤں میں بھی کئی تبدیلیاں واقع ہوچکی تھیں۔ اب آدھے سے زیادہ مکان تعطیلات گزارنے کے لیے لوگوں کو کرائے پر دے دیے جاتے تھے اور ان کے مکین دوسری جگہوں پر منتقل ہوچکے تھے۔ اب وہاں نئے نئے لوگ عمدہ لباس پہنے اور نئی چمکیلی گاڑیاں دوڑاتے نظر آتے۔ اسٹیو کو بھی اپنی ماں کے مکان کے لیے لندن کے ایک بینکر کی جانب سے پیشکش ہوچکی تھی اور وہ اتنی پرکشش تھی کہ وہ اسے قبول کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ماں کی چیزوں کو وہاں سے ہٹانا ضروری تھا گزشتہ روز وہ ایسی ہی کچھ چیزیں اپنی کار میں رکھ رہا تھا کہ اس کی نظر جارج ٹیبلے پر پڑی۔ وہ کافی بوڑھا نظر آرہا تھا لیکن اسٹیو نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔ وہ گزشتہ شب سینڈوچ اور ڈرنک لینے بلیک ہارس نامی ریستوران گیا تھا۔ وہاں کے مالک نے اسے بتایا کہ ٹیبلے ابھی بھی اپنی بہن کے ساتھ ہی رہتا ہے اسٹیو کو وہ اچھی طرح یاد تھی۔ ایک دبلی پتلی عورت جس کے چہرے پر زردی چھائی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ سرمئی رنگ کا لباس پہنا کرتی تھی۔ اگر بچے اس کے مکان کے قریب کھیلتے تو وہ انہیں ڈانٹنے لگ جاتی اور جب اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہتا تو وہ دونوں ہاتھ بھینچ لیتی اور چہرے پر غصہ نمودار ہوجاتا۔ اسٹیو کی ماں نے ہمیشہ اسے نظرانداز کیا اور ایک مرتبہ اسٹیو نے اسے پڑوسن سے یہ کہتے سنا کہ ویلیری ٹیبلے کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے۔ اس کے لفظوں میں بہت سی معنی چھپے ہوتے تھے۔

جارج ٹیبلے گھر سے نکلتے وقت اپنی بہن کا بازو مضبوطی سے پکڑا رہتا جیسے وہ اسے لوگوں کی نظروں سے بچانا چاہتا ہو۔ اسٹیو کو اس عورت سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن وہ اس کے بھائی سے ملاقات کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی ماں نے مرتے وقت جو الفاظ ادا کیے، ان کا مفہوم کیا تھا۔ ماضی کی یادیں ایک بار پھر اس کے ذہن میں روشن ہوگئیں اور یہ اس کے لیے خطرے کا الارم تھا۔ زرد لباس، سبز رنگ کا ربن اور دریا کے کنارے بیٹھا جارج ٹیبلے جو گریس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑا ہوگیا لیکن اس نے ٹیبلے سے کبھی نہیں پوچھا اور بہت سے بچوں کی طرح اس نے بھی صورتِ حال کو جوں کا توں قبول کرلیا تھا۔

اسے یاد تھا کہ جب ٹیبلے اپنی بہن کے ساتھ نہیں ہوتا تھا تو وہ ہمیشہ تنہا اور اپنی ذات میں مگن نظر آتا۔ وہ اپنے ملنے والوں سے ہمیشہ دور رہتا اور اسے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ جب سے اسپتال میں اس کی ماں نے وہ الفاظ ادا کیے تھے۔ اسٹیو ان کا مفہوم جاننے کی کوشش کررہا تھا۔ ممکن ہے کہ ٹیبلے اس لیے خاموش ہو کیونکہ اسے یاد تھا کہ وہ کیا کرچکا ہے۔ گریس کے بالوں میں بندھا ہوا ربن کبھی نہیں مل سکا۔ شاید ٹیبلے نے کسی وجہ سے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ اس کا سامنا کرنے کے خیال نے اسٹیو کو پریشان کردیا لیکن وہ اپنی ماں کا مقروض تھا اور گریس اس کی اکلوتی بہن تھی لہٰذا اس کی موت کی وجہ جاننا ضروری تھا لیکن اسے صبر سے کام لیتا تھا۔

ہر شخص کے اپنے خیالات اور احساسات ہوتے ہیں۔ اس کے دادا مچھلیاں پکڑتے تھے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر اس خوشگوار لمحے کا انتظار کرتے رہتے جب کوئی مچھلی کانٹے میں پھنس جائے۔ بلیک ہارس کے مالک نے بتایا تھا کہ ٹیبلے نے ان دنوں ایک نیا مشغلہ اختیار کیا ہے۔ اسٹیو نے اسے گزشتہ روز کانوں پر ہیڈفون چڑھائے سڑک سے

گزرتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میٹل ڈیٹیکٹر تھا جس کے ذریعے وہ زمین پر پڑی ہوئی چیزیں چن رہا تھا۔ اسٹیو کے خیال میں اس دلچسپی میں لالچ کا عنصر شامل تھا۔ شاید وہ ہمیشہ سے ہی لالچی تھا اور اب اسٹیو اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکا کہ گریس کی موت بھی اسی وجہ سے واقع ہوئی کہ وہ کسی کے ناجائز قبضے کی خواہش پوری نہ کرسکی۔

گریس کی موت کے بعد کئی برسوں تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن مرنے سے پہلے اسٹیو کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نحیف آواز میں کہا تھا۔ ''اگر جاننا چاہتے ہو کہ گریس کے ساتھ کیا ہوا تھا تو جارج ٹیبلے سے پوچھو۔''

ٹیبلے ایک تنہائی پسند شخص تھا اور اپنی پراسرار بہن کے ساتھ اس سرخ اینٹوں والے مکان میں رہ رہا تھا۔ گاؤں میں اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور تھیں مثلاً یہ کہ اس نے ایک مرتبہ شادی کی اور اپنی بیوی کو قتل کردیا۔ اسے نوجوان لڑکیوں سے تعلق قائم کرنے کا شوق تھا۔ وہ اس لیے ڈارٹ مور کے جنوب میں واقع اس جگہ چلا گیا تھا جہاں اس کے کرتوتوں سے کوئی واقف نہ ہو وغیرہ وغیرہ لیکن جو لوگ اسے جانتے تھے، ان کے خیال میں یہ سب افواہیں تھیں۔

اسٹیو اس بات سے واقف تھا کہ اس کے دادا کا ٹیبلے سے ملنا جلنا تھا۔ یہ بات نہیں کہ ان کی آپس میں دوستی تھی۔ ٹیبلے کا کوئی دوست نہیں تھا لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے اسٹیو کے دادا کو گریس کی موت کے فوراً بعد ٹیبلے کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ خاندان کے کسی فرد نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ وہ ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے گریس کے مرنے کے بعد بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا جیسے وہ بھولنے کی کوشش کررہے ہوں کہ اس کا کوئی وجود بھی تھا۔

لیکن اب وقت آگیا تھا کہ حقیقت سامنے لائی جائے۔ اسٹیو کی ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ دوبارہ ویلیری ٹیبلے کا سامنا کرے لہٰذا ٹیبلے سے اس کے گھر پر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ایک اور بہتر راستہ یہ تھا کہ وہ چارا استعمال کرے اور انتظار کرے کہ مچھلی کب اس کے جال میں پھنستی ہے اور وہ چارا ایک خط کی شکل میں تھا جس میں اس نے لکھا۔ ''کچھ پرانے سکے دریا کے کنارے پڑے ہوئے ملے ہیں۔ انہیں ایک نظر دیکھنا فائدہ مند ہوسکتا ہے۔'' اسٹیو نے یہ خط ٹیبلے کے لیٹر بکس میں ڈالا اور فوراً ہی وہاں سے چل دیا۔ اسے امید تھی کہ گمنام خط پڑھ کر ٹیبلے کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ٹیبلے نے گریس کے ساتھ کچھ کیا ہے تو وہ کبھی دریا کے کنارے نہیں آئے گا، اگر اسے خط بھیجنے والے کے بارے میں معلوم ہوگیا۔

لیٹر بکس میں خط ڈالنے کے بعد وہ دریا کے کنارے پہنچا اور وہاں زمین میں چند پرانے سکے دبا دیے جو اس نے اپنی ماں کی دراز سے نکالے تھے۔ ان میں سے کچھ بہت زیادہ پرانے تھے۔ ان میں چاندی کے ساتھ ساتھ ایک سونے کا سکہ بھی تھا جس پر بادشاہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مچھلی پھانسنے کے لیے ضروری ہے کہ عمدہ چارا استعمال کیا جائے۔ بعد میں وہ کسی وقت بھی ان سکوں کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

اس نے جس جگہ کا انتخاب کیا، وہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ اس لیے اگر منصوبہ کامیاب ہوگیا تو وہ ٹیبلے سے تنہائی میں مل سکتا ہے جہاں اس کی عجیب و غریب بہن مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ بلیک ہارس کے مالک نے بتایا تھا کہ ٹیبلے عام طور پر دن کے دو بجے اپنے میٹل ڈیٹیکٹر کے ساتھ گھر سے باہر نکلتا ہے۔ اسٹیو مقررہ مقام پر دس منٹ پہلے پہنچ گیا۔ وہ اپنی بہن کے لیے اتنا تو کرسکتا تھا۔ اس نے آخری بار اسے پانی میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ حالیہ دنوں میں وہ اسے خواب میں جل پری کے روپ میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا دھڑ مچھلی کا اور سر پر وہی سنہری بال تھے جنہیں وہ بڑے سلیقے سے ربن میں باندھا کرتی تھی۔

چارا زمین میں دبایا جا چکا تھا اور اب اسٹیو درختوں کی آڑ میں کھڑا ٹیبلے کا انتظار کررہا تھا پھر اس نے ٹیبلے کو میٹل ڈیٹیکٹر کے ساتھ اس جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بالکل عام سا انسان نظر آرہا تھا، ساٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود اس نے نیلی پتلون اور چیک کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال سفید اور لمبی ناک تھی۔ دیکھنے میں وہ ایک بے ضرر انسان لگتا تھا لیکن اسٹیو کو شبہ تھا کہ وہی اس کی بہن کا قاتل ہوسکتا ہے۔

کام شروع کرتے ہوئے ٹیبلے کسی چور کی طرح گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے تھیلے سے ایک چھوٹی کھرپی نکالی اور ایک ایک کرکے سکے اٹھانے لگا۔ اسٹیو نے اپنے بائیں جانب بہتے ہوئے دریا کو دیکھا تو اسے اپنی بہن یاد آگئی اور اس کے ذہن میں پرانی یادیں سر اٹھانے لگیں۔ وہ ہمیشہ سے یہ محسوس کرتا تھا کہ کسی نے بھی اس کی بہن کی موت کو حادثہ نہیں سمجھا اور اس کی ماں نے بھی مرتے وقت کم

وینش یہی اشارہ دیا تھا کہ ٹیپلے ہی اس کی بہن کا قاتل ہے۔
ٹیپلے ابھی تک کھدائی میں مصروف تھا۔ اسٹیو نے ایک قدم آگے بڑھایا اور رک کر اسے دیکھنے لگا پھر اس نے دوسرا قدم اٹھایا اور پہلی بار اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ ٹیپلے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو پھر اسٹیو نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا۔ میٹل ڈیٹیکٹر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور اس کے ساتھ ہی ٹیپلے بھی اپنا سینہ دبائے گر چکا تھا۔ اسٹیو اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا جیسے جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔
اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ اس کی نظر ایک سنہری بالوں والی عورت پر گئی جس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے چست جینز، سبز بلاؤز اور ایک قیمتی رین کوٹ پہن رکھا تھا، وہ ایک کتے کے ساتھ تھی جو زمین پر پڑے ہوئے شخص کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے کتے کو زمین پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور اپنی جیب سے آئی فون نکال کر کسی سے بات کرنے لگی۔ اسٹیو درخت کی آڑ میں ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کوئی ٹیپلے کی بہن کو اس واقعے کے بارے میں بتانے کی زحمت کر سکتا ہے۔ جبکہ گاؤں میں رہنے والا کوئی بھی فرد اس سے بات نہیں کرتا تھا۔
تھوڑی دیر بعد حیرت انگیز طور پر ایمبولینس آ گئی اور اس میں سے طبی عملے کے دو افراد باہر آئے۔ جب وہ ٹیپلے کے بے جان جسم کا معائنہ کر رہے تھے تو اس لمحے اسٹیو نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا جیسے وہ ہی ٹیپلے کو اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار ہو۔ وہ اب گھر جانا چاہ رہا تھا۔ اس دوران وہ عورت بے چینی سے ٹہلتی رہی اور جب اس نے طبی عملے سے کچھ کہا تو فاصلے پر ہونے کے باوجود اس کی آواز اسٹیو کو صاف طور پر سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”یہ ٹھیک تو ہو جائے گا۔“
وہ پہلے اسے نہیں پہچان سکا تھا لیکن اب جان گیا۔ وہ اس کی ماں کے کاٹیج کے برابر میں رہتی تھی لیکن وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اسٹیو اس کے شوہر کو بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک موٹی گردن والا شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن سے مل کر آپ خوش ہو سکیں۔
جب مریض کو اسٹریچر پر لٹایا گیا تو طبی عملے نے اس کے ہاتھ کو دیکھا جو سرخ کمبل پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے مٹھی کھولی تو کئی سکے زمین پر گر پڑے۔ اسٹیو کو پچھتاوا ہونے لگا کہ اس کی ماں کی قیمتی چیزیں اس طرح ضائع ہو رہی تھیں۔ اس کام کے لیے تو پرانے پینی کے سکے بھی کافی ہوتے۔ اس نے دیکھا کہ عورت نے وہ سکے اٹھا لیے تھے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ان کے وزن یا مالیت کا اندازہ لگا رہی تھی۔
جیسے ہی ٹیپلے کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، اس نے وہ سکے اپنی جیب میں رکھ لیے اور اسٹیو سوچنے لگا کہ کیا اسے ان سکوں کو واپس حاصل کرنے کا موقع مل سکے گا۔ یہ سکے اس کی ماں کو بہت عزیز تھے۔ اسے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا لیکن منصوبہ بناتے وقت یہ خیال اسے اچھا لگا تھا مگر یہ فیصلہ غلط ثابت ہوا، اب اسے ان سکوں کو واپس حاصل کرنے کا طریقہ سوچنا تھا۔
گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ٹیپلے کی خیریت کس طرح معلوم کرے۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں شاید آسان راستہ یہی بہتر ہوگا کہ وہ ٹیپلے کے گھر فون کر کے اس کی بہن سے پوچھے کہ اب وہ کیسا ہے لیکن وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شام کو بلیک ہارس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سے اسے ٹیپلے کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔
اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس سنہری بالوں والی عورت تک کس طرح پہنچا جائے گو کہ وہ اس کی ماں کی پڑوسن تھی لیکن اسٹیو نے کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ اس عورت کا شوہر اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ اس جوڑے کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ لوگ ایک سال قبل گاؤں کی پرسکون زندگی گزارنے کے شوق میں لندن سے یہاں آئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ سکے اس عورت کے پاس ہی ہیں اور اگر وہ مناسب طریقے سے اس سے رابطہ کرے تو ان سکوں کی واپسی ممکن ہے۔
اس نے بلیک ہارس میں سن رکھا تھا کہ اس کا شوہر لندن میں کام کرتا ہے اور صرف ہفتے کے اختتام پر گھر آتا ہے۔ اس لیے عورت اس وقت اکیلی ہوگی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس عورت کو سکوں کی واپسی کے لیے آمادہ کرے گا۔ وہ یہ سوچ کر بے چینی محسوس کر رہا تھا کہ وہ سکے بہت قیمتی تھے۔ اس لیے اسے ان کی واپسی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔
یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عورت ٹیپلے کی حالت کے بارے میں جانتی ہو۔ اس طرح اسے اس عورت سے بات کرنے کا بہانہ مل جائے گا اور اسے ویلیری کو بھی فون نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ واپس اپنی ماں کے گھر آیا اور اس عورت سے بات

کرنے کے لیے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

کولین نے اپنے لیے چائے بنائی اور کپ میز پر رکھ کر فون دیکھنے لگی۔ کوئی کال، پیغام یا ای میل نہیں آئی تھی۔ وہ کتا ایک اچھا محافظ تھا اور اگر وہ نہ ہوتا تو وہ پورے ہفتے تنہا رہ کر پاگل ہو جاتی۔ ولیم لندن میں کوئی کاروبار کر رہا تھا اور اس نے سختی سے بیوی کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ گاؤں کے لوگوں سے دور رہے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس کے بارے میں غیر ضروری سوال کریں۔ کبھی کبھی کولین کا بھی دل چاہتا کہ لوگ اس سے بات کریں۔ اسی لیے جب اس نے ٹیبلے کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تو اس کی مدد کر کے وہ بہت خوش ہوئی گو کہ وہ اس کا نام نہیں جانتی تھی لیکن یہ معلوم تھا کہ وہ گاؤں میں ہی رہتا ہے اور اس نے وقتاً فوقتاً اسے میٹل ڈیٹیکٹر کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی طرح وہ بھی کبھی کسی سے بات کرتا ہوا نہیں دیکھا گیا اور اس حوالے سے وہ اس کے ساتھ ایک خاص تعلق محسوس کرنے لگی، دونوں تنہا تھے اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی بھی۔

لیکن اس نے اکثر اسے اپنے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مکان کے سامنے سے گزرتا اور کھڑکیوں پر نظر ڈالتا۔ ولیم اکثر پوچھتا کہ کوئی شخص اس میں غیر معمولی دلچسپی تو نہیں لے رہا لیکن اس نے کبھی اسے کچھ نہیں بتایا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ولیم نہ جانے اس کے بارے میں کیا سوچے گا۔ وہ اس شخص کے لیے کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ خاص طور پر اس کی جان بچانے کے بعد تو بالکل نہیں۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا اور اس کا کتا سیزر اپنی ٹوکری میں لیٹا ہوا تھا۔ کولین نے چائے کی پیالی دھو کر رکھی اور ٹی وی آن کر دیا۔ وہاں کوئی ڈراما دکھایا جا رہا تھا۔

اس نے اسکرین پر نظریں جما دیں لیکن وہ اب بھی اسی شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی کی جان نہیں بچائی تھی اور یہ سوچ کر اسے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید وہ اس کا حال پوچھنے جاتی اور ممکن ہے کہ اسے یہ جاننے کا بھی موقع مل جاتا کہ وہ اس کے گھر میں کیوں دلچسپی لیتا رہا ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجی اور سیزر نے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا لیکن کولین نے پیچھے سے جا کر اس کا پٹا پکڑ کر اسے پیچھے کیا اور خود دروازہ کھولنے لگی۔ وہاں ایک طویل قامت شخص تھا اور

اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ

☆ کسی کا ظرف دیکھنا ہو تو اس کو عزت دو۔

☆ جسے قریب کے لوگ چھوڑ دیتے ہیں، اسے دور والے اپنا لیتے ہیں۔

☆ جو بولا وہ پہچانا گیا۔

☆ جب عقل پختہ ہو جاتی ہے تو گفتگو کم ہو جاتی ہے۔

☆ کنجوس سے نہ ملو، وہ تمہیں تمہاری ضرورتوں سے بھی روک دے گا۔

☆ جھوٹے سے میل جول نہ رکھو، وہ تو سراب ہے۔ دور کو قریب اور قریب کو دور کر کے دکھائے گا۔

☆ ایک شخص نے حضرت علیؓ سے پوچھا۔ ''اگر کسی کے گھر کا دروازہ بند کر دیا جائے تو اسے رزق کہاں سے ملے گا؟''

آپؓ نے جواب دیا۔ ''جدھر سے اسے موت آئے گی۔''

مرسلہ۔ اظہر حسین بچار، ہزاری، جتوئی

سنہری باتیں

☆ انسان کی عزت کرو اور اس سے محبت کرو کیونکہ ہر انسان کے اندر خدا کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہوتی ہے۔

☆ عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ تعالیٰ سے ایک گناہ بھی نہیں بخشوا سکتیں۔ لیکن ندامت کا ایک آنسو ممکن ہے زندگی بھر کے گناہ معاف کرا دے۔

☆ تنگ دستی میں سخاوت کرنا، غصے میں سچ بولنا اور طاقت کے ہوتے ہوئے معاف کرنا افضل ترین نیکیوں میں سے ہے۔

☆ لامحدود خواہشات محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں جبکہ انسان کی زندگی میں صبر، شکر اور محبت تینوں کا بڑا درجہ ہے۔ صبر مصیبت کو ٹالتا ہے، شکر نعمت کو بڑھاتا ہے اور محبت خوشیوں کا خزانہ ہے۔

☆ اگر اپنے دل کو صاف اور پاکیزہ رکھنا ہے تو اپنی آنکھوں کی حفاظت کرو کیونکہ یہی وہ دروازہ ہے جس سے غبار اندر آتا ہے۔

☆ کسی نے مولا علی سے پوچھا، انسان میں کتنے عیب ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ بے شمار مگر ایک خوبی سب پر پردہ ڈال دیتی ہے...... اور وہ ہے خوش اخلاقی۔

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم

دیکھنے میں رگبی کا کھلاڑی لگ رہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا واٹر پروف کوٹ، پولو شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی اور اس کی آنکھوں سے معذرت جھلک رہی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے کتے کو دیکھا تو وہ اس کا ڈر سمجھ گئی اور اس نے کتے کو گھسیٹ کر کچن میں بند کر دیا۔

''زحمت کے لیے معافی کا طلب گار ہوں۔'' اس آدمی نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''میرا نام اسٹیو ہارڈی ہے اور میری ماں تمہارے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ اس کا انتقال پندرہ روز پہلے ہوا ہے اور میں اس کا مکان خالی کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

کولین کو معلوم تھا کہ اس کے پڑوس میں ایک بوڑھی عورت کا انتقال ہو چکا ہے اور اسی لیے گزشتہ دو ہفتوں سے اس مکان میں زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسے خاموش دیکھ کر اسٹیو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے آج صبح ایک شخص کے لیے ایمبولینس منگوائی تھی۔ اس کا نام جارج ٹیبلے ہے۔ میں اس کی بہن سے رابطہ نہیں کر سکا۔ شاید وہ اسپتال میں ہے کیا تم جانتی ہو کہ اب اس کی حالت کیسی ہے؟''

کولین جان گئی کہ جس شخص کی اس نے جان بچائی۔ اس کا نام جارج ٹیبلے ہے۔ اب کم از کم وہ ولیم کو بتانے کے لیے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکتی تھی۔ تاہم اس نے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

''مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میں نے صرف اس کے لیے ایمبولینس منگوائی تھی۔''

اسٹیو نے ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پر منتقل کیا۔ وہ قدرے شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ ''معاف کرنا۔ میں نے تمہیں زحمت دی۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور دوسرے دن جب کولین اپنے کتے کو ٹہلا کر گھر واپس آئی تو اسے معلوم ہوا کہ گھر میں چوری ہو گئی ہے اور صرف ایک دس پاؤنڈ کا نوٹ اور چند سکے غائب ہیں جو جارج ٹیبلے کی بند مٹھی سے نیچے گر گئے تھے۔ اس عورت کی غیر موجودگی میں اس کے گھر سے مال کے سکے واپس لانا ایک دہشت ناک تجربہ تھا۔ وہ ذہنی طور پر تیار تھا کہ اگر اس نے الارم کی آواز سنی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر واپس آ جائے گا لیکن شاید اس عورت کو گاؤں میں رہتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے اس عورت نے حفاظت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اسٹیو نے بڑی آسانی سے کچن کے دروازے میں لگا ہوا شیشہ توڑا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی چٹخنی کھول دی اور اسے اپنی مطلوبہ اشیا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بعد میں جب اس نے اس مہم کے بارے میں سوچا تو اس کے پورے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ اب وہ ایک چور بن چکا تھا۔

اس عورت کے گھر کی تلاشی کے دوران اسے دراز میں ناموں کی ایک فہرست بھی ملی جس میں آخری نام جارج ٹیبلے کا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا یہ کسی قسم کی ہٹ لسٹ ہے۔ کیا ٹیبلے کا اس عورت کے شوہر کے ساتھ کوئی تعلق ہے جس کی ساکھ اچھی نہیں ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس عورت کا نام کولین ہے۔

وہ توقع کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس کار اس عورت کے دروازے پر موجود ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا جو بڑی عجیب بات تھی۔ شاید اس عورت نے چوری کی رپورٹ ہی درج نہیں کروائی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے شوہر سے یہ واقعہ چھپانا چاہ رہی ہو کیونکہ قصبے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ایک گینگسٹر ہے اور کئی مرتبہ جیل جا چکا ہے۔

بلیک ہارس میں ہی اس نے سنا کہ ٹیبلے گھر واپس آ گیا ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ دل کا دورہ خطرے کی گھنٹی تھی اور اسے ٹیسٹ وغیرہ کے لیے دوبارہ اسپتال جانا ہوگا۔ ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے گریس کا چہرہ آ گیا اور اس کے دل میں سچ جاننے کی خواہش دوبارہ سر اٹھانے لگی۔ ٹیبلے سے ملنے کے لیے اب وہ پہلے والی غلطی نہیں دہرا سکتا تھا بلکہ اس نے براہِ راست ملاقات کرنا ہی مناسب ہوتا۔ کولین کے گھر چوری کرنے کے بعد اس میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ وہ ٹیبلے اور اس کی بہن کا سامنا کر سکے۔

لیکن دوسری صبح اس نے جارج ٹیبلے کے مکان کے باہر پولیس کاریں کھڑی دیکھیں اور کسی نے اسے بتایا کہ جارج کو قتل کر دیا گیا ہے۔ شام کو وہ بلیک ہارس گیا۔ اب یہ اس کی عادت بنتی جا رہی تھی لیکن وہ اس بارے میں تازہ ترین پیش رفت جاننا چاہ رہا تھا اور اس بارے میں وہ وہاں سے ملنے والی اطلاعات پر بھروسا کر سکتا تھا۔

''پولیس جارج ٹیبلے کے قتل کے سلسلے میں لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔'' ریسٹوران کے مالک نے اس کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

اسٹیو نے مشروب کی ادائیگی کی اور پوچھا۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''لوگوں کا خیال ہے کہ قاتل وہی شخص ہے جو تمہاری ماں کے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں یہاں آیا

اور ٹیبلے کو قتل کر کے واپس لندن چلا گیا تا کہ جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکے۔ اس کا نام ولیم جونز ہے اور اسے ہمیشہ مشتبہ سمجھا گیا۔ وہ منشیات کے کاروبار اور مسلح ڈکیتی میں ملوث رہا ہے۔''

''یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ اس چھوٹی سی پرسکون جگہ پر بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں ایسا کسی نے سوچا تھا؟'' اسٹیو نے کہا لیکن وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے خود اس شخص کو ایک بڑی سی سیاہ کار میں دیکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

ریستوران کا مالک بار کاؤنٹر پر جھکا اور نیچی آواز میں بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ یہ انتقامی کارروائی ہے تم جانتے ہو کہ ایک زمانے میں جارج ٹیبلے گاؤں میں پولیس مین تھا جنہیں بوبی کہا جاتا ہے لیکن بائیس سال پہلے وہ لندن چلا گیا اور وہاں اس نے میٹروپولیٹن پولیس میں ملازمت کرلی۔''

''میں نے بھی سنا ہے کہ وہ یہاں سے چلا گیا تھا لیکن مجھ کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔''

''اس نے لندن میں سولہ سال گزارے اور ریٹائر ہونے کے بعد واپس آکر اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگا۔ اسی نے سب سے پہلے اس کی لاش دیکھی۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس نے قاتل سے مزاحمت بھی کی تھی۔'' اس نے نمک مرچ لگا کر واقعہ بیان کیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں بہت سے اخباری نمائندے بھی بیٹھے ہیں جنہیں قتل کی واردات میں دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ ٹیبلے نے چند برس قبل جونز کو ایک بینک ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ یہ اسی کا انتقام ہوسکتا ہے۔''

اسٹیو نے سر ہلایا اور مشروب کا گھونٹ لینے لگا۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اس نے ولیم جونز کی دراز میں جو فہرست دیکھی۔ اس میں ٹیبلے کا نام کیوں لکھا ہوا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ٹیبلے نے کافی عرصہ لندن پولیس میں بھی ملازمت کی اور جب وہ گریس کے انتقال کے فوراً بعد گاؤں چھوڑ کر چلا گیا تب بھی کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

گھر جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کولین اپنے کتے کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا رہی تھی لیکن اس نے اسٹیو کو نہیں پہچانا جب وہ دور نکل گئی تو اس نے دیکھا کہ پولیس کی ایک پٹرول کار جائے وقوعہ یعنی ٹیبلے کے گھر کی طرف جارہی تھی۔ اسٹیو سیدھا اپنی ماں کے کاٹیج میں چلا گیا۔ ابھی اسے بہت سے کام کرنا تھے۔

سراغ رساں انسپکٹر ڈیرک، ٹیبلے کے چھوٹے سے لیونگ روم میں کھڑا قالین پر جمے ہوئے سرخ دھبے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جون سے کہا۔

''جارج ٹیبلے کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں، میں جانتا ہوں کہ وہ سابقہ پولیس مین تھا لیکن وہ اس علاقے میں کچھ مقبول نہیں تھا۔''

''کس طرح کی افواہیں؟'' جون نے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ افواہوں میں بھی کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتی ہے اور دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔

''ان میں سے کچھ بہت بے ہودہ ہیں۔'' سراغ رساں انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ یہاں بوبی تھا تو بچوں میں غیر صحت مند دلچسپی لیا کرتا تھا۔''

''کوئی ثبوت؟''

ڈیرک نے ٹھنڈی سانس لی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ صرف سرگوشیاں ہیں، مجھے اس کی بہن پر افسوس ہورہا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے اس کی لاش دیکھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تھوڑی سی عجیب ہے۔''

''میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔''

ڈیرک مرنے والے کی زندگی کے بارے میں کوئی سراغ یا ولیم جونز کے ساتھ اس کے تعلق کے بارے میں ثبوت تلاش کررہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ولیم ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور اس نے گاؤں میں رہائش اسی لیے اختیار کی ہے تاکہ کوئی اس کے کالے کرتوتوں سے واقف نہ ہوسکے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پہلے بھی قتل کرچکا ہے لیکن ایک ہوشیار وکیل نے مقدمے میں ایسی تکنیکی خامیاں تلاش کرلیں کہ عدالت کو اسے بری کرنا پڑا۔ ڈیرک کا خیال تھا کہ اس نے ٹیبلے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنے دل میں نفرت پالتا تھا۔

میز کی دراز سے اسے دیگر کاغذات کے ساتھ ایک نوٹ بک بھی ملی وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگا اور ایک صفحہ پر پہنچ کر رک گیا۔ جون نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ اسے کوئی دلچسپ بات معلوم ہوگئی ہے۔

''یہ دیکھو۔'' ڈیرک نے کہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ نوٹ بک جون کے حوالے کرتا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے مختصر بات کرنے کے بعد جون سے کہا۔ ''لندن پولیس سے فون آیا تھا۔ بری خبر ہے۔ ولیم جونز قتل کے وقت جائے واردات پر موجود نہیں تھا جس وقت ٹیبلے قتل ہوا۔ ولیم کو پولیس نے ٹاور برج کے قریب نشے کی حالت میں گاڑی

چلاتے ہوئے پکڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قتل کے وقت وہ گاؤں میں نہیں تھا۔''

''پھر ٹیبلے کو کس نے قتل کیا؟''

''اس جیسے لوگ اپنے مقصد کے لیے کسی دوسرے کی خدمات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کی بیوی کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے صرف ٹیبلے کی جان بچائی تھی۔ جب اسے دل کا دورہ پڑا تو فون کر کے ایمبولینس کو بلایا اور اپنے گھر چلی گئی۔''

ڈیرک نے دوبارہ نوٹ بک پڑھنا شروع کر دی۔ اس میں زیادہ تر پرانی باتیں لکھی ہوئی تھیں جب وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کے نام تلاش کرنا شروع کیے جن سے ٹیبلے کا تعلق ہو سکتا تھا لیکن ان میں جونز کا نام تو نہیں آیا۔ وہ ٹیبلے کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ لیکن کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ البتہ اس میں ایک بچی کا ذکر تھا۔ اس نے وہ صفحہ غور سے پڑھا اور نوٹ بک جون کو پکڑا دی۔ اسی وقت ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ یہ فون پولیس کی گشتی ٹیم کی طرف سے تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ ایک پڑوسی نے کسی شخص کو اس وقت ٹیبلے کے مکان میں جاتے دیکھا جب اس کا قتل ہوا تھا۔ ڈیرک نے انہیں مزید معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی اور جون کو ایک فون کرنے کے لیے کہا۔ وہ گریس ہارڈی کی موت کا پس منظر معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔

ڈیرک نے اس سلسلے میں اسٹیو سے بات کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس وقت ٹیبلے کا قتل ہوا، وہ بلیک ہارس میں موجود تھا اور اسے وہاں کئی لوگوں نے دیکھا۔ ریستوران کا مالک بھی اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ڈیرک اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا لیکن اس نے اسٹیو سے اس جگہ ملنے کی خواہش ظاہر کی جہاں گریس کی موت واقع ہوئی تھی۔

اسٹیو دریا کے کنارے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دو روز سے بارش نہیں ہوئی تھی اور طوفان کا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن دریا میں اب بھی طغیانی تھی۔ اس نے وہ جگہ دیکھی جہاں کئی برس پہلے گریس کی بے جان لاش پڑی ہوئی تھی پھر اسے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ویلیری ٹیبلے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق سرمئی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اسٹیو اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''مجھے تمہارے بھائی کی موت کا سن کر صدمہ ہوا۔''

لیکن ویلیری نے اس کے کہے ہوئے الفاظ کو نظر انداز کر دیا اور بولی۔ ''میں نے اس دن تمہیں اپنے دروازے پر لگے لیٹر بکس میں وہ خط ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تم نے میرے بھائی کو دریا پر کیوں بلایا تھا؟ تم کیا چاہتے تھے؟''

اسٹیو کو لگا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہ رہا تھا اور بس۔''

''میں نے پولیس کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔''

اسٹیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم اس رات بھی میرے گھر آئے تھے جب ٹیبلے کا قتل ہوا۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا۔''

''ہاں۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنے آیا تھا اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔'' وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی پھر اس نے چند قدم آگے بڑھائے اور اتنے قریب آ گئی کہ اسے چھو سکتی تھی۔ اسٹیو نے کہا۔ ''تمہارے بھائی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

ویلیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسٹیو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ گریس تم پر آوازے کستی تھی اور تمہیں طرح طرح کے ناموں سے پکارا کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ تم نے اسے دریا میں دھکا دیا تھا۔ اس وقت میں اپنے دادا کے ساتھ کچھ فاصلے پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ لہٰذا ہم نہیں دیکھ سکے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا لیکن تمہارے بھائی نے دیکھ لیا۔''

اب وہ اس کے قریب آ چکی تھی۔ اسٹیو اس کے زرد چہرے پر پڑی ہوئی لکیریں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ میں کوئی چیز پکڑ رکھی تھی۔

پھر سب کچھ بہت تیزی سے ہوا۔ جیسے ہی اس نے اسٹیو کے سر کا نشانہ لینے کے لیے بھاری پتھر اوپر اٹھایا۔ پولیس جو درختوں میں چھپی ہوئی تھی، تیزی سے اس کی جانب لپکی اور پتھر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اسٹیو نے مچھلی پکڑنے کے لیے جو چارا ڈالا تھا، وہ اس میں پھنس گئی۔ اسے دو سپاہیوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ زور زور سے چلا بھی رہی تھی لیکن اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اسٹیو کی گواہی کے بعد وہ اپنے بھائی کے قتل کے الزام میں جیل بھیج دی جائے گی جو کہ زندگی بھر اس راز کو سینے میں دبائے ہوئے تھک چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ویلیری کو

گریس کی موت کے حوالے سے اپنے حصے کے جرم کا اعتراف کرلینا چاہیے۔

اسٹیو جانتا تھا کہ اس کا بھی بیان لیا جائے گا لیکن اس نے سراغ رساں ڈیرک سے کہا کہ وہ کچھ وقت تنہائی میں اس جگہ گزارنا چاہتا ہے جہاں اس کی بہن کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ایک کر کے تمام واقعات تازہ ہو رہے تھے۔ جس شام ٹیبلے کا قتل ہوا اس سے پہلے وہ اس سے ملنے گیا تھا اور ٹیبلے نے اسے جو کچھ بتایا، اس سے سچ سامنے آگیا۔ وہ حقیقت جو اب تک نہیں جان سکا تھا۔ اس پر واضح ہوگیا اور اسے سب کچھ یاد آگیا۔

اس کے دادا کچھ دیر کے لیے اسے دریا کے کنارے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گریس اپنی عادت کے مطابق شور مچا رہی تھی جس سے مچھلیاں دور بھاگ جاتی تھیں۔ وہ اس کا مذاق اڑاتی اور کہا کرتی کہ مچھلیاں پکڑنا احمقانہ بات ہے۔ تم مچھلی کے انتظار میں بیٹھے رہو اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چلی گئی پھر اس نے اسے ویلیری کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے دیکھا۔ اچانک ہی ویلیری نے اسے دھکا دے دیا اور وہ پانی میں جا گری۔ ویلیری بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اسٹیو نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ اس کی یہ حرکت کہیں گریس کی جان نہ لے لے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ گریس پانی سے باہر آگئی تھی اور اپنے سبز ربن کو تلاش کر رہی تھی جو اس کے بالوں سے نکل گیا تھا۔ اس نے گریس کو خاموش ہو جانے کے لیے کہا کیونکہ اس طرح مچھلیاں ڈر کر بھاگ جاتیں لیکن وہ چپ نہیں ہوئی۔ وہ اپنے طور پر لطف اندوز ہو رہی تھی اور دھمکی دے رہی تھی کہ وہ ہر ایک کو ویلیری کی اس حرکت کے بارے میں بتائے گی جس کی وجہ سے اس کے نئے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

اسٹیو نے اسے چپ کرانے کے لیے ایک پتھر اٹھا کر اس کی جانب پھینکا۔ اس کے بعد شور تھم گیا اور ربن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں بہتا ہوا دور چلا گیا۔ ان تمام برسوں میں اسٹیو اپنے ذہن کو اس لمحے کی گرفت سے آزاد نہ کرسکا جب اس نے اپنی بہن کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا ذمے دار وہ خود تھا۔

جارج ٹیبلے کو یہ حقیقت معلوم تھی اور جب اس شام اسٹیو اس سے ملنے گیا تو اس نے اشارہ دے دیا کہ بالآخر اسے یہ سچ ظاہر کرنا ہی ہوگا۔ اسٹیو یہ سن کر پریشان ہوگیا۔

اسے شدت سے شراب کی طلب محسوس ہونے لگی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر بلیک ہارس آگیا۔ اب اس کے دماغ میں بار بار ایک ہی بات آرہی تھی کہ جب تک ٹیبلے زندہ ہے، وہ اس کی پرسکون زندگی کے لیے مستقل خطرہ بنا رہے گا اور اگر یہ بات کھل گئی کہ اس نے ہی اپنی بہن کو قتل کیا تھا تو اس کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔

وہ جانتا تھا کہ اسے فوراً ہی کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے بار کے مالک سے کہا کہ وہ رفع حاجت کے لیے جارہا ہے۔ ٹیبلے کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اتنی دیر میں اپنا کام مکمل کر کے واپس آسکتا تھا۔ اب وہ دریا پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔ جارج ٹیبلے مرچکا تھا اور کوئی شخص اسٹیو کے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ ایسا کوئی جال نہیں تھا جس میں وہ پھنس سکے سوائے اس کے اپنے ضمیر کے۔

''کیا تم نے ویلیری ٹیبلے کو رہا کردیا؟'' جون نے پوچھا۔

ڈیرک نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور سرہلاتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ گریس کی موت میں ویلیری کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ واقعی عجیب عورت ہے اور اب اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھائی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اسے علاج کے لیے مزید کچھ عرصہ اسپتال میں رہنا ہوگا۔ بےچاری عورت۔''

اس نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ٹیبلے کی دراز سے جو نوٹ بک ملی تھی اور اس میں ٹیبلے نے گریس کی موت کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اس کی روشنی میں تو یہ کیس کچھ اور ہی شکل اختیار کر گیا ہے اور اب ہمیں یقین کرلینا چاہیے کہ گریس کو اس کے بھائی اسٹیو نے ہی قتل کیا تھا اور جب ٹیبلے نے اسے یہ بات بتائی کہ گریس اس کا پتھر لگنے سے ہلاک ہوئی تھی تو وہ سچ کا سامنا نہ کرسکا اور اس راز کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کی خاطر اس نے ٹیبلے کی زبان بند کردی۔''

''لہٰذا اب ہمیں ایک اور گرفتاری کرنا ہوگی۔'' جون نے کہا۔

''ہم یقیناً ایسا ہی کرتے اگر اسٹیفن ہارڈی کی لاش آج صبح دریا کے کنارے نہ ملتی۔ اس نے خودکشی کرنے سے پہلے جو خط لکھا اس میں تحریر تھا کہ وہ اس تلخ حقیقت کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا کہ وہی اپنی بہن کا قاتل ہے۔''

یہ کہہ کر ڈیرک ایک دوسری فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اسے اور بھی مچھلیاں پکڑنا تھیں۔

انصاف طلب

ملک صفدر حیات

قدرت کا یہ کمال ہے کہ ترازو برابر رکھتے ہوئے انسان کو نشیب و فراز سے گزارتی رہتی ہے... جو کچھ بھی انسان کے مقدر میں قید کردیا گیا بس اس سے نہ ایک ماشہ زیادہ نہ ایک رتی کم... لیکن دل ہے کہ مانتا ہی نہیں کہ کچھ نہ کچھ انسان سے بھی غلط سرزد ہوسکتا ہے غلط کا نتیجہ جب غلط نکلے تو انسان کو ظلم کا گمان ہوتا ہے تو گویا ثابت ہوگیا کہ ظالم آدمی خود ہے جو اپنی ہی ذات پر ظلم کرتا ہے اور مقدر کو دہائی دیتا ہے۔ وہ بھی اگر غلط سمت میں قدم نہ اٹھاتی تو اندھیرے رستے مقدر نہ ہوتے۔ اسے دریا کی روانی اچھی لگتی تھی لیکن روانی میں اگر طوفان چھپا ہو تو بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے... اس نے بھی روانی کے ساتھ بہنا چاہا مگر جال پھیلانے والے تاک لگائے بیٹھے تھے۔ گویا دریا کی روانی میں ایک کہانی پوشیدہ تھی جس کے عام ہوتے ہی تانے بانے قانون کی ڈوری سے الجھ پڑے۔
ایسے میں ملک صفدر حیات کی تھانے داری نے گرہیں کھولنے کی کوشش کی تو ایک اور ہی داستان زبان زد عام ہوگئی۔

کچے صحن سے اونچی اڑان بھرنے والے ایک زخمی پنچھی کی روداد

ایک ٹھنڈی ٹھار صبح میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ موضع جھوک ضامن سے چند افراد مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

وہ ماہِ فروری کے اختتامی ایام تھے مگر اس سال موسمِ سرما کے تیور خاصے خوف ناک دکھائی دیتے تھے۔ ابھی تک فضا دھند کی لپیٹ میں تھی۔ صبح کے ابتدائی حصے میں حتیٰ کہ دوپہر تک سورج کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے اسی لیے سخت حیرت کا احساس ہوا تھا کہ اتنی صبح وہ لوگ مجھ سے ملنے کیوں چلے آئے تھے۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ خیریت کی کوئی خبر نہیں لائے ہوں گے......!

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل نے مذکورہ افراد کو میرے سامنے حاضر کردیا۔ وہ کُل تین افراد تھے اور تینوں ہی کے چہروں پر گہری پریشانی نظر آتی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر سوالیہ نظر سے باری باری ان کی صورتوں کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا۔

''ہاں بھئی...... کیا معاملہ ہے؟''

''معاملہ بڑا خطرناک ہے جی!'' ان میں سے ایک نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اسی لیے صبح ہی صبح ہم جھوک ضامن سے چل کر آپ کے پاس پہنچے ہیں۔''

''خطرناکی تو تم تینوں کے چہروں ہی سے جھلک رہی ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اب ذرا جلدی سے بتاؤ، اس خطرناک معاملے کی تفصیل کیا ہے؟''

''اللہ دتا نے نہر میں سے ایک لاش پکڑی ہے......''

وہ اپنے ایک ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔

''لاش پکڑی ہے'' کے الفاظ اس نے ایسے ادا کیے تھے جیسے کوئی مچھلی پکڑنے کا ذکر کر رہا ہو۔ میں اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جدھر اشارہ کر کے اس نے لاش پکڑنے کی بات کی تھی۔

''ہوں...... تو تم اللہ دتا ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی...... جی ہاں'' اس نے مسکین سی صورت بنا کر جواب دیا۔

''اللہ دتا...... تم نے لاشیں پکڑنے کا کام کب سے شروع کر دیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ اللہ دتا کوئی جواب دیتا، پہلے والا شخص بول اٹھا۔ ''تھانے دار صاحب! اللہ دتا ہمارے گاؤں کا بہت مشہور مچھیرا ہے۔ یہ روزانہ صبح نہر پر مچھلیاں پکڑنے جاتا ہے مگر آج صبح مچھلیوں کے علاوہ ایک انسانی لاش بھی اس کے جال میں پھنس گئی...... ایک خوب صورت اور پرکشش عورت کی لاش......!''

یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں نے اس زیادہ بولنے والے شخص سے پوچھا۔ ''تم کون ہو... کیا تمہارا تعلق بھی جھوک ضامن ہی سے ہے؟''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''جناب میرا نام وحید ہے میں چودھری فرمان علی کا خاص بندہ ہوں اور انہی کے حکم پر اس واقعے کی اطلاع دینے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' پھر اس نے اللہ دتا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''یہ رزاق ہے۔ یہ بندہ بھی جھوک ضامن ہی میں رہتا ہے۔ جب اللہ دتا نے عورت کی لاش دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کیا تو قریبی کھیت سے، سب سے پہلے رزاق ہی دوڑتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچا تھا۔''

ان تینوں میں فی الحال مچھیرا اللہ دتا مجھے سب سے زیادہ اہم نظر آیا اور میں نے اسی کو اپنے تیز و تند سوالات کی باڑ پر رکھ لیا۔

''ہاں اللہ دتا! اس عورت کی لاش کب اور کتنے بجے تمہارے جال میں پھنسی؟''

''تھانے دار صاحب!'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ ''وہ کب اور کتنے بجے کے بارے میں تو میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں آج صبح جب نہر پر پہنچا تو وہ لاش پہلے سے جال میں لگی ہوئی تھی۔''

''جال میں لگی ہوئی تھی......!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، تم نے اپنا جال پہلے سے نہر میں ڈال رکھا تھا؟''

''جی سرکار۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ سردی کے موسم میں نہروں اور دریاؤں میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے۔ یہی حال ہماری نہر کا بھی ہے۔ نہر کے درمیانی حصے میں پانی بہہ رہا ہے۔ میں نہر کے پل کے قریب رات کو ہی جال ڈال کر گھر چلا جاتا ہوں اور صبح جا کر سمیٹتا ہوں تو اللہ میری روزی روٹی کا بندوبست کر دیتا ہے۔ میں مچھلیوں کو فروخت کر کے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں خرید لیتا ہوں مگر آج صبح......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے جب اپنا جال کھینچا تو اس میں مچھلیوں کے علاوہ ایک حسین عورت کی لاش بھی پھنسی ہوئی تھی۔ لاش کو دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے سارے طوطے اڑ گئے اور میں نے بے ساختہ ''لاش، لاش'' چلانا شروع کر دیا۔ میری پکار پر سب سے پہلے رزاق نہر کے کنارے پہنچا پھر تھوڑی ہی دیر میں وہاں درجن بھر افراد جمع ہو گئے...... میں نے لوگوں کے کہنے پر جال کو کھینچ کر اس عورت کی لاش کو نہر کے کنارے تک پہنچا دیا۔ وہ اس وقت بھی جال میں لپٹی ہوئی ادھر ہی پڑی ہے۔''

اللہ دتا خاموش ہوا تو میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی چودھری فرمان علی کا خاص بندہ وحید بول اٹھا۔ ''تھانے دار صاحب! جلد ہی اس واقعے کی خبر پورے جھوک ضامن میں پھیل گئی جب چودھری صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا تاکہ آپ جھوک ضامن آ کر موقع کی ضروری کارروائی کر سکیں......''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ لوگ جھوک ضامن سے کیسے یہاں پہنچے ہو؟''

''تانگے پر جناب۔'' وحید نے جواب دیا۔ ''ہمارا تانگا باہر تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ تینوں باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تھوڑی دیر میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ تینوں اٹھے اور یکے بعد دیگرے میرے کمرے

سے نکل گئے۔

اس کے بعد میں نے کانسٹیبل وسیم سیٹھی کو اپنے کمرے میں بلالیا اور فی الفور تھانے سے جھوک ضامن جانے کی تیاری کا حکم دیا۔ وسیم ایک سمجھدار اور چاق وچوبند پولیس اہلکار تھا اور وہ اکثر معاملات کی تفتیش میں میرے ساتھ رہا تھا۔

اس کیس کی روداد کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنے تھانے اور گردونواح کے گاؤں دیہات کی جغرافیائی کیفیت کو مختصراً بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ دورانِ مطالعہ... آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

میرا تھانہ ''عثمان آباد'' نامی ایک قصبے کی حدود میں سڑک کے کنارے واقع تھا۔ عثمان آباد کے اختتام پر وہ نہر بہتی تھی جس میں سے کسی خوب صورت عورت کی لاش برآمد ہوئی تھی۔ یوں سمجھیں کہ عثمان آباد نامی وہ قصبہ نہر اور سڑک کے درمیان آباد تھا۔ اسی طرح احمد نگر، جھوک ضامن اور جمال کوٹ بھی اسی نہر اور سڑک کے بیچ واقع تھے۔ مذکورہ نہر مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی جس کی دوسری جانب یعنی شمالی سمت کھیتوں کا وسیع وعریض سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ گویا متذکرہ بالا گاؤں دیہات نہر کے جنوب میں واقع تھے جن کے بعد وہ سڑک تھی جس کے کنارے پر میرا تھانہ تھا۔ یہ تمام گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔

عثمان آباد سے مشرق میں دو میل کے فاصلے پر احمد نگر تھا جبکہ مغرب میں تین میل کے فاصلے پر جھوک ضامن، پانچ میل کے فاصلے پر جمال کوٹ واقع تھا۔ یعنی جھوک ضامن اور جمال کوٹ میں دو میل کا فاصلہ تھا۔ اسی طرح اگر احمد نگر سے جمال کوٹ کی دوری ناپنا مقصود ہو تو وہ سات میل بنتی تھی۔

☆☆☆

جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو دھند چھٹنا شروع ہوگئی تھی۔ کانسٹیبل سیٹھی بھی میرے ساتھ تھا۔ اس وقت لگ بھگ دن کے گیارہ بجے ہوں گے۔ ہم لوگ تانگے میں سے اترے اور اللہ دتا مچھیرے کی راہ نمائی میں نہر کے اندر اتر گئے۔

نہر کے دونوں کنارے خشک تھے اور پانی گویا نہر کے پیٹ میں رواں دواں تھا تاہم اس کے بہاؤ میں اچھی خاصی تیزی پائی جاتی تھی۔ اللہ دتا مجھے اس مقام پر لے آیا جہاں اس کے جال میں ایک عورت کی لاش لپٹی پڑی تھی۔ جائے وقوعہ پر کم وبیش درجن بھر افراد جمع تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور وقوعہ سے دور رہنے کا حکم دیا پھر میں مذکورہ لاش کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔ میرے حکم پر سب سے پہلے اس عورت کی لاش کو جال سے نکال کر نہر کے کنارے ایک چادر پر ڈال دیا گیا تھا۔

وہ دل کش نقوش کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ پستہ قامت اور جسم بھرا بھرا، رنگت گندمی مگر اس وقت وہ بدنصیب زندگی کی رعنائی سے بہت دور، موت کی آغوش میں سر رکھے دائمی نیند سو رہی تھی۔

متوفی کے بدن پر کوئی خاص نوعیت کا گرم کپڑا نظر نہیں آرہا تھا جیسا کہ موسم کی مناسبت سے ہونا چاہیے تھا۔ اس نے فلالین کی پھول دار قمیص زیب تن کر رکھی تھی جس میں پھولوں کا رنگ سرخ تھا۔ شلوار بھی سرخ رنگ کے کاٹن کی تھی۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ یا تو اس کے پاؤں میں کوئی جوتا تھا ہی نہیں یا پھر نہر میں بہنے کے دوران میں اس کے پاؤں سے جوتا نکل گیا تھا۔ اسی طرح اس کا دوپٹا بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اکڑوں بیٹھ کر لاش کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس بدنصیب کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ متوفی ...... بلکہ مقتولہ کی گردن پر مجھے ایسے آثار ملے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے کافی دیر تک اس گردن کو انگلیوں کے شکنجے میں جکڑے رکھا ہوگا اور سانس کی آمد ورفت منقطع ہونے کے باعث اس کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔

مقتولہ کے بازوؤں کے جائزے سے پتا چلا کہ اس نے زندگی اور موت کی کش مکش کے دوران میں حتی الامکان مزاحمت بھی کی تھی جس کے نتیجے میں اس کی چوڑیاں ٹوٹنے سے کلائیاں زخمی ہوگئی تھیں۔ لاش کے معائنے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے موقع پر موجود لوگوں سے متعدد سوالات کیے لیکن کہیں سے بھی تسلی بخش جواب نہیں آیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس مردہ عورت کو نہیں جانتا تھا بلکہ ان کا متفقہ فتویٰ یہی تھا کہ وہ عورت جھوک ضامن کی رہنے والی نہیں تھی۔ گویا اس کی شناخت کا معاملہ ایک معما بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک اور چادر منگوا کر لاش کے اوپر ڈلوا دی اور مچھیرے اللہ دتا سے پوچھ گچھ کرنے لگا لیکن اس سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ وہ جو جانتا تھا، مجھے پہلے ہی بتاچکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ اللہ دتا دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔

جھوک ضامن اور جمال کوٹ کے درمیان نہر پر ایک پل بنا ہوا تھا جو جھوک ضامن کے بہت قریب تھا۔ اسی پل کے نیچے اللہ دتا نے اپنا جال نہر کے پانی میں ڈال رکھا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، مذکورہ نہر کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت میں تھا اور حالات وواقعات کے مطابق، اس نامعلوم عورت کی لاش اسی نہر کے پانی میں بہہ کر اللہ دتا کے جال تک پہنچی تھی لہٰذا اس بات کے امکانات صفر تھے کہ وہ بدنصیب عورت جمال کوٹ سے بہہ کر جھوک ضامن پہنچی ہوگی۔ جھوک ضامن کی مشرقی سمت تین میل کے فاصلے پر عثمان آباد واقع تھا جہاں میرا تھانہ بھی تھا۔ عثمان آباد کے مشرق میں دو میل کی دوری پر احمد نگر نامی گاؤں تھا۔ امکان اس بات کا تھا کہ وہ عورت یا تو عثمان آباد سے تعلق رکھتی تھی یا پھر احمد نگر سے۔ میں اس علاقے کا تھانے دار ضرور تھا مگر ظاہر ہے، ان گاؤں دیہات میں بسنے والے ایک ایک شخص کا صورت آشنا نہیں تھا خصوصاً عورتوں کے حوالے سے تو یہ اور بھی ناممکن تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس نامعلوم مقتولہ عورت کو اس سے پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔

جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی اور وہاں موجود لوگوں کے بیانات سے میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ مقتولہ جھوک ضامن کی رہنے والی نہیں تھی اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی موت کے حوالے سے کچھ نہیں جانتا تھا!

میں جس تانگے پر سوار ہو کر تھانے سے جائے وقوعہ تک پہنچا تھا، اس عورت کی لاش کو اسی تانگے کے اگلے حصے میں، سیٹ کے سامنے پاؤں رکھنے والی خالی جگہ پر رکھوا دیا اور خود تانگے کے عقبی حصے میں سوار ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پتا چلا چودھری فرمان علی گھوڑے پر سوار وہاں پہنچ گیا ہے۔ مجھے مجبوراً تھوڑی دیر کے لیے رکنا پڑا۔

چودھری فرمان علی ایک ادھیڑ عمر اور عمدہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا باپ چودھری قربان علی اور دادا چودھری ضامن بڑے رعب دار اور جاہ وجلال والے چودھری گزرے تھے۔ ''جھوک ضامن'' چودھری فرمان علی کے دادا کے نام پر تھا۔ چودھری فرمان علی اپنے دو حواریوں کے ہمراہ موقع پر پہنچا اور گھوڑے سے اترنے کے بعد سیدھا میری طرف آیا۔

ہمارے درمیان گرم جوش مصافحے کے بعد رسمی علیک سلیک ہوئی پھر وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ملک صاحب! میں صبح بھی یہاں ایک چکر لگا کر گیا ہوں۔ جب مجھے پتا چلا تھا کہ نہر میں سے کسی عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے تو میں پہلی فرصت میں یہاں پہنچ گیا تھا اور میں نے ہی وحید کو اس واقعے کی اطلاع دینے آپ کے پاس بھیجا تھا۔''

''جی ہاں۔ آپ کے بندے نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''چودھری صاحب! یہ تو طے ہو گیا کہ یہ بدنصیب عورت آپ کے گاؤں سے تعلق نہیں رکھتی۔ آپ اس کے بارے میں اور اس کی ناگہانی موت کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

چند لمحات سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''ملک صاحب! یہ بات درست ہے کہ یہ عورت جھوک ضامن کی رہنے والی نہیں اور یہاں کا کوئی بندہ اسے جانتا بھی نہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ نہر کے پانی میں بہتے ہوئے اللہ دتا کے جال تک پہنچی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ پیچھے کے کسی گاؤں سے تعلق رکھتی ہے جیسے کہ عثمان آباد یا احمد نگر یا اس سے بھی پیچھے واقع کسی اور گاؤں سے۔ اگر آپ نہر کے بہاؤ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی تفتیش کو آگے بڑھائیں گے تو بہت جلد کسی حتمی نتیجے تک پہنچ جائیں گے اور جہاں تک اس کی موت کا تعلق ہے......''

لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں اس عورت نے اپنے گھریلو حالات سے تنگ آ کر نہر میں کود کر خودکشی کی ہے......!''

''میں آپ کی بات سے بالکل اتفاق نہیں کروں گا چودھری صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! میں آپ کی بات بالکل سمجھ نہیں سکا......؟''

''چودھری صاحب!'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ''یہ خودکشی والا معاملہ نہیں ہے......!''

''پھر......؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس عورت کو قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا ہے۔''

''آپ...... اتنی بڑی بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟'' اس کی حیرت اور الجھن تشویش میں بدل گئی۔

''اس بنا پر کہ......'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے

میں جواب دیا۔ ''میں نے بڑی توجہ کے ساتھ اس بدقسمت عورت کی گردن کا معائنہ کیا ہے۔ وہاں پر گلا گھونٹنے کے بڑے واضح آثار موجود ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ رہی سہی کسر نکال دے گی۔''

''اوہ......!'' اس نے ایک گہری، تشویش بھری سانس خارج کی اور بولا۔ ''میں نے صبح اتنی باریک بینی سے لاش کا جائزہ نہیں لیا تھا۔''

''آپ ادھر آئیں......'' میں نے اسے اشارہ کیا اور تانگے کے اگلے حصے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں دکھاتا ہوں آپ کو......''

اگلے دو تین منٹ میں، میں نے چادر اٹھا کر چودھری فرمان علی کو نامعلوم لاش کی گردن کا دیدار کرایا۔ وہ بڑی گہری نظر سے گردن کا معائنہ کرنے کے بعد تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ملک صاحب مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بدقسمت کو کس ظالم نے گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا ہوگا؟''

''اس ظالم کی تلاش کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میرے نزدیک سب سے پہلا کام تو مقتولہ کی شناخت کا ہے۔ جب تک معلوم نہ ہو کہ یہ ہے کون، اس کے قاتل تک رسائی ممکن نہیں!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ جھوک ضامن سے مشرق کی سمت پائے جانے والے گاؤں یعنی جدھر سے یہ نہر بہتی ہوئی آرہی ہے، انہیں چیک کریں تو اس عورت کے پتے ٹھکانے کا سراغ مل جائے گا۔''

''میں یہی کرنے جارہا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''اگر اس سلسلے میں کہیں میری مدد یا تعاون کی ضرورت پیش آئے تو ضرور بتائیں۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔''

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر واقعی مجھے ایسی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو یہ زحمت ضرور دوں گا۔''

الوداعی کلمات کے تبادلے کے بعد میں کانسٹیبل وسیم سیٹھی کے ساتھ تانگے کے عقبی حصے میں سوار ہوا اور ہمارا تانگا جھوک ضامن سے عثمان آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔ جھوک ضامن گاؤں کے اندر سے گزر کر سڑک کی جانب آتے ہوئے جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں کھڑی دکھائی دیں۔ وہ آپس میں باتیں کررہے تھے اور ان کی نظریں ہمارے تانگے پر لگی ہوئی تھیں۔ نہر سے ملنے والی نامعلوم بدقسمت عورت کی لاش کی خبر پورے جھوک ضامن میں پھیل چکی تھی لہٰذا اس امر کے قوی امکانات تھے کہ وہ لوگ اسی عورت کے بارے میں باتیں کررہے ہوں گے۔ جب ہمارے تانگے نے موضع جھوک ضامن کو خیرباد کہا، اس وقت دھند مکمل طور پر چھٹ چکی تھی اور نرم، دھیمی دھیمی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

''کرم دین!'' میں نے تانگے کے کوچوان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟''

جب سے ہمارا تانگا جائے وقوعہ سے روانہ ہوا تھا، میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ کوچوان کچھ بے چین اور بے قرار دکھائی دینے لگا تھا جبکہ اس طرف آتے ہوئے اس کی یہ کیفیت نہیں تھی۔

''کچھ نہیں جناب......'' وہ کترانے والے انداز میں بولا۔ ''بس، بڑا عجیب سا محسوس ہورہا ہے تھانے دار صاحب۔''

کوچوان تانگے کے بانس پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب تانگا سواریوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا ہو تو کوچوان بانس پر ہی بیٹھا کرتا ہے مگر اس وقت ہمارے ساتھ ایسی صورت حال... نہیں تھی۔ میں اور سیٹھی تانگے کی عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگلی سیٹ بالکل خالی تھی۔ کرم دین اگر چاہتا تو بڑے آرام سے پھیل کر اس سیٹ پر بیٹھ سکتا تھا۔ وہ بار بار گردن موڑ کر سراسیمہ نظر سے اگلی نشست اور اس کے سامنے موجود خالی جگہ کو دیکھ تو رہا تھا مگر بانس سے اٹھ کر سیٹ پر بیٹھنے کی ہمت نہیں کرپارہا تھا۔ میں اس کے اس احتراز یا خوف کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے کہا۔

''کرم دین! انسان کو اپنے جیسے زندہ انسانوں سے ڈرنے اور محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، لاشوں یا مردہ انسانوں سے نہیں۔ جو گیا، سو گیا۔''

''سرکار...... میں ڈر تو نہیں رہا......!'' وہ اپنی آواز میں مصنوعی مضبوطی بھرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو...... مغالطہ ہوا ہے۔''

''مجھے مغالطہ وغالطہ نہیں ہوا کرم دین!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کافی دیر سے تمہارا جائزہ لے رہا ہوں۔ تم اس خوبصورت لاش کی وجہ سے خاصے سہمے ہوئے ہو جیسے یہ ابھی اٹھ کر تمہیں چمٹ جائے گی...... ہوں؟''

"جناب!" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "آپ...... روحوں اور...... بدروحوں کے وجود سے انکار...... تو نہیں کرسکتے نا......!"

"ہاں، بالکل انکار نہیں کرسکتا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی نیک روح ہو یا بدروح، اسے کسی نہ کسی جسم کی بہرحال ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جس شخص کے اندر نیک روح موجود ہو وہ نیک اور جس کے وجود میں کوئی بدروح سما جائے وہ بدکار ہوتا ہے۔"

"جناب...... میں روحوں کی دوسری قسم کی بات کررہا ہوں۔" وہ گویا میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"دوسری قسم......!" میں نے استعجابیہ نظر سے اسے دیکھا۔ "کرم دین! تم آخر کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"جناب! میں ان روحوں کا ذکر کررہا ہوں جو کسی انسان کی موت کے بعد آزاد ہوجاتی ہیں اور دوسرے لوگوں کو تنگ کرتی ہیں۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "آپ نے ان عاملوں کاملوں کو نہیں دیکھا جو مخصوص عمل سے روحوں سے رابطہ کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کسی روح کو حاضر بھی کرلیتے ہیں......!"

"ایسے عامل وکامل ڈھونگی ہیں، دکان دار ہیں۔" میں نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ تانگا بانی جاری رکھتے ہوئے، سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے خود ایک شاہ صاحب کو "حاضرات" کا عمل کرتے دیکھا تھا۔"

"یہ سب تمہاری نظر کا دھوکا ہے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اس شاہ جی نے تمہارے کمزور عقائد سے کھلواڑ کیا ہوگا...... اور کچھ نہیں۔"

کرم دین نے بے یقینی سے مجھے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اس کا ذہن میری بات سے نہ تو متفق تھا اور نہ ہی مطمئن! اصل میں جو عقائد نسل درنسل ہمارے خاندانوں اور معاشرے میں چلے آرہے ہوتے ہیں اس کے خلاف کوئی بات سننا اور اس پر یقین کرنا ہمارے ذہن کو قبول نہیں ہوتا۔ ابھی عثمان آباد پہنچنے میں کچھ دیر باقی تھی لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس حوالے سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میرا انداز استفساریہ تھا۔

"کرم دین! تم مسلمان ہونا......؟"

"جی الحمدللہ!" وہ جلدی سے بولا۔ "میں مسلمان ہوں تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے اس قسم کے سوال کیوں کررہے ہیں......؟"

"اس لیے کرم دین کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم عاملوں کاملوں کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ طاقت ور سمجھتے ہو۔"

"توبہ...... استغفراللہ!" وہ جلدی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"جناب! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اللہ سے زیادہ کوئی طاقت والا نہیں ہوسکتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔"

"ہاں...... وہ قادرِ مطلق ہے اور اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا۔ "اس بات کو تو تم مانتے ہونا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس بات پر تو میرا بڑا پکا ایمان ہے جناب۔"

"تو پھر تمہیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ تمام روحوں کو بھی اسی قادرِ مطلق کے حکم کا تابع رہنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے خالق کی منشا کے بغیر ایک انچ ادھر سے ادھر حرکت نہیں کرسکتیں؟"

"جی...... جی ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ اس کائنات میں پائی جانے والی ہر زندہ، مردہ، جان دار، بے جان شے کا خالق اور مالک ہے......" لحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارواح کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین مقامات مقرر کررکھے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر روزِ قیامت تک پیدا ہونے والے ہر جاندار کی روحوں کو اس قادرِ مطلق نے پیدا کرکے عالم ارواح میں جمع کررکھا ہے۔ جب کسی انسان کو پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ رب کریم ایک روح کو اس کے وجود میں داخل کردیتا ہے۔ انسانی جسم یا کسی بھی جاندار شے کا جسم روح کا دوسرا ٹھکانا ہے۔ اور جب کوئی انسان انتقال کرجاتا ہے تو اس کی روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ عالم ارواح، انسانی وجود، عالم برزخ...... ارواح کے یہی تین ٹھکانے ہیں جہاں وہ حکم ربی سے رہ سکتی ہیں۔ وہ اپنی مرضی یا کسی عامل کامل کی مرضی سے کہیں آجا نہیں سکیں۔"

"تو...... تو وہ کیا ہوتا ہے......" وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک بار حاضرات کا عمل دیکھا تھا......؟"

"فریبِ نظر...... نگاہ کا دھوکا۔" میں نے ٹھہرے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ایسے عاملوں کاملوں کے پاس بعض ایسے شعبدے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ سادہ لوح اور معصوم افراد کو بہ آسانی بے وقوف بنا لیتے ہیں اور اس عمل میں ان کے قریبی ساتھی یعنی مجاور اور متولی وغیرہ بھی معاون ہوتے ہیں۔ البتہ، ان دکان دار عاملوں کاملوں کے علاوہ اللہ کے چند نیک بندے بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔‘‘ میں نے کہا ’’یہ ولی اللہ حضرات اپنے معبود کے حکم سے اور اپنی روحانی قوتوں کو بروئے کار لاکر حاجت مندوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان قابلِ احترام لوگوں کو اپنے پاس آنے والے ضرورت مندوں سے کوئی مطلب یا لالچ نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں محض دکھی انسانیت کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں۔‘‘

’’آپ کی باتوں نے میرے دل اور دماغ پر بہت اثر کیا ہے جناب۔‘‘ وہ بڑے عقیدت مندانہ انداز میں بولا۔

’’میں کیسے یقین کرلوں کرم دین کہ میری باتوں نے واقعی تمہیں متاثر کیا ہے؟‘‘ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

’’جی...... ‘‘ وہ چونکا۔ ’’آپ کو کیسے یقین آئے گا جی؟‘‘

’’تم یقین دلاؤ گے تو یقین آجائے گا۔‘‘ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

اس کی الجھن سوا ہوگئی۔ ’’مگر کیسے......؟‘‘

’’ایسے......!‘‘ میں نے اگلی سیٹ کو تھپتھپاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’یہاں بیٹھ کر دکھاؤ تو میں مان لوں گا کہ واقعی میری باتوں نے تمہارے دل ودماغ میں گھر کیا ہے......!‘‘

ایک لمحے کے لیے وہ گہرے تذبذب میں دکھائی دیا پھر ایک انقلابی فیصلے کے تحت وہ بڑے عزم کے ساتھ تانگے کے بانس پر سے اٹھا اور اگلی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

’’شاباش کرم دین! مجھے یقین آگیا کہ تمہارے اندر سے روحوں کا ڈر نکل گیا ہے۔ تم چاہے کتنی دیر بھی اس نامعلوم بدنصیب عورت کے ساتھ گزار لو، تمہارا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا......‘‘

وہ مطمئن اور نڈر نظر آنے لگا۔

اب کانسٹیبل سیٹھی بھی اس گفتگو میں شریک ہوگیا تھا۔ وسیم سیٹھی کا تعلق موضع عثمان آباد ہی سے تھا اور جائے وقوعہ پر میں نے نامعلوم مقتولہ عورت کے بارے میں اس سے بھی پوچھا تھا۔ سیٹھی کے مطابق، وہ عورت عثمان آباد کی

رہنے والی نہیں تھی۔ یہی سوال میں نے کوچوان سے بھی کیا مگر قدرے مختلف انداز میں۔

''کرم دین! اس لاش کی وجہ سے اب تمہیں خوف تو محسوس نہیں ہو رہا؟''

''نہیں جی۔'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''بالکل نہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے یہ کسی سواری کا سامان ہو۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''کسی بھی انسان کی لاش سامان کی ایک گٹھری کے مانند ہی ہوتی ہے جسے میت کی صورت ڈھو کر قبر تک پہنچایا اور پھر مٹی میں دبا دیا جاتا ہے۔''

''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

''تم بھی تو عثمان آباد ہی کے رہنے والے ہو نا کرم دین؟''

''جی سرکار!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''تین پیڑھیوں سے میرا خاندان ادھر ہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ بدنصیب عورت بھی عثمان آباد ہی کی وسنیک ہے؟''

''نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کا تعلق ہمارے گاؤں عثمان آباد سے نہیں ہے......!''

''تم تو ہر جگہ کی سواریاں اٹھاتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کبھی یہ عورت تمہارے تانگے میں بیٹھی ہو؟''

اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ نفی میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

تھانے پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نامعلوم مقتولہ عورت کی لاش کی شناخت کے لیے عملی کوشش شروع کی۔ میں نے ایک پولیس اہلکار کو بھیج کر گاؤں کے چند معتبر افراد کو تھانے بلا لیا۔ یہ تمام وہ لوگ تھے جو سالہا سال سے عثمان آباد کے باسی تھے اور وہاں کے بچے بچے کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ اگر مقتولہ عورت کا تعلق اسی گاؤں سے ہوتا تو وہ یقیناً اس کی شناخت کر لیتے۔ ویسے تو میں وسیم سیٹھی اور کوچوان کرم دین کے بیانات سے پوری طرح مطمئن تھا لیکن فرض اور قانون کے تقاضے نبھانا بھی بہت ضروری تھے۔

آئندہ ایک گھنٹے کے اندر یہ مرحلہ بھی گزر گیا جس کا نتیجہ میری توقع کے عین مطابق برآمد ہوا تھا یعنی اس بدنصیب عورت کا عثمان آباد سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔

اس شناخت پریڈ سے مجھے ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ تو طے ہو گیا تھا کہ وہ عورت عثمان آباد کی رہنے والی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی فرید احمد نامی ایک شخص نے بڑا سنسنی خیز انکشاف بھی کیا تھا جو میری تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے پیٹرول کے ذخیرے سے کم نہیں تھا۔

فرید احمد کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ عثمان آباد ہی کا باسی تھا۔ جب اس نے مقتولہ کی لاش کا جائزہ لیا تو چونک اٹھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی۔ میں چونکہ ان لمحات میں فرید کے تاثرات کو بہ غور دیکھ رہا تھا لہٰذا میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''کیا ہوا فرید...... تم اس طرح کیوں چونکے ہو...... کیا تم اس عورت کو جانتے ہو؟''

میرے پے در پے سوالات کے جواب میں اس نے کہا۔ ''جی...... مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے......!''

''کہاں...... کیا عثمان آباد میں؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں...... عثمان آباد سے باہر......''

''باہر کہاں......؟''

''مجھے یاد آ گیا......'' وہ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔ ''یہ...... یہ احمد نگر کی رہنے والی ہے......''

احمد نگر، عثمان آباد کی مشرقی سمت دو میل کے فاصلے پر واقع تھا اور نہر بھی اسی طرف سے آ رہی تھی یعنی نہر کے پانی کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی جانب تھا۔ یہ ممکن نظر آتا تھا کہ وہ احمد نگر سے پانی کے ساتھ بہہ کر جھوک ضامن پہنچی ہو اور پھر اللہ دتا مچھیرے کے جال میں پھنس گئی ہو۔

''فرید!'' میں نے شناخت کرنے والے نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اس عورت کا تعلق احمد نگر ہی سے ہے۔ کیا تم نے اسے وہاں دیکھا ہے؟''

''جی ہاں، مجھے پکا یقین ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے احمد نگر ہی میں دیکھا ہے۔''

''پھر تو تم اس کے نام اور پتے سے بھی واقف ہو گے۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہیں معلوم ہوگا، یہ احمد نگر میں کس گھر میں رہتی تھی......؟''

''اس کے نام کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا

تھانے دار صاحب۔'' وہ لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''البتہ، یہ پتا ہے کہ یہ عورت آپا صغریٰ کے پڑوس میں رہتی ہے...... میرا مطلب ہے، رہتی تھی۔''

''آپا صغریٰ......'' میں نے سوالیہ نظر سے فرید کو دیکھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''آپا صغریٰ میری بڑی بہن ہے جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی شادی ادھر احمد نگر میں ہوئی ہے اور وہ احمد نگر ہی میں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ میں کبھی کبھی آپا صغریٰ سے ملنے چلا جاتا ہوں۔''

''تو تم نے اس بدنصیب عورت کو اپنی صغریٰ آپا کے پڑوس میں دیکھا تھا؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ''اور تمہیں یقین ہے کہ یہ وہیں رہتی تھی؟''

''جی بالکل!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اس کا گھر والا لکڑی کا کام کرتا ہے۔ شاید اس کا نام یعقوب ترکھان ہے۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''فرید! تم ابھی اور اسی وقت ایک اہل کار کے ساتھ احمد نگر روانہ ہو جاؤ اور فوراً سے پیش تر یعقوب ترکھان کو لے کر واپس آجاؤ۔''

''جو حکم جناب کا......'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

اگلے پندرہ منٹ میں، میں نے کانسٹیبل آصف علی کو فرید احمد کی سنگت میں ایک تانگے پر سوار کرا کے احمد نگر کی جانب روانہ کر دیا اور خود اپنے کمرے میں آگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حوالدار رستم خان بھی میرے پاس آگیا اور ہمارے درمیان اسی نامعلوم مقتولہ عورت کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی۔

''میرے نزدیک مقتول کی شناخت ایک بہت بڑی کامیابی ہے ملک صاحب!'' رستم خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو رستم خان۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''مگر میں سمجھتا ہوں، یہ شناخت ابھی ادھوری ہے۔''

''ادھوری شناخت!'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ ''میں سمجھا نہیں ملک صاحب۔ جب فرید احمد نے تصدیق کی ہے کہ یہ عورت اس کی صغریٰ آپا کی پڑوسن ہے تو پھر کسی شک وشبے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے......!''

''شک وشبے کی گنجائش تو ہر جگہ موجود رہتی ہے رستم خان!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آنکھ بڑی عجیب شے ہے۔ یہ اکثر دھوکا بھی کھا جاتی

غفلت

ایک ہندوستانی نے پاکستانی شخص سے کہا۔ ''ہم سے زیادہ انگریز لوگ اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو کڑی دھوپ سے بچاتے ہیں جبکہ ہم پاکستانی اور ہندوستانی غفلت کرتے ہیں۔

پاکستانی۔ ''وہ کیسے؟ ذرا بتاؤ تو۔''

ہندوستانی۔ ''انگریزوں کے سر کے آگے چھجا ہوتا ہے جس سے ان کی آنکھوں پر دھوپ نہیں پڑتی جبکہ ہماری پگڑیوں اور ٹوپیوں کے آگے چھجا نہیں ہوتا۔ یہ غفلت نہیں تو اور کیا ہے۔''

***

مشق

ڈاکٹر ایک موٹے شخص سے۔ ''تمہارے لیے ورزش کرنا بہت ضروری ہے۔ ورزش سے تمہاری توند اندر ہو جائے گی اور جسم بھی کسرتی ہو جائے گا۔ تم روزانہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر چڑھو اور کمرے میں کودنے کی ورزش کرو۔ یہ مشق تمہیں فائدہ دے گی۔''

موٹا آدمی۔ ''لیکن ڈاکٹر صاحب! میں تو روزانہ اس سے بھی کڑی ورزش کرتا ہوں۔ جب رات کو دیر سے گھر آتا ہوں تو بیوی کی سرزنش کے خوف سے بیرونی دروازے پر چڑھتا ہوں اور اندر والے کنڈے پر پیر رکھ کے صحن میں کود جاتا ہوں۔''

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

تحفہ

ایک پھول فروش نے ایک نوجوان کو روکتے ہوئے کہا۔ ''جناب اپنی محبوبہ کے لیے پھولوں کے ہار لیتے جائیں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری کوئی محبوبہ نہیں۔''

پھول والا۔ ''تو پھر اپنی بیوی کے لیے لیتے جاؤ۔''

نوجوان۔ ''افسوس کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔''

پھول والا یہ سن کر بولا۔ ''اے دنیا کے خوش قسمت انسان پھر یہ ہار میری طرف سے تحفتاً لیتے جاؤ۔''

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

ہے۔ ہوسکتا ہے، فرید جس عورت کا ذکر کررہا ہے اس کی شکل اس مقتولہ عورت سے ملتی جلتی ہو۔ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔ فرید کو مغالطہ بھی تو ہوسکتا ہے......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جب تک یعقوب ترکھان یہاں آکر اس بات کی تصدیق نہ کردے کہ یہ عورت اس کی بیوی ہے، میں یقین نہیں کرسکتا۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کی اصل شناخت تو اس کا گھر والا ہی کرسکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں، زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے بعد یعقوب ترکھان یہاں آپ کے سامنے ہوگا۔''

ادھر حوالدار رستم خان کی بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل آصف علی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ پہلے آصف کو فرید کی معیت میں احمد نگر روانہ کیا تھا۔ غیر متوقع طور پر اتنی جلدی اس کی واپسی نے مجھے چونکا دیا اور میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''تم احمد نگر نہیں گئے......؟''

''جناب! احمد نگر پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

میری الجھن سوا ہوگئی۔ ''کیوں نوبت نہیں آئی؟'' میں نے قدرے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا راستے میں سیلِ آب آیا ہوا تھا؟''

''نہیں ملک صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے مجھے جس کام سے احمد نگر بھیجا تھا وہ تھانے سے نکلتے ہی ہوگیا اس لیے میں فوراً واپس آگیا ہوں۔''

میں نے ٹٹولنے والی نظر سے کانسٹیبل کو دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آصف علی! میں نے تو تمہیں احمد نگر اس مقصد سے روانہ کیا تھا کہ تم یعقوب ترکھان کو اپنے ساتھ لے کر آؤ گے......؟''

''جی ہاں!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں یعقوب ترکھان کو لے کر ہی آیا ہوں۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔''

''لیکن صرف پندرہ بیس منٹ میں تم احمد نگر جاکر واپس کیسے آسکتے ہو؟'' میری حیرت ابھی رفع نہیں ہوئی تھی۔

''جناب! دراصل یعقوب ترکھان ہمیں راستے ہی میں مل گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے تھانے سے نکل کر بہ مشکل سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے سے ایک تانگا آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچنے پر فرید احمد نے مجھے بتایا کہ اس تانگے میں یعقوب ترکھان سوار ہے۔ میں نے مذکورہ تانگے کو رکوا کر یعقوب ترکھان سے پوچھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی عائشہ کہیں گم ہوگئی ہے اور وہ اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے تھانے جارہا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے جناب!''

میں نے ایک اطمینان بخش گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یعقوب ترکھان کو اس نامعلوم مقتولہ عورت کی لاش دکھاؤ۔ میں بھی آرہا ہوں۔'' وہ مجھے سیلوٹ کرکے کمرے سے نکل گیا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری تقلید میں حوالدار رستم خان نے بھی کرسی چھوڑ دی اور بولا۔ ''ملک صاحب! اب یہ بدنصیب عورت نامعلوم تو نہیں رہی۔ یہ یعقوب ترکھان کی گمشدہ بیوی عائشہ ہے جناب......''

''ہاں، بہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کسی حتمی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں یعقوب ترکھان کی تصدیق یا تردید کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم آؤ میرے ساتھ۔''

ہم دونوں وہاں پہنچے جہاں مذکورہ مقتولہ عورت کی لاش رکھی تھی۔ کانسٹیبل آصف نے ہم سے پہلے یعقوب ترکھان کو وہاں پہنچا دیا تھا۔ فرید احمد بھی ادھر ہی موجود تھا۔ یعقوب ترکھان نے مقتولہ عورت کا چہرہ دیکھتے ہی اعلان کردیا کہ وہ اس کی بیوی عائشہ کی لاش تھی۔ بیوی کو مردہ حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب...... یہ آپ کو کہاں سے ملی...... اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں تو صبح سے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہوگیا ہوں......!''

لاش کی حتمی شناخت کے بعد میرا کام خاصا آسان ہوگیا تھا۔ میں یعقوب ترکھان کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں اس سے تفصیلی نشست کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی بیوی کی موت کا معما حل ہوسکے۔ میں نے یعقوب ترکھان کو ایک کرسی پر بٹھایا اور تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''یعقوب! اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں دس منٹ بعد تم سے بات کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف مڑا تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کہاں

جا رہے ہیں......؟''

''تمہاری بیوی کی لاش کے سلسلے میں مجھے کچھ ضروری کارروائی کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔''میں لاش کو اسپتال بھجوانے کے بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔''

''آپ عائشہ کی لاش کو اسپتال کیوں بھیج رہے ہیں تھانے دار صاحب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں گہرا اضطراب تھا۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔''اسپتال میں تمہاری بیوی کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔''

''پوسٹ مارٹم...... یعنی چیر پھاڑ......؟'' اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''بڑی اشد ضرورت ہے!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''تمہاری بیوی کی طبعی موت نہیں ہوئی۔ اس کی موت کا سبب جاننا بہت ضروری ہے۔''

وہ یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے کانسٹیبل وسیم سیٹھی کی نگرانی میں یعقوب ترکھان کی بیوی عائشہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔

یعقوب ترکھان کی عمر چالیس سے متجاوز نظر آتی تھی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے اور چندیا صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی ''غائب'' تھیں۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مذکورہ انگلیاں بے احتیاطی کے باعث آرے میں کٹ گئی تھیں۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں یعقوب ترکھان کو اس کی بیوی کی لاش کی ''دریافت'' کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہا اور اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی نمایاں تبدیلیاں بھی آتی رہیں۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''آپ کا مطلب ہے...... عائشہ کو قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا ہے؟''

''بالکل...... میرا یہی مطلب ہے!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اسی امر کی تصدیق کرے گی۔''

''لیکن...... عائشہ کو...... کون قتل کر سکتا ہے......؟''

وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔
''یہ تو تم مجھے بتاؤ گے......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم عائشہ کے شوہر ہو۔ تم سے زیادہ یہ بات اور کون جان سکتا ہے!''
''جناب! میں عائشہ کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ رات کو ٹھیک ٹھاک سوئی تھی۔ صبح دیکھا تو وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ بس، میں اسی وقت سے عائشہ کی تلاش میں لگ گیا۔ میں نے پورا احمد نگر چھان مارا لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ تھک ہار کر میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے تھانے آرہا تھا تو یہاں آکر پتا چلا......'' اس کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔
''یعقوب! اس بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ تمہاری بیوی کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور زخمی کلائیاں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے خاصی جدوجہد کی ہوگی لیکن قاتل نے اس کا بس نہیں چلنے دیا اور اس وقت تک عائشہ کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط انگلیوں میں جکڑے رکھا جب تک اس کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہوگیا۔ اسے موت کی نیند سلانے کے بعد ہی قاتل نے اس کی لاش کو نہر میں پھینکا ہوگا جہاں سے وہ پانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے جھوک ضامن پہنچ گئی......'' میں نے ذرا دیر کو توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''اگر جھوک ضامن کے مچھیرے اللہ دتا نے نہر میں جال نہ ڈال رکھا ہوتا تو عائشہ کی لاش پانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے پتا نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتی......!''
''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھانے دار صاحب......'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''عائشہ کا کوئی دشمن بھی نہیں پھر کون اسے قتل کر کے نہر میں پھینک سکتا ہے۔''
''جب ایسے حالات میں کوئی عورت قتل ہوجاتی ہے تو پہلا شک اس کے شوہر کی طرف جاتا ہے۔'' میں نے یعقوب ترکھان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا تم سچ سچ بتادو کہ تم نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا کیا ہے......؟''
میرے سنگین استفسار نے اسے گڑگڑانے پر مجبور کردیا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ میں عائشہ کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تم دونوں کے بیچ ازدواجی زندگی کیسی چل رہی تھی؟''
''ٹھیک تھی جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''جیسے دوسرے میاں بیوی کی ہوتی ہے۔''
پولیس ڈیپارٹمنٹ میں طویل عرصہ کام کرتے ہوئے بھانت بھانت کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا تھا جن میں زیادہ تعداد جرائم پیشہ افراد کی ہوتی تھی۔ میں ان لوگوں کی مخصوص نفسیات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہ خوبی آگاہ تھا اور اللہ کے فضل وکرم سے میں پہلی نگاہ ہی میں اندازہ لگالیتا تھا کہ سامنے کس مزاج کا مجرم کھڑا ہے۔ یعقوب ترکھان کے حوالے سے میری ابتدائی رائے یہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی موت کا ذمے دار نہیں ہے اور اس نے عائشہ کو قتل نہیں کیا ہوگا لیکن یہ بھی طے ہے کہ ایک دو فیصد مجرم بڑے عیار اور کھوچل ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں قائم کیے گئے اندازے بعد میں غلط ثابت ہوجاتے ہیں لہٰذا یعقوب ترکھان کو بھی مختلف زاویوں سے پرکھنا ضروری تھا جیسا کہ وہ لکڑی کو رندے سے چھیل کر ہموار کیا کرتا تھا۔
''میاں بیوی کی زندگی چاہے کتنی بھی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہو لیکن ان کے بیچ گاہے بہ گاہے تو تکرار اور لڑائی جھگڑا بھی ہوتا ہے۔'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم دونوں بھی آپس میں دنگا فساد کیا کرتے تھے؟''
''کوئی بڑا دنگا فساد تو نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''ہاں مگر کبھی کبھی منہ ماری ہوجاتی تھی۔''
''عموماً یہ منہ ماری کس بات پر ہوا کرتی تھی؟''
یعقوب ترکھان نے جواب دیا۔ ''ہمارے درمیان جب بھی لڑائی ہوئی تو وہ یوسف ہی کا کوئی معاملہ تھا۔''
''یوسف کون؟'' میں نے پوچھا۔
''یوسف میرا بیٹا ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''آٹھ سال کا ہوگیا ہے مگر نہ تو اس کا پڑھنے میں دل لگتا ہے اور نہ ہی کام میں میرا ہاتھ بٹانے سے اسے کوئی دلچسپی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، ماں کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''بس جی، اسی بات پر عائشہ سے میری نوک جھوک ہوجاتی تھی!''
اکثر باپوں کی زبان سے یہ شکایت سنی ہے کہ ماؤں نے بے جا لاڈ پیار سے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ اس موضوع پر اگر ماؤں سے بات کی جائے تو ادھر سے بھی باپوں کے خلاف شکوہ شکایت کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔
یعقوب ترکھان کی اس بات سے تو مجھے اتفاق تھا

کہ آٹھ سالہ یوسف کو اپنی تعلیم کی جانب توجہ دینا چاہیے تھی مگر اس کی یہ خواہش جائز نہیں تھی کہ معصوم یوسف کو اس کے کام میں بھرپور ہاتھ بٹانا چاہیے۔ بہرحال، اس وقت معاملہ تعلیم اور کام سے بھی زیادہ اہم یعنی یوسف کی ماں عائشہ کی ناگہانی موت کا تھا لہٰذا میں یعقوب ترکھان کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کیا گزشتہ رات بھی عائشہ سے تمہاری نوک جھوک ہوئی تھی؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''یوسف کے علاوہ تمہارے اور کتنے بچے ہیں؟''

''کوئی نہیں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہماری بس یہی ایک ہی اولاد ہے۔''

''تم نے بتایا ہے کہ پچھلی رات عائشہ ٹھیک ٹھاک اپنے بستر پر سوئی تھی۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس سے پہلے تمہارا اس سے لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا؟''

''جی ہاں یہی حقیقت ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

''کیا رات میں کسی وقت تمہاری آنکھ کھلی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب! میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''رات کا کھانا کھانے کے بعد ایسی گہری نیند سویا کہ پھر آج صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔''

''اور جب آنکھ کھلی تو عائشہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی؟''

''جی...... جی ہاں!''

''عائشہ کو بستر سے غائب پا کر تمہارے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا تھا؟''

''میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اٹھ گئی ہے اور گھر کے اندر ہی کہیں موجود ہوگی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن جب وہ مجھے گھر کے کسی حصے میں دکھائی نہ دی تو مجھے تشویش ہوئی اور میں نے اسے گھر سے باہر گاؤں میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔''

میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ''کیا تم نے گھر کے بیرونی دروازے کو چیک کیا تھا؟''

''کیا مطلب جی؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، گھر کا بیرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا؟''

''دروازہ کھلا ہوا تھا جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''یعنی اس کے دونوں پٹ تو بند تھے مگر کنڈی لگی ہوئی نہیں تھی۔''

''کیا رات کو تم نے یاد سے بیرونی دروازے کی کنڈی لگائی تھی؟''

''جی ہاں...... یہ کام سونے سے پہلے میں یاد سے کرتا ہوں۔''

''رات کو سونے سے قبل تم نے بیرونی دروازے کی کنڈی لگائی تھی۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور صبح جب تم بیدار ہوئے تو دروازے کی کنڈی گری ہوئی تھی اور تمہاری بیوی گھر میں موجود نہیں تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ......'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ رفعِ حاجت کے لیے گھر سے باہر نکلی ہو۔ کنڈی کا کھلا ہوا پایا جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عائشہ اپنی مرضی سے کنڈی کھول کر گھر سے نکلی ہوگی۔''

''میرا دھیان بھی سب سے پہلے اسی طرف گیا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے چند منٹ اس کی واپسی کا انتظار کیا لیکن جب وہ واپس نہیں لوٹی تو میں پریشان ہو گیا اور اس کی تلاش میں، میں نے سب سے پہلے کھیتوں ہی کا رخ کیا تھا مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ میں نے مختلف لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا مگر کسی نے عائشہ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس صورتِ حال نے میرا دماغ پاگل کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، عائشہ کو کہاں تلاش کروں۔ جب ہر طرف سے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا تو میں آپ کے پاس آ گیا ہوں......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ نم ناک آواز میں بولا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ پولیس عائشہ کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالے گی مگر یہاں آ کر تو مجھے اس کی لاش کا سامنا کرنا پڑا۔''

''یعقوب! مجھے تمہاری بیوی کی المناک موت کا سخت افسوس ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ بہت جلد میں عائشہ کے قاتل کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا لیکن......!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔ ''لیکن کیا تھانے دار صاحب؟''

''لیکن یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی...... سچے اور کھرے تعاون کی!''

''میں تعاون کروں گا جی۔ سچا اور بالکل کھرا......'' وہ بڑے عزم سے بولا ''عائشہ تو چلی گئی۔ کوئی اسے واپس نہیں لا سکتا۔ میری خواہش ہے کہ اس کے قاتل کو عبرت ناک سزا ملے۔''

"عبرت ناک سزا ہی ملے گی یعقوب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اور اگر اس واقعے کے حوالے سے تمہیں کچھ بھی معلوم ہو تو مجھے بتا دو۔"

"اگر میں عائشہ کی موت کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا تھانے دار صاحب!" وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سنگین واقعہ پیش آجائے گا۔ میرا تو گھر اجڑ گیا جناب......!"

میں نے اسے تسلی تشفی دے کر رخصت کر دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ وہ گھر ہی میں رہے۔ میں کسی بھی وقت احمد نگر تفتیش کی غرض سے آسکتا ہوں۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اسی روز، میں ظہر کی نماز کے بعد احمد نگر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن بہ وجوہ میں اپنے اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ ایک ایمرجنسی کی صورت میں عثمان آباد میں میری موجودگی لازمی ٹھہری تھی۔ دنگے فساد کا ایک ایسا کیس میرے تھانے میں آیا تھا جس میں چند افراد شدید زخمی بھی ہوئے تھے۔ ان معاملات سے نمٹتے ہوئے شام ہو گئی اور مجھے احمد نگر والا پروگرام اگلے دن پر چھوڑنا پڑا چنانچہ آئندہ روز میں صبح ہی صبح وسیم سیٹھی کو اپنے ساتھ لے کر احمد نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ہم دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں نے دانستہ تانگے کے سفر کو نظر انداز کیا تھا اور اس وقت ہم پختہ سڑک پر بھی سفر نہیں کر رہے تھے۔ میں نے دانستہ نہر والا روٹ اختیار کیا تھا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ بھی رواں دواں تھا جس پر مویشی اور بیل گاڑیاں وغیرہ سفر کیا کرتی تھیں یا پھر گھڑ سوار۔

میں اگر چاہتا تو پختہ سڑک پر سفر کرتے ہوئے بہ سہولت اور کم وقت میں عثمان آباد سے احمد نگر پہنچ سکتا تھا۔ دو میل کا فاصلہ کوئی زیادہ مسافت نہیں تھی لیکن میں نے ایک خاص مقصد کی خاطر نہر کے کنارے سفر کا فیصلہ کیا تھا۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک اچھوتا منصوبہ تھا۔

گزشتہ روز میں نے وسیم سیٹھی کو نامعلوم مقتولہ عورت کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال روانہ کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ بدنصیب عورت اب نامعلوم نہیں رہی تھی۔ یہ حقیقت بڑے واضح انداز میں سامنے آچکی تھی کہ مقتولہ کا نام عائشہ تھا اور وہ احمد نگر کے باسی یعقوب ترکھان کی بیوی تھی۔

"اسپتال والوں نے کیا کہا تھا سیٹھی؟" میں نے دوران سفر میں کانسٹیبل سے دریافت کیا۔ "پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ وہ کب دیں گے......؟"

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"ملک صاحب! ابتدائی رپورٹ آج شام کو یا کل صبح مل جائے گی۔"

سیٹھی کے لہجے میں ایک عجیب سی بیزاری کو محسوس کر کے میں نے کہا۔ "کیا بات ہے سیٹھی! تم خاصے الجھے ہوئے نظر آرہے ہو۔ یہ تمہارے مزاج کے خلاف ہے۔ سب خیر خیریت تو ہے نا؟"

"جی ملک صاحب! میں تو ٹھیک ہوں مگر کبھی کبھی، آپ کی معمول سے ہٹی ہوئی کوئی بات دیکھ کر ذہن میں متعدد سوال سر اٹھانے لگتے ہیں۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے کبھی تمہیں سوالات کرنے سے منع کیا ہے سیٹھی!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی بتاؤ، اس وقت تم نے میری کون سی حرکت ایسی دیکھی ہے جو خلاف معمول ہو؟"

"ملک صاحب! چھوڑیں...... رہنے دیں۔"

"کیوں رہنے دیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا تاہم انداز ڈانٹنے والا نہیں تھا۔ "بات چیت جاری رہنا چاہیے۔ اسی بہانے وقت اچھا کٹ جائے گا۔ تھانے میں تمہاری یہ کیفیت نہیں تھی۔ ہمارے روانہ ہونے کے بعد ہی تم پر قنوطیت کا یہ دورہ پڑا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرے ذہن میں یہی تھا کہ سڑک کے راستے منٹوں میں احمد نگر پہنچ جائیں گے۔ دو میل کا فاصلہ آخر ہوتا ہی کتنا ہے......!"

"اوہ...... اب میں تمہاری بیزاری اور جھنجلاہٹ کا سبب سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "تم اس بات پر ذہن کو الجھا رہے ہو کہ میں صاف ستھری پختہ سڑک چھوڑ کر نہر کے کنارے کچے راستے کی خاک کیوں اڑا رہا ہوں۔ ہیں نا؟"

"جی ملک صاحب!" وہ تائیدی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اتنا تو میں جانتا ہوں کہ آپ کے اس فیصلے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور چھپی ہوگی مگر میں چونکہ اس

وجہ سے واقف نہیں ہوں اس لیے ذہن الجھ رہا ہے......"

"بس...... اب ذہن کو مزید مت الجھاؤ۔" میں نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہارے ذہن میں موجود ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔"

میری تقلید میں اس نے بھی لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا پھر متعجب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ رک کیوں گئے ملک صاحب......؟"

میں نے اس کے سوال کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔ "سیٹھی! کل تم جائے وقوعہ پر میرے شانہ بشانہ تھے نا؟"

"جی ملک صاحب!" اس نے جواب دیا تاہم اس کی حیرانی میں کوئی کمی نہ آئی۔

"مقتولہ عائشہ کی لاش کہاں سے برآمد ہوئی تھی؟"

"اللہ دتا مچھیرے کے جال میں سے۔" اس نے جواب دیا۔ "جھوک ضامن کے نہر والے پل کے نیچے سے۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔" میں نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یعنی یہ تو طے ہے نا کہ عائشہ کی لاش نہر کے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے اللہ دتا کے جال تک پہنچی تھی؟"

"ظاہر ہے جی...... اس میں شک والی کون سی گنجائش ہے۔"

"یہ راز کھل جانے کے بعد کہ مقتولہ خوبصورت عورت عائشہ کا تعلق احمد نگر سے ہے، اس امر میں بھی کسی شبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سفاک قاتل نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد احمد نگر یا اس کے قرب وجوار ہی سے اس کی لاش کو نہر میں پھینکا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ہیں نا......؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "بالکل جناب! یہ بھی سامنے کی بات ہے۔"

"مقتولہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور زخمی کلائیوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ عائشہ نے موت کے منہ میں جانے سے پہلے اپنی زندگی کے لیے حتی المقدور مزاحمت بھی کی تھی۔" میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب...... میں آپ کی تھیوری سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔"

"اب میں تمہارے آخری سوال کا جواب بھی دیتا ہوں کہ میں نے یہاں گھوڑا کیوں روکا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم نے جان لیا کہ میں نے [illegible] کو نظر انداز کر کے اس دھول اڑاتے کچے راستے کا انتخاب اس لیے کیا کہ نہر کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے میں اس ماحول پر نظر رکھ سکوں جس میں "تیرتے" ہوئے عائشہ کی لاش احمد نگر سے جھوک ضامن تک پہنچی تھی تا کہ کوئی اہم سراغ یا مخصوص اشارہ میرے علم میں......!"

"مگر جناب......" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ "میرا یہاں پر رکنے والا سوال تو بیچ میں ہی رہ گیا؟"

"میں اسی طرف آ رہا تھا سیٹھی!" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن تم نے میری بات کاٹ دی خیر......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اس وقت احمد نگر گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ وہ دیکھو۔" میں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "وہ چند گز آگے نہر کے کنارے تمہیں جو ڈیرا نظر آ رہا ہے نا یہ رانا بہادر علی کا ہے۔"

"جی ہاں۔ میں رانا بہادر علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ احمد نگر کے چودھری صاحب ہیں اور چھ ماہ بعد ہونے والے الیکشن میں حصہ بھی لے رہے ہیں۔ ان کی ٹکر پر جمال کوٹ کے ملک کریم بخش کھڑے ہوئے ہیں۔ عثمان آباد کے چودھری سلیم راجپوت کی مکمل سپورٹ رانا بہادر علی کو حاصل ہے جبکہ ڈھوک ضامن کے چودھری فرمان علی کی حمایت ملک کریم بخش کے ساتھ ہے۔"

"سیٹھی لگتا ہے تمہیں سیاست سے کچھ زیادہ دلچسپی ہے!" میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

"آپ کچھ بھی کہہ لیں جناب۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔ "جب بھی الیکشن قریب آتے ہیں۔ جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں اور نعرے بازی ہوتی ہے تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔"

"الیکشن میں ابھی چھ ماہ باقی ہیں۔" میں نے واپس اپنے موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "رانا بہادر علی اور ملک کریم بخش کے درمیان کس کانٹے کا مقابلہ ہوگا یہ بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال، ہمیں عائشہ کے قتل کا سراغ لگانا ہے۔ گھوڑے روکنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم گھوڑوں سے نیچے اتر کر پیدل چلتے ہوئے رانا صاحب کے ڈیرے کی سمت بڑھیں گے اور نہر کے کنارے کو اندر اور باہر دونوں جانب سے تنقیدی نگاہ سے دیکھتے بھی جائیں گے...... کیا سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گیا ملک صاحب!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے سست روی سے آگے بڑھنے لگے۔ پندرہ بیس گز آگے آنے کے بعد سیٹھی کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

''ملک صاحب! وہ کیا ہے......؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے نہر کے اندرونی کنارے کی جانب اشارہ بھی کر دیا جہاں پستہ قامت ہلکی پھلکی جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ میں نے سیٹھی کے اشارے کی تقلید کی اور اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔

مذکورہ جھاڑیوں میں سرخ رنگ کی کوئی شے پھنسی دکھائی دی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ کوئی گرم چادر تھی۔ اس کے ساتھ ہی مقتولہ عائشہ کا لباس میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ سرخ پھول دار فلالین کی قمیص، سرخ کاٹن کی شلوار اور چادر یعنی دوپٹا ندارد۔ میرے ذہن میں ایک فوری سوال ابھرا۔

''کہیں یہ عائشہ ہی کی چادر تو نہیں......؟''

یہ بڑا سنسنی خیز اور ولولہ انگیز سوال تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اور سیٹھی گھوڑں کو نہر کے بیرونی کنارے پر ایستادہ ایک درخت کے تنے سے باندھ کر نہر میں اتر چکے تھے۔ نہر کا اندرونی کنارہ بالکل خشک تھا کیونکہ پانی کے بہاؤ نے نہر کے دست وبازو کو چھوڑ کر ان دنوں محض نہر کے پیٹ (درمیانی حصے) پر اکتفا کر رکھا تھا۔ جلد ہی ہم خودرو نرم شاخوں والی ان جھاڑیوں کے پاس پہنچ گئے جو ہماری نگاہوں کا ٹارگٹ تھیں۔

سرخ رنگ کا وہ کپڑا ایک زنانہ گرم شال تھی۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ شال عائشہ کی ہو گی پھر یہ اغلب امکان اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب تھوڑا آگے ایک بند زنانہ چپل بھی مل گئی۔ میں نے عائشہ کی لاش کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ اور پاؤں کو بھی غور سے دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چپل اسی کی ہو گی۔

''ملک صاحب......!'' سیٹھی نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ ''مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ عائشہ کو اسی جگہ گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور پھر اس کی لاش کو نہر میں پھینک دیا گیا......''

''ہوں......'' میں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے اس لیے میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

''اور کیا ملک صاحب؟'' سیٹھی نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''رانا بہادر علی کا ڈیرا یہاں سے چند گز کے فاصلے پر ہے۔'' میں نے ڈیرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا ڈیرے پر رہنے والے رانا صاحب کے ملازموں کو اس خونیں واردات کے بارے میں کچھ نہ کچھ علم تو ہونا ہی چاہیے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں ڈیرے پر جا کر پوچھ گچھ کرنا چاہیے۔''

''میں تمہاری تجویز پر ضرور عمل کروں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن پہلے ہم یعقوب ترکھان کی طرف جائیں گے۔ اس کی خیر خبر لینا بھی ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے، اس کے پاس مقتولہ عائشہ کے حوالے سے کوئی نئی اطلاع ہو۔''

''جیسی آپ کی مرضی جناب!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔

ہم نے واپسی کی راہ لی اور نہر سے نکل کر اپنے گھوڑوں کے پاس پہنچ گئے۔ جھاڑیوں کے اندر سے ملنے والی گرم سرخ شال اور چپل کو ایک تھیلے میں ڈال کر وسیم سیٹھی نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ہم نے گھوڑوں کو کھولا اور ان پر سوار ہو کر کھیتوں کے کنارے کنارے چلتے ہوئے احمد نگر گاؤں کے اندر داخل ہو گئے۔ یعقوب ترکھان کا گھر ڈھونڈنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

عائشہ کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کی خبر پورے احمد نگر میں پھیل چکی تھی اور اس کا گھر تعزیت کے لیے آنے والے افراد سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک درخت کے نیچے ہی میں نے چارپائیاں ڈلوا کر بیٹھک کا سماں پیدا کر دیا۔ گھر کے اندر بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یعقوب کو میں نے اپنے سامنے بٹھا لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کچھ پتا چلا کہ عائشہ کب اور کس مقصد سے گھر سے نکلی تھی؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرا یہی خیال ہے کہ وہ معمول کے مطابق، رفع حاجت کے لیے صبح گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف گئی ہو گی اور اسی دوران میں کسی وقت اسے یہ سنگین حادثہ پیش آ گیا۔''

''ہوں......'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یعقوب! احمد نگر گاؤں اور اس کی شمال کی جانب بہنے والی نہر کے بیچ سرسبز کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا تم لوگ رفع

حسین اور پُراثر تحریروں کا مجموعہ اکتوبر 2015ء کا دل پذیر پاکیزہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

نگہت سیما، قیصرہ حیات کے ناولوں کی نئی اقساط کے ہمراہ

پڑھیے **دُرِّ ثمن بلال** کے دلچسپ ناول کی دوسری بھرپور قسط

زندگی خاک نہ تھی...... شیریں حیدر کی جاندار تحریر منی ناول کی صورت

متاعِ دل...... نبیلہ ابر راجا کا خوب صورت ناولٹ اختتام کی طرف گامزن

دلہن میں لے کے جاؤں گا...... اقبال بانو کی کھلکھلاتی تحریر

قارئین کے پُرزور اصرار پر...... **ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی**

کے قلم سے ایک پُرعقیدت سلسلہ **یادوں کی مالا......**

حقیقت...... سحر ساجد کے قلم کا شاہکار مکمل ناول

گلوکارہ **سارہ رضا خان** سے گنگناتی ملاقات

دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی پُرلطف کاوشیں جن میں **شمیم فضل خالق، ام ایمان قاضی، رفاقت جاوید، صدف آصف، عنیقہ محمد بیگ** و دیگر شامل ہیں

ساتھ ساتھ مثبت معلومات و تفریحی عناصر سے پُر مزیدار مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

حاجت کے لیے انہی کھیتوں کی طرف جاتے ہو؟''

''جی ہاں...... بالکل!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ عائشہ کھیتوں سے آگے نہر کی طرف بھی چلی جاتی ہو؟''

''اس کی ضرورت تو نہیں لیکن آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں......؟'' وہ کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''مجھے کھیتوں کے اس طرف، نہر کے اندر سے کچھ ایسے آثار ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہاری بیوی وقوعہ کی رات نہر کے اندرونی کنارے پر پہنچی تھی۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ادھر ہی اس کے ساتھ کوئی خطرناک جان لیوا واقعہ پیش آیا تھا......؟''

''آپ کو ادھر سے کس قسم کے آثار ملے ہیں؟'' وہ پریشان ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وسیم سیٹھی کو اشارہ کیا۔ وہ ہوشیار بندہ میرے اشارے کی تہ تک پہنچ گیا اور اپنے ساتھ لائے ہوئے تھیلے کو یعقوب ترکھان کے سامنے کھول دیا۔

تھیلے کے اندر سے برآمد ہونے والی گرم شال اور چپل پر نظر پڑتے ہی یعقوب ترکھان اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ...... یہ...... آپ کو کہاں سے ملیں...... یہ چادر اور چپل تو عائشہ کی ہے۔''

''یہ دونوں چیزیں مجھے نہر کے اسی اندرونی حصے سے ملی ہیں جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تم سے ذکر کیا ہے۔'' میں نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ''اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تمہاری بیوی مقتولہ عائشہ وقوعہ کی رات نہر کے مذکورہ حصے میں پہنچی تھی۔ وہ وہاں اپنی مرضی سے گئی تھی یا کسی نے اسے وہاں پہنچایا تھا، اس کا فیصلہ کرنا بعد کی بات ہے اور یہ فیصلہ بھی بعد میں کیا جاسکتا ہے کہ وہ رات کے کسی حصے میں وہاں گئی تھی یا علی الصباح یا پوری طرح اجالا ہو جانے کے بعد۔ میرے سامنے فوری، ضروری اور اہم سوال یہ ہے کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے اپنی سانس کو ہموار کیا پھر کہا۔

''......سوال یہ ہے یعقوب کہ عائشہ وہاں کیوں گئی تھی اور اس سوال کا جواب مجھے تم دو گے......!''

''میں...... میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم ایسے بتا سکتے ہو کہ تم اس کے شوہر ہو...... بلکہ شوہر تھے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

''لیکن...... وہ مجھے بتا کر...... تو نہیں گئی تھی......!'' وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے تو صبح اٹھ کر جب دیکھا تو وہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔''

''یعقوب! میری نظر میں عائشہ کے، نہر کے اس حصے میں پہنچنے کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔'' میں نے مستحکم انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک...... اسے زبردستی اغوا کر کے وہاں پہنچایا گیا ہو اور پھر قتل کر کے اس کی لاش کو سپرد نہر کر دیا گیا ہو۔ نمبر دو...... وہ خود اپنی مرضی سے وہاں پہنچی ہو اور پھر اپنی توقع کے خلاف حادثے کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلی گئی ہو......؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں......!''

''میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں یعقوب جو کہ حقیقت ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اس حقیقت کو تسلیم نہ کرو تو تمہاری مرضی ہے۔ ویسے مجھے تسلیم کرانے کے ایک سو ایک گر آتے ہیں......!''

''تھانے دار صاحب! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''آپ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے اور الجھا رہے ہیں۔''

''میں تمہاری پریشانی دور کرنے کے لیے ہی یہ سب کر رہا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کیا تم نہیں چاہتے کہ عائشہ کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں ہو؟''

''جی کیوں نہیں۔ میری تو پہلی خواہش ہی یہ ہے......''

''تو پھر مجھ سے تعاون کرو یعقوب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے سچ بول کر ہی تم اپنی یہ خواہش پوری کر سکتے ہو۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، بس مجھے دیکھتا چلا گیا۔

''میں نے جن دو اسباب کا ذکر کیا ہے، اب ان کی طرف آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر عائشہ کو زبردستی اغوا کر کے نہر کے اندرونی حصے تک پہنچایا گیا ہوتا تو اس کے واضح آثار بھی ملتے۔ وہ اپنے اغوا کے خلاف یہاں تمہارے گھر میں مزاحمت کرتی، ادھر نہر کے کنارے جا کر نہیں۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اسے گھر سے زبردستی اغوا کر کے نہر تک نہیں پہنچایا گیا تھا......'' میں ذرا دیر کے لیے تھما پھر اسی انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر سے نکل کر وہاں پہنچی تھی اور یہ تم بتاؤ گے کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی، کس

سے ملنے گئی تھی......؟''

''جناب! میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھ پر شک نہ کریں۔ میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔''

''تم قصوروار ہو یا بے قصور اس بات کا فیصلہ ایک آدھ دن میں ہو جائے گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں فی الحال تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور تم نے دانستہ مجھ سے کوئی بات چھپائی تھی تو پھر میں تمہارے ساتھ کوئی رورعایت نہیں کروں گا۔''

''جو آپ کی مرضی جناب!'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

میں یعقوب ترکھان کے پاس سے اٹھ گیا اور وہاں موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ ان سب کو عائشہ کی دردناک موت کا بہت افسوس تھا اور وہ یعقوب ترکھان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ ابتدائی پوچھ تاچھ سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ابھی تک میرے ہاتھ میں کوئی ایسا سراغ نہیں لگ سکا تھا جس کی مدد سے میں عائشہ کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ابھی میرا ذہن یعقوب ترکھان کی طرف سے بھی صاف نہیں ہوا تھا۔ جب میں نے تھانے میں اس سے ملاقات کی تھی تو وہ مجھے مظلوم نظر آیا تھا لیکن اس کے بعد جو شواہد سامنے آئے تھے، خاص طور پر تھوڑی دیر پہلے نہر کے اندرونی حصے سے مجھے عائشہ کی گرم شال اور چپل جو ملی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر سے تو اپنی مرضی ہی سے نکلی تھی۔ اگر وہ رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گئی تھی تو پھر نہر کی جانب جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر وہ باقاعدہ کسی سے ملنے وہاں پہنچی تھی تو پھر اس بات کا پتا لگانے کی ضرورت تھی کہ وہ کس سے ملنے گھر سے نکلی تھی۔ اگر میں اس شخص تک پہنچ جاتا تو پھر عائشہ کے قاتل تک رسائی آسان ہو جاتی۔ ان تازہ ترین حالات کی روشنی میں ذہن میں بار بار یہی نکتہ ابھرتا تھا......!

''عائشہ کا کسی مرد کے ساتھ چکر تھا۔ وہ اسی سے ملنے نہر کے اندرونی حصے میں پہنچی تھی اور سنگین حادثے کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی تھی!''

اس نکتے کے بعد سوال اٹھتا تھا کہ کیا اسی شخص نے عائشہ کو قتل کیا تھا جس سے وہ ملنے گئی تھی یا اس کا قاتل کوئی اور شخص تھا اور عین ممکن تھا، عائشہ کے چکر کا یعقوب کو پتا چل گیا ہو۔ وہ جانتا ہو کہ عائشہ کے کسی مرد کے ساتھ تعلقات ہیں اور موقع پا کر اسی نے عائشہ کو ختم کر دیا ہو......!

ایسا ہونا ناممکن تو نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یعقوب، عائشہ کا قاتل ہو سکتا ہے۔ بہرحال، اگر مجھے عائشہ کے قاتل کا کوئی سراغ نہ ملتا تو میں یقیناً یعقوب پر بھی سختی کر کے حقیقتِ حال تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتا۔ تفتیش کے تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان کی کوشش اور محنت کبھی رائگاں نہیں جاتیں۔ اگر کوئی شخص خلوصِ نیت سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ مجھے بھی اپنی کوششوں پر پورا بھروسا تھا کہ میں عائشہ کے قاتل کو بہت جلد بے نقاب کر کے رہوں گا۔

''اب آپ کا کیا پروگرام ہے ملک صاحب؟'' کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا۔

''فی الحال واپسی کا پروگرام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن احمد نگر چھوڑنے سے پہلے میں ڈیرے کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......تو پھر ڈیرے پر چلتے ہیں۔'' وسیم سیٹھی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم رانا بہادر علی کے ڈیرے پر تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مذکورہ ڈیرا احمد نگر گاؤں کے شمال میں نہر کے کنارے واقع تھا۔ اس قسم کے ڈیرے ہر بڑے زمین دار اور چودھری کے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اگر میں نے اسے رانا بہادر علی کا ڈیرا کہا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رانا صاحب خود اس ڈیرے میں رہا کرتے تھے۔ ایسے ڈیروں میں عموماً ملازم ہی رہا کرتے ہیں جو کھیتی باڑی اور دیگر زرعی معاملات کی نگرانی پر مامور ہوتے ہیں۔ زراعت سے متعلق مختلف آلات، مال مویشی اور ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ بھی انہی ڈیروں میں نظر آتے ہیں۔

جب ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر رانا بہادر علی کے ڈیرے پر پہنچے تو وہاں صرف ایک شخص موجود تھا۔ ہم چونکہ پولیس کی وردی میں ملبوس تھے اس لیے مذکورہ شخص ہمیں دیکھتے ہی باادب، باملاحظہ ہوشیار ہو گیا۔ اس نے ہمیں سلام

کیا اور جب ہم گھوڑوں سے نیچے اترے تو اس نے چھوٹتے ہی سوال کر ڈالا۔

''تھانے دار صاحب! کیا عائشہ کے قتل کا مسئلہ حل ہوگیا؟''

''مسئلہ......؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''جی...... میرا مطلب ہے......'' وہ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے، کیا آپ نے یعقوب ترکھان کی بیوی کے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے؟''

''تو تمہیں اس بات کی خبر ہے کہ میں احمد نگر میں عائشہ کے قتل کی تفتیش کرنے آیا ہوں؟'' میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''نام کیا ہے تمہارا......؟''

''جی...... میں طفیل ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ دونوں کو نہر کے اندر بھی دیکھا تھا۔ وہ اس طرف جناب......'' وہ اسی جانب اشارہ کررہا تھا جدھر سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں عائشہ کی شال اور چپل ملی تھی۔ ''میں تھوڑی دیر پہلے گاؤں کی طرف بھی گیا تھا اور مجھے پتا چلا کہ پولیس تفتیش کرنے یعقوب ترکھان کے گھر آئی ہوئی ہے اور اب آپ یہاں آئے ہیں اس لیے میں نے آپ سے عائشہ کے قاتل کے بارے میں پوچھا تھا۔''

اس کا جواب منطقی طور پر درست تھا لیکن میں اتنی جلدی مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے اتنی دور نہر کے اندر ہمیں دیکھا اور اب اپنے سامنے دیکھ کر فوراً پہچان بھی لیا۔ کیا یہاں ڈیرے پر کھڑے ہوکر ادھر نہر کے اندرونی حصے میں تمہیں ہماری شکلیں بھی صاف نظر آرہی تھیں؟''

''نہیں جناب......'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''اتنی دور سے شکل تو صاف نظر نہیں آسکتی۔ میں نے آپ لوگوں کی وردیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر کانسٹیبل کے ہمراہ ڈیرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔

''تمہارے ساتھ یہیں ڈیرے پر اور کون کون ہوتا ہے؟''

''جی۔ میں اور شونکا۔'' اس نے بتایا۔ ''بس جی۔ ہم دونوں ہی ادھر ہوتے ہیں اور رانا صاحب کی زمینوں کے کام کی نگرانی کرتے ہیں۔''

''شونکا کہاں ہے؟'' میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ یہاں ڈیرے پر تو مجھے کہیں نظر نہیں آرہا۔''

''وہ جی...... رانا صاحب کے ساتھ جھنگ گیا ہے۔'' طفیل نے بتایا۔

''جھنگ...... رانا صاحب کیا احمد نگر میں موجود نہیں ہیں؟''

''نہیں جی۔ وہ دو دن پہلے شونکا (شوکت) کے ساتھ جھنگ گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''چودھری صاحب کو وہاں کوئی ضروری کام تھا۔''

''دو دن پہلے......!'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''تمہارا مطلب ہے، وہ جمعے کے دن یہاں سے گئے ہیں؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ لوگ ہفتے کو دوپہر کے بعد احمد نگر سے نکلے ہیں۔''

میں نے اپنے ذہن میں حساب لگایا۔ آج پیر کا دن تھا۔ ہفتے کی صبح جھوک ضامن کے بشیرے اللہ دتا نے کسی خوبصورت عورت کی لاش کی اطلاع دی تھی اور اسی روز دوپہر تک اس واقعے کی خبر احمد نگر تک پہنچ گئی تھی۔ تو کہیں رانا بہادر علی عائشہ کی عبرت ناک موت کی خبر سننے کے بعد تو جھنگ کی طرف روانہ نہیں ہوگیا تھا؟

یہ ایک سنسنی خیز سوال تھا اور اسی سوال نے مجھے طفیل سے پوچھنے پر مجبور کردیا۔ ''اچھا اچھا...... تو رانا صاحب اس دن جھنگ گئے ہیں جس روز عائشہ کی لاش نہر میں سے ملی تھی؟''

''جی ہاں...... جی ہاں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا رانا صاحب کا پہلے سے جھنگ جانے کا پروگرام بنا ہوا تھا یا وہ اچانک ہی روانہ ہوگئے تھے؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''دوپہر کے بعد شونکا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رانا صاحب کے ساتھ جھنگ جارہا ہے لہٰذا ڈیرے کا کام مجھے اکیلے ہی سنبھالنا ہوگا۔ بس جی، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ رانا صاحب واپس آجائیں تو آپ ان سے پوچھ لینا......''

''ان سے میں ضرور پوچھوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''رانا صاحب کب واپس آئیں گے؟''

''شاید وہ آج شام تک واپس آجائیں۔'' اس نے جواب دیا ''یا پھر کل کسی بھی وقت......''

اسی گفتگو کے دوران میں، میں نے گھوم پھر کر اچھی

طرح ڈیرے کا بھی جائزہ لے لیا تھا اور مجھے وہاں کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہ عام ڈیروں کی طرح ایک روایتی ڈیرا تھا۔ میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے طفیل سے چند اہم سوالات بھی کیے۔

''طفیل! تم کتنے عرصے سے احمد نگر میں رہ رہے ہو؟''

''جناب! ساری زندگی ادھر ہی گزری ہے۔''

''پھر تو تم یعقوب ترکھان کو اچھی طرح جانتے ہوگے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''یہ کیسا بندہ ہے؟''

''بس جی۔ سیدھا سادہ ترکھان ہے وہ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور اس کی بیوی......؟''

''جی......!'' اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ ''میں...... آپ کی بات نہیں سمجھا تھانے دار صاحب۔''

''یعقوب تو تمہاری نظر میں ایک سیدھا سادہ ترکھان ہے۔'' میں نے طفیل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم عائشہ کو بھی سیدھی سادی عورت سمجھتے تھے؟''

''دلوں کے حال تو سوہنا رب ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میرا ابھی اس عورت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔''

''میں نے تو عائشہ کے بارے میں ایک بہت ہی خطرناک بات سنی ہے!'' میں آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ''کیا تمہیں بھی کچھ پتا ہے؟''

''کون سی خطرناک بات جناب......؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''مجھے تو کچھ پتا نہیں۔''

یہ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا حالانکہ مقتولہ عائشہ کے حوالے سے میرے پاس ایسی کوئی سنسنی خیز خبر نہیں تھی۔ اگر میرا یہ تیر نشانے پر لگ جاتا تو طفیل سے بہت ساری کام کی باتیں اگلوائی جاسکتی تھیں۔

''حیرت ہے، گاؤں میں تو بہت سارے لوگوں کو اس بات کا پتا ہے اور تم ہی بے خبر بیٹھے ہو......'' میں نے اندھیرے میں تیر اندازی کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا شوکا نے بھی کبھی تمہیں عائشہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''نن...... نہیں جی...... آپ بتائیں......'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''تم یہ بات جانتے ہو نا، عائشہ ایک دل کش اور حسین عورت تھی؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی......'' اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ ''یہ بات تو پورے پنڈ کو پتا تھی۔''

''اور عائشہ کے مقابلے میں یعقوب ترکھان کچھ بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گنجا اور بے ڈھنگا...... ہیں نا؟''

''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ابھی تک آپ نے عائشہ کی وہ خطرناک بات نہیں......''

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ''عائشہ جیسی حسین وجمیل عورت پر ایک سے بڑھ کر ایک مرد عاشق ہوسکتا تھا اور...... ایسا ہی ہوا بھی تھا......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر طفیل سے استفسار کیا۔

''تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ عائشہ کا کسی کے ساتھ چکر چل رہا تھا نا؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ طفیل، عائشہ کے کسی ایسے چکر سے ضرور واقف تھا۔ میرے لیے بس اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔ میں نے تیز نظر سے اسے گھورا تو وہ گھگیانے والے انداز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب تک انسان اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے، منہ سے کوئی بات نہیں نکالنا چاہیے۔''

طفیل کے اس مصلحت بھرے جواب نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ اس کا کنی کاٹنا اس امر پر دلالت کرتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور وہ اس کالا سے بخوبی واقف ہے یعنی وہ عائشہ کے کسی مرد کے ساتھ چکر سے آگاہ ہے مگر مجھے بتانا نہیں چاہتا۔ اس یقین کے بعد میں نے ذرا مختلف انداز میں اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ میرا انداز اور لب ولہجہ دوستانہ تھا۔

''ٹھیک ہے طفیل...... اگر تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم پر زیادہ زور نہیں دوں گا لیکن اگر یہی بات مجھے تمہارے جوڑی دار شوکا کی زبانی پتا چلی تو پھر میں تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا......''

''شوکا آپ کو بھی نہیں بتائے گا کہ......!'' بے ساختہ اس کی زبان سے پھسل گیا تاہم فوراً ہی اس نے زبان کو بریک بھی لگا دیے۔

طفیل کی حالت دیدنی تھی۔ میں اسے کھا جانے والی

نظر سے گھور رہا تھا اور وہ مجھ سے نگاہ ملانے سے کترا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے خیالی میں کوئی نہایت ہی اہم راز منکشف کرنے جا رہا تھا لیکن اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس نے زبان روک لی تھی۔

''شونکا مجھے کیا نہیں بتائے گا؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ''وہی نا...... جو تم بھی جانتے ہو...... اور اس معاملے کا تعلق یعقوب ترکھان کی کمسین و جمیل بیوی سے ہے......؟''

''نن...... نہیں...... میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔ ''مجھے معاف کر دیں...... میں نے کچھ نہیں کیا......''

''جب تم نے کچھ نہیں کیا تو تمہارا دم کیوں نکل رہا ہے؟'' میں نے اسے دبکا مارا۔ ''اور میں نے تمہارے کچھ کرنے یا نہ کرنے کی بات ہی کب کی ہے؟ میں نے تو تم سے صرف یہ پوچھا ہے کہ...... تمہارا اپنی بھائی اور جوڑی دار شونکا مجھے کیا نہیں بتائے گا؟''

''وہ جی بس...... ایسے ہی میری زبان سے نکل گیا تھا۔'' وہ اپنی بگڑی کو بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں جو شونکا یا میں آپ کو بتائیں......''

اس کا بے ساختہ پن میں کچھ کہہ جانا اور پھر غلطی کا احساس ہوتے ہی اس بیان کی لیپا پوتی کرنا اس امر کا بین ثبوت تھا کہ وہ مقتولہ عائشہ کے کسی خفیہ معاملے سے پوری طرح آگاہ تھا بلکہ اس کا ساتھی شوکت عرف شونکا بھی اس راز سے بہ خوبی واقف تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ عین ممکن ہے، شونکا ہی سے عائشہ کا ربط ضبط ہو اور اسی نے عائشہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد نہر میں پھینک دیا ہو تا کہ اس کی لاش بہتے ہوئے کہیں سے کہیں نکل جائے۔

میں نے اپنے ذہن میں ترتیب پانے والے خیالات کو طفیل یا سیٹھی پر عیاں نہیں کیا اور طفیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے طفیل! یہ بات ایسے ہی تمہاری زبان سے نکل گئی ہے نا...... کوئی بات نہیں۔ تم میرے ساتھ تھانے چلو گے۔ زبان کی اس بیماری کا بڑا شافی علاج ہے میرے پاس...... آئندہ کبھی یہ ایسی غلطی نہیں کرے گی۔''

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''آپ...... مجھے......'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تھانے کیوں لے کر جا رہے ہیں...... میں نے کیا کیا ہے؟''

کانسٹیبل وسیم سیٹھی نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سنا نہیں۔ ملک صاحب نے کیا کہا ہے۔ تھانے میں تمہاری زبان کا علاج کریں گے

ہم۔ چلو آگے لگو......''

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اور گڑگڑا کر التجائیں کرنے لگا کہ ہم اسے اپنے ساتھ تھانے نہ لے کر جائیں۔ اس موقع پر میں نے ایک پتّا کھیلا اور وسیم سیٹھی سے کہا۔

''سیٹھی! اگر یہ بندہ ادھر ڈیرے پر ہی ہمیں سب کچھ صاف صاف بتا دے تو میرا خیال ہے، اسے تھانے لے جانے کی ضرورت نہیں......!''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' سیٹھی نے معنی خیز انداز میں کہا پھر طفیل کی طرف دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ ''چل بھئی، شروع ہو جاؤ۔ ملک صاحب کو جلدی سے بتاؤ کہ عائشہ کا کس بندے کے ساتھ چکر تھا...... شاباش...... جلدی!''

طفیل آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے سینے میں کوئی بہت ہی اہم اور خطرناک راز پوشیدہ ہے اور وہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ میں نے ڈیرے پر وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا اور طفیل کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ واپسی کے لیے میں نے پختہ سڑک والے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ جب ہم مذکورہ سڑک کی طرف آتے ہوئے احمد نگر گاؤں کے اندر سے گزر رہے تھے تو وہاں کے باسیوں کی نگاہیں ہم ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ ان سب کے ذہن میں یقیناً یہی سوال ہو گا کہ میں نے طفیل کو کیوں گرفتار کیا ہے...... کیا وہ عائشہ کا قاتل ہے؟

☆☆☆

اس رات میں اپنے بستر پر لیٹا کافی دیر تک جاگتا رہا۔ تھانے واپسی میں ہمیں شام ہو گئی تھی اور تھکن سے میرا برا حال تھا۔ آج کا پورا دن افراتفری اور بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ طفیل کو میں نے تھانے پہنچ کر حوالدار رستم خان کے حوالے کر دیا تھا اور ساتھ ہی رستم خان کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ طفیل کی زبان کھلوانے کے لیے ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا ہے۔ اگر ڈرانے اور ہلکان کرنے سے کام چل جائے تو پھر زور زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ طفیل کا مقتولہ عائشہ یا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا البتہ وہ اس واردات کے حوالے سے بہت کچھ جانتا تھا، خاص طور پر یہ بات اس کے علم میں تھی کہ عائشہ کا کس مرد کے ساتھ چکر رہا تھا۔

طفیل نے جس طرح بے دھیانی میں کہا تھا کہ شونکا مجھے کچھ نہیں بتائے گا اس سے خیال لامحالہ شونکا کی طرف جاتا تھا۔ وہ ڈیرا جائے وقوعہ نمبر ایک سے چند گز کے فاصلے

پر واقع تھا۔ جائے وقوعہ نمبر ایک ان معنوں میں کہ شواہد کے مطابق، عائشہ کو نہر کے اسی اندرونی حصے میں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا تھا۔ اس کی گرم شال اور چپل بھی ہمیں اسی مقام سے ملی تھی جبکہ وقوعہ نمبر دو میری نظر میں جھوک ضامن والا نہر کا پل تھا جہاں مچھیرے اللہ دتا کے جال میں عائشہ کی لاش دریافت ہوئی تھی۔

ڈیرے اور جائے وقوعہ نمبر ایک کے درمیان چند گز کا فاصلہ یہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا کہ عائشہ کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا تھا اس کا تعلق اس ڈیرے سے ضرور ہوگا یا کم از کم وہاں رہنے والے اس اندوہناک واقعے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔

حالات وواقعات کے مطابق، اس ڈیرے پر رانا بہادر علی کے دو قابلِ اعتماد ملازم رہتے تھے جو رانا صاحب کی زرعی زمینوں کے تمام معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ ان میں سے ایک تو رانا صاحب کے ساتھ جھنگ گیا ہوا تھا اور دوسرا اس وقت میرے تھانے کے لاک اپ میں بند تھا۔ اس بات کا میں پتا چلا چکا تھا کہ وقوعہ کی رات طفیل اور شوکا دونوں ڈیرے پر موجود تھے اور اس کے اگلے روز شوکا، رانا صاحب کے ہمراہ جھنگ چلا گیا تھا۔

اس کیس کے تانے بانے سے کھیلتے ہوئے پتا نہیں، کس وقت میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پھر اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔

اگلی صبح نسبتاً صاف اور چمکدار تھی۔ آج دھند کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔ فضا کی خنکی میں بھی حد درجہ کمی واقع ہوچکی تھی۔ میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو حوالدار میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا تو وہ بھی وہیں چلا آیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر آنے والے دبے دبے جوش کے پیشِ نظر کہا۔

”رستم خان! بڑے خوش نظر آرہے ہو۔ کوئی خاص خبر؟“

”بڑی خاص الخاص خبر ہے ملک صاحب! وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”سنیں گے تو آپ کی طبیعت خوش ہوجائے گی۔“

”تو پھر دیر کس بات کی ہے بھئی!“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”جلدی سناؤ، ایسی سنسنی خیز خبر کون سی ہے؟“

”آپ نے رات ایک بندہ میرے حوالے کیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے ایک تھپڑ مارے بغیر، ذرا دھمکا کر ہی اس کی زبان کا بند دروازہ کھول

ڈالا ہے۔"

"تو اس نے شونکا کا نام ظاہر کر ہی دیا!" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"شونکا......؟" حوالدار اُلجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"ہاں شونکا!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "طفیل اور شونکا ایک ساتھ اس ڈیرے پر رہتے ہیں۔ طفیل نے عائشہ والے معاملے میں شونکا کا نام لیا ہوگا نا!"

"نہیں جناب......!" حوالدار رستم خان نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "عائشہ کا معاملہ شونکا کے ساتھ نہیں، بلکہ کسی اور شخص کے ساتھ تھا......"

"کوئی اور شخص......؟" میں چونک اٹھا۔

حوالدار معنی خیز انداز میں بولا۔ "شخص نہیں...... شخصیت ملک صاحب!"

"رستم خان! پہیلیاں نہیں بجھواؤ۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "طفیل نے تمہارے سامنے جو بھی راز اگلا ہے اس کی تفصیل مجھے بتاؤ۔ میں بھی جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ مقتولہ عائشہ کا معاملہ کس شخص کے ساتھ تھا اور...... اس کی موت کا ذمے دار کون ہے؟"

"ملک صاحب! طفیل کے انکشاف کے مطابق......" وہ ڈرامائی انداز اپناتے ہوئے بتانے لگا۔ "مقتولہ عائشہ اور رانا بہادر علی کے درمیان ایک خاص نوعیت کا تعلق پایا جاتا تھا۔"

"اوہ......!" میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا پھر حوالدار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا واقعی؟"

"آپ کو یقین نہیں آرہا نا......" وہ اپنے بیان کو انکشاف انگیز انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس سے بھی زیادہ حیران کن اور چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ ان "تعلقات" کا عائشہ کے گھر والے یعقوب ترکھان کو بھی پوری طرح علم تھا لیکن وہ بے بس، مجبور اور لاچار تھا۔ وہ اپنی بیوی کو رانا بہادر علی کے پاس جانے سے روک نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ رانا صاحب کی طاقت اور اختیار سے بہ خوبی واقف تھا۔ رانا بہادر علی موضع احمد نگر کا مطلق العنان چودھری ہے ملک صاحب۔"

"تو یہ ہے ساری کہانی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسی لیے میں جب بھی یعقوب ترکھان سے عائشہ کے کسی مرد سے تعلق کا ذکر کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا کرب اور بے بسی نمودار ہو جاتی تھی۔"

"ملک صاحب! مجبوری انسان کو بعض اوقات بے غیرت اور بے حیا بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔" رستم خان نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "یعقوب ترکھان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔"

حوالدار رستم خان کافی دیر تک مجھے عائشہ اور رانا بہادر علی کے خفیہ تعلقات کی تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا بڑی توجہ سے اس کی بات سنتا رہا۔

"ملک صاحب! طفیل کا کیا کرنا ہے؟" حوالدار نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے...... مطلب؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! میرا مطلب ہے، اسے حوالات میں بند رکھنا ہے یا چھوڑ دینا ہے۔" رستم خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"تم سر دست طفیل کو یہاں میرے پاس لے آؤ۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ "پھر دیکھتے ہیں، اس کے ساتھ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

عائشہ کی اندوہناک موت یعنی اس کے قتل کی کئی کڑیاں مجھے حاصل ہو گئی تھیں۔ تاہم ابھی تک اس سلسلے کی چند کڑیاں غائب تھیں اور انہی کڑیوں کو تلاش کرنے کے بعد اس زنجیر کو مکمل کیا جا سکتا تھا۔

اگلے ہی لمحے حوالدار، طفیل کو لے کر میرے پاس آگیا۔ میں نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے چوبی بینچ پر بیٹھ گیا پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ کے حوالدار نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ رانا صاحب کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے کہ میں نے عائشہ سے ان کے تعلقات کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا ہے۔ آپ کو پتا نہیں، رانا صاحب کتنے سخت آدمی ہیں۔ وہ غصے میں آکر میری کھال بھی کھنچوا سکتے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو طفیل! رانا صاحب کو تمہارے حوالے سے کچھ نہیں بتایا جائے گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے قانون کے ساتھ تعاون کیا ہے تو قانون تمہاری حفاظت بھی کرے گا۔"

"جی، بہت بہت شکریہ۔" اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھ لیا۔ "کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟"

"ہاں، اب تم واپس جا سکتے ہو لیکن جاتے جاتے

میرے ایک دو سوالات کے بالکل درست جواب بھی دیتے جاؤ۔‘‘ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

’’جی حکم تھانے دار صاحب۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے مجھے تکنے لگا۔

’’تم نے مجھے بتایا تھا کہ رانا بہادر علی اور شوکا ہفتے کو دوپہر کے بعد جھنگ گئے تھے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہفتہ یعنی پچیس فروری؟‘‘

’’جی جی...‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ’’بالکل!‘‘

’’ہفتہ، پچیس فروری کی صبح ہی جھوک ضامن والے نہر کے پل کے نیچے سے عائشہ کی لاش دریافت ہوئی تھی اور میرے اندازے کے مطابق، اس واقعے کی خبر دوپہر تک آس پاس کے گاؤں دیہات تک پھیل گئی تھی۔‘‘ میں نے بدستور طفیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ ’’کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ رانا صاحب کے یہاں سے نکلنے سے پہلے یہ اطلاع انہیں بھی مل چکی تھی؟‘‘

میرے اس سوال کا بالکل درست جواب بہت ضروری تھا... اگر رانا بہادر علی کے علم میں عائشہ کی عبرت ناک موت نہیں تھی تو معاملہ دیگر ہو جاتا تھا لیکن اگر اسے عائشہ والے واقعے کا پتا چل چکا تھا اور اس کے باوجود بھی وہ جھنگ روانہ ہو گیا تھا تو پھر اس کی ذات شکوک و شبہات کے دائرے میں بند ہوتی دکھائی دیتی تھی۔

’’میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔‘‘ طفیل نے بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہو سکتا ہے، انہیں عائشہ کی موت کی خبر ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے، وہ اس سلسلے میں مکمل طور پر بے خبر ہوں۔‘‘

’’ہوں...‘‘ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ’’تم نے وہاں ڈیرے پر یہی بتایا تھا نا کہ ہفتہ پچیس فروری کی دوپہر شوکت عرف شوکا تمہارے پاس آیا اور اس نے تم سے کہا کہ وہ رانا بہادر علی کے ساتھ جھنگ جا رہا ہے لہٰذا ڈیرے کا انتظام و انصرام تمہیں ہی سنبھالنا ہے؟‘‘

’’جی، میں نے یہی کہا تھا۔‘‘ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ’’اور یہی حقیقت بھی ہے۔‘‘

’’ذرا سوچ کر بتاؤ... جب شوکا ڈیرے سے رخصت ہو رہا تھا تو کیا اس وقت تک تمہیں عائشہ والے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی یا شوکا نے ایسا کوئی ذکر کیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں جناب۔‘‘ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اس بات کا بعد میں پتا چلا تھا اور شوکا نے بھی ایسا

محبت

☆ محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھتی ہے۔ اسی لیے محبت کے دیوتا کو اندھا بتایا گیا ہے۔

☆ محبت کے معاملے میں ہم سب یکساں طور پر بے وقوف ہیں۔

☆ محبت قربانی سکھاتی ہے، حساب نہیں۔

☆ محبت کرنے والوں کے باہمی جھگڑے محبت میں اضافہ کرتے ہیں۔

☆ محبت کمان کے مانند ہے جو زیادہ تاننے سے ٹوٹ جاتی ہے۔

☆ محبت خدا کا اعلیٰ ترین عطیہ ہے۔

☆ محبت کبھی مطالبہ نہیں کرتی، وہ تو ہمیشہ دیتی ہے۔

☆ محبت انسانیت کا دوسرا نام ہے۔

ایمبولینس

وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ ریستوران میں آکر بیٹھا اور محبوبہ سے پوچھا۔

’’کہو... کیا منگوایا جائے۔‘‘

محبوبہ جلدی سے بولی۔ ’’اب تمہیں اپنے لیے ایمبولینس منگوا لینی چاہیے۔ میرا خاوند یہاں بھی آگیا ہے۔‘‘

رنگین بیانی

ایڈیٹر نے ضخیم مسودے کے صفحات الٹتے ہوئے کہا۔

’’آپ نے بہت زیادہ رنگین بیانی سے کام لیا ہے۔‘‘

’’وہ کیسی رنگین بیانی...؟‘‘ رائٹر نے پوچھا۔

’’صرف پہلے ہی باب کو لیجیے۔ آپ نے لڑکی کے باپ کا چہرہ غصے سے سرخ کر دیا۔ رقیب انتہائے حسد سے سبز پڑ جاتا ہے۔ ہیرو خوف سے پیلا پڑ جاتا ہے۔ ہیروئن رقیب کو دیکھ کر لال ہو جاتی ہے اور جاسوس کے ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے نظر آتے ہیں۔‘‘

بہت خوب

ایک شخص کسی دکاندار سے ادھار سودا لیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ دکاندار کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ’’دس روپے کا کھلا دینا۔‘‘

دکاندار نے ایک ایک روپے کے دس نوٹ دے کر دس روپے کا نوٹ مانگا تو اس آدمی نے کہا۔

’’میرے حساب میں لکھ دو...‘‘

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

کوئی ذکر نہیں کیا۔‘‘
’’ٹھیک ہے، تم جاسکتے ہو۔‘‘ میں نے اسے فارغ کرتے ہوئے کہا۔’’اگر وہاں احمد نگر میں تم سے کوئی پوچھے کہ تھانے میں کیا باتیں ہوئیں تو تم یہی کہنا کہ بس معمول کی پوچھ تاچھ کی ہے۔ عائشہ اور رانا بہادر علی کے تعلقات والی بات کسی کو نہیں بتانا۔‘‘
’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔‘‘ وہ بڑے عزم سے بولا۔’’میں اس سلسلے میں اپنی زبان پر تالا ڈال لوں گا۔‘‘
طفیل کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ میں نے فوراً لفافہ کھول کر رپورٹ کا مطالعہ کیا۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، عائشہ کی موت جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کے منہ میں جانے سے قبل اس نے اپنی سلامتی اور بقا کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے اور اسی کوشش میں اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں جن کے کانچ کی وجہ سے اس کی کلائیاں بری طرح زخمی ہوگئی تھیں۔
اس رپورٹ کے ساتھ ہی عائشہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش بھی سرکاری اسپتال سے تھانے پہنچادی گئی تھی۔ میں نے ایک پولیس اہلکار کو احمد نگر روانہ کردیا تاکہ وہ مقتولہ عائشہ کے شوہر یعقوب ترکھان کو بلا لائے۔ عائشہ کی لاش یعقوب کے حوالے کرنا تھی۔
ہمارے زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور نہ ہی عدالت فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو کوئی اہمیت دیتی تھی لہٰذا جب عائشہ کی لاش دریافت ہوئی اور مذکورہ لاش کے معائنے سے مجھے پتا چلا کہ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو میں نے پھر بھی اس کی گردن کے کسی خصوصی معائنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ویسے بھی پانی میں بہہ کر یہاں تک پہنچنے کے دوران میں فنگر پرنٹس کی موجودگی کا قائم یا برقرار رہنا ممکن نہیں تھا۔
میرا دھیان بار بار آٹھ سالہ یوسف کی طرف بھی جاتا تھا۔ یوسف عائشہ اور یعقوب کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے والدین کا کردار جو بھی رہا ہو اور عائشہ کی موت کے اسباب کچھ بھی کیوں نہ ہوں، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ وہ معصوم، ماں جیسی عظیم نعمت سے محروم ہوگیا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد یعقوب ترکھان تھانے میں موجود تھا۔ اب دوپہر رفتہ رفتہ سہ پہر میں ڈھل رہی تھی۔ یعقوب کو یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ میں نے عائشہ کی لاش کی حوالگی کے سلسلے میں اسے تھانے بلایا ہے۔ وہ اندر باہر سے بری طرح ٹوٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔
وہ میرے سامنے آکر بیٹھا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ’’تھانے دار صاحب! عائشہ کے قاتل کا کچھ پتا چلا؟‘‘
’’ہاں...... کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ پتا چل چکا ہے مجھے۔‘‘ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
’’کک...... کیا؟‘‘ وہ لکنت زدہ انداز میں مستفسر ہوا۔
’’یہ کہ تمہاری بیوی کو جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔’’اس بدنصیب نے اپنی جان بچانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ظالم قاتل نے اس کی پیش نہیں چلنے دی۔ اسی مزاحمت کے دوران میں اس کی چوڑیاں ٹوٹتی رہیں اور کلائیاں زخمی ہوتی رہیں۔ نہر کے کنارے پر جہاں جھاڑیوں میں سے عائشہ کی چادر اور چپل ملی وہیں آس پاس ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی ملے تھے۔ اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ اسی مقام پر زور آور قاتل نے عائشہ کی زندگی کا چراغ گل کیا اور پھر اس کی لاش کو سپردِ نہر کردیا تھا۔‘‘
’’مم...... مگر...... یہ ساری باتیں تو آپ پہلے بھی مجھے بتا چکے ہیں۔‘‘ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اس میں نیا کیا ہے جناب......!‘‘
’’اس میں نیا یہ ہے کہ تمہاری بیوی کے رانا بہادر علی کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات تھے......‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے، سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
’’کک...... کیا......‘‘ یعقوب ترکھان کو اس طرح جھٹکا لگا جیسے اس نے بے دھیانی میں بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو، جھرجھراتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔’’یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟‘‘
’’میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، بڑے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔’’اور اس سلسلے میں، میں نے مکمل تصدیق کرلی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری بیوی اکثر رات کی تاریکی میں رانا بہادر علی سے ملنے اس کے ڈیرے پر جایا کرتی تھی۔ وقوعہ کی رات بھی وہ اسی مقصد کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور پھر اسے ایک حادثہ پیش آگیا......‘‘

میں بات ختم کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ یعقوب ترکھان کے چہرے پر مجھے زلزلے کے آثار دکھائی دیے، بے حد ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔ ''یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائی ہیں؟''

''یعقوب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''تم پیڑ نہیں گنو، صرف آم کھانے سے غرض رکھو اور یہ بتاؤ کہ آم میٹھے ہیں یا کھٹے......؟''

''جج...... جناب...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......''

وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

''اور تمہیں عائشہ اور رانا بہادر علی کے تعلقات کا علم تھا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم مجبور اور بے بس تھے۔ رانا بہادر علی کے سامنے تمہیں دم مارنے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا تم نے بے غیرتی کی زندگی کو اپنا نصیب سمجھ لیا تھا اور چپ چاپ یہ گھناؤنا تماشا دیکھ رہے تھے۔''

اس کی آنکھیں چھلک آئیں اور وہ ننھے بچوں کے مانند بلک بلک کر رونے لگا۔ ان لمحات میں مجھے اس لاچار شوہر پر بے پناہ ترس آیا۔ میں نے اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا غبار دھل جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! میں کیا کرتا...... میں کیا کر سکتا تھا......!''

اس کے الفاظ میں دنیا جہاں کا درد سمٹا ہوا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے وہی کیا...... جو تمہیں کرنا چاہیے تھا......!''

''جی......!'' وہ متعجب انداز میں مجھے تکنے لگا۔ ''میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا تھانے دار صاحب؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وقوعہ کی رات اچانک تمہاری غیرت جاگ اٹھی اور تم نے فیصلہ کر لیا کہ اس گندے کھیل کو مزید آگے نہیں بڑھنے دو گے۔'' میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس رات جیسے ہی عائشہ گھر سے نکلی، تم بھی خاموشی سے اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میں اپنے ذہن میں ترتیب پانے والی کہانی کی روشنی میں یعقوب ترکھان کو گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں قطعیت کا عنصر شامل تھا۔

''نہیں جناب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں......''

''اور پھر تم دبے قدموں عائشہ کا تعاقب کرتے ہوئے رانا بہادر علی کے ڈیرے کے قریب پہنچ گئے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''پھر تم نے اس کا کام تمام کر دیا۔''

میرا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ وہ لرز کر رہ گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ''کاش...... میں ایسا کر سکتا!''

''کیا مطلب......'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ ''کیا تم نے عائشہ کا گلا گھونٹنے کے بعد اسے موت کے منہ میں نہیں دھکیلا تھا؟''

''نہیں جناب......'' وہ شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں گھر سے نکلا تو اسی ارادے سے تھا لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی...... کوئی مجھ پر سبقت لے گیا تھا۔''

''کوئی کون؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''شونکا!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''تمہارا مطلب ہے، رانا بہادر علی کے ملازم شونکا نے تمہاری بیوی عائشہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی بالکل۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تھا۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ اس رات میں عائشہ کو ٹھکانے لگانے کی نیت سے ہی گھر سے نکلا تھا۔ میری برداشت جواب دے گئی تھی۔ میں بے غیرتی کی زندگی جیتے جیتے خود کو ایک زندہ لاش سمجھنے لگا تھا۔ میں نے ہمت کر کے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عائشہ کا کام تمام کر کے اس اذیت کا خاتمہ کر دوں گا لیکن یہ نیک کام میرے ہاتھوں سے نہ ہو سکا۔'' بات کے اختتام پر وہ ایک مرتبہ پھر سسک اٹھا۔

پھر میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وقوعہ کی رات وہ عائشہ کے پیچھے ہی گھر سے نکل گیا تھا اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر وہ عائشہ کا تعاقب کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں مجھے عائشہ کی سرخ گرم شال اور چپل پڑی ملی تھی اور وہیں اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جھاڑیوں کے عقب سے ایک شخص اچانک برآمد ہوا اور اس نے عائشہ کو زیر کرنے کی کوشش کی۔ عائشہ اپنے تحفظ میں ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شونکا، عائشہ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے کیوں ہے؟ اور جب تک وہ کچھ سمجھ پاتا، شونکا اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔

عائشہ کی موت کا ایک عینی شاہد مجھے مل گیا تھا لیکن یہ عینی شاہد یعنی یعقوب ترکھان یہ نہیں جانتا تھا کہ شونکا نے

عائشہ کو موت کے گھاٹ کیوں اتارا تھا۔ اس کے مطابق، جب اس نے عائشہ کو بے دم ہوتے دیکھا تو دبے قدموں واپس چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شونکا نے کب اور کیسے عائشہ کو سپردِ نہر کیا تھا۔

''تم نے یہ ساری باتیں مجھے پہلے کیوں نہیں بتائیں؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''رانا بہادر علی کے ڈر سے۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اور پھر اپنی بیوی کے کالے کرتوتوں کی کہانی کس منہ سے سناتا......''

آخری جملہ اس نے بڑے کرب ناک انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دیکھو یعقوب! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں تمہاری بیوی کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ شونکا کو ضرور کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لوں گا اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری گواہی کی ضرورت پیش آئے گی۔ تم اس اندوہناک واقعے کے چشم دید گواہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم قانون کے ساتھ بھرپور تعاون کرو گے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلا کر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد عائشہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اس کے حوالے کر دی۔

☆☆☆

اٹھائیس فروری کی شام عائشہ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اگلے روز یعنی انتیس فروری کی دوپہر کو رانا بہادر علی اپنے چمچۂ خاص شونکا کے ہم راہ جھنگ سے واپس آ گیا۔ انتیس فروری کے ذکر پر چونکنے کی ضرورت نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ لیپ کا سال تھا۔ گزشتہ روز یعقوب ترکھان کی زبانی جو سنسنی خیز اور عبرت انگیز انکشافات ہوئے تھے ان کے پیشِ نظر میں نے شونکا کی گرفتاری کا بڑا شافی بندوبست کر رکھا تھا لہٰذا جیسے ہی اس نے احمد نگر میں قدم رکھا، میرے سادہ لباس چاق و چوبند اہلکاروں نے اسے گرفتار کر کے تھانے کی حوالات میں پہنچا دیا۔ شونکا کی گرفتاری پر رانا بہادر علی نے بڑی اچھل کود مچائی تھی لیکن میں نے کوئی پروا کیے بغیر شونکا کو تفتیش کی چکی میں پیس ڈالا۔

شونکا کے خلاف میرے پاس اتنا ٹھوس ثبوت تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تفتیش کے سامنے مزاحمت...... نہ کر سکا اور اس نے عائشہ کے قتل کا اقبال کر لیا۔

شونکا نے پہلے تو اس قتل کا سارا ملبا اپنی ذات پر ہی ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو عورت رانا بہادر علی کی منظورِ نظر ہو، اسے شونکا نے اپنی مرضی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جب میں نے تفتیش کے مخصوص گر آزمائے تو وہ یہ بتانے پر مجبور ہو گیا کہ یہ قتل اس نے رانا بہادر علی کے ایما پر کیا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں رانا بہادر علی کو شریکِ جرم بلکہ اس جرم کی اصل جڑ نامزد کرتے ہوئے شاملِ تفتیش کر لیا۔ پہلے تو رانا بہادر علی مجھے اپنے تعلقات سے ڈرانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے جب اس کی ہر دھمکی کو جوتے کی نوک پر رکھا تو وہ ''راہِ راست'' پر آ گیا۔

میری کڑی تفتیش کے جواب میں اس نے بتایا کہ عائشہ نے اس کے ساتھ غداری کی تھی۔ وہ اس کے سیاسی حریف ملک کریم بخش آف جمال کوٹ کے ساتھ مل گئی تھی اور احمد نگر کی اہم خبریں جمال کوٹ پہنچا رہی تھی لہٰذا اس نے عائشہ کا کام تمام کروانے کے بعد اسے نہر میں پھنکوا دیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ عائشہ کی لاش جمال کوٹ کے علاقے میں نہر سے برآمد ہوتا کہ اس کے قتل کا شک ملک کریم بخش کی طرف چلا جائے جو اس کا سیاسی حریف تھا۔ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے جمال کوٹ میں اپنے ایک ایسے بندے کو بھی تعینات کر دیا تھا جو نہر میں سے عائشہ کی لاش کو دریافت کرتا لیکن رانا بہادر علی کی بدقسمتی سمجھ لیں یا وقت کی ستم ظریفی کہ عائشہ کی لاش نہر کے سست رو پانی میں بہتے ہوئے اللہ دتا کے جال میں جا پھنسی۔ اگر اللہ دتا مچھیرے نے جھوک ضامن میں نہر کے اندر اپنا جال نہ پھیلایا ہوتا تو یقیناً عائشہ کی لاش بہتے ہوئے جھوک ضامن سے آگے نکل جاتی اور پھر جمال کوٹ میں پہنچ کر دریافت ہوتی لیکن تقدیر کے آگے تدبیر کی کب چلتی ہے۔

عائشہ کا کردار اس کا اور...... اللہ کا معاملہ تھا اور وہ اپنے اچھے برے اعمال کے لیے اپنے معبود کو جواب دہ تھی لیکن زمینی حقائق یہ تھے کہ اس کا خون ہوا تھا اور یہ خون ناحق انصاف کا طلب گار تھا۔ میرا یہ فرض بنتا تھا کہ میں اس کے قاتل بلکہ قاتلوں کو عدالت سے قرار واقعی سزا دلواؤں لہٰذا میں نے رانا بہادر علی اور اس کے نمک خوار شونکا کے خلاف بڑا مضبوط چالان تیار کر کے انہیں حوالۂ عدالت کر دیا تاکہ دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت ثابت ہو...... خس کم، جہاں پاک!

(تحریر: حسام بٹ)

اس روز بھی اٹھنے میں کچھ سستی ہوگئی تھی۔
صبح کے آٹھ بج گئے تھے لیکن مجھے گھر سے جلدی نکلنا بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو باہر جانے کے لیے تیار کر ہی لیا۔

پھر بھی نکلتے نکلتے بہت سی ہدایات دینی پڑ گئی تھیں۔
ظاہر ہے، گھر کی بڑی جو ٹھہری جبکہ بابا بہت ضعیف ہوگئے تھے۔ ان کے لیے کمزوری کی وجہ سے چارپائی سے اٹھنا بھی محال تھا۔ اسی لیے چلتے چلتے بھی ان کا خاص طور پر

بہار سے پہلے

منظر امام

محبت سے بھرپور توجہ بچوں کو غیر محسوس طریقے سے تحفظ کا احساس دلاتی ہے... انہیں لگتا ہے اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن... جہاں اس احساس کا فقدان ہو وہاں چھوٹی سی عمر میں بھی قدم قدم پر طوفان کا سامنا کرتے ہوئے لرزتے دل کس قدر تنہائی اور عدم تحفظ کا شکار ہوجاتے ہیں اس کا ادراک جب لوگوں کو ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

خوف و ہراس میں گھری ایک معصوم بچی کا لرزہ خیز واقعہ

خیال رکھنے کی ہدایات۔ دوپہر کے کھانے کے لیے باورچی کو پیسے دینا۔ صبح کے دودھ، انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ کا حساب کرنا۔ یعنی گھر سے نکلتے نکلتے اتنی الجھنوں اور... افراتفری کا سامنا کرتے کرتے دماغ چکرا کر رہ جاتا تھا۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح بابا کو خدا حافظ کہہ کر برقع پہن کر گھر سے باہر نکل آئی۔ اب رکشے کا انتظار۔ یہ ایک اور مرحلہ تھا۔

صبح صبح کا وقت۔ ہر طرف سواریوں کی بھاگ دوڑ۔ اس وقت کوئی رکشا بھی خالی نظر نہیں آرہا تھا۔

اگر کوئی خالی رکشا آتا بھی تو وہ اتنا کرایہ مانگ لیتا کہ ہمت نہیں پڑتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رکشا خالی ہونے کے باوجود خالی نہیں تھا۔

میں اسٹاپ تک ملازم کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ دیا بھاگ دوڑ کر کے رکشا رکواتا اور مجھے رکشے میں بٹھا کر واپس چلا جاتا۔ بہت دیر کی محنت کے بعد وہ ایک رکشا پکڑ ہی لایا۔ میں اس میں بیٹھ کر اسکول کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسکول پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے قدم اٹھا کر اسٹاف روم سے رجسٹر لے کر تیزی سے اپنی کلاس روم کی طرف چل دی۔

اسمبلی کچھ ہی دیر پہلے ختم ہوئی تھی اور طالبات اپنی اپنی کلاسز کی طرف جارہی تھیں۔ میری کلاس پہلی منزل پر تھی۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر اپنی کلاس میں پہنچی۔ تمام طالبات اپنی اپنی سیٹ پر موجود تھیں۔ میں نے حاضری رجسٹر سے لڑکیوں کی حاضری لینی شروع کردی۔

یس مس، یس مس کی صدائیں آنے لگیں لیکن جب شیریں کا نام پکارا تو کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے نظریں دوڑائیں۔ شیریں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے دوبارہ آواز دی۔ ''شیریں!'' لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

میں جلبلا کر رہ گئی تھی۔ پھر میں نے طنزیہ انداز میں اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں حاضری کا جواب دینے میں کوئی اعتراض ہے؟ کیا یہ تمہیں برا لگتا ہے؟''

وہ کھڑی ہو کر بہت اطمینان سے بولی۔ ''میں نے تو جواب دیا تھا مس۔ اگر آپ نے نہیں سنا تو اس میں میرا کیا قصور ہوا۔''

اس کے اس جواب نے میرا خون کھولا دیا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں بہری ہوگئی ہوں اور میرا بہرا پن صرف تمہارے لیے ہے کیونکہ دوسروں کے جواب تو میں نے سن لیے تھے۔ صرف تمہاری آواز نہیں سن پائی۔''

''نہیں۔ آپ بہری تو نہیں ہیں لیکن میرے معاملے میں آپ بے پروا ضرور ہیں۔'' اس نے اسی اطمینان سے کہا۔ اس کی آواز کچھ تیز سی ہوگئی تھی۔

میں اس کے غیر معقول رویے سے شروع سے نالاں رہتی تھی۔ میں اس سے عاجز بھی آچکی تھی۔ اس وقت بھی اس کے اس نامعقول جواب نے مجھے بھڑکا دیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے پڑھانا شروع کردیا۔ ہم ٹیچرز کے ساتھ بھی کیسے کیسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ کیسے کیسے اسٹوڈنٹ ہمارے حصے میں آتے ہیں لیکن ہمیں سب کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے دن اسکول میں الوداعی پارٹی ہونے والی تھی۔ اس پارٹی کے لیے ہر لڑکی سے اس کے حصے کے پیسے لیے جارہے تھے اور ہر کلاس کی مانیٹر کو پیسے جمع کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔

میں نے کلاس لینے کے بعد مانیٹر سے جب رپورٹ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ زیادہ تر لڑکیوں نے پیسے دے دیے تھے۔ کچھ نے نہیں دیے تھے۔ ان میں ایک شیریں بھی تھی۔

باقی لڑکیوں نے دوسرے دن پیسے لانے کا وعدہ کیا تھا سوائے شیریں کے۔ وہ اس معاملے میں بھی خاموش رہی تھی۔

اسٹاف روم کی طرف جاتے ہوئے میں لاشعوری طور پر شیریں ہی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اس کا رویہ ناقابل برداشت تھا۔ اس پر غصہ آیا کرتا۔ اب دو ہی طریقے ہوسکتے تھے۔ یا تو میں اس پر پھٹ پڑوں، یا... نظرانداز کر جاؤں۔

اس کے رویے نے اسے نہ صرف میری کلاس کے لیے بلکہ پورے اسکول کے لیے ایک مسئلہ بنادیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔ بہت خوبصورت شکل وصورت کی۔ گورا رنگ، لانبا قد، خوبصورت آنکھیں، بڑے بڑے بال۔ خدا نے اسے بہت حسن دے رکھا تھا۔ جو لوگ اسے نہیں جانتے تھے، یا اس کے مزاج سے واقف نہیں تھے، اس سے مل کر، اس سے باتیں کر کے اور اس کے پاس بیٹھ کر خوشی محسوس کیا کرتے لیکن اس کی بدمزاجی، اکھڑے رویے اور غیر مہذب انداز نے اسے سب کی نگاہوں سے گرادیا تھا۔ وہ اگر خاموش ہی رہتی تو بھی ایسا محسوس ہوتا جیسے سامنے والے کا مذاق اڑا رہی ہے۔ اس کے دیکھنے اور گھورنے کا انداز حقارت آمیز ہوا کرتا۔ جیسے

اس کے نزدیک کسی کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو اور وہ سامنے والے کا مذاق اڑا رہی ہو۔ اس کا یہ رویہ اپنے ساتھ کی لڑکیوں اور ٹیچرز دونوں سے ایک ہی جیسا ہوا کرتا تھا۔ پھر اس کی زبان..... خدا کی پناہ۔ بے ڈھنگے الفاظ استعمال کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بالکل منہ پھٹ تھی۔

اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اسکول کا ہر فرد اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک اکیلی لڑکی تھی لیکن اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ پورے اسکول میں شیطان کی طرح مشہور تھی۔ ایسا کوئی دن نہیں جاتا ہوگا، جب اس کا ذکر منفی انداز سے نہیں ہوتا ہو۔ دوسری ٹیچرز کو جب گفتگو کا کوئی خاص موقع نہیں ملتا، تو وہ میرے پاس بیٹھ کر شیریں کی باتیں کیا کرتیں۔ اس کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے ہوتے۔ اس کو برا بھلا کہنے کے بعد شاید وہ یہ محسوس کرتی ہوں گی کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اپنے سروں سے اس اکھڑ اور بدتمیز لڑکی کا بوجھ اتار دیا ہے۔

بات صرف اس کے نامناسب رویے اور اس کی زبان درازی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کی حرکتیں بھی کراہت آمیز ہوا کرتیں۔

ہاف ٹائم میں گولا گنڈا منہ میں رکھ کر بھول جاتی اور اس کے ہونٹوں کے کناروں سے رس ٹپکتا رہتا۔ اسے اس کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے کپڑے گندے ہو رہے ہیں۔ ٹھیلے سے کچھ لے کر جلدی جلدی کھاتی اور گندے ہاتھوں کو اپنے کپڑوں سے صاف کر لیا کرتی۔ وہ ٹھیلے والوں یا کینٹین والوں سے ادھار بھی لے لیا کرتی تھی۔ جس کے بعد ادھار واپس کرنے کے سلسلے میں گالی گلوچ کی نوبت بھی آجاتی۔

کسی کو اس پر اس لیے تعجب نہیں ہوتا تھا کہ سب ہی اس کی حرکتوں اور فطرت سے واقف تھے۔ اس کی ایک اور عادت بھی تھی۔ وہ کینٹین سے چوری بھی کر لیا کرتی۔ کئی دفعہ اسے پکڑا جا چکا تھا لیکن مجال ہے جو وہ خود کسی قسم کی شرمندگی محسوس کرتی ہو۔

کئی دفعہ اس کے ساتھ بہت سختی بھی کی گئی لیکن وہ کسی قسم کا اثر لینا ہی نہیں جانتی تھی۔ اپنے ظاہری حلیے کے حوالے سے بھی اس کی عادتیں بہت مختلف تھیں۔

کبھی خود کو پاؤڈر اور سرخی وغیرہ سے اس طرح تھوپ لیتی جیسے سرکس کے مسخرے ہوا کرتے ہیں اور کبھی اس کا چہرہ ایسا لگتا جیسے اس نے منہ دھونے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی ہو، بستر سے اٹھ کر سیدھی اسکول چلی آئی ہے۔

اب ایک دو حرکتیں ہوں تو بتائی جائیں۔ ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ کلاس میں اپنی سیٹ بدلتی رہتی تھی۔ کبھی ایک جگہ، کبھی دوسری جگہ اور اسی بات پر آئے دن اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا بھی ہوا کرتا تھا۔

ایک بار کلاس میں ایک لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ”مس، شیریں نے میرا قلم چرا لیا ہے۔“

میں نے جب شیریں کی تلاشی لی تو اس لڑکی کا قلم اس کے ازاربند سے بندھا ہوا ملا۔ انتہا یہ تھی کہ وہ اس پر بھی شرمندہ دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ اس کا ردیہ بے پروائی کا تھا۔

دوسری ٹیچرز کا بھی اس سے واسطہ پڑتا تھا لیکن میرا واسطہ اس لیے زیادہ تھا کہ میں اس کی کلاس ٹیچر تھی اور اس کی ساری شکایتیں مجھے سننے کو ملتی تھیں۔

دسویں کلاس امتحانوں سے فارغ ہو کر جا رہی تھی۔ رسم ورواج کے مطابق نویں جماعت کو دسویں جماعت کے اعزاز میں الوداعی پارٹی دینی تھی۔

میں نے کلاس کی مانیٹر کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ ہر ایک سے پیسے جمع کر لے۔ مانیٹر نے بتایا کہ سوائے شیریں کے سب نے پیسے دے دیے ہیں جبکہ شیریں کلاس سے بھی غائب تھی۔

میں نے مانیٹر سے پیسے لے کر گننے شروع کر دیے۔ اسی وقت شیریں دندناتی ہوئی کلاس میں داخل ہوئی اور میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

”محترمہ!“ میں نے طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ”کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ کتنی دیر کے بعد کلاس میں آرہی ہیں؟“

”تم پیسے کے بغیر کلاس میں بیٹھنے بھی نہیں دیتیں نا۔ اسی لیے جب امی نے پیسے دیے تو میں آگئی۔“ اس نے کہا۔

میں غصے سے کھول کر رہ گئی۔ ایک تو اس کا روکھا لہجہ، پھر بجائے آپ کے تم کہا۔ یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔

”اچھا لاؤ۔“ میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہیں پیسے؟“

”یہ لیں۔“ اس نے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

”یہ تو صرف دو روپے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”باقی ایک روپیا کہاں ہے۔“

اس سے پہلے کہ خود شیریں کوئی جواب دیتی، کلاس کی لڑکیوں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ ”ٹیچر ٹیچر..... اس نے ایک روپیا دوسرے ہاتھ میں چھپا رکھا ہے۔“

اچانک شیریں نے دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا نوٹ نکال کر پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو...... مرو۔''

اب یہ انتہا ہوگئی تھی۔ اس لڑکی نے استاد اور شاگرد کے درمیان کی تمام حدیں توڑ دی تھیں۔ اس نے ناقابلِ معافی بے عزتی کی تھی۔ اس نے تہذیب اور احترام کی ساری دیواریں مسمار کردی تھیں۔ اس نے ایسی حرکت کی تھی، جو کسی طور نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی۔

میں غصے سے کانپنے لگی۔ میرے ماتھے پر پسینا آ گیا تھا۔ میں نے پسینا صاف کیا اور خاموشی سے کلاس سے نکل کر اسٹاف روم میں آگئی۔

اسٹاف روم میں عائشہ بیٹھی ہوئی تھی۔ عائشہ اسکول میں میری دوست تھی۔ میں اس سے ہر بات شیئر کرلیا کرتی تھی۔

اس نے مجھے اداس اور پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے خیریت تو ہے نا؟ کیا اس زبان دراز نے پھر کوئی گل کھلا دیا ہے؟''

یہ رویہ ساری ٹیچرز کا تھا۔ وہ اس کا نام لینے کے بجائے مختلف القابات سے پکارا کرتیں۔ بدتمیز، زبان دراز، بدمعاش اور نہ جانے کیا کیا۔

میں اس وقت شیریں کے خلاف بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے میں نے عائشہ کو سب کچھ بتادیا۔ اس دوران دوسری ٹیچرز بھی آگئی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ سن لیا۔ پھر طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

''وہ تو اسی قسم کی حرکتیں کرتی ہے۔''

''انتہائی بدتمیز ہے۔''

''آج تو اس نے نیا گل کھلا دیا ہے۔''

''آج تو اس بدتمیز لڑکی نے انتہا کردی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

پھر سب کا یہ فیصلہ ہوا کہ یہ سب کچھ ہیڈ مسٹریس کے علم میں لایا جائے اور اس روز روز کی مصیبت سے چھٹکارا پایا جائے ورنہ اس کی حرکتیں بڑھتی جائیں گی۔

ہیڈ مسٹریس نے شیریں کو اپنے پاس بلالیا۔ کمرے میں جانے سے پہلے اس نے طنزیہ اور حقارت بھری نگاہوں سے ساری ٹیچرز کی طرف دیکھا اور کمرے میں داخل ہوگئی۔

ہم سب ٹیچرز کے کان کمرے کے دروازے سے لگے ہوئے تھے۔ ہم سب کو یقین تھا کہ ہیڈ مسٹریس آج اس کو ایسا سبق سکھادیں گی کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرسکے۔

کچھ باتوں کی آوازیں آئیں۔ شاید ہیڈ مسٹریس اس سے سوال جواب کررہی تھیں۔ پھر دو چار تھپڑوں کی آوازیں آئیں۔

ہم میں سے کسی کو بھی افسوس نہیں ہورہا تھا۔ شیریں جیسی لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا تھا، وہ بالکل مناسب تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئی تو اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اس کے دونوں گال سرخ ہورہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے آنسو بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا اس وقت .... اس کے انداز میں وہی پہلے والی اکڑ اور غرور تھا۔

ایک ٹیچر نے کہا۔ ''ذرا دیکھو تو سہی۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور اس کے یہ انداز۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس پر مار کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہو۔''

وہ اسٹاف روم سے باہر نکل گئی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد بھی اس پر تبصرے ہوتے رہے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ شیریں اب احاطے کے ایک کونے میں نظر آنے کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ اب وہ ہر وقت گم صم رہا کرتی۔ اور جب اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ رونا شروع کردیتی تھی۔ کوئی بھی ٹیچر جب اس سے مخاطب ہوتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو... گرنے لگتے۔ پھر نظریں ہٹا کر کسی اور طرف دیکھنے لگتی۔

اب اس کے چہرے کے تاثرات ہی کچھ اور تھے۔ اس کا چہرہ بے بسی، کرب اور مجبوری کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔

اس کی شخصیت کے بے پناہ اعتماد کا پودا جیسے سوکھ کر مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے نمودار ہونے لگے تھے۔ گالوں کا گلابی پن اب مایوسی کی تاریکی میں شامل ہوکر زرد ہوتا جارہا تھا۔ اس کا نام اب اسٹاف روم میں پہلے کی طرح نہیں لیا جاتا تھا، کیونکہ وہ سراسر کچھ اور ہوگئی تھی۔

جو ٹیچرز اس سے نالاں تھیں، ناراض رہا کرتیں، جو ہر وقت اس کی شکایت کیا کرتیں، اب خود پریشان تھیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا ہے۔

ہم سب ٹیچرز بشمول ہیڈ مسٹریس کے سب نے یہ فیصلہ سنادیا کہ شاید اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہتا۔ اسی لیے وہ کبھی کچھ ہوجاتی ہے اور کبھی کچھ اور۔

بالآخر اسکول کے ڈاکٹر سے کہا گیا کہ وہ اس لڑکی کا جائزہ لے کر اس کے بارے میں رائے دے۔ ڈاکٹر کا بھی یہی خیال تھا کہ لڑکی ذہنی مریضہ ہے۔ اس کا رویہ عام لڑکیوں جیسا نہیں ہے اور اس کی مسلسل نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس کی نگرانی کی ذمے داری میرے اور عائشہ کے سپرد کردی گئی تھی۔

ایک دن ہم نے موقع پا کر شیریں کو اپنے پاس بلایا۔ ہم اس سے اس کی ایسی کیفیت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے۔

عائشہ نے بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے۔ وہ جھجک کر دیکھتی رہی۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا ہوگا کہ اس کے ساتھ بھی ایسی ہمدردی کا برتاؤ کیا جاسکتا ہے۔ پھر وہ خود کو سمیٹتی ہوئی بیٹھ گئی۔

ہم نے جب بہت پیار اور نرمی سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ وہ ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

عائشہ نے تسلی دینے کے انداز میں اسے سینے سے لگالیا۔ میں بھی پریشان ہوکر رہ گئی تھی کہ خدا جانے اس بچی پر ایسی کون سی افتاد ٹوٹ پڑی ہے کہ وہ اس طرح رو رہی ہے۔

وہ بہت دیر تک... اسی انداز سے روتی رہی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔

بڑی مشکلوں کے بعد اس نے کہا۔ ''میری ماں!'' اس کے بعد اس نے پھر رونا شروع کردیا۔

میں نے اور عائشہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے رونے نے خود ہمیں تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ شاید اس کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

عائشہ نے بے چین ہوکر پوچھا۔ ''شیریں! بتاؤ کیا ہوا ہے تمہاری ماں کو؟ کیا وہ اس دنیا میں نہیں رہی؟''

''ایسی بات نہیں ہے مِس۔'' اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا بلکہ اس کے لہجے کی تلخی شاید لوٹ آئی تھی۔ پھر اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے بولنا شروع کردیا۔ اس وقت اس پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری تھی۔

وہ آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کے بغیر بولتی جارہی تھی۔

''میری ماں نے میری شادی پچاس برس کے ایک بوڑھے شخص سے کرادی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وحشی درندے نے مجھے اذیتیں دے دے کر مار دیا ہے۔ وہ مجھے بری طرح مارتا بھی ہے۔''

''اور تمہاری ماں...... وہ کیا کرتی ہے؟''

''یہ سب اسی کا تو کیا دھرا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ میری ماں کا بھی شوہر ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں، میری ماں کے اس سے تعلقات ہیں اور میری ماں نے زمانے کو دھوکا دینے کے لیے میری شادی اس ظالم سے کردی ہے تاکہ اس بہانے وہ ہمارے گھر میں رہ سکے۔ وہ دونوں ایک بستر پر سوتے ہیں۔ مجھے کمرے میں بند کردیا جاتا ہے۔ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی۔ وہ کم بخت جتنے پیسے لاتا ہے، میری ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ وہ میری سگی ماں ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ وہ مجھے بھوکی دیکھتی رہتی ہے اور وہ دونوں میرے سامنے کھا رہے ہوتے ہیں۔ مجھے اسکول بھیجنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو تنہائی مل سکے۔''

''میرے خدا...... تو ایسی ہے تمہاری ماں۔''

''ہاں، وہ شروع ہی سے ایسی تھی۔ اس نے میرے باپ کو ٹی بی کا مریض بنا کر مار دیا۔ تو ایسی ہے میری زندگی۔'' پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ ہم دونوں سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ وہ بچی اپنے سینے پر اتنا بڑا بوجھ اٹھائے گھوم رہی تھی اور ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکے۔

ہم کو یہ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ دراصل نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ اتنی سی عمر میں اتنے صدمے اٹھا اٹھا کر وہ انتقام پسند بن گئی تھی۔ اور جب اپنی ماں اور اس ظالم بوڑھے پر اس کا بس نہیں چلتا تو غصے میں آکر اسکول میں الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ وہ اس طرح اپنی بھڑاس نکالتی رہتی ہے۔

ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکے۔ الٹا اس کے ساتھ زیادتی کرتے رہے۔ اسے سزائیں دلوائیں۔ اسے ڈانتے پیٹتے رہے۔ کبھی اس سے پیار سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک اسکول نہیں آئی۔

ہوسکتا تھا کہ وہ بیمار پڑ گئی ہو۔ یا وہ دکھ اور صدموں کے مراحل سے گزر رہی ہو۔

ایک صبح مجھے اسکول پہنچنے میں پھر دیر ہونے لگی۔ ملازم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے بازار سے کیا کیا لانا ہے۔

میں اسے دو تین بار سمجھا چکی تھی۔ بالآخر جب اس کی سمجھ میں آگیا تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف عائشہ تھی۔ وہ بتا رہی تھی۔ ''آج اسکول نہیں آنا، اسکول بند ہوگیا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''شیریں انتقال کرگئی ہے۔'' عائشہ کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

خود میں ریسیور ہاتھ میں لیے رونے لگی۔

محفلِ شعر و سخن

❋ مدحت...... کراچی

کر کر کے منتیں تری عادت بگاڑ دی
دانستہ ہم نے تجھ کو ستم گر بنا دیا

❋ ایم الیاس...... پشاور

جہانِ خواب سے اکثر ہمیں تم نے پکارا ہے
چلو نکلیں سفر پہ اب اسے تعبیر کرنے تک
بہت انمول ہوتا ہے مگر صورت ہے اک باقی
تم اپنی زندگی دو گے، یہ دل جاگیر کرنے تک

❋ عظمیٰ عبید...... اوکاڑہ

پھولوں کی نمائش میں اگر وہ بھی ہوا
اِک بار تو گلابوں کو بڑی آگ لگے گی

❋ ادریس خواجہ...... لاہور

ہر سمت نظارے تو ہیں بکھرے ہوئے لیکن
اِک اس کے تبسم کا وہ جلوہ نہیں ملتا

❋ محمد یوسف سانول...... خوشاب

مٹی بھی جمع کی کھلونے بھی بنا کر دیکھے
زندگی کبھی نہ مسکرائی پھر بچپن کی طرح

❋ محمد حنیف گبول...... نیو سینٹرل جیل، ملتان

محبتوں میں ہر ایک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا
بچھڑ گئے ہیں تو کیا ہوا کہ یہی تو دستورِ زندگی ہے
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا

❋ عبدالغفور خان ساغری خٹک...... اٹک

چڑھتی رہیں مزار پہ چادریں تو بے شمار
باہر جو فقیر تھا وہ سردی سے مر گیا

❋ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان

عشق کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
جاگتی پلکوں کے بھی کچھ خواب ہوا کرتے ہیں
ہر کوئی رو کے دکھائے یہ ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

❋ ایمان علی...... اسلام آباد

مدتیں ہوگئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے

❋ اطہر حسین...... کراچی

بدلے ہیں انداز ان کے کچھ اس انداز سے
اب بڑے انداز سے ہمیں نظر انداز کرتے ہیں

❋ اظہر حسین پچار...... ہزاری، جتوئی

سکوتِ شامِ غریباں میں سن سکو تو سنو
مقتلوں سے ابھی تک صدائیں آتی ہیں
لہو سے جن کو منور کرے دماغِ بشر
ہوائیں بھی ایسے چراغوں سے خوف کھاتی ہیں

❋ کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

کتنا دشوار ہے فطرت کا بدلنا یوسف
لوگ کعبہ گئے اور دل سے برائی نہ گئی

❄ ذوالفقار احمد..... لاڑکانہ
برسات کے تھمنے کی دعا مانگی ہے ہم نے
پر دل کا لہو آنکھ یہ برسائے بہت ہے
مٹنے لگے جب سے تری یادوں کے مناظر
آئینۂ دل مرا یہ دھندلائے بہت ہے

❄ احمد علی..... اسلام آباد
اس شہر میں رہیں گی یوں ہی کیا عداوتیں
گلشن میں خارزار کا منظر رہیں گے ہم
تھک جائے گا تو مانگ کے ہم کو دعاؤں میں
تیرے خیال وخواب کا محور رہیں گے ہم

❄ محمد عمران..... بہاولپور
جنگل ہو یا صحرا ہو اب تنہائی سے کیا ڈرنا
ہم تو دل ہی رکھ آئے ہیں چارہ گر کی گھاتوں میں
تم کیا جانو پیار کے کھیل میں جان کے ہم کیوں ہار گئے!
جانتے تھے ہم جیت ملے گی دل کی ساری ماتوں میں

❄ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
پوچھتا ہے جب کوئی کہ دنیا میں محبت ہے کہاں
مسکرا دیتا ہوں میں اور یاد آجاتی ہے ماں

❄ فرحان شیخ..... فیصل آباد
حسن یوسف کو دیکھ کر وہاں کٹی تھیں انگلیاں
خود چاند کٹ گیا یہاں انگلی کو دیکھ کر

❄ شبانہ حسن..... لاہور
سرد اندھیری راتوں میں دل اس سے باتیں کرتا ہے
آنکھیں جاگ رہی ہیں لیکن خواب میں چلنا اور ہنسنا
اپنی ذات کے میلے میں اب اتنا بھی کیا گم رہنا
خود سے خود کی باتیں کرنا خود سے جلنا اور ہنسنا

❄ جاوید شبیر بربرہ..... علی پور، مظفر گڑھ
ہم محبت کو بنا کر زینہ
رب کے نزدیک چلے جاتے ہیں

❄ فلک شیر ملک..... ضلع رحیم یار خان
جو تیری یاد میں گزرے، وہی پل زندگی ٹھہرے
بظاہر ساری گھڑیاں، سارے لمحے ایک جیسے تھے

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانیوال
کتاب ہستی جہاں سے کھولی
تری ہی یادوں کا باب نکلا

❄ آفتاب احمد..... صدر، کراچی
ٹوٹ گیا آنکھوں میں سپنا چھوڑ دیا یاروں نے ساتھ
راہِ سفر میں سب کے ہی پیمانِ وفا بے کار گئے
رفتہ رفتہ جان لیا پھر اس کے جو بھی ارادے تھے
میرے سچ کو جانے کیسے جھوٹے وعدے مار گئے

❄ محمد اعتزاز..... کوئٹہ
وفا کے گیت لکھیں گے
جفا جب یاد آئے گی
یہ دل پھر دعا دے گا
دغا جب یاد آئے گی

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ہارون آباد
دیدہ وروں کے گھر پہ مسلط ہے تیرگی
اندھوں کی انجمن میں چراغاں ہے ان دنوں
بدتر ہے جانور سے بھی دانش وروں کا حال
جو سوچتا نہیں ہے وہ انساں ہے ان دنوں

❄ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
آؤ آنکھوں سے بات کرتے ہیں
لفظ تو مطلب ہی بگاڑ دیتے ہیں

❄ شازیہ..... کراچی
کیا خبر ان کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

❄ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
جب چاند کو بدلی میں چھپا لیتی ہیں زلفیں
اس وقت تیرے حسن کا ہوتا ہے سماں اور

❄ کاشف خان..... راولپنڈی
کیوں قطرہ قطرہ پیتے ہو، نہ مرتے ہو نہ جیتے ہو
یا چھوڑ بھی دو یہ مے نوشی یا زہر کا پیالا بن جاؤ
دل ہنس کر ہر دکھ سہہ لے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ

❄ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور
دیکھا تو میں نے سمجھا اسے دن کی روشنی
بچھڑا تو تیرگی بھری رات دے گیا

❄ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ سٹی
وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

❁ ایم شفیق خان، احمد حسن...... قبولہ بائی پاس
دیوارِ دل جو گری تو گویا لٹ سی بچ گئی
جو خوشی جس کے ہاتھ آئی اٹھا کے چلا گیا

❁ ایم ۔آئی ۔فرید خاں......اوکاڑہ سٹی
اگر دل غم سے خالی ہو تو جینے کا مزہ کیا ہے
نہ ہو خون جگر تو اشک پینے کا مزہ کیا ہے

❁ ملائکہ حریم......اوکاڑہ
سوچنے بیٹھوں تو یاد آنے لگے تیرا پتا
ڈھونڈنے نکلوں تو مجھ کو راستہ ملتا نہیں

❁ داؤد اشفاق......اوکاڑہ
مجھ کو کسی کے آنے کا اتنا یقین تھا
شب کٹ گئی میں گھر کو سجاتا چلا گیا

❁ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
دوریوں میں جو ملا قربتوں میں کھو دیا
اتنے پھیکے رنگ پہلے کب تری باتوں میں تھے

❁ اشفاق شاہین......کراچی
اس سے جذبات میں توڑا ہے تعلق ورنہ
دل جدائی کا کہاں بوجھ اٹھا سکتا ہے

❁ محمد جاوید......تحصیل علی پور
چلو آج ہم ہی کر لیتے ہیں اعترافِ بے وفائی
بزمِ وفاداروں میں شاید ہم ہی برحق کلام ہیں

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لیے
میرا ضمیر بہت ہے مری سزا کے لیے

❁ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی
تم اگر بھول بھی جاؤ تو یہ حق ہے تم کو
میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے

❁ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
ان بادلوں کا مزاج میرے اپنوں سے بہت ملتا ہے
کبھی ٹوٹ کر برستے ہیں کبھی بے رخی سے گزر جاتے ہیں

❁ مہتاب شیروانی......حیدر آباد
میری تنہائی کو میرا شوق نہ سمجھنا
بہت پیار سے دیا ہے یہ تحفہ کسی نے

❁ عتیق الرحمن ندیم......سمندری، فیصل آباد
اس نے پوچھا زندگی برباد کس نے کی
ہم نے انگلی اٹھائی اور اپنے دل پہ رکھ دی

❁ مہر النساء......سکھر
عجیب سی بے تابی ہے تیرے بن
رہ بھی لیتا ہوں اور رہا بھی نہیں جاتا

❁ نبیلہ ملک......ضلع جہلم
خواب اور حقیقت میں فرق صرف اتنا ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں حقیقت توڑ دیتی ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
سسکیاں لیتا ہے وجود میرا
نوچ کے کھا گئی تیری یاد مجھے

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
سینہ غم سے بوجھل ہو اور یاد کسی کی آئی ہو
تب کمرے میں بند ہو جانا اور چپکے چپکے رو لینا

❁ منصور اختر......سکھر
کتنے فضول ہیں ہم صاحب!
دیکھ تجھے یاد تک نہیں آتے

❁ انجم کمال......کراچی
اٹھ نہ جائے اعتبار زمانے کا
اے محبت! کسی کو تو راس آ

❁ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
ہر فرد میری قوم کا اک ایسا فرد ہو
اپنی خوشی وطن کی خوشی پر جو وار دے

❁ صبا سحر......کراچی
میں روتا رہا رات بھر مگر فیصلہ نہ کر سکا
وہ یاد آ رہا ہے یا میں یاد کر رہا ہوں

کوپن برائے شمارہ نومبر 2015

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

جال ساز

رضوانہ ساجد

انسان کا وجود ہو یا گھڑیال کی سوئی۔ اگر حرکت میں رہیں تو زندگی کا احساس باقی رہتا ہے جو ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور جو لوگ وقت اور انسان کی قدر نہیں کرپاتے بالآخر اپنی قدر بھی کھو دیتے ہیں... یہی حال ان دونوں کا بھی تھا جنہیں اپنے حسن پر ناز تھا مگر جب کوئی سراہنے والا ہی نہ ہو تو کیسا ناز اور کیسی ادائیں۔ یہ تلخ حقیقت ان پر بہت آخر میں کھلی۔ جب عمر کی دھوپ سارا حسن چاٹ گئی... اور ان کے چاروں جانب ہمدردوں کے روپ میں جال سازوں کا ہجوم تھا۔

وقت کی دھول میں دبنے والی عشوہ طراز حسیناؤں کا

عبرت اثر ماجرا

بیگم نادرہ...... کیا ٹھسے دار نام تھا۔ یہ نام یا تو شہزادیوں کا ہوتا ہے یا فلمی اداکاراؤں کا لیکن وہ نہ تو شہزادی تھیں نہ فلمسٹار۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر کہتی ضرور تھیں کہ انہوں نے اپنی جوانی بلکہ لڑکپن میں کئی فلمسازوں کو خط لکھے تھے۔ اس پکی عمر میں بھی انہیں دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ اگر ان کے خط کا جواب آگیا ہوتا تو کئی حسن پرست آنکھیں سینما گھروں میں مستقل بسیرا کرلیتیں۔ ان کے گھر کے سامنے پرستاروں کی قطاریں لگی رہتیں لیکن ہوا

یہ کہ قطاریں لگیں ضرور لیکن پرستاروں کی نہیں، یہ قطاریں رشتوں کی تھیں۔ پھر فلم سازوں سے خط وکتابت منقطع ہوگئی۔
رشتوں کی چھان بین بھی ایک مرحلہ بن کر رہ گئی۔
بیگم نادرہ شہزادی نہیں تھیں لیکن دماغ شہزادیوں والے تھے۔ رشتے کے لیے شرط یہ تھی کہ شوہر کے سوا گھر میں کوئی اور نہ ہو۔ ماں باپ سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔ عمر نکلی نہیں جا رہی تھی لیکن ماں کو جلدی تھی کہ وہ اپنے گھر کی ہوجائے۔ گریجویشن کر چکی تھیں۔
اس کے والد عثمان درانی اوسط درجے کے تاجر تھے۔ پانچ سوگز کا ایک بنگلا بھی رہنے کا ٹھکانا بنالیا تھا۔ بیگم نادرہ اسے بھی شیش محل سمجھے بیٹھی تھیں۔ دوسری ضدوں میں ایک ضد یہ بھی شامل ہوگئی تھی کہ بیاہ کر جائیں گی تو اس سے بڑے گھر میں۔ خوبصورت اتنی تھیں کہ مشکل ضرور پیش آئی لیکن دونوں شرطیں پوری ہوگئیں۔ بس ایک کمی رہ گئی کہ شوہر ملا تو ان کی عمر سے دوگنی عمر کا۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ ہونے والا شوہر ایک بڑا سرکاری افسر تھا۔ شاندار مکان تھا۔ بیگم نادرہ جھٹ تیار ہوگئیں اور اپنے پیچھے اپنی چھوٹی بہن بیگم فاخرہ کو چھوڑ کر نئے گھر پہنچ گئیں۔
پہلا صدمہ تو انہیں یہ پہنچا کہ نوکرانی کے نام پر ماسی رکھی ہوئی تھی جو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آتی اور گھر کی صفائی ستھرائی کر کے چلی جاتی۔ انہوں نے دبی زبان سے شکوہ ضرور کیا لیکن اس دلیل پر خاموش بھی ہوگئیں کہ اکیلے گھر میں چوبیس گھنٹے کی ملازمہ کا رہنا ٹھیک نہیں۔
دوسرا صدمہ چند ماہ بعد یہ پہنچا کہ مکان کرائے کا نکلا۔ یہ ایسا انکشاف تھا جس نے ان کے ہوش اڑا دیے۔ اب وہ چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔ پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ میکے جا کر خوب ہنگامہ برپا کیا کہ شادی سے پہلے اتنی ضروری چھان بین کیوں نہیں کی گئی۔ پھر شوہر کا روٹی پانی بند کر دیا کہ انہوں نے شادی سے پہلے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔ انہوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ یہ بات پوچھی ہی نہیں گئی تھی تو وہ کیوں بتاتے۔ وہ اپنے گھر جا کر بیٹھ گئیں۔ باپ نے سمجھانے کی کوشش کی۔
''یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ سیکڑوں لوگ کرائے پر رہتے ہیں۔ اتنی سی بات پر تم خود پر طلاق کا داغ لگاؤ گی۔''
''بات کرائے پر رہنے کی نہیں ہے۔ غصہ تو مجھے اس پر ہے کہ یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی گئی۔''
''میں افضال سے بات کروں گا۔ وہ کوئی نہ کوئی انتظام کردے گا۔''
''آپ جو چاہیں بات کرلیں، میں تو اب اسی وقت اس کے پاس جاؤں گی جب وہ اپنا مکان خرید لے گا۔''
''بیٹا، بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ مکان کوئی کھلونا ہے جو فوراً خرید لیا جائے گا۔ اچھا، میں کچھ کرتا ہوں۔ مجھے افضال سے بات تو کرنے دو۔''
بات کیا کرنی تھی، وہ ایک پیش کش لے کر افضال کے پاس گئے۔ ان کے پاس دو سوگز کا ایک پلاٹ پڑا تھا۔ انہوں نے اپنے داماد افضال کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اس پلاٹ پر مکان بنوالے تاکہ بیگم نادرہ کی ضد پوری ہوجائے۔
''اس مکان کا آدھا کرایہ گورنمنٹ دیتی ہے۔ میں صرف آدھا کرایہ دے کر اتنے اچھے مکان میں رہتا ہوں۔ پھر دو سوگز پر مکان کیوں بنواؤں؟''
''یہ بیگم نادرہ کی ضد ہے۔''
''اسے سمجھائیں کہ وہ یہ ضد چھوڑ دے۔ مکان بنانا ہوگا تو ریٹائرمنٹ کے بعد بنالوں گا۔''
یہ بات بیگم نادرہ کو بتادی گئی۔ خلاف توقع یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ پلاٹ ان کے نام ہوگیا اور وہ ایک مرتبہ پھر شوہر کے گھر آگئیں۔
افضال صاحب کو محض ضد تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد مکان بنوائیں ورنہ تجویز انہیں بھی معقول معلوم ہوئی تھی۔ ابھی دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ انہوں نے بیگم نادرہ کے پلاٹ پر مکان کھڑا کردیا۔
ان دو برسوں میں بیگم نادرہ کو بھی اونچ نیچ کا اندازہ ہوگیا تھا لہٰذا یہ طے ہوا کہ نئے مکان کو کرائے پر دے دیا جائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہم جس مکان میں رہ رہے ہیں، اسے چھوڑ کر اپنے مکان میں شفٹ ہوجائیں گے۔
بیگم نادرہ تو شاید کوئی بے چین روح لے کر دنیا میں آئی تھیں۔ ایک کے بعد ایک دھن سما جاتی تھی۔ یا تو یہ ضد تھی کہ شادی وہاں کروں گی جہاں شوہر کے سوا کوئی نہ ہو۔ اب تنہائی کاٹنے لگی تھی۔ جی میں آئی کہ کہیں نوکری کرلوں۔ ان کے شوہر نے بہت سمجھایا کہ نوکری کے دس بکھیڑے ہوتے ہیں۔ کیوں اپنی جان کو روگ لگاتی ہو۔ گھر میں رہو، آرام کرو لیکن وہ تو جو کہہ دیں اسے پورا کرنا ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک اسکول میں نوکری کرلی۔
عثمان درانی بھی لگتا تھا اسی دن کے انتظار میں تھے۔ بیمار تو رہتے ہی تھے لیکن اب تو بستر سے لگ گئے۔ کبھی اسپتال میں داخل ہوجاتے کبھی گھر چلے آتے۔ آہستہ آہستہ کاروبار ٹھپ ہوگیا۔ قریب تھا کہ مکان بیچ کر علاج کراتے کہ اللہ

نے لاج رکھ لی۔ ان کا جنازہ ان کے اپنے گھر سے اٹھا۔

ان کو مرے ابھی چند مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ بیگم نادرہ کی والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن بیگم فاخرہ دھوپ میں کھڑی ہو گئی۔ عثمان درانی نے مرتے مرتے مکان اس کے نام کر دیا تھا لیکن اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی کیسے رہتی۔ بیگم نادرہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئیں۔ ماں کا جتنا زیور تھا، وہ اس کی شادی کے لیے اٹھا کر رکھ دیا۔

"فاخرہ! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہارے زیور پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں تمہارے نام سے لاکر لے کر بینک میں رکھوا دوں گی۔ پھر تم جانو تمہارا کام۔"

"باجی! آپ کیوں غیروں والی بات کرتی ہیں۔ یہ زیور آپ اپنے ہی پاس رکھیں۔"

"پگلی تو نہیں سمجھتی۔ افضال غیر ہیں۔ کسی وقت ان کے دل میں بے ایمانی آ جائے۔ میں بھی فرشتہ نہیں ہوں۔ اپنی امانت اپنے پاس رکھو۔"

وہ اسے بینک لے کر گئیں اور اس کے نام سے لاکر لے لیا۔

اس معاملے سے نمٹنے کے بعد یہ سوچا گیا کہ باپ کے مکان کا کیا کیا جائے۔ یہ مکان بیگم فاخرہ کے نام تھا لیکن وہ وہاں اکیلی کیسے رہتیں۔ پہلے یہ سوچا گیا کہ مکان فروخت کر دیا جائے لیکن افضال نے اچھی رائے دی۔

"مکان کرائے پر دے دیا جائے۔ فاخرہ ہمارے پاس جس طرح رہ رہی ہے، رہتی رہے۔ وہ اپنے مکان کا کرایہ اپنی شادی کے لیے جمع کرتی رہے۔ شادی کے بعد چاہے تو وہاں رہ لے چاہے تو کرائے پر رہنے دے۔"

یہ تجویز بیگم نادرہ کے دل کو بھی لگی۔ فاخرہ سے پوچھا تو اس نے بھی اتفاق کیا۔ مکان کرائے پر دے دیا گیا۔

☆☆☆

افضال حنیف نے پچاس سال میں تو شادی کی تھی۔ چار چھ سال اور گزرے تو ریٹائرمنٹ کی فکر ستانے لگی لیکن اطمینان یہ تھا کہ مکان اپنا ہو گیا تھا جو کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ بیگم نادرہ کی نوکری بھی چل رہی تھی۔ اچھے عہدے پر تھے، پنشن کا آسرا بھی تھا۔ فاخرہ بھی ان پر بوجھ نہیں تھی۔ فکر تھی تو بس یہ کہ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ مکان چھوڑ کر دو سو گز کے چھوٹے سے مکان میں شفٹ ہونا پڑے گا۔

یہ فکر بھی جلد ہی دور ہو گئی۔ وہ ریٹائر ہو گئے۔ پہلے یہ سوچا گیا کہ ہم سب فاخرہ کے مکان میں شفٹ ہو جائیں۔ اگر یہ معاملہ فاخرہ کے سامنے رکھا جاتا تو وہ ہرگز انکار نہ کرتی لیکن بیگم نادرہ نے خود ہی اس تجویز کی مخالفت کی۔

"فاخرہ کے مکان کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کی شادی کے وقت ہم زیر بار نہیں ہوں گے۔ ہم اپنے مکان میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ جیسے تیسے گزارہ کر ہی لیں گے۔"

افضال کا تو نہ ایک مکان اپنا تھا، نہ دوسرا۔ ایک بیگم نادرہ کے نام تھا دوسرا فاخرہ کے نام تھا لہٰذا وہ مخالفت کرنے والا کون ہوتا تھا۔ اس نے کرائے دار کو نوٹس دے دیا اور بیگم نادرہ کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔ بیگم نادرہ کو کچھ دن تو عجیب سا لگا اور پھر وہ عادی ہوتی چلی گئیں۔

افضال حنیف نے بھی کچھ دن آرام کرنے کے بعد ایک جگہ نوکری کر لی۔ آمدنی اتنی تھی کہ انہیں یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ ریٹائر ہو گئے ہیں۔

وہ اس دن گھر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک دم گھبراہٹ سی طاری ہوئی اور پھر دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ فاخرہ اپنے کمرے میں تھی، بیگم نادرہ نے گھبرا کر اسے آوازیں دیں۔ وہ آئی تو وہ بھی بہنوئی کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ دو عورتیں کس طرح سنبھالتیں، کیا کرتیں۔ فاخرہ بھاگتی ہوئی گئی اور پڑوس سے ایک لڑکے کو بلا کر لے آئی۔ جتنی دیر میں وہ ٹیکسی لاتا، افضال کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اسے پھر بھی اسپتال لے جایا گیا لیکن وہی ہوا جس کا یقین تھا۔

پلک جھپکتے کیا سے کیا ہو گیا۔ بیگم نادرہ نہ شہزادی تھیں، نہ فلسطار...... اب سہاگن بھی نہ رہیں۔ تیس سالہ بیوہ تھیں جو عدت کے دن کاٹ رہی تھیں۔ مرنے والوں کے ساتھ دوسروں کی زندگی نہیں مرجاتی۔ عدت کے دن پورے ہوتے ہی زندگی پھر اسی طرح رواں دواں ہو گئی۔ بیگم نادرہ نے بیوگی اتاری اور اسکول جانا شروع کر دیا۔

فاخرہ باقاعدگی سے کالج جا رہی تھی۔ ایک روز وہ کالج سے گھر آئی اور چابی سے دروازہ کھول کر اندر گئی تو اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ گھر میں باجی کے سوا بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے بیگم نادرہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بیڈ پر کمر کے پیچھے دو تکیے لگائے بیٹھی تھیں اور قریب پڑی کرسی پر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ لڑکا بیگم نادرہ سے بہت چھوٹا تھا۔ فاخرہ کو تعجب تو ہوا لیکن اندر جانا اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بیگم نادرہ کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی لیکن اس لڑکے نے اسے دیکھ لیا تھا اسی لیے کچھ دیر بعد بیگم نادرہ اس کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

"آج تم کالج سے کچھ جلدی نہیں آ گئیں؟"

"کالج میں اسٹرائیک ہوگئی اس لیے جلدی آگئی۔"

"میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں بھی اسکول سے جلدی آگئی تھی۔ بس حاضری لگا کر چلی آئی۔"

"باجی! یہ لڑکا کون ہے جو آپ کے کمرے میں بیٹھا ہے؟"

"میں وہی تو بتانے آئی ہوں۔ اس کا نام فیصل ہے۔"

"آپ کا شاگرد ہے؟"

"ارے نہیں۔ ایک لڑکا میری کلاس میں پڑھتا ہے۔ یہ اس کا بڑا بھائی ہے۔"

"تو یہاں کیوں آیا ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں۔ کچھ سنتی تو ہو نہیں۔ بس آگے آگے بولے جاتی ہو۔ یہ باہر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے پاس آیا ہے کہ میں اسے انگریزی پڑھا دیا کروں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے اسے بیڈ روم میں بٹھالیا۔"

"خدا کی شان، اب تم مجھے سکھاؤ گی کس کو کہاں بٹھانا ہے۔ میری طبیعت خراب تھی، میں نے اسے بیڈ روم میں بٹھالیا۔ میرا گھر ہے میں جس کو جہاں چاہوں بٹھاؤں۔ آئندہ میرے معاملے میں دخل دینے کی کوشش مت کرنا۔" انہوں نے کہا اور آندھی کی طرح کمرے سے نکل گئیں۔

یہ پہلا موقع تھا جب نادرہ نے اس سے اس لہجے میں بات کی تھی۔ اس نے بڑی بہن کے لہجے پر غور کیا تو اسے لگا جیسے اسی کی غلطی ہو۔ میں نے ہی ایسی کوئی بات کہہ دی ہوگی کہ ان کا دل ٹوٹ گیا۔ یہ لڑکا چلا جائے تو میں باجی سے معافی مانگ لوں گی۔

فاخرہ دروازے پر کان لگائے بیٹھی تھی کہ فیصل جیسے ہی جائے وہ اپنی صفائی پیش کرنے نادرہ کے کمرے میں پہنچے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے فیصل کے جانے کا احساس ہوا۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ وہ نادرہ کے کمرے سے نکل رہا تھا۔ نادرہ اسے چھوڑنے کے لیے دروازے تک گئی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ غور سے فیصل کو دیکھا۔ وہ نہایت خوبصورت لڑکا تھا۔ خوبصورتی کے علاوہ اس کے پاس کیا ہے، یہ اسے معلوم نہیں تھا اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔

اس نے سوچا تو یہی تھا کہ وہ نادرہ سے اپنے رویے کی معافی مانگے گی لیکن یہ سوچ کر اس نے ارادہ ترک کردیا کہ اس طرح تو باجی یہ سوچیں گی کہ میں ان پر شک کر رہی ہوں۔ بس جتنا معلوم کرنا تھا کرلیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی۔

"چندا، میری جان! چل اٹھ کھانا کھالے۔" اس کے کانوں میں آواز آئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بیگم نادرہ اس کے سرہانے بیٹھی بڑے پیار سے اسے جگا رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"باجی! آپ نے تو میری عادتیں خراب کردی ہیں۔ میں جب اٹھتی کھالیتی۔"

"گھر میں دو ہی تو آدمی ہیں۔ وہ بھی الگ الگ کھائیں۔ چل جلدی سے منہ ہاتھ دھولے۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

وہ کھانے کی میز پر بیٹھی تو بیگم نادرہ نے خود ہی فیصل کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"بہت ہی فرماں بردار اور ذہین لڑکا ہے۔ تم نہیں تھیں تو میرا حال بتا کر ڈاکٹر سے دوا بھی لے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا باہر کا کوئی کام ہوا کرے تو بتا دیا کریں۔ آپ کے گھر میں کوئی مرد جو نہیں ہے۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔"

"فیصل کی بات کر رہی ہوں اور کس کی۔ تم پوچھ رہی تھیں نا کہ یہ لڑکا کون ہے۔"

"اچھا وہ۔ آپ کا نیا شاگرد۔"

"ہاں اسی کا بتا رہی ہوں۔ نہایت ذہین لڑکا ہے۔ محنتی بھی ہے۔ باہر جانے کی تیاری کر رہا ہے حالانکہ دیکھو ابھی عمر ہی کیا ہے۔ ہوگا کوئی بیس بائیس سال کا۔ میں نے کہہ دیا ہے جس وقت بھی چاہے، آجایا کرو۔ جتنی انگریزی مجھے آتی ہے، سکھادوں گی۔"

ان کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ فاخرہ کے لیے اسے پسند کرچکی ہوں اس لیے فاخرہ کو بھی تجسس ہوا۔

"یہ رہتا کہاں ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا ناظم آباد میں کہیں رہتا ہے۔ اس کی ماں سوتیلی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ماں سے تعلقات اچھے نہیں ہیں ورنہ وہ مجھے اپنی ماں سے ملواتا۔"

فاخرہ کو تھوڑی دیر کے لیے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ دوسرے دن فاخرہ نے جان بوجھ کر نادرہ سے کہہ دیا کہ وہ شام تک آئے گی کیونکہ کالج میں فنکشن ہے۔ نادرہ نے اسے بخوشی اجازت دے دی۔

وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ فیصل اس کی غیر موجودگی میں کتنی دیر بیٹھتا ہے۔ وہ شام سے کچھ پہلے گھر پہنچی اور اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اندر گئی تو نادرہ گھر پر نہیں تھی۔ اس کے دل میں فوراً خیال آیا کہ باجی کو موقع مل گیا۔ وہ یقیناً فیصل کے ساتھ گئی ہوں گی لیکن فوراً ہی اس نے توبہ کی۔ میں کتنی بری ہوں، اپنی

بڑی بہن کے لیے برے خیالات دل میں لاتی ہوں۔ وہ میری شادی کے لیے فکرمند ہیں اور میں......

انہی دنوں اسکول و کالج کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔

فیصل ہر دوسرے دن آتا اور نادرہ کے کمرے میں بیٹھ جاتا تھا۔ وہ گھر میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی کہ کوئی کتاب تک اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ کیا پڑھنے آتا ہے؟ فاخرہ بھی اس خیال سے کھڑے کھڑے کمرے میں ہو آتی تھی کہ کہیں باجی برا نہ مان جائیں۔ فیصل ایسا مٹی کا مادھو تھا کہ اس نے کبھی فاخرہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، بات کرنا تو درکنار تھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ مخاطب کرتی۔

چھٹیاں گزر گئیں۔ وہ پہلے دوسرے تیسرے دن آتا تھا، اب روز آنے لگا تھا۔

فاخرہ یہ تماشا خاموشی سے دیکھتی رہی۔ بیگم نادرہ نے جب دیکھا کہ وہ تو کچھ بولتی ہی نہیں ہے تو وہ شیر بن گئیں۔ جو تھوڑا بہت تکلف تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ اب فیصل اس طرح گھر میں داخل ہوتا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ شام کو آتا اور رات گئے جاتا۔ بیگم نادرہ اتنی بے خوف ہوگئی تھیں کہ اس کے ساتھ باہر بھی جانے لگی تھیں اور لطف یہ تھا کہ فاخرہ کو بتا کر جاتی تھیں۔ فاخرہ بچی نہیں تھی۔ اب وہ بھی اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر سوچا کرتی تھی کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ کبھی سوچتی اپنے گھر میں جا کر رہ لوں۔ پھر سوچتی تھی، دنیا کتنی باتیں بنائے گی۔ کبھی خیال آتا تھا کہ جو دو چار رشتے دار ہیں، ان سے شکایت کروں لیکن پھر سوچتی تھی بڑی بہن پر الزام لگاتی ہوئی کیا اچھی لگے گی۔ ایک مرتبہ یہ بھی خیال آیا تھا کہ فیصل کی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دے لیکن وہ کسی ترکیب پر بھی عمل نہ کر سکی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی جا رہی تھی کہ ایک روز عجیب ماجرا ہوا۔ بیگم نادرہ کو بخار تھا۔ وہ فاخرہ سے کہہ کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں۔ ان کے نکلتے ہی کسی نے ڈور بیل بجائی۔ وہ اس خیال سے دروازے پر گئی کہ شاید ڈاکٹر نہیں ملا۔ باجی جلدی آگئیں۔ اس نے دروازہ کھولا اور یہ دیکھے بغیر کہ دروازے پر کون ہے واپس پلٹی۔ چند قدم چل کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی اور ہے۔ دیکھا تو وہ فیصل تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت اس کی بے عزتی کر کے نکال دے لیکن وہ ایسا کر نہیں سکی۔ اسے نادرہ کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔

''اس وقت باجی گھر پر نہیں ہیں، آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیں۔''

''چلو اچھا ہوا۔ مجھے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

''کیسی بات؟''

''مجھے بیٹھنے تو دیں پھر آرام سے بتاتا ہوں۔''

''آپ کو جو بات کرنی ہے، باجی کے سامنے کیجیے گا۔''

''ان کے سامنے کر کے دیکھ چکا اور ٹکا سا جواب مل گیا۔ آپ سے اور کر کے دیکھ لوں۔ اگر آپ نے بھی جواب انکار میں دیا تو میں یہاں آنا چھوڑ دوں گا۔''

فاخرہ خوش ہوگئی کہ چلو جان چھوٹی۔ ایسی ترکیب لڑاؤں گی کہ وہ ادھر کا راستہ ہی بھول جائے گا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

''پہلے ایک گرم گرم چائے ہو جائے، اس کے بعد بات ہوگی۔'' اس نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔

فاخرہ کو تجسس ہو گیا تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے اس لیے فرمائش پوری کرنے باورچی خانے میں چلی گئی اور چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے فاخرہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

''تمہیں معلوم ہے، میں یہاں کیوں آتا ہوں؟''

''میں نجومی تو ہوں نہیں۔ یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔''

''تم یہی سمجھتی ہوگی کہ میں تمہاری باجی کی وجہ سے یہاں آتا ہوں؟''

''اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے۔ آپ کی انہی سے دوستی ہے۔''

''یہ دوستی کس وجہ سے ہے، وجہ نہیں پوچھو گی؟''

''یہ بھی آپ ہی بتا دیں تو اچھا ہے۔''

''فاخرہ! میں یہاں تمہاری وجہ سے آتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا ہی میری منزل ہے۔ میں اب سے پہلے تمہیں اس لیے نہیں بتا سکا کہ میں پہلے نادرہ باجی کے دل میں گھر کرنا چاہتا تھا۔''

''تو گھر کر لیا؟''

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اب میں تمہارا رشتہ مانگوں گا تو وہ انکار نہیں کریں گی لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا۔ اب شاید میں یہاں نہ آسکوں۔ میں نے تمہیں اپنی پسند بتا دی ہے۔ اگر تم بھی انکار کر دو گی تو پھر میرا یہاں آنا فضول ہے۔''

''آپ چائے پئیں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''آپ نے جواب نہیں دیا۔''

وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ بیگم نادرہ آگئیں۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں کہ فاخرہ نے ان کے مہمان کو چائے بنا کر دی ہے اور باتیں بھی کر رہی ہے۔ اب سے پہلے وہ خود

کو چور سا محسوس کرتی تھیں۔ احساس جرم سا ہوتا تھا کہ فاخرہ اس کا آنا پسند نہیں کرتی۔ دو گھڑی بیٹھ کر بات نہیں کرتی۔
نادرہ کو دیکھتے ہی فاخرہ وہاں سے اٹھ گئی۔ نادرہ نے بھی اسے بیٹھنے کو نہیں کہا۔
''تم نے کیا جادو کر دیا۔''
''کیسا جادو؟''
''فاخرہ اور تمہارے لیے چائے بنائے؟''
''دیکھ لو ہم ایسے ہی جادوگر ہیں۔ خود ہی کہنے لگی، فیصل بھائی آپ کے لیے چائے بناؤں۔ مجھے کیوں انکار ہوتا۔''
''یہ بہت اچھا ہوا۔ مجھے احساس جرم ہوتا تھا کہ فاخرہ مجھے اچھا نہیں سمجھتی۔ اچھا نہیں لگتا تھا کہ تم آؤ اور وہ تم سے بات نہ کرے۔''
''بابدولت کو کسی اور سے سروکار بھی نہیں۔ ہمیں تو آپ سے غرض ہے۔''
فاخرہ ان باتوں سے بے خبر اپنے کمرے میں تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے فیصل سے ہونے والی گفتگو پر غور کر رہی تھی۔ بات ہی ایسی تھی کہ اس کے اندر خوشی پھوٹ رہی تھی۔
یہ سن کر اسے خوشی ہوئی تھی کہ فیصل اس کی وجہ سے یہاں آتا ہے۔ اس کی شرافت کی بھی قائل ہو رہی تھی کہ اس نے براہِ راست اس سے بات کرنے کے بجائے میری بہن سے بات کی۔ آج تک اس نے مجھ سے ایسی ویسی بات نہیں کی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بہن نے... خودغرضی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے رشتہ مانگا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اسے اپنے لیے پسند کر چکی ہیں۔
وہ نہ کریں فیصل سے میری شادی، ملنے جلنے سے تو نہیں روک سکتیں۔ اب دیکھو میں ان کے ساتھ کس طرح کھیلتی ہوں۔
وہ اس لیے باہر نکلی تھی کہ فیصل سے اشاروں اشاروں میں کہہ سکے کہ وہ کل ضرور آئے لیکن وہ باہر آئی تو وہ جا چکا تھا۔ خوشی نے اس کے انگ انگ کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ کبھی اتنی جلدی نہیں جاتا تھا۔ چلا گیا اس کا مطلب ہے باجی سے اسے اب کوئی مطلب نہیں۔ اسے جو بات کہنی تھی، مجھ سے کہہ دی۔ اب وہ آئے گا تو صرف میرے پاس آئے گا۔ اب تک میں کڑھتی رہی تھی، اب باجی کو جلاؤں گی۔
دوسرے دن نادرہ اسکول چلی گئی، فاخرہ گھر پر تھی۔ اسے یقین تھا کہ فیصل ضرور آئے گا لیکن وقت گزرتا گیا۔ نادرہ اسکول سے آ گئی لیکن فیصل نہیں آیا۔ اب اگر آتا بھی تو نادرہ کے پاس بیٹھتا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بار بار دروازے سے جھانک کر دیکھ لیتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ ان کے کمرے میں بھی گئی۔ کہیں وہ میری طرف سے مایوس تو نہیں ہو گیا۔ اس نے کہا بھی تھا کہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ کہیں وہ میری خاموشی کو انکار تو نہیں سمجھا۔ باجی نے تو اسے منع نہیں کر دیا۔ طرح طرح کے اندیشے اس کے دل میں آ رہے تھے۔
شام ہو گئی اور وہ نہیں آیا۔ دوسرا دن بھی اسی انتظار میں گزر گیا۔
فیصل چالاک لڑکا تھا۔ اس کی آتش شوق کو بھڑکا رہا تھا۔ بالآخر تیسرے دن اس نے گھر میں قدم رکھا۔
وہ ہوشیار تھا، آیا اسی وقت تھا جب نادرہ کو اسکول میں ہونا چاہیے تھا۔ فاخرہ اس تپاک سے ملی کہ کبھی نادرہ نے بھی اس کا استقبال نہیں کیا ہوگا۔ بس پلکیں بچھانے کی دیر تھی۔
''دو دن سے کہاں تھے؟''
''تم سے باتیں کرنے کے لیے ہمت جمع کر رہا تھا۔''
''باجی سے ملنے تو روز آ جاتے تھے۔''
''بس دینے لگیں طعنے۔ کیا اب بھی یقین نہیں آیا کہ میں نادرہ باجی سے ملنے نہیں آتا تھا۔ ان کا اور میرا بھلا کیا جوڑ۔ میرا نصیب تو تم ہو۔''
''تم تو کہہ رہے تھے، باجی نے انکار کر دیا ہے۔''
''ہاں اور ان کے رویے سے لگتا ہے، گھر آنے کو بھی منع کر دیں گی۔''
''واہ! وہ کون ہوتی ہیں مجھے منع کرنے والی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں میرے مکان کے کرائے سے یہ گھر چل رہا ہے۔ زیادہ نخرے دکھائیں گی تو اٹھ کر چلی جاؤں گی اپنے مکان میں۔ پانچ سو گز کا بنگلا ہے میرا۔''
''اس میں نادرہ باجی کا بھی تو حصہ ہوگا۔''
''جی نہیں۔ میرے ڈیڈی نے وہ بنگلا میرے نام کر دیا تھا۔''
''یہ کیا ہم بنگلوں اور مکانوں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ محبت ان سب چیزوں کو نہیں دیکھتی۔ مجھے تم پسند ہو۔ اب یہ بتاؤ اگر نادرہ باجی ہمارے راستے میں آئیں تو تم میرا ساتھ دو گی؟''
''فیصل! وہ یہ غلطی کبھی نہیں کریں گی کہ میرے راستے میں آئیں اور اگر آئیں تو میں اپنا راستہ الگ کر لوں گی۔''
''فاخرہ! اب میں یہاں آتے ہوئے ڈرنے لگا ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم باہر ملا کریں؟''
''مجھے خود پر اعتماد ہے۔ باہر ملنے پر اعتراض نہیں لیکن میں تمہارا خوف دور کرنا چاہتی ہوں۔ تم اسی طرح آتے رہو جس طرح آتے ہو۔''

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ نادرہ باجی کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''آتی ہیں تو آنے دو۔ وہ بھی تو دیکھ لیں کہ اب تم ان کے پاس نہیں، میرے پاس آتے ہو۔''

وہ بیٹھ گیا بلکہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ نادرہ گھر میں داخل ہوئی۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ آواز سن کر فاخرہ کے کمرے کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر کمرے میں آگئی۔

''ارے فیصل تم! تم کب آئے؟''

''بس ابھی آیا ہوں۔ میں سمجھا تھا آپ آگئی ہوں گی۔''

''ہاں، آج مجھے کچھ دیر ہوگئی۔'' انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ فاخرہ نے فیصل کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور نادرہ کے کمرے میں چلا گیا۔

فاخرہ نے نادرہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے تیر نشانے پر لگ گیا ہے۔ انہیں یہ قطعی اچھا نہیں لگا ہوگا کہ فیصل اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

فاخرہ نے فیصل سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس وقت آیا کرے جب باجی گھر پر نہ ہوں۔ وہ یقیناً خود بھی یہی چاہتا ہوگا۔ نادرہ کی آنکھوں سے دور رہ کر وہ اپنی محبت میں گم تھی۔ اس کی کم عمری اسے تیز دوڑنے پر مجبور کر رہی تھی۔ فیصل کے بغیر اسے ایک پل چین نہ آتا تھا۔ سوچتی تھی جلد سے جلد وہ وقت آجائے کہ فیصل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ فیصل سے اس کی شادی ہو جائے اور شادی کے لیے بقول فیصل، نادرہ نے انکار کر دیا تھا۔ فاخرہ اس کو اپنی جیت سمجھ رہی تھی کہ نادرہ کے نہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے ملنے آرہا تھا۔ نادرہ کو اس سے جو تکلیف پہنچ رہی ہوگی، فاخرہ کے لیے یہی خوشی تھی۔

فیصل بڑی چالاکی سے دو کشتیوں پر بڑی کامیابی سے سفر کر رہا تھا۔ جب آتا نادرہ کی دلجوئی میں لگا رہتا، فرصت ملتی تو فاخرہ کے کمرے میں چلا آتا۔

نادرہ اس صورتِ حال کو تو برداشت کرتی رہی تھی لیکن فیصل نے بڑی چالاکی سے چال بدل دی۔ اب وہ آتا تو سیدھا فاخرہ کے کمرے میں چلا جاتا۔ وہاں سے نکلتا تو دروازے کی راہ پکڑتا۔ فاخرہ نے اس کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں دیکھ رہی ہوں تم نے باجی سے بالکل ہی کنارہ کشی کر لی ہے۔''

''میں نے نہیں، کنارہ کشی انہوں نے کر لی ہے۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ ان کی مرضی تو یہ ہے کہ میں یہاں آنا ہی بند کر دوں۔''

''کچھ بھی ہے، تمہیں چاہیے کہ تم ان سے بنا کر رکھو۔ وہ بڑی ہیں ان کی ناراضی ہماری شادی میں رخنہ ڈال سکتی ہے۔''

''وہ تو یہ چاہتی ہیں کہ میں یہاں نہ آؤں۔ تو کیا نہ آؤں؟''

''یہ حرکت کبھی نہ کرنا۔ یہ میرا گھر ہے۔ وہ منع بھی کریں تو آنا نہ چھوڑنا۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ ان کو اپنی مٹھی میں رکھو۔''

اب فیصل سمجھ گیا تھا کہ نادرہ اس کی مٹھی میں ہو نہ ہو، فاخرہ پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔ اسے مزید آزمانے کے لیے اس نے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ ایک دن بہت گھبرایا ہوا آیا۔

''فاخرہ! اس وقت میں بہت مشکل میں ہوں۔ تم میرا ایک کام کر دو۔ نادرہ باجی تو ان دنوں مجھ سے ناراض ہیں ورنہ میں ان سے خود کہتا۔ تم میری طرف سے کہہ کر ایک لاکھ روپے کا بندوبست کرا دو۔ میرے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، کل اس کا آپریشن ہے۔ دو لاکھ کا خرچہ ہے۔ ایک لاکھ میرے پاس ہیں ایک لاکھ کی کمی پڑ رہی ہے۔ میں جلد ہی واپس کر دوں گا۔''

''جب میں ہوں تو نادرہ باجی سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''نہیں فاخرہ نہیں۔ تم سے نہیں۔ نادرہ باجی میری بڑی بہن کی طرح ہیں۔ ان سے تو مانگ سکتا ہوں، تم سے نہیں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ نادرہ باجی کو اب تک تم اپنا سمجھتے ہو اور مجھے غیر۔''

''فاخرہ! یہ بات نہیں۔ بس تم سے نہیں۔ میں کہیں اور دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اگر تم اس وقت چلے گئے تو پھر کبھی نہ آنا۔ دوست بھی کہتے ہو اور دوست کی مدد لینے سے انکار بھی کرتے ہو۔''

''پھر کیا کروں فاخرہ؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ تم سے مانگوں۔''

''چلو اٹھو، اسی وقت میرے ساتھ بینک چلو۔ اچھا ہے اس وقت باجی بھی گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ اسی وقت اسے بینک لے کر چلی گئی۔

''میرے اکاؤنٹ میں تو شاید اتنے پیسے نہ ہوں۔ کچھ زیور رکھا ہوا ہے، اس میں سے کچھ نکلوائے لیتی ہوں۔ ابھی بازار جا کر بیچ دوں گی۔ انتظام ہو جائے گا۔''

اس نے لاکر سے کچھ زیور نکلوایا اور فیصل کے ساتھ بازار چلی گئی۔ جیولر نے اس زیور کے ڈیڑھ لاکھ لگائے۔ فیصل نے ایک لاکھ مانگے تھے لیکن فاخرہ نے پورے ڈیڑھ لاکھ اسے دے دیے۔

''پچاس ہزار اوپر سے رکھ لو۔ کیا پتا زیادہ کی ضرورت پڑ جائے۔''

''تمہارا شکریہ فاخرہ۔ کوشش کروں گا کہ یہ پیسے جلد لوٹا دوں۔''

''کیا غیروں کی طرح بات کرتے ہو۔ اگر اور بھی ضرورت ہو تو مانگ لینا۔''

اس نے تکلفاً کہہ دیا تھا لیکن ایک ہفتے بعد فیصل کو پھر ضرورت پڑ گئی۔ فاخرہ کی تعلیم کا اب آخری سال تھا۔ فیصل نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس کی تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ اس سے شادی کرلے گا۔ اسے مزید خوش کرنے کے لیے اس نے یہ آسرا بھی دے دیا تھا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ مل کر اپنا بزنس شروع کرنے والا ہے۔

کالج کھل گئے تھے اس لیے صبح کے وقت وہ اس سے نہیں مل سکتی تھی۔ فیصل نہیں چاہتا تھا کہ نادرہ کی موجودگی میں وہ اس سے ملنے آئے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا۔ فیصل اس کے کالج پہنچ گیا اور اس کا کزن بن کر اسے چھٹی دلا دی۔

''فیصل! تم نے یہ کیا غضب کیا۔ فلسفے کا پیریڈ چل رہا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ مضمون ہے اور تم مجھے چھٹی دلانے آ دھمکے۔''

''پورے دو دن ہو گئے تھے تمہیں دیکھے ہوئے۔ آؤ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ باہر گھومنے نکلی تھی۔ جب ایک مرتبہ پاؤں کھل گیا تو آگے بڑھتا ہی گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ اسے لے کر کسی ریسٹورنٹ یا کسی پارک میں چلا جاتا۔ فاخرہ کو معلوم تھا کہ وہ ابھی بے روزگار ہے اس لیے اپنی بچی کچی رقم اس پر لٹا رہی تھی۔ چپکے چپکے چھوٹا موٹا زیور بھی ٹھکانے لگاتی جا رہی تھی۔ ایک روز فیصل اسے لے کر اپنے ایک دوست کے آفس پہنچ گیا۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟''

''یہی تو وہ دوست ہے جس کے ساتھ مل کر میں اپنا بزنس شروع کرنے والا ہوں۔ میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنے والا ہوں۔ میرے ساتھ ذرا... بے تکلفی سے ملنا تاکہ اسے یقین آجائے۔ میں اس سے یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ تم ایک دولت مند لڑکی ہو۔ پانچ سو گز کے شاندار بنگلے کی مالک ہو۔ اس کے کاغذات دکھا کر ہم بینک سے بہت بڑا قرض لے سکتے ہیں۔''

فیصل اسے لے کر پہنچ تو گیا لیکن اس کا دوست اس وقت موجود نہیں تھا۔

''آؤ نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''نیچے کہاں؟''

''خاص مہمانوں کے لیے تہ خانے میں ڈرائنگ روم بنایا گیا ہے۔''

''اچھا نہیں لگتا کہ ہم تہ خانے میں جا کر بیٹھیں۔''

''تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟''

''بھروسا نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ آتی کیوں؟''

''تو پھر چلو۔''

وہ دیگر ملازموں کے سامنے تماشا بننا نہیں چاہتی تھی لہٰذا تہ خانے کی سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ ابھی ڈر رہی تھی۔ اس کی جان میں جان اس وقت آئی جب فیصل کا دوست بھی وہاں پہنچ گیا۔

''عدنان! یہ ہیں بیگم فاخرہ۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ان سے شادی کرنے والا ہوں۔''

''فیصل! میں تمہارے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔'' عدنان نے کہا اور شیک ہینڈ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ گھبراہٹ میں فاخرہ نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

فیصل نے فاخرہ کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور اسے لے کر صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی اس سے لگ کر بیٹھ گیا۔ عدنان کچھ فاصلے پر دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ فیصل نے فاخرہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔ فاخرہ نے ابھی دنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

فیصل آج ایسی ایسی حرکتیں کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ ایک مرتبہ تو اس نے حد ہی کردی۔ فاخرہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ جب وہ اٹھنے لگے تو فیصل اس کے اتنے قریب ہوگیا جسے گلے ملنا کہہ سکتے ہیں۔

جب وہ وہاں سے باہر نکلے تو فاخرہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

''میں تو تم پر بھروسا کرتی تھی لیکن تم نے آج اچھی حرکتیں نہیں کیں۔ اب میں تمہارے ساتھ یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔''

''تم کہتی ہو تو یہاں نہیں آئیں گے۔ جنہیں تم حرکتیں کہہ رہی ہو وہ تو میں نے اس لیے کیں کہ عدنان کو یہ یقین دلا سکوں کہ تم میری ہو۔ اس کے بغیر وہ اپنے پیسے میرے بزنس میں کیوں لگائے گا۔ میں اسے یقین دلا چکا ہوں کہ تم ایک دولت مند لڑکی ہو اور تم میری ہو۔''

فاخرہ کی خفگی دور ہوگئی۔ بات اس کی سمجھ میں آچکی تھی۔
محبت اندھی نہیں ہوتی محبت کرنے والے اندھے ہوجاتے ہیں۔ وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی کسی تفریح گاہ میں نہیں۔ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا ہے جبکہ بیگم نادرہ کو ادھر ادھر سے خبر مل گئی تھی کہ ان کے ڈر کی وجہ سے فیصل نے آنا تو بند کردیا ہے لیکن وہ دونوں باہر ملتے ہیں۔
''اب تم گھر سے باہر بھی فیصل سے ملنے لگی ہو؟''
ایک دن نادرہ نے اسکول سے آتے ہی اس سے پوچھا۔
''جب آپ نے اسے گھر آنے سے منع کردیا تو اور کیا کرتی۔ گھر سے باہر ہی مل سکتی تھی۔''
''تمہیں شرم تو آتی نہیں ہے یہ کہتے ہوئے۔''
''جب وہ آپ سے ملنے آتا تھا تو آپ کو شرم آتی تھی؟'' اس نے اتنی گستاخی سے کہا کہ نادرہ کا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ فاخرہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔
گھر میں تھا ہی کون۔ دو بندے وہ بھی اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔ موت کے سناٹے نے چادر بچھادی۔ ایسی رات اس گھر میں کبھی نہیں اتری تھی۔ صبح ہوئی تو نہ نادرہ اسکول گئی نہ فاخرہ کالج۔ دن چڑھا تو بیگم نادرہ کی محبت نے جوش مارا۔ انہوں نے فاخرہ کو ماں بن کر پالا تھا۔ وہ اس سے سترہ سال چھوٹی تھی۔ جو تھپڑ انہوں نے فاخرہ کے مارا تھا، فاخرہ کے دل پر لگا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی وہ تڑپ کر اٹھیں اور فاخرہ کے کمرے میں پہنچ گئیں۔
''میری بچی، میری بہن!'' وہ اس کے سرہانے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔
''آپ جو کہنے آئی ہیں، وہ کہے بغیر لوٹ جائیں۔''
''میری چندا! تیرا غصہ اب تک نہیں اترا۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں تیرے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔''
''میں اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہوں۔''
''تو نہیں سمجھتی۔ تو نادان ہے۔''
''اگر آپ کو فیصل کے ساتھ میرا گھومنا برا لگتا ہے تو میری شادی اس سے کیوں نہیں کرادیتیں؟''
''اس لیے کہ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔''
''کل تک تو وہ بہت اچھا تھا۔ اس نے آپ کو گھاس نہیں ڈالی تو برا ہوگیا۔''
بات ایسی تھی کہ بیگم نادرہ ایک تھپڑ اور مارتیں تو جائز تھا لیکن وہ ضبط کرگئیں۔ ان کے آنسو بہن کی محبت کی گواہی دے رہے تھے۔ فاخرہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

''باجی! اگر اس نے آپ کو پروپوز نہیں کیا اور مجھے کردیا تو آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کے آنسو بتا رہے ہیں کہ آپ میری خوشی میں خوش نہیں۔ مجھے آپ کی پروا نہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں فیصل سے شادی کروں گی۔ آپ کون ہوتی ہیں میرا فیصلہ کرنے والی۔''
''میں تیری ماں کی جگہ ہوں میری جان۔''
''میں بھی آپ کی عزت کرتی ہوں لیکن یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ شادی کروں گی تو فیصل سے۔ میں آپ کی خاطر یہ قربانی دے سکتی ہوں کہ اس سے شادی نہ کروں لیکن اس سے دوستی تو رکھوں گی۔''
''بیٹا اس کے بارے میں جتنا میں جانتی ہوں تم نہیں جانتیں۔ اس سے کوئی بھی تعلق رکھو، وہ تمہیں برباد کردے گا۔''
''آپ میری نہیں، اپنی فکر کریں۔''
''اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے، یہ میں پھر کسی وقت بتاؤں گی۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل گئیں۔
محبت وہ بھی کچھ کم نہیں کرتی تھی۔ نادرہ کی حالت پر اسے ترس آنے لگا۔ بے چاری فیصل سے محبت کرنے لگی ہیں اور اب مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے ورغلا رہی ہیں۔ اس میں ان کا کیا قصور۔ وہ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہیں۔
بیگم نادرہ کو کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد پھر آگئیں۔
''میری بات مان لے۔ فیصل کو یہاں آنے سے منع کردے۔ میں تیری شادی بہت اچھی جگہ کراؤں گی۔''
''میں راستے سے ہٹ جاتی ہوں۔ آپ اس سے شادی کرلیں گی۔''
''میں تجھے سچی بات بتاؤں۔ میں نے یہ سوچا ضرور تھا لیکن وہ پرخلوص ثابت نہیں ہوا۔ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹا... میں تجھے کبھی اپنا زیور دکھاؤں گی۔ اس نے بہانے بہانے سے میرا آدھا زیور بکوادیا۔ اب وہ تمہیں لوٹنے کے لیے شیشے میں اتار رہا ہے۔''
فاخرہ دل ہی دل میں ان کی چالاکی کی داد دے رہی تھی۔ میرا دل اس کی طرف سے برا کرنے کے لیے اس پر الزام لگا رہی ہیں۔ یہ اتنی سیدھی ہیں کہ اسے اپنا زیور دے دیں گی۔
بیگم نادرہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن فاخرہ کے دل میں فیصل کی طرف سے برائی پیدا نہ کرسکیں بلکہ وہ اور زیادہ ضد میں آگئی۔ وہ محتاط ہوگئی تھی لیکن اب اس نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ دیں۔ فیصل سے اس نے

کہہ دیا کہ نہ صرف آیا کرے بلکہ نادرہ کی موجودگی میں آیا کرے۔ اس نے پھر آنا شروع کر دیا۔ کئی کئی گھنٹے فاخرہ کے پاس بیٹھتا اور پھر چلا جاتا۔ وہ دونوں ایک کمرے میں بند رہتے اور نادرہ اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کے جانے کے بعد فاخرہ... کو سمجھانے بیٹھ جاتیں اور بالآخر اس دھمکی کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گئیں کہ اگر اسے زیادہ سمجھانے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے بنگلے میں ایک کمرا کرایہ داروں سے خالی کرا کے رہنے لگے گی۔ نادرہ نے سمجھانا چھوڑ دیا۔

فاخرہ بے خوف فیصل کی لچھے دار باتوں کے جھولے میں جھول رہی تھی۔ بیگم نادرہ بھی کیا کرتیں۔ انہوں نے فاخرہ سے کہہ دیا کہ وہ فیصل سے کہے وہ مجھ سے بات کرے، میں تمہاری شادی اس سے کرا دوں گی۔ ''اگر تم برباد ہونا ہی چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم نے میرے تجربے سے سبق نہیں سیکھا۔ تم اس سے شادی پر بضد ہو تو اس سے کہو مجھ سے بات کرے۔''

فاخرہ بہن کی طرف سے اتنی بدظن تھی کہ نہایت بدتمیزی سے اس کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

''آپ اپنی پیش کش اپنے پاس رکھیں۔ مجھے اگر شادی کرنی ہو گی تو خود کر لوں گی۔''

''شادی بیاہ کے معاملات بڑے نمٹاتے ہیں بیٹا۔''

''آپ بڑی نہیں، میری رقیب ہیں۔ اب میں آپ سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ فیصل کو آنے دیں، میں اس سے خود بات کر لوں گی۔''

بیگم نادرہ اندر سے ٹوٹ سی گئیں۔ فاخرہ کے سوا دنیا میں ان کا تھا بھی کون اور اب وہ بھی دشمن بنی ہوئی تھی۔ انہیں خود پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے یہ تک معلوم نہیں کیا کہ فیصل رہتا کہاں ہے۔ میں خود اس کے گھر جاتی اور ہاتھ جوڑ کر اس سے کہتی کہ وہ فاخرہ کے جذبات سے کھیلنا بند کر دے اور اس سے شادی کر لے۔ میری بہن میری اولاد کی طرح ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

فیصل روز ہی آتا تھا، اس روز بھی آیا۔ فاخرہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس سے شادی کی بات کرے گی لیکن اس سے پہلے فیصل نے کوئی اور ہی بات چھیڑ دی۔

''فاخرہ! آج میں بہت خوش ہوں۔ پوچھو کیوں؟ میں نے اور میرے دوست نے ایک جگہ کرائے پر لے لی ہے۔ بس بزنس شروع ہی ہونے والا ہے۔''

''میں تم سے ایک اور بات کرنے والی تھی۔''

''میں اس وقت اپنی پیاری سی فاخرہ کے پاس ایک پیاری سی خواہش لے کر آیا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے تم کیا کہنے والے ہو۔ میں بھی یہی کہنے والی تھی۔''

''بزنس شروع کرنے کے لیے رقم کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ تم اپنے بنگلے کے کاغذات مجھے دے دو۔ کاغذات کو بینک میں رکھوا کے قرض لیا جا سکتا ہے۔ ایک سال نہیں گزرے گا کہ قرض اتر جائے گا۔ کاغذات پھر تمہارے پاس ہوں گے۔''

''فیصل! باجی نے بہت ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ ہمیں جلد شادی کرنی ہو گی ورنہ وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، جلدی سے بزنس شروع ہو اور میں اڑن کھٹولے پر بٹھا کر تمہیں یہاں سے اڑا لے جاؤں۔''

''تم سمجھتے نہیں ہو، اب اس گھر میں رہنا میرے لیے مشکل ہو گیا ہے۔''

''تم نے اپنے بنگلے کے کاغذات بینک لاکر میں رکھے ہوئے ہیں یا گھر میں ہیں؟''

''فیصل! میں لڑکی ہو کر اپنی شادی کے لیے خود کہہ رہی ہوں اور تم ہو کہ دوسری باتیں لے کر بیٹھ گئے۔''

''میں بھی تو شادی ہی کی بات کر رہا ہوں۔ بینک سے قرضہ ملتے ہی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں لگے گا۔ بزنس شروع ہوتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔''

''کیا جو لوگ بزنس نہیں کرتے، ان کی شادیاں نہیں ہوتیں؟''

''وہ نوکری تو کرتے ہوں گے...... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ ہر حال میں گزارہ کر لوں گی۔ میرے پاس اتنے پیسے تو ہیں کہ جب تک تمہاری کہیں نوکری نہیں لگ جاتی، ہم بھوکے نہیں مریں گے۔''

''میں نادرہ باجی سے بات کر چکا ہوں۔ وہ اس شادی پر تیار نہیں۔ بینک سے قرض مل جائے گا تو میں مضبوط ہو جاؤں گا پھر ہمیں شادی کرنے کے لیے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

''یہ بات پہلے کی تھی۔ اب وہ خود چاہتی ہیں کہ میری شادی تم سے ہو جائے۔ تمہیں یقین نہیں ہے تو میں انہیں بلائے لیتی ہوں۔ ان سے خود پوچھ لو۔''

''یہاں مت بلاؤ۔ اگر تم کہتی ہو تو میں ان کے کمرے میں جا کر بات کر لیتا ہوں۔ دیکھ لینا انکار کر دیں گی۔''

وہ اٹھ کر نادرہ کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد فاخرہ بھی اپنے کمرے سے نکلی اور نادرہ کے

کمرے کے باہر ایک ایسی جگہ کھڑی ہوگئی جہاں اندر کی آواز باہر آسکتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ فیصل کیا بات کرتا ہے اور نادرہ کیا جواب دیتی ہے۔

''مجھے فاخرہ نے بتایا ہے کہ آپ میری شادی اس سے کرانے پر تیار ہوگئی ہیں؟''

''ہاں، یہ کڑوی دوا مجھے پینی پڑ گئی۔ تم اس کے لائق تو نہیں ہو لیکن وہ بے وقوف سمجھتی نہیں تو میں کیا کرسکتی ہوں۔''

''سنا ہے پانچ سو گز کا بنگلا اس کے نام ہے؟''

''یہ کون سی ڈھکی چھپی بات ہے۔ ہمارے گھر کی کون سی بات ہے، جس سے تم واقف نہیں۔''

''اس سے کہو وہ بنگلا میرے نام کر دے، میں شادی کرلوں گا۔''

''یہ تم شادی کر رہے ہو یا سودا؟''

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔ میں باہر جاکر کہہ دوں گا کہ آپ اس شادی کے لیے تیار نہیں بلکہ آپ چاہتی ہیں کہ میں شادی آپ سے کروں۔''

''کتنے ذلیل ہو تم۔ اب یہ بتاؤ کہ فاخرہ کی زندگی سے نکلنے کے لیے تم کتنی رقم لوگے۔ میں یہ رقم تمہارے منہ پر ماروں گی۔ پھر کبھی اپنا منحوس چہرہ نہیں دکھانا۔''

''زیادہ نہیں صرف پانچ لاکھ۔''

''کتنی کم قیمت ہے تمہاری۔ کل یہ رقم آکر لے جانا اور پھر کبھی منہ نہ دکھانا اور ہاں، فاخرہ کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تم اسے اپنے بے وفا ہونے کا تاثر دوگے۔''

''فاخرہ اب اس قابل رہی بھی نہیں ہے کہ میں اس سے شادی کروں۔ اس سے تو اب وہی شادی کرے گا جو اس کے ماضی سے واقف نہ ہو۔''

فاخرہ کو احساس ہوگیا تھا کہ اب بات ختم ہو چکی۔ فیصل کسی وقت بھی باہر آسکتا ہے۔ اس کے پاؤں چلنے سے انکار کر رہے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے تک پہنچ ہی گئی۔

اسے توقع تو نہیں تھی کہ فیصل اس کے کمرے میں آئے گا لیکن وہ تو ایک تیر سے دو شکار کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف اس کے کمرے میں آیا بلکہ آتے ہی نادرہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

''یہ تمہاری بہن ہے۔ اسے تم بہن کہتی ہو۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ کہہ رہی ہیں یا تو میں ان سے شادی کروں یا پانچ لاکھ روپے لے کر تمہاری دنیا سے نکل جاؤں۔''

''تم دونوں شرطیں ماننے میں آزاد ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''فاخرہ! یہ تم کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔ میں اب بھی کہہ رہا ہوں تم اپنے بنگلے کے کاغذات مجھے دے دو۔ میں اپنا بزنس شروع کرتے ہی تم سے شادی کرلوں گا۔''

''میں اپنی بہن کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ میں سمجھوں گی تم میرے راستے میں آئے ہی نہیں تھے۔ اگر تمہیں پانچ لاکھ روپے مل رہے ہیں تو لے لو۔ اپنا بزنس شروع کرو۔ تم واقعی بزنس مین ہو۔ خوب ترقی کروگے۔ کسی دولت مند لڑکی سے شادی کر لینا، مزید ترقی کروگے۔ اب تم جاسکتے ہو۔''

فیصل نے اس کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے کمرہ اندر سے بند کیا اور تقدیر کا ماتم کرنے بیٹھ گئی۔ اس نے اگر اپنے کانوں سے سب کچھ نہ سن لیا ہوتا تو اسے کبھی یقین نہ آتا کہ فیصل کے خوبصورت چہرے کے پیچھے کیسا بھیانک چہرہ چھپا ہوا ہے۔ اب نادرہ کی کہی ہوئی ایک ایک بات اسے سچ نظر آرہی تھی۔ وہ سچ کہہ رہی تھیں کہ فیصل برا لڑکا ہے۔ اس نے نادرہ کو اپنا دشمن سمجھ لیا تھا مگر اب سب سے بڑی دوست نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے کتنی بڑی تباہی سے اسے بچالیا تھا۔ وہ سوچوں کے سفر میں اتنی دور نکل گئی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکی۔ نادرہ دیوانوں کی طرح دروازہ پیٹ رہی تھی۔

''دروازہ کھول، فاخرہ۔''

''میں اتنی عظیم بہن کا سامنا کیسے کروں گی۔ میں دروازہ کیسے کھولوں۔ میں نے ان پر شک کیا تھا۔ میں کس طرح ان کے سامنے جاؤں۔''

''دروازہ کھول دے فاخرہ۔ تجھے میری جان کی قسم، دروازہ کھول دے۔''

اس قسم کے بعد وہ اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ نادرہ کو دیکھتے ہی وہ اس کے پیروں پر گر گئی۔

''باجی! میں آپ کی مجرم ہوں۔ میں نہ آپ کو پہچان سکی، نہ فیصل کو۔ میں نے اس پر بھروسا کر کے آپ پر شک کیا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔''

''ایسا کیا ہوگیا جو تو اس طرح رو رہی ہے۔ کیا کہہ گیا

وہ مردود فیصل تجھ سے۔“

”وہ کیا کہتا۔ اس نے جو کچھ آپ سے کہا، میں نے اپنے کانوں سے سن لیا۔ اس کی نیت کا جھوٹ مجھ پر کھل گیا ہے باجی۔“

”میری گڑیا! میں نے تجھے اس لیے نہیں پالا تھا کہ تیری آنکھوں میں آنسو دیکھوں۔ اس ناقدرے کے لیے اپنے قیمتی آنسو ضائع مت کر۔ یہ آنسو پونچھ لے۔ شکر بھیج کہ برباد ہونے سے پہلے ہمیں ہوش آگیا۔“

”آپ نے اسے پانچ لاکھ روپے دینے کی بات کیوں کی؟“

”میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ تم ہماری باتیں ضرور سن رہی ہوگی۔ میں تمہیں سنانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا کم قیمت ہے۔ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ میں پانچ لاکھ کو ٹھوکر مارتا ہوں، مجھے فاخرہ چاہیے لیکن وہ تو اتنی آسانی سے تمہاری دنیا سے نکلنے کو تیار ہو گیا جیسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔“

”باجی! اب اسے ایک روپیا دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ کیا میری دنیا سے نکلے گا، میں خود اس کی دنیا سے نکل گئی ہوں۔ اب وہ یہاں آکر تو دیکھے۔“

”تم ابھی بچی ہو۔ وہ اتنی آسانی سے جانے والا نہیں۔ مجھے اس کی قیمت ادا کرنے دو۔ ہم دونوں یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ محلے والے اسے آتا جاتا دیکھتے رہے ہیں۔ وہ کوئی بھی الزام لگا سکتا ہے۔ ہمیں عقل مندی سے کام لینا ہوگا۔ میں ہی اسے لے کر آئی تھی، میں ہی اسے نکالوں گی۔“

”وہ اگر اس کے بعد بھی آتا رہا تو آپ کیسے روکیں گی؟ الزام تو وہ پیسے لینے کے بعد بھی لگا سکتا ہے۔“

”اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہے، یہ میں بعد میں سوچوں گی۔ ابھی تو اس کا منہ بند کرنا ضروری ہے۔ کچھ دن کے لیے وہ خاموش ہو جائے گا۔ اس کی خاموشی ہمیں سوچنے کے لیے وقت دے گی۔“

وہ نادرہ سے بحث کرنے کا نتیجہ دیکھ چکی تھی۔ وہ جو کچھ کریں گی، میری بھلائی کے لیے کریں گی۔ اس نے سوچا اور چپ ہو گئی۔

دوسرے دن وہ صبح ہی سے کمرا بند کر کے پڑی رہی۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا فیصل کس وقت آیا، نادرہ سے اس کی کیا بات ہوئی اور کس وقت چلا گیا۔ یہ اطلاع اسے اس وقت ہوئی جب نادرہ نے اسے بتایا۔

”میری گڑیا! اب تو بے فکر ہو جا۔ فیصل اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ سمجھ لینا ایک بھیانک خواب تھا جو تو نے دیکھا تھا۔ تجھے نئی زندگی شروع کرنی ہے میں تیری شادی بہت اچھی جگہ کراؤں گی۔“

”باجی! کیا میں اب بھی شادی کروں گی؟“

”کیوں نہیں کرے گی؟ اب تو میری ہر بات ماننے لگی ہے تو یہ بات بھی مانے گی۔“

فاخرہ خاموش رہی۔ ایک وہی نہیں، گھر کے در و دیوار بھی کئی دن تک خاموش رہے۔ ایک سوگواری سی طاری تھی۔ فاخرہ کے لیے یہ حادثہ معمولی نہیں تھا۔ فیصل کی بے وفائی اور اپنی شکست کے احساس نے اسے نیم مردہ کر دیا تھا۔

نادرہ بہت کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی آجائے لیکن وہ تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔

وہ تو سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھی لیکن نادرہ دیکھ رہی تھی کہ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ وہ فیصل کی فطرت سے واقف تھی۔ پانچ لاکھ جیسے ہی خرچ ہوتے، وہ گھر کے چکر کاٹنا شروع کر دیتا۔ بارش آنے سے پہلے سامان کی حفاظت کر لی جائے تو بہتر ہے۔ حفاظت یہی تھی کہ وہ مکان تبدیل کر لے۔ کسی اور جگہ شفٹ ہو جائے تاکہ فیصل انہیں ڈھونڈ نہ سکے اور فاخرہ کی جلد سے جلد شادی کر دے تاکہ اسے مرد کا مضبوط سہارا مل جائے۔ اس نے فاخرہ سے بات کی۔ وہ خاموش گڑیا صرف اتنا کہہ سکی۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“

بیگم نادرہ کو اندیشے مارے ڈال رہے تھے۔ رات رات بھر جاگ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئیں کہ اب گھر بدلنا لازمی ہو گیا ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر فاخرہ سے بات کی اور ایک اسٹیٹ ایجنسی پہنچ گئیں۔ یہ مکان انہیں عزیز تھا کہ ان کے والد اور شوہر کی نشانی تھا لیکن اب اسے بیچنا ضروری ہو گیا تھا۔

مکان فروخت ہو گیا۔ وہ اس مکان میں مزید تین ماہ رہ سکتی تھیں لیکن انہیں ایک ایک گھڑی بھاری ہو رہی تھی۔ اتنی جلدی دوسرا مکان نہیں مل سکتا تھا لہٰذا ایک جگہ کرائے کا مکان لے کر منتقل ہو گئیں اور کوشش کرتی رہیں کہ کوئی مکان مل جائے تو وہ خرید لیں۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ نہایت معقول مکان مل گیا۔ شہر سے دور تھا لیکن قیمت کم تھی۔ اپنے پاس سے کچھ ملانا نہیں پڑا۔ شہر سے دور ہونے کا انہیں فائدہ بھی تھا۔

ذیشان اس طرح وارد ہوا تھا جیسے بارش کا پہلا قطرہ

اطلاع دیے بغیر زمین پر گر جائے۔ ایک لمبی سی کار دروازے پر آ کر رکی تھی اور پھر ڈور بیل نے شور مچایا تھا۔ دروازے پر فاخرہ گئی تھی۔

''نادرہ چچی یہیں رہتی ہیں؟''

''چچی کا تو پتا نہیں لیکن یہاں جو رہتی ہیں، ان کا نام بیگم نادرہ ہے۔''

''جی ہاں، میں انہی کا پوچھ رہا ہوں۔ میرا نام ذیشان ہے اور وہ میری چچی ہیں۔ افضال انکل جن کا انتقال ہو چکا ہے، یہ انہی کی بیوی ہیں نا؟''

''ٹھہریئے، میں ان کو بلاتی ہوں۔ یہ باتیں آپ انہیں بتایئے گا۔''

وہ بھاگتی ہوئی اندر گئی اور جو باتیں دروازے پر ہوئی تھیں، نادرہ کو بتا دیں۔

شوہر کے مرنے کے بعد سسرال بہت عزیز ہو جاتا ہے۔ سسرال کے نام کا کوئی آیا تھا۔ پہلے تو بیگم نادرہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن پھر کسی سوچ میں پڑ گئیں۔ فیصل کے بعد وہ بہت محتاط ہو گئی تھیں۔ کیا خبر کون ہے اور کس نیت سے آیا ہے؟ اسے گھر میں کیسے بلالوں؟ پھر خیال آیا کہ افضال اپنے بڑے بھائی کا ذکر تو کیا کرتے تھے۔ کیا خبر یہ انہی کا بیٹا ہو۔ دروازے پر جا کر تصدیق کرلوں پھر مناسب ہوا تو اندر بھی بلالوں گی۔ وہ دروازے پر گئیں۔ نوجوان نے وہی سب باتیں ان سے بھی کیں جو وہ فاخرہ سے کر چکا تھا۔ اب بیگم نادرہ کی باری تھی۔

''تمہیں آج سے پہلے تو کبھی دیکھا نہیں؟''

''میں ملک سے باہر تھا۔ ابھی آیا ہوں تو آپ لوگوں کی یاد آ گئی۔''

''میں یہ کیسے مان لوں کہ تم افضال کے بھتیجے ہو؟''

''آپ اندر تو بلائیں۔ سب باتیں بیٹھ کر ہو جائیں گی۔''

''بیٹا، ہم اکیلے رہتے ہیں۔ جان نہ پہچان تمہیں اندر کیسے بلالوں؟ تمہارے ساتھ عورتیں ہوتیں تو بات الگ تھی۔''

''ابھی تو میں مکان دیکھنے آیا تھا۔ آپ کہیں گی تو کل ہی والدہ اور بہنوں کو لے آؤں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ چاہیں تو میرا پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیں۔ اب بھی گاڑی میں رکھا ہوا ہے۔ گلی میں کھڑے ہو کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ بیٹھ کر تفصیل سے اپنی شناخت کرادوں گا۔'' اس نے گاڑی سے اپنا پاسپورٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے، اندر آ جاؤ۔''

''چاہیں تو میری تلاشی بھی لے لیں۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ہمارے گھر میں ہے کیا جو لے جاؤ گے۔ بس عزتوں سے ڈر لگتا ہے۔ صورت سے تو شریف ماں باپ کی اولاد لگتے ہو۔ آؤ اندر آؤ۔'' انہوں نے کہا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ ''تم بیٹھو، میں ذرا فاخرہ کو بتا کر آتی ہوں۔''

انہوں نے فاخرہ کے کمرے تک جاتے جاتے پاسپورٹ دیکھ لیا۔ اس کی ولدیت میں اقبال احمد لکھا ہوا تھا۔ افضال کے بڑے بھائی کا یہی نام تھا۔ وہ اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی کا نام بھی بتایا کرتے تھے۔ ذرا ذہن پر زور دوں گی تو یاد آ جائے گا۔

''فاخرہ! دو کپ چائے بنا کر لاؤ۔ میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔''

''کون ہیں یہ صاحب؟''

''افضال کا بھتیجا ہے۔''

''کیا یہاں آنے کے لیے بڑا ہونے کا انتظار کر رہا تھا؟''

''یہ لوگ ملک سے باہر تھے۔ افضال نے مجھے بتایا تھا۔''

''کیا ضمانت ہے کہ یہ وہی ہے؟ فیصل گیا تو اب یہ نئی مصیبت آ گئی۔''

''میں نے اس کا پاسپورٹ لے لیا ہے۔ ولدیت کی تصدیق بھی ہو گئی۔ بس ماں کا نام اور معلوم کرنا ہے۔ افضال نے مجھے بتایا تھا۔ اس سے پوچھوں گی، تو یاد آ جائے گا۔ بس تم چائے بنا لاؤ۔''

''میں چائے بنا دوں گی، لے کر نہیں آؤں گی۔''

''مت لانا۔ آواز دے دینا، میں خود آ کر لے جاؤں گی۔''

نادرہ بیگم نے پاسپورٹ فاخرہ کے کمرے میں رکھا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

''ہاں بیٹا، کیا نام بتایا تم نے اپنا؟''

''ذیشان......''

ہنستے رہو

☆لڑکا (لڑکی سے)۔ ''آئی لو یو اینڈ آئی وانٹ ٹو گیٹ میرج ود یو۔''

لڑکی۔ ''بھائی اردو میں بولو، اردو میں۔''

لڑکا۔ ''کچھ نہیں باجی دعا کرو کہ پیٹرول سستا ہو جائے۔''

مرسلہ۔ اختر شاہ عارف، ڈھوک جمعہ، جہلم

''ذیشان! یہ بتاؤ تمہاری والدہ کا نام کیا ہے؟''
''والد کا نام تو آپ نے پاسپورٹ پر پڑھ ہی لیا ہوگا، امی جان کا نام تصور خانم ہے۔''
بیگم نادرہ کی یادداشت نے فوراً آواز دی۔ افضال نے اپنی بھاوج کا یہی نام بتایا تھا۔ ''میں نے مذاق میں کہا بھی تھا کہ اس نام کا تو صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ افضال نے یہ بھی بتایا تھا کہ اقبال بھائی نے پسند کی شادی کرلی تھی۔ اس پر پورے خاندان نے ان سے تعلق توڑ لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر لندن چلے گئے تھے اور پھر ایسے گئے کہ لوٹ کر نہ آئے۔ وہ سب ہی سے ناراض ہوگئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے افضال سے بھی خط وکتابت نہیں تھی۔'' وہ یہیں تک سوچ سکی تھیں، باقی تفصیل ذیشان نے انہیں بتادی۔
''میرے والد نے کسی بات پر سب سے تعلق توڑ لیا تھا لیکن غالباً چچا جان سے ان کی خط وکتابت ہونے لگی تھی۔ یہ انکشاف مجھ پر اس وقت ہوا جب ابا کے انتقال کے بعد ان کے سامان سے افضال چچا کے دو خط ملے۔ ایک خط میں انہوں نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ ایک خط میں پتا کچھ اور تھا، دوسرے خط میں پتا دوسرا تھا۔ بہرحال وہ دونوں خط میں نے سنبھال کر رکھ لیے اور بھی خط ہوں گے لیکن مجھے دو ہی خط ملے۔''
''اقبال بھائی کا انتقال ہوگیا؟''
''ہاں، ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ میں نے لندن میں تعلیم حاصل کی، وہیں ملازمت کرنے لگا لیکن ابا کے انتقال کے بعد والدہ کو اپنے میکے اور سسرال کی یاد آگئی۔ لندن میں رہتے رہتے ان کا دل بھر گیا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ بس گھومنے کے لیے پاکستان چلتے ہیں لیکن وہ بضد تھیں کہ مستقل پاکستان میں رہیں گی۔ میں سیکنڈری اسکول پاس کرکے یہاں سے گیا تھا۔ مجھے بھی یہاں کی یاد آرہی تھی۔ مختصر یہ کہ ہم اب مستقل پاکستان آگئے ہیں اور رشتے داروں کو تلاش کررہے ہیں تاکہ پھر سے نئی دنیا آباد ہو۔''
''تمہارے ساتھ اور کون، کون ہے؟''
''میں اور ایک بہن۔ ایک بہن کی شادی لندن میں ہوگئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔''
فاخرہ نے کہا تو یہی تھا کہ وہ چائے لے کر اندر نہیں آئے گی لیکن پھر اسے برا لگا کہ نادرہ چائے لینے خود باہر آئے۔ وہ چائے لے کر خود ہی چلی گئی لیکن اتنا ضرور کیا کہ وہاں بیٹھی نہیں۔
''یہ کون ہیں؟''
''میری چھوٹی بہن ہے فاخرہ۔ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔'' بیگم نادرہ نے کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ تمہیں یہ گھر کیسے ملا؟ یہاں تو ہم ابھی شفٹ ہوئے ہیں۔''
''دیکھ لیجیے، میرا ہی دم تھا جو میں نے تلاش کرلیا۔ ہوا یہ کہ میں خط پر لکھے ہوئے ایڈریس پر پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ نے وہ گھر فروخت کردیا ہے۔ میں نے اس اسٹیٹ ایجنٹ کا ایڈریس پوچھا جس کی معرفت آپ نے مکان فروخت کیا تھا۔ اس نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ چچا جان کا انتقال ہوگیا ہے۔ اسی نے رجسٹر دیکھ کر یہ بتایا کہ اب آپ نے نیا مکان کہاں خریدا ہے کیونکہ یہ مکان بھی آپ نے اسی کے ذریعے خریدا تھا اور یوں یہاں تک پہنچ گیا۔ امی کو بتاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔''
''صرف بتانا نہیں ہے، انہیں لے کر بھی آنا۔ افضال ان کی بہت تعریف کرتے تھے۔ میں نے افضال کے پاس ان کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ ڈھونڈوں گی تو شاید اب بھی مل جائے۔''
اس نے وعدہ کیا کہ وہ والدہ کو لے کر کل ہی آئے گا۔
بیگم نادرہ کو اس دن شوہر کی یاد بے تحاشا آئی۔ وہ ہوتے تو آج کتنا خوش ہوتے۔ ان کے بچھڑے ہوئے مل رہے ہیں اور وہ اس دنیا میں موجود نہیں۔
دوسرے دن ذیشان اپنی والدہ اور بہن کو لے کر آگیا۔ نادرہ کے آنسوؤں نے تعزیت قبول کی۔ کچھ دیر ماحول سوگوار رہا اور پھر پچھلی یادیں دہرائی جانے لگیں۔
وہ ایک مرتبہ آئی تھیں پھر ہر دوسرے تیسرے دن آنے لگیں۔ نادرہ بھی ان کے گھر گئی، فاخرہ بھی ساتھ تھی۔ ذیشان کی بہن سعدیہ سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ بیگم نادرہ خوش تھیں کہ گھر کی فضا پھر سے معتدل ہوگئی۔
فاخرہ کا دل بھی بہلا ہوا تھا۔ فون پر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ ذیشان تو تقریباً روز ہی چکر لگالیا کرتا تھا۔ ایک دن ذیشان نے یہ خوش خبری سنائی کہ اسے ملازمت مل گئی ہے۔ دوسرے ہی دن اس کی والدہ اس کے ساتھ آگئیں۔
''نادرہ، مجھے تمہاری بہن فاخرہ بہت اچھی لگتی ہے۔''
''یہ آپ کی محبت ہے۔ ویسے وہ ہے بھی بہت پیاری۔ گھر کے کام کاج میں بھی میں نے اسے ایسا طاق کردیا ہے کہ جس گھر میں جائے گی دلوں میں گھر کرلے گی۔ بس دعا کریں اس کا نصیب کھل جائے۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔''
''تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا گھر بھی ویران پڑا ہے۔ فاخرہ آجائے گی تو کچھ چہل پہل ہوجائے

گی۔ ذیشان کی خیر سے نوکری لگ گئی ہے۔ میں اگر فاخرہ کو تم سے مانگ لوں تو انکار مت کرنا۔''

''لو...... کوئی خوش قسمتی کو بھی ٹھوکر مارتا ہے۔ آپ کی امانت ہے جب چاہیں لے جائیں۔ بس یہ ہے کہ ایک رسم پوری کرلوں، فاخرہ سے اور پوچھ لوں۔''

''اس میں کوئی حرج نہیں۔ لڑکی سے ضرور پوچھ لینا چاہیے۔''

بیگم نادرہ ڈر رہی تھیں کہ فیصل کے واقعے کے بعد فاخرہ شادی کے لیے تیار ہونہ ہو۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے ذکر کیا لیکن فاخرہ نے پھر وہی الفاظ دہرا دیے۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔''

اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ذیشان خوبصورت تھا۔ سول انجینئر تھا۔ اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اسے ایک لمحے کو فیصل کا خیال آیا ضرور تھا لیکن اس کی بے وفائی کا داغ بھی ابھی تازہ تھا۔

ایک سادہ سی تقریب میں وہ بیاہ کر ذیشان کے گھر چلی گئی۔

اب سوال یہ تھا کہ بیگم نادرہ اکیلی کیسے رہیں گی۔ ذیشان نے ضد کی کہ وہ اس مکان کو کرائے پر دے کر ان کے ساتھ رہیں۔ تصور خانم بھی بہت پیچھے پڑیں لیکن بیگم نادرہ کسی طرح تیار نہ ہوئیں۔

''بیٹی کے ساتھ اس کی سسرال میں رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ صرف فاخرہ کی سسرال ہی تو نہیں تمہاری سسرال بھی تو ہے۔ بیوہ ہونے کے بعد کیا لڑکیاں سسرال میں رہتی نہیں ہیں؟''

''آپ سے غیریت نہیں لیکن اب میں تنہائی کی عادی ہوگئی ہوں۔ آدھا دن تو اسکول میں گزر جاتا ہے۔ ویسے میں فاخرہ کو دیکھنے کے لیے روزانہ چکر لگالیا کروں گی۔ آپ کا گھر میرے اسکول کے نزدیک ہی تو ہے۔''

فاخرہ نے بھی ضد کی۔ سب سر سے پاؤں تک جھول گئے لیکن وہ یہی کہتی رہیں۔ ''بیٹی کی سسرال میں رہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

☆☆☆

فاخرہ اپنی ساس کے پاس بیٹھی تھی کہ ذیشان کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ آج جلدی آگئے؟'' فاخرہ نے سر پر دوپٹا رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، آج ذرا کام کم تھا اور پھر ایک دیرینہ دوست ملا تو اسے لے کر آیا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ تم ذرا دو کپ چائے تو بنا کر لے آؤ۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں نے شادی کرلی ہے تو تمہیں دیکھنے کے اشتیاق میں چلا آیا۔''

''ایسا کون سا دوست مل گیا تمہیں؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''آپ دیکھیں گی تو پہچان لیں گی۔ میرے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ قریب ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آیا کرتا تھا۔''

فاخرہ چولہے پر چائے رکھنے چلی گئی اور تصور خانم ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔

''امی! یہ فیصل ہے، یاد آیا؟''
''بیٹا اب اتنے دن ہو گئے، پہچان میں نہیں آ رہا۔''
''خالہ جان! آپ مجھے نہ پہچانیں لیکن آپ مجھے یاد آ گئیں۔''
''تو میرے بیٹے کا دوست ہے، بس یہی بہت ہے۔''
اتنی دیر میں پردے کو جنبش ہوئی اور فاخرہ ہاتھ میں ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ابھی تک فیصل کو دیکھا نہیں تھا۔ ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہی اس کی نظر فیصل پر پڑی۔ ایک بھیڑیا تھا جو اس کے سامنے تھا۔ اس نے صوفے کا سہارا لیا اور زمین پر گرنے سے پہلے صوفے پر گر گئی۔
''فیصل! یہ ہیں تمہاری بھابی فاخرہ!''
''خالہ! آپ ہیں خوش قسمت کہ ایسی خوبصورت بہو آپ کو مل گئی۔ ہم تو ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔ آج تک ایسے ہی بیٹھے ہیں۔''
''یہ میرے دیور کی بیٹی ہے۔ مجھے ڈھونڈنے کے لیے کہیں دور جانا نہیں پڑا۔''
''ان کی کوئی دوسری بہن نہیں ہے؟''
''ہاں، ایک بیوہ بہن ہے، کیا ارادہ ہے؟''
وہ باتیں کر رہا تھا اور فاخرہ سانس روکے بیٹھی تھی۔ فیصل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کب وہ کوئی ایسی بات کہہ دے کہ جس سے سب کو شک ہو جائے۔ اسے جتنی دعائیں یاد تھیں، دل ہی دل میں سب پڑھ ڈالیں۔ یہ بھی سوچتی رہی کہ انسان کا ایک غلط قدم کتنی دور تک اس کا پیچھا کرتا ہے۔
اس کی ساس کچھ دیر بعد اٹھ کر چلی گئیں لیکن یہ سہارا تھا کہ ذیشان بیٹھا ہے۔ وہ بھی اٹھ سکتی تھی لیکن اس خیال سے بیٹھی رہی کہ اکیلے ہی ذیشان سے نہ جانے کیا کہہ دے۔
وہ اب کسی قدر سنبھل گئی تھی لیکن گھبرا اب بھی رہی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ذیشان نے ایکسکیوز کیا اور فون سننے چلا گیا۔
''میرے پاس تمہاری کچھ تصویریں ہیں۔ اس... تہ خانے کی یادگار جہاں تم میرے ساتھ گئی تھیں۔ اگر واپس لینی ہوں تو میرے گھر سے آ کر لے لینا۔ اگر تم دو دن تک نہیں آئیں تو وہ تصویریں میں ذیشان کو دے دوں گا۔ وہ تم تک پہنچا دے گا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اس پر ایڈریس ہے۔''
ذیشان کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے فیصل کا دیا ہوا کارڈ مٹھی میں دبا لیا۔ باتیں پھر شروع ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا ذہن مشین کی طرح گھوم رہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ نادرہ کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کرے لیکن پھر سوچا وہ پہلے ہی بہت دکھ اٹھا چکی ہیں۔ سن کر اور پریشان ہو جائیں گی۔ میرا معاملہ ہے، میں خود ہی نمٹوں تو اچھا ہے۔ فیصل بھیڑیا سہی لیکن اب مجھے بھی اپنے ناخن نکالنے پڑیں گے۔ اس نے فیصل کا دیا ہوا کارڈ ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ اس کا ایڈریس ایک کاپی پر لکھ لیا اور کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ''میں اس کے گھر جاؤں گی۔ معلوم تو ہو اب وہ کیا چاہتا ہے۔ اس کے گھر میں اور بھی تو سب ہوں گے۔ وہ میرے ساتھ کیا بدسلوکی کرے گا۔''
اس نے دوسرے دن نادرہ کی طرف جانے کا بہانہ کیا اور فیصل کے دیے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئی۔ عجیب ویران علاقہ تھا۔ چند مکان تھے جو ایک دوسرے سے بہت دور دور بنے ہوئے تھے۔ کوئی ایسی بستی تھی جو ابھی آباد ہو رہی تھی۔ اس نے فیصل کا مکان ڈھونڈا اور دروازے پر لگی بیل بجا دی۔
''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ آؤ اندر آ جاؤ۔''
وہ اندر چلی گئی۔ اجاڑ گھر دیکھ کر اسے شک ہوا کہ وہ یہاں اکیلا رہتا ہے۔
''گھر میں عورتیں نہیں ہیں؟''
''ہماری ایسی قسمت کہاں کہ گھر بسا سکیں۔ والدہ تھیں، ان کا پندرہ دن پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔''
''میں اکیلے گھر میں اندر نہیں آؤں گی۔ جو کچھ کہنا ہے دروازے پر ہی کہہ دو۔''
''پہلے کی بات اور تھی، اب تم میرے دوست کی عزت ہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ہاں، کچھ کاروباری باتیں ہیں وہ ضرور کروں گا۔ آؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ گھر کا دروازہ کھلا ہے تم فکر مت کرو۔ تمہاری تصویریں بھی ڈرائنگ روم ہی میں ہیں اس لیے وہیں بیٹھنا مناسب رہے گا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اس کی تصویریں یاد دلا دیں، وہ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔
''نادرہ باجی کے دیے ہوئے پانچ لاکھ بڑے کام آ گئے۔ یہ مکان پانچ لاکھ کا مل رہا تھا، میں نے لے لیا۔ اب تم جو دو گی اس سے اوپر کی منزل بنوا لوں گا۔''
''میں کس بات کے دوں گی؟''
''یہ تصویریں دیکھ لو۔'' وہ اٹھا اور قریب رکھی الماری سے ایک لفافہ نکال کر لے آیا۔ اس نے تصویریں ایک میز پر پھیلا دیں۔ ایک تصویر میں وہ عدنان سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ ایک تصویر میں فیصل اس کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔ ایک میں وہ فاخرہ کو گلے لگائے ہوئے تھے۔ ایک میں فاخرہ کا ہاتھ اپنی گود میں رکھے بیٹھا تھا۔

''یہ سب تصویریں عدنان کے دفتر کی ہیں۔ وہاں خفیہ کیمرا لگا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا، کبھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں یہ تصویریں نادرہ باجی کو بھی دکھا سکتا تھا لیکن مزہ نہ آتا۔ اب اتفاق سے ذیشان سے ملاقات ہوگئی، ان تصویروں کی قیمت بڑھ گئی ہے۔''

''تمہاری نیت میں شروع ہی سے کھوٹ تھا۔ تم محبت کا جھانسا دے کر میری تصویریں بناتے رہے۔ خبیث آدمی۔''

''محبت تو میں نے نادرہ باجی سے بھی کی تھی لیکن ان کی تصویریں بنانا بھول گیا تھا۔''

''کیا چاہتے ہو؟''

''فقیر کا وہی سوال۔ تمہارے بنگلے کے کاغذات تاکہ بینک میں رکھوا کر قرض لے سکوں۔ قرض ادا ہوتے ہی کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔ تم مہربانی کرو تو کنسٹرکشن کمپنی کھولنے کا خواب پورا ہو جائے گا۔''

''میں کاغذات نہیں دے سکتی۔''

''دوسرا آپشن بھی ہے۔ بیس ہزار روپے ماہانہ پہنچاتی رہو۔ جس مہینے ناغہ کیا، یہ تصویریں ذیشان کو پہنچا دوں گا۔''

''یہ رقم بہت ہے۔''

''تمہاری مرضی۔'' اس نے تصویریں سمیٹتے ہوئے کہا۔ اٹھا اور تصویریں الماری میں رکھ دیں۔ ''اب تم جا سکتی ہو۔ پرسوں پہلی قسط لے کر آجانا ورنہ پھر تم جانو اور ذیشان۔''

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔''

''ظاہر ہے۔ شکر سمجھو کوئی اور مطالبہ نہیں کر رہا ہوں ورنہ سوچ لو میں اکیلا رہتا ہوں۔''

''فیصل! خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ کبھی ہماری دوستی رہی ہے۔ اس کا ہی خیال کر لو۔''

''اسی کا خیال تو کر رہا ہوں ورنہ میرے پاس تیسرا آپشن بھی ہے۔ ذیشان کو پتا بھی نہیں ہوگا اور تم لٹتی رہو گی۔''

اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ آنسوؤں کے دریا بہائے۔ جب پتھر نہیں پگھلا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں صرف پرسوں تک انتظار کروں گا۔'' فیصل کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی اور وہ گھر سے باہر نکل آئی۔

ایک طوفان تھا جو اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کے گھر تک آگیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کی نظر نادرہ پر پڑی۔ سب پریشان تھے کہ نادرہ تو یہاں آگئی فاخرہ کہاں گئی۔ اسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

راستے بھر یہی سوچتی آئی تھی کہ نادرہ کو کچھ نہیں بتائے گی لیکن نادرہ کو سامنے دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے کمرا بند کر کے وہ تمام روداد سنا دی جو اس پر گزری تھی۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ نادرہ کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔

''باجی! آپ فکر نہ کریں، میں بیس ہزار روپے دے کر اس کا منہ بند کر دیا کروں گی۔''

''فاخرہ! یہ سلسلہ کبھی نہیں تھمے گا۔ وہ ہر دو چار مہینے بعد اس میں اضافہ کر دیا کرے گا۔ تم کب تک اور کہاں تک اس کے مطالبے پورے کرتی رہو گی۔''

''اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں باجی۔ اگر ذیشان کو بھنک پڑ گئی تو میری زندگی خراب ہو جائے گی۔''

''میں جان پر کھیل جاؤں گی لیکن تیری زندگی خراب نہیں ہونے دوں گی۔ تو مجھے اس کا ایڈریس دے۔''

''تم کیا کرو گی باجی؟'' فاخرہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''تو جو کچھ لٹا چکی ہے، وہ تو واپس نہیں دلا سکتی لیکن تیری تصویریں ضرور واپس لاؤں گی۔''

''وہ تصویریں بھی واپس نہیں دے گا۔ غصے میں نہ جانے کیا قدم اٹھائے۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ اس نے تصویریں کہاں رکھی ہیں۔''

''اپنے ڈرائنگ روم میں رکھی ایک الماری میں۔''

''کل شام تک میرا انتظار کرنا۔ اگر رات تک نہ آؤں تو پولیس اسٹیشن جا کر میری گمشدگی کی رپورٹ کر دینا۔''

وہ وعدے کے مطابق دوسرے دن شام کو فاخرہ کے گھر پہنچ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

''اس لفافے میں تمہاری تصویریں ہیں۔ انہیں فوراً جلا دو۔''

''یہ آپ کو کیسے مل گیا؟''

''انہیں فوراً جلا دو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ گھر جا کر آرام کروں گی۔''

''آج یہیں رہ جائیں۔''

''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ ان تصویروں کو فوراً جلا دو۔'' بیگم نادرہ اپنے گھر چلی گئیں۔

دوسرے دن ذیشان آفس سے آیا تو بہت پریشان تھا۔ ''میرا وہ دوست جو پرسوں یہاں آیا تھا اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے...... بے چارہ فیصل۔''

فاخرہ اب سمجھ سکتی تھی کہ اسے کس نے قتل کیا ہے مگر بتا نہیں سکتی تھی۔

ماروی

محی الدین نواب

تئیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کہیں چھاؤں کہیں دھوپ، محبت کی حنائیں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی مٹی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفادے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے۔

مراد مرینہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچادیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET فیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کرواکے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب بونا عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو بونا دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آتی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹمی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ

گئی ۔لندن ایئرپورٹ پر میکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا۔ مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد نے دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر لیا مراد انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا مراد شدید زخمی ہوا جبکہ مرینہ کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ماری گئی۔ ایمان علی اور میڈونا مراد کو محفوظ پناہ گاہ میں لے آئے۔ ادھر بلے نے حماد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مرینہ زخمی حالت میں تھی۔ وہ ایک تانترک مہاراج کی چھتر چھایہ میں پہنچ گئی۔ وہ اس کا علاج کرنے لگا۔ وہ بہتر ہونے لگی۔ ادھر مراد کا علاج مولانا اجمیری کر رہے تھے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ مراد کی زندگی بچانے میں میڈونا نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ مراد نے فیصلہ کیا کہ وہ میڈونا سے نکاح کرلے گا۔ وہ مرینہ کو لے کر شاپنگ کے لیے نکلا، میڈونا چادر میں تھی مگر کچھ لمحے کے لیے چادر ہٹی اور مرینہ نے ان دونوں کو دیکھ لیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ بھی پچھلے ایک ماہ سے عبا اور نقاب میں چھپ کر مراد کو تلاش کر رہی تھی۔ دور ہی دور سے جگنی بائی اور ڈاکٹر ٹمنی سن پر نظر رکھتی تھی۔ اپنی دھن کی پکی تھی۔ آخر محنت کا پھل مل ہی گیا۔

اس کی نظر پہلے میڈونا پر گئی تھی۔ اس کے ٹکرانے کرنے اور سنبھلنے کے دوران میں چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا۔ مراد کی پشت اس کی طرف تھی، وہ اسے دیکھے بغیر سمجھ گئی کہ میڈونا کے ساتھ مراد ہی ہوگا۔ قدوقامت سے ہی پتا چل رہا تھا۔

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ایک دکان میں چلے گئے تھے۔ مرینہ نے بھیڑ میں چھپتے ہوئے اسے دوسری طرف سے آکر دیکھا تو وہی تھا، جس سے شملہ جانے والے راستے پر جان لیوا جنگ لڑی گئی تھی۔ دشمنوں میں صرف مرینہ ہی اسے موجودہ چہرے سے پہچان سکتی تھی۔

اور مراد بھی اسے موجودہ چہرے سے پہچان سکتا تھا لیکن وہ پردہ نشین بنی ہوئی تھی پھر بھی شاید اسے توجہ سے دیکھنے کے بعد پہچان لیتا۔ ادھر میڈونا عبا خرید کر پہن رہی تھی۔ چہرے کو باقاعدہ نقاب میں چھپا رہی تھی۔ اپنے طور پر اطمینان ہو رہا تھا کہ آئندہ مسلمان پردہ نشین شریک حیات بن کر مراد کے ساتھ رہے گی تو اسے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔

مرینہ دور کھڑی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ کس طرح مراد کو بے بس اور مجبور کر کے اس کے ساتھ رہ سکے گی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ ابتدا میں وہ آسانی سے نہیں مانے گا۔ کوئی ایسی چال چلے گا کہ وہ پھر ہار جائے گی۔ وہ پھر ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

اسے یہ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ وہ پچھلے ایک ماہ سے میڈونا کے ساتھ رہتا آ رہا ہے۔ کیا وہ پارسائی سے ایک حسین عورت کے ساتھ رہتا ہوگا؟

ہرگز نہیں...... اور کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟ ہرگز نہیں......

وہ مجھ سے نکاح پڑھانے والا تھا اور اس سے نکاح پڑھائے بغیر گناہ گار بن رہا ہے۔ اس یہودی عورت نے تو اس کا ایمان ہی بدل دیا ہے اور میں اسے ایک ذرا بدل نہ سکی۔ اسے ماروی سے چھڑا نہ سکی اور وہ چھڑا چکی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی، اپنی توہین اور ذلت محسوس کر رہی تھی۔ میڈونا اور مراد اس دکان سے خریداری کے بعد دوسری دکان میں گئے۔ وہاں وہ اپنے لیے ریڈی میڈ لباس خریدنے لگا۔ وہ دونوں جہاں جا رہے تھے، وہ بھی فاصلہ رکھ کر وہاں پہنچ رہی تھی۔

ماضی میں مراد سے بڑے تلخ تجربات حاصل ہوئے تھے۔ عقل کہہ رہی تھی کہ اس کا سامنا نہ کرے۔ میڈونا کو ٹارگٹ بنا کر اسے دور ہی دور سے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے۔

اس نے سوچا۔ ’’کسی طرح میڈونا کو اغوا کرلوں تو کیا مراد اس کی خاطر میرے آگے جھکے گا؟ اس کی رہائی کے لیے مجھ سے سمجھوتا کرے گا؟‘‘

پھر اس نے سوچا۔ ’’میں میڈونا کو اغوا کر کے میکی براؤن کے خلاف بھی گیم پلے کروں گی۔ مراد اور میکی دو بڑے پہاڑ میرے سامنے جھکیں گے۔ مجھے معلوم کرنا چاہیے کہ میڈونا ان دونوں کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے اور یہ اسے اغوا کرنے سے ہی معلوم ہوگا۔‘‘

ایسے وقت حالات مرینہ کے موافق ہو گئے اور میڈونا کے ناموافق۔ یہ مقدر کی کارستانی تھی کہ میڈونا اچانک پریشان ہوگئی۔ اس کے ساتھ کچھ ہونے لگا۔ اس نے سہارے کے لیے مراد کے بازو کو تھام لیا۔ وہ دکاندار کو اپنے لباس کی قیمت ادا کر رہا تھا۔ اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

اس نے اسے تھکتے ہوئے پوچھا۔ ’’تم ٹھیک تو ہو؟‘‘

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ’’میری طبیعت ٹھیک

نہیں، مجھے واش روم جانا ہے۔"
اس نے پھر اسے تھپک کر کہا۔ "ڈونٹ وری۔ میرے ساتھ آؤ۔"
وہ دکان سے باہر آئے۔ میڈونا واش روم کی سمت جانے لگی۔ مراد نے کہا۔ "میں ادھر اسنیکس بار میں رہوں گا۔"
وہ سر ہلا کر ٹوائلٹ کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اس نے فون پر عبداللہ کبڈی کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ "یار! بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" میڈونا کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ فی الحال یہ کرو کہ یہاں آجاؤ۔ میڈونا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ قیامت کی جدائی اسے بھی برداشت کرنی ہوگی۔"
"میں ابھی آتا ہوں۔"
کبڈی سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ ایک اسنیکس بار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ذہنی طور پر بری طرح الجھ گیا تھا۔ ابھی ایک اور الجھن اس کے لیے چیلنج بننے والی تھی۔ مرینہ تو جیسے اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔
وہ پہلے تو انہیں دور سے دیکھتی رہی پھر واش روم کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ اپنے چہرے سے نقاب ہٹالی۔ میڈونا نے اچانک ہی اسے دیکھا تو گھبرا گئی۔ وہ جوشملہ کے راستے پر مراد کے ہاتھوں مرگئی تھی پھر سے زندہ ہوکر زندگی حرام کرنے آگئی تھی۔
وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہ گئی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ انتہائی بدترین دشمن اچانک آسمان سے ٹپک پڑی ہے۔
مرینہ اس کی گھبراہٹ سے خوش ہوکر بولی۔ "ہائے میڈونا! مجھ سے دوستی کروگی یا دشمنی؟ جلدی بولو۔ مجھے کم سے کم وقت میں بہت کچھ کرگزرنا ہے۔"
میڈونا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "دوست بن جاؤ۔ میرے راستے میں نہ آؤ۔"
وہ مسکرا کر بولی۔ "دوست بنتے ہی تمہارا راستہ میرا راستہ ہوگیا ہے۔ دو دوست ہر معاملے میں شیئر کرتے ہیں۔ مراد میرا یار تھا۔ تم میرے یار کو حاصل کررہی ہو۔ اب میں اسے پھر سے حاصل کروں گی اور تم ایک اچھی دوست کی طرح میرا ساتھ دوگی۔"
"وہ تم سے سخت نفرت کرتا ہے۔ تمہیں دیکھتے ہی پھر گن اٹھالے گا پھر یہاں گولیاں چلیں گی۔"
"میں گولیاں نہیں چلنے دوں گی۔ تمہیں اس کی کمزوری بنالوں گی۔ کیا وہ چاہے گا کہ یہاں ہماری لڑائی میں تم ماری جاؤ؟"
میڈونا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "نہیں، وہ مجھ پر آنچ بھی نہیں آنے دے گا۔"
مرینہ نے اسے گن نکال کر دکھائی۔ پھر اسے اپنی عبا میں چھپا کر کہا۔ "تم میرے نشانے پر رہ کر یہاں سے چلوگی۔"
"تم کیا سمجھتی ہو وہ مجھے تمہارے ساتھ جانے دے گا؟"
"میں یہ گیم کھیلنا جانتی ہوں۔ وہ اسنیکس بار میں ہے۔ میں تمہیں دوسرے کوریڈور سے لے جاؤں گی۔"
وہ پریشان ہوکر بولی۔ "مجھے گولی ماردو۔ میں مرجاؤں گی لیکن مراد سے دور نہیں جاؤں گی۔"
وہ ناگواری سے بولی۔ "سوچ لو۔ میں ابھی یہاں سے باہر جاتے ہی اسنیکس بار میں پہنچتے ہی اسے گولی ماردوں گی۔ اسے سنبھلنے کا اور کچھ کرنے کا موقع نہیں دوں گی۔ ورنہ خود ماری جاؤں گی۔ بولو کیا جاؤں؟ اسے گولی کھا کر تڑپتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھ سکوگی؟"
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مرینہ نے کہا۔ "اس کی دیوانی ہوگئی ہو۔ وہ مرد ہے ہی ایسا' پاگل کردیتا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوگی۔"
اس کا ایک ہاتھ عبا کی سائڈ پاکٹ میں پستول کو تھامے ہوئے تھا۔ اس نے پستول کی حرکت سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ "فوراً میرے ساتھ چلو اور اپنا فون مجھے دو۔"
پھر اس نے خود ہی تلاشی لے کر اس کا فون اپنے پاس رکھ لیا اور کہا۔ "ایک لمحے کی دیر نہ کرو۔ چلو یہاں سے۔"
اس نے میڈونا کے ایک ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "ہمیں اچھی سہیلیوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنا ہے۔ میرے خلاف کچھ بولنا چاہوگی تو اس سے پہلے ہی ماری جاؤگی۔ تمہارے بعد میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"
وہ مجبور ہوکر اس کے ساتھ باہر آگئی۔ اس نے بڑی بے بسی سے اس سمت دیکھا جدھر مراد کسی اسنیکس بار میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا وہ بار دکانوں کے پیچھے تھا۔ نظر نہیں آرہا تھا۔ مرینہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ پھنسائے' اسے کھینچتی ہوئی دوسرے راستے سے عمارت سے باہر آگئی۔
میڈونا کے دل سے آہیں نکل رہی تھیں۔ وہ صرف مراد کی سلامتی کے لیے اس سے بچھڑ رہی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ مرینہ اس کی دیوانی بھی ہے اور جانی دشمن بھی ہے۔ یہ اچانک اسنیکس بار میں جاکر گولی چلائے گی تو وہ ناگہانی حملے سے بچ نہیں پائے گا۔ خلافِ توقع آنے والی موت اسے دبوچ لے گی۔
مرینہ نے اپنی کار کے پاس آکر اسے چابی دیتے

ہوئے کہا۔ ''تم ڈرائیو کرو گی۔ چلو فوراً بیٹھو اور اسٹارٹ کرو۔''

وہ اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ دونوں عبا اور نقاب میں تھیں۔ دونوں کو ہی سیکڑوں دشمنوں سے چھپ کر رہنا تھا۔ فی الحال تانترک مہاراج کی رہائش گاہ سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں تھی۔

مہاراج گھر چھوڑ کر شمشان میں چلہ کشی کے دن رات گزار رہا تھا۔ تقریباً تیس دن گزر چکے تھے۔ ابھی دس راتوں کی گھور تپسیا باقی تھی۔ مرینہ نے اس کے ایک دست راست سے فون پر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ میں ابھی شمشان سے گھر آیا ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آدھی رات تک شانتی گرو دیو کی سیوا کرتا رہے گا۔ پھر میں وہاں جاؤں گا۔''

''میں آرہی ہوں۔ ایک سہیلی کو ساتھ لا رہی ہوں۔ یہ سہیلی دشمن بھی ہے۔ تمہیں کیا کرنا ہے یہ آکر بتاؤں گی۔''

اس نے فون بند کر کے میڈونا کو دیکھا۔ وہ مراد سے دور ہوتی جارہی تھی۔ صدمے سے دل ٹوٹ رہا تھا۔ حالات کہہ رہے تھے کہ مرینہ اسے کبھی مراد کے پاس جانے نہیں دے گی۔

اس کے باوجود یہ قوی امید تھی کہ مراد اسے واپس حاصل کرنے اور اپنی دلہن بنانے کے لیے مرینہ سے ٹکرائے گا۔ ان کے درمیان پھر ایک بار لہو اچھالنے والی جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔

عبداللہ کبڈی نے شاپنگ پلازا میں آکر فون پر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ میں یہاں آگیا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''دوسرے فلور کے اسنیکس بار میں آجاؤ۔''

اس نے وہاں آکر پوچھا۔ ''میڈونا کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''واش روم میں ہے۔''

پھر پریشان ہو کر بولا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔''

اس نے فون نکال کر میڈونا کے نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ میڈونا نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے تڑپ کر کہا۔ ''یہ مراد ہے۔ مجھے کال کر رہا ہے۔''

مرینہ نے فون کی ننھی سی اسکرین پر نمبر پڑھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہی مراد کا موجودہ نمبر ہے نا؟''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں، پلیز مجھے بات کرنے دو۔ وہ میرے لیے پریشان ہوگا۔''

مرینہ نے کال کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے، باتیں ہوں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی اسے دوڑاؤں گی۔''

دوسری طرف مراد نے کبڈی کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ''تعجب ہے میڈونا نے لائن کاٹ دی ہے۔''

کبڈی نے پوچھا۔ ''اس کا مطلب کیا ہوا؟ وہ تمہاری ہونے والی دلہن کیا تم سے بات کرنے سے انکار کر رہی ہے؟''

''نہیں۔ وہ واش روم گئی تھی۔''

''واش روم میں اتنی دیر نہیں ہوتی۔ وہ اتنا تو کہہ سکتی ہے کہ پرابلم کیا ہے؟ تمہیں انتظار کرنے کو کہہ سکتی ہے؟''

مراد نے قائل ہو کر ری ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے بیل جانے لگی۔ اس بار مرینہ نے لائن نہیں کاٹی۔ رنگ ٹون کو جاری رہنے دیا۔ مراد بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''کم آن میڈونا! فون اٹھاؤ۔''

فون چیختے چیختے خود ہی چپ ہو گیا۔ مراد اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے واش روم کی طرف جانے لگا۔ کبڈی نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔ وہاں کیا کر رہی ہے؟''

وہ واش روم کے دروازے کے سامنے رک گئے۔ اندر نہیں جاسکتے تھے۔ ایک خاتون اندر سے باہر آرہی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''پلیز ایک مہربانی کریں۔ میری وائف بڑی دیر سے اندر گئی ہیں۔ باہر نہیں آرہی ہیں۔ وہ انگریز ہیں۔ لیکن عبا اور نقاب میں ہیں۔ فار گاڈ سیک اندر جا کر دیکھیں، وہ کہاں ہیں۔ ہمارا فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی ہیں؟''

وہ خاتون اندر گئی پھر جلد ہی واپس آکر کہا۔ ''اندر کوئی بھی عبا اور نقاب والی نہیں ہے اور کوئی گوری چٹی انگریز عورت بھی نہیں ہے۔''

مراد نے اور کبڈی نے ایک دوسرے کو حیرانی اور پریشانی سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ''وہ میرے سامنے واش روم کے اندر گئی تھی۔ اسے یہاں ہونا چاہیے۔''

خاتون نے کہا۔ ''مجھے تو نظر نہیں آئی۔ جسٹ اے منٹ۔ ابھی یقین دلاتی ہوں۔''

واش روم کے اندر اور دو خواتین تھیں۔ اس خاتون نے اندر جا کر ان سے کہا۔ ''دو منٹ کے لیے مردوں کو یہاں آنے دو۔ ان کی ایک عورت لاپتا ہو گئی ہے۔''

انہیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ دونوں نے وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں میڈونا کا وجود نہیں تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ اس کی گمشدگی نے سمجھا دیا کہ وہ دشمنوں کی نظروں میں آگئی تھی۔ اسے اغوا کیا گیا ہے۔

وہ اسے شاپنگ پلازا کے اندر اور باہر ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ بات ذہن میں تھی کہ پتا نہیں کب اسے اغوا کیا گیا ہوگا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ وہاں نظر آنے والی نہیں تھی۔ پھر بھی اپنی تسلی کے لیے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔

کبڈی نے کہا۔ ''دشمنوں نے میڈونا کو دیکھ لیا ہے تو تمہیں بھی دیکھا ہوگا۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''مجھے دیکھ لیتے اور پہچان لیتے تو ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مجھے گولی مار دیتے۔ انہوں نے میڈونا سے پوچھا ہوگا۔ اس نے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ وہ اسے لے گئے ہیں۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے اسے ٹارچر کریں گے۔ وہ اذیت ناک مصیبتوں میں پڑگئی ہے۔ یا خدا......! میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟''

فون سے میسیج کی ٹون سنائی دی۔ مراد نے فوراً ہی بٹن دبا کر پڑھا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ ''ارے او قیامت کے بازی گر! یہ تیرے لیے ایک خاموش چیلنج ہے۔''

وہ میسیج میڈونا کے فون سے SEND کیا گیا تھا۔ اس نے فوراً میسیج کے ذریعے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟ دشمنی کرنے سے پہلے کھل کر بات کرو۔''

جواب موصول ہوا۔ ''انتظار اور ابھی......''

وہ ابھی مکمل نہیں رہی تھی۔ اسے ذہنی اضطراب میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ بڑے آرام سے ایک فاتح کی طرح گھر پہنچ کر اطمینان سے بولنا چاہتی تھی۔ میڈونا گن پوائنٹ پر تھی۔ مجبور ہو کر اس کی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ مراد سے بہت دور آکر یہ اطمینان ہو گیا کہ اس نے مرینہ کو بھی اس سے دور کر دیا ہے۔ اب اس کی گن سے نکلی ہوئی کوئی گولی مراد تک نہیں پہنچے گی۔

وہ بہت ذہین تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ مراد اس دشمن بلا سے دور رہ کر ہی اپنی ہونے والی دلہن کے لیے فائٹ کر سکے گا۔ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ مراد پوری طرح سلامت رہے۔

مرینہ نے کہا۔ ''میں اس بے وفا اور بے مروّت کے لیے جان لڑاتی رہی۔ اسے اپنی جوانی دی۔ اس کی خاطر میٹ جیسے بڑے ادارے کو چھوڑ دیا۔ اسے کئی بار سیکیورٹی دینے کے لیے دشمنوں کو جہنم میں پہنچاتی رہی۔ اتنی قربانیاں دی ہیں کہ وہ مجھ سے نکاح پڑھوانے کے لیے راضی ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر مکر گیا۔''

وہ فون کو مٹھی میں بھینچ کر بولی۔ ''وہ کمینہ، بدذات ماروی جب تک زندہ ہے، تب تک اسی کا دیوانہ رہے گا۔ وہ کسی عورت کے قریب بھی نہیں جاتا ہے۔''

وہ میڈونا کو دیکھ کر بولی۔ ''تم ایک ماہ سے اس کے ساتھ چھپی ہوئی ہو۔ کیا اس کے ساتھ بالکل تنہا رہتی آئی ہو؟''

''ہاں۔ مراد نے کسی پر بھروسا نہیں کیا ہے۔ کسی کو رازدار نہیں بنایا ہے۔ ہم دونوں اس خفیہ پناہ گاہ میں بالکل تنہا تھے۔ کوئی تیسرا نہیں تھا۔''

مرینہ نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''آگ بھڑکتی تھی تو کیا ہوتا تھا؟''

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ چٹان ہے۔ بہت زبردست وِل پاور (قوتِ ارادی) کا مالک ہے۔ میری قربت بھی اسے پگھلا نہ سکی۔''

''ایک ماہ تک اس کے ساتھ کیسے رہ گئیں؟ یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

''میں اس کے ساتھ رہ کر روحانیت کو تسلیم کرنے لگی ہوں۔ وہ پانچوں وقت کے علاوہ آدھی رات کے بعد بھی کسی وقت اٹھ کر نمازیں پڑھتا ہے اور کہتا ہے، نماز اس کی طاقت ہے۔ اسے گناہوں سے بچاتی ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''نمازیں اسے بچاتی ہیں۔ تم تو نہیں پڑھتی ہو۔ تمہیں تو نہیں بچاتیں۔ تم تو اسے بھڑکا سکتی تھیں۔ ایک حسین اور جوان عورت شرابی کے ہاتھ سے پیالہ اور زاہد کے ہاتھ سے تسبیح گرا دیتی ہے۔''

''ہاں۔ میں اسے جنون میں مبتلا کرنے کے تماشے کر سکتی تھی لیکن نہ کر سکی۔ میں اسی لیے روحانیت کی قائل ہوں۔ کوئی انجانی نادیدہ قوت مجھے بے حیا بننے سے روکتی رہی۔''

مرینہ نے ''اونہہ'' کہہ کر منہ پھیر لیا۔ کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسے نماز کی قوت سمجھوں یا ماروی کا جادو؟ وہ سر پھرا کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ مجھے لگا کر چھوڑ دیا لیکن ماروی کو نہیں چھوڑ رہا ہے۔

اس نے پھر سر گھما کر میڈونا کو دیکھا اور پوچھا۔ ''وہ خفیہ پناہ گاہ کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''سیدھی طرح بتا دو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔''

''تمہیں جو کرنا ہے وہ تو ضرور کرو گی لیکن سچ یہی ہے کہ میں پہلی بار اس شہر میں آئی ہوں اور آتے ہی چار دیواری میں چھپ گئی تھی۔ یہاں کے راستوں، گلیوں اور محلوں کے نہ نام جانتی ہوں، نہ اس خفیہ پناہ گاہ کے آس پاس کی کوئی جگہ اب تک دیکھی ہے۔''

مرینہ نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ میڈونا نے کہا۔ ''اور مراد اتنا نادان نہیں ہے کہ میرے اغوا ہونے کے بعد دشمنوں کی نظروں میں آنے کے لیے اس پناہ گاہ کی طرف جائے گا۔''

یہ بات بھی درست تھی۔ وہ ذرا مایوس ہو کر سوچنے لگی ''واقعی وہ اپنی خفیہ پناہ گاہ کا رخ نہیں کرے گا۔ کوئی دوسری جگہ ڈھونڈ لے گا۔ اس کے موجودہ چہرے سے صرف میں ہی اسے پہچان سکتی ہوں اور وہ مجھ اکیلی سے یہ آسانی چھپتا رہے گا۔''

اس نے پریشان ہو کر سوچا ''مشکل یہ ہے کہ میں اسے نظروں میں رکھنے کے لیے اس کے قریب نہیں رہ سکتی۔ وہ بھی میرے موجودہ چہرے سے مجھے پہچانتا ہے۔''

اس نے میڈونا کو دیکھ کر سوچا۔ اب تو جو کچھ ہے' یہی ہے۔ میں اسی کو اپنے شکنجے میں رکھ کر اسے جھکاتی رہوں گی۔''

وہ ڈرائیونگ کے دوران میڈونا کو گائڈ کر رہی تھی۔ اس طرح وہ تانترک مہاراج کی رہائش گاہ میں پہنچ گئیں۔ گرو مہاراج کے دو خاص چیلے وہاں تھے۔ وہ بھی منتر پڑھنے میں اور کالا جادو کرنے میں مہارت حاصل کر رہے تھے۔

پچھلی بار جب تانترک مہاراج کی آتما اس کے جسم سے نکل کر واپس نہیں آرہی تھی، تب ان دو چیلوں نے منتروں کی شکتی سے آتما کو مہاراج کے اندر پہنچا کر اسے نئی زندگی دی تھی۔ ان میں سے ایک چیلے کا نام شانتی تھا۔ دوسرے کا نام کیشو ناتھ تھا۔

کیشو نے مرینہ اور میڈونا کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ دونوں اندر آئیں۔ میڈونا اس مکان کو پریشان ہو کر دیکھنے لگی، سوچنے لگی۔ پتا نہیں کب تک یہاں قیدی بن کر رہنا... ہوگا۔ میرا مراد مجھے کب تک یہاں سے لے جاسکے گا؟

وہ کیشو سے بولی۔ ''یہ وہی میڈونا ہے۔ میں مراد کے علاوہ اسے بھی ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ تو ہاتھ آگئی ہے، مراد بھی اس کے پیچھے آنے پر مجبور ہو جائے گا۔ فی الحال اسے باندھ کر رکھنا چاہتی ہوں۔ رسیوں سے اور زنجیروں سے نہیں' اپنے جادوئی منتروں سے ایسا کرو کہ اسے باہر جانے کا دروازہ بھی نظر نہ آئے اور یہ چیخنا چلانا چاہے تو اس کے منہ سے آواز نہ نکلے۔''

وہ بولا۔ ''یہ کوئی کٹھن سمسیا نہیں ہے۔ آج آدھی رات کے بعد یہ بولنا بھول جائے گی۔ تم جب چاہو گی تب یہ کچھ بولے گی۔ پھر گونگی ہو جائے گی۔ یہ گھر کے اندر دیکھ سکے گی۔ باہر نکلتے ہی اندھی ہو جائے گی۔''

وہ میڈونا کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے جانے لگا۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ رو رہی تھی، فریاد کر رہی تھی۔ مراد کو پکار رہی تھی۔ وہ اسے کاندھے پر اٹھا کر ایک کمرے میں لے گیا۔ پھر اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

وہ بے چاری سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی کالے جادو کے اثر میں رہ کر ایک جگہ قیدی بن جائے گی۔ مرینہ نے ایک کرسی پر بیٹھ کر فون پر مراد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر مراد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! تم کون ہو؟ میڈونا کہاں ہے، اس کی آواز سناؤ۔''

مرینہ نے کہا۔ ''پہلے میری آواز تو سنو۔ نقار خانے کے شور میں بھی یہ آواز، یہ لہجہ تمہیں چونکا دے گا اور اس وقت تم حیران ہو رہے ہو۔ پریشان ہو رہے ہو۔''

وہ واقعی شدید حیرانی سے اس کی آواز سن رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا۔ پھر اس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم...... یہ تم ہو؟''

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''ہاں۔ میرا دلدار مجھے کیسے نہیں پہچانے گا؟ میں دل میں گھسی جو رہتی ہوں۔ مجھ سے منہ پھیرتے ہو لیکن دماغ سے مجھے نکال نہیں سکتے۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''فوراً میڈونا سے بات کراؤ۔''

''حکم نہ دو۔ میں صرف دوست بن کر بات مانوں گی۔''

''مجھ پر گولیاں چلاتے وقت دوستی کہاں گئی تھی؟''

''تم نے بھی مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ ایسا کئی بار ہوتا رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے دشمنی بھی کرتے رہے اور دوستی بھی۔ یوں حساب برابر ہوتا رہا۔''

وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔ ''میری بات مانو۔ اب تک جو ہو چکا ہے، اس پر مٹی ڈالو۔ دوستی کا نیا کھاتہ کھولو۔ تم دوست بن کر دیکھتے رہے ہو مرینہ تمہارے لیے جان کی بازی لگاتی رہی ہے۔''

''میں مانتا ہوں۔ تمہاری وفاداری اور قربانیاں بے مثال ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سے دشمنی کا دوسرا نام موت ہے۔''

''ایمان والے ہو تو یہ بھی مان لو کہ تم ہی مجھے دشمنی پر مجبور کرتے ہو۔ شام کو نکاح پڑھانے کی بات کرتے ہو اور اس سے پہلے ہی منہ پھیر کر مجھے ذلیل کرتے ہو۔ میری توہین کرتے ہو۔ اس وقت تمہارا ایمان کہاں جاتا ہے؟''

''میرا ایمان یہ ہے کہ میں ماروی سے بے ایمانی بھی نہیں کروں گا۔ وہ میری شریکِ حیات ہے۔ اس کی مرضی

کے بغیر تمہیں سوکن بناتا تو یہ سراسر بے ایمانی ہوتی۔ مجھ سے بحث میں وقت ضائع نہ کرو۔ میڈونا کو رہا کرو۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا میڈونا کے معاملے میں ماروی کی محبت آڑے نہیں آرہی ہے؟"

"بحث بعد میں کرو۔ پہلے میڈونا کو رہا کرو۔"

"پہلے دوستی ہوگی۔ تم اپنے وعدے کے مطابق مجھ سے نکاح پڑھاؤ گے۔ ہم ایک ماہ تک کہیں ہنی مون منائیں گے پھر میں میڈونا کو رہا کردوں گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں دوستی کروں گا لیکن نکاح کو بھول جاؤ۔ ہم پہلے کی طرح اچھے دوست بن کر رہیں گے۔"

"اچھے دوست بننے کے لیے پہلے میرا اعتماد حاصل کرو اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے میرے ساتھ .... ازدواجی زندگی گزارو۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، اب بھی کہتی ہوں۔ جب تک تمہارے بچے کی ماں نہیں بنوں گی' تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ ہم لڑتے رہیں گے مرتے رہیں گے۔ مرتے مرتے جب بھی بچتے رہیں گے' میں ایک بچے کی آرزو کرتی رہوں گی۔"

"یہ پاگل آرزو ہے' جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔"

"ہوگی....." وہ بڑے ٹھوس لہجے میں بولی۔ "میں ایک جونیئر مراد کو جنم دے کر رہوں گی۔ ابھی میڈونا کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو مجھ سے عارضی طور پر نکاح پڑھا لو۔ جس دن میڈیکل رپورٹ کہے گی کہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں، اسی دن تم سے طلاق لے کر تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی۔"

"کیا تم نے شادی اور طلاق کو کھیل سمجھ لیا ہے؟"

"اگر کھیل نہیں بنانا چاہتے تو مجھے طلاق نہ دینا۔ یہ میری اور میرے بچے کی خوش نصیبی ہوگی۔"

"تم کیوں ایسی بات کررہی ہو جو ناقابلِ قبول ہے۔"

"میں ایک جونیئر مراد کو جنم دے کر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ کس قدر تمہاری دیوانی ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ اس لیے تمہارے بچے کی ماں بنوں گی۔ تمہارے ساتھ مرنا چاہتی ہوں، اس لیے تم پر گولیاں چلاتی ہوں۔ اگر شملہ کے راستے میں میری فائرنگ سے تم مرجاتے تو دنیا دیکھتی کہ میں بھی مرجاتی۔ ابھی اس وقت زندہ نہ ہوتی۔"

اس نے کہا۔ "بے شک تم میری دیوانی ہو۔ میرے ساتھ جیو گی اور مرنا ہوگا تو پہلے مجھے گولی مارو گی پھر خود مرو گی۔ ایسا پر پھرا عشق تمہیں مبارک ہو۔ اب ان باتوں کو چھوڑ کر صرف میڈونا کی رہائی کی بات کرو۔ اس کی رہائی کے عوض میں ابھی تمہارا دوست بن رہا ہوں۔ آؤ' مجھ سے ملو، یا اپنا پتا بتاؤ۔ میں آرہا ہوں۔"

"میں کہہ چکی ہوں، اب ہماری دوستی کی ابتدا نکاح خوانی سے ہوگی۔ پہلے مجھے شریکِ حیات بناؤ پھر میڈونا کی بات کرو۔ یہ تمہاری امانت بن کر میرے پاس رہے گی۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ فی الحال میڈونا سے بات تو کراؤ۔"

وہ فون تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر میڈونا کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "ہمیں اپنی چار دیواری سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں۔ میں تم سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اب نہ جانے کب تک تمہارے پاس آنے کے لیے ترستی رہوں گی۔"

وہ بولا۔ "حوصلہ رکھو۔ میں مرینہ سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرکے تمہیں اپنے پاس بلاؤں گا۔"

"مجھے یقین ہے' تم میری خاطر سمجھوتا کروگے۔ مجھے ہر حال میں زندہ دیکھنا چاہو گے۔ میری عقل کہتی ہے کہ سمجھوتا نہیں ہوگا تو میری خاطر پھر دشمنی ہوگی۔ پھر گولیاں چلیں گی۔"

فون پر مرینہ کی آواز سنائی دی۔ وہ بول رہی تھی۔ "اسے بھی سمجھاؤ کہ گولیاں نہ چلیں۔ بہت ہوچکا۔ اب ایک دوسرے کو قبول کرکے سلامتی سے رہنا چاہیے۔ تم بھی سن لو کہ جب تک میں اس کے بچے کی ماں نہیں بنوں گی، تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گی اور مراد بھی ادھر آنہیں سکے گا۔"

"میں صرف مراد کی بہتری چاہتی ہوں اور بہتری اسی میں ہے کہ یہ تم سے دور رہے۔"

مرینہ نے اس سے فون چھین کر کہا۔ "مراد! یہ میرے ہاتھوں حرام موت مرے گی۔ جو بھی میرے اور تمہارے درمیان آئے گا' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ بولا۔ "تم بھی یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ جب تک میڈونا وہاں صحیح سلامت ہے۔ تب تک تم بھی سلامتی سے ہو۔ اگر اسے ذرا بھی نقصان پہنچاؤ گی تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گا۔ آج سے اپنی نیندیں حرام کرلو، یہ یقین کرلو کہ کسی دن کسی بھی لمحے میں تمہاری شہ رگ تک پہنچنے والا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ کبڑی چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "پتا نہیں' وہ میڈونا کو

کہاں لے گئی ہے۔ ہم اسے کہاں تلاش کرنے جائیں؟''

''تلاش تو کرنا ہوگا۔ میں اس سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ میڈونا کو نقصان پہنچائے گی۔ میں اس کے مقابلے میں میڈونا کو لفٹ دے رہا ہوں۔ یہ انسلٹ وہ برداشت نہیں کرے گی۔ اس پر جنون سوار ہوگا تو اسے مار ڈالے گی۔''

''ایک بات کہوں مراد؟''

کبڈی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تمہارا رویہ مرینہ کے لیے غلط ہے۔ تم اس سے ناانصافی کرتے آرہے ہو۔''

''تم کیا چاہتے ہو۔ اس خطرناک بلا کو گلے لگالوں جو کئی بار مجھ پر گولیاں چلا چکی ہے۔''

''تم نے بھی اسے نہیں بخشا ہے۔ اسے گولیوں سے چھلنی کرکے دو بار اسپتال پہنچا چکے ہو۔ وہ ہر بار موت سے لڑتی ہوئی واپس آکر پھر تم سے محبت کرنے لگی۔ دشمنوں کے مقابلے میں تمہارے سامنے ڈھال بنتی رہی۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ مارنے مرنے والی عورت ہے۔ جب تم اسے مجبور کرتے ہو، تب ہی وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تمہارے مقابلے پر آتی ہے۔ اپنے ایمان سے بولو۔ کیوں تم نے اس سے نکاح پڑھانے کا وعدہ کیا؟ پھر کیوں اپنی زبان سے پھر گئے؟ کیوں اسے ٹھکرا کر ڈیل کیا؟''

''تم جانتے ہو۔ میں اپنی ماروی کو ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جیتنے کے لیے ضروری تھا کہ اس پر سوکن نہ لاتا۔''

کبڈی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آج میڈونا سے نکاح پڑھا کر ماروی کو جیتنے والے تھے یا ہارنے والے تھے؟ کیا ماروی نے کہا ہے کہ مرینہ کو اس کی سوکن نہ بناؤ..... میڈونا کو سوکن بنادو؟''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''تم ایک ماہ سے میری مجبوریوں کو دیکھ رہے ہو۔ میں حالات سے مجبور......''

کبڈی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''آگے نہ بولو۔ جاؤ نماز پڑھو۔ سجدے میں جا کر اپنے رب سے پوچھو کہ میڈونا سے نکاح پڑھوا سکتے ہو تو اصولاً پہلے مرینہ کو منکوحہ بنانا چاہیے یا نہیں؟''

وہ دونوں جامع مسجد کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہورہا تھا۔ وہ مسجد میں آگئے۔ فیصلہ اب اللہ کی عدالت میں ہی ہوسکتا تھا۔ مراد وضو کرتے وقت تصور میں مرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی، جہاں وہ حق اور انصاف سے ہی سوچ سکتا تھا اور وہ دل ہی دل میں تسلیم کررہا تھا کہ اس کے لیے مرینہ کی محبت، وفاداری اور قربانیاں بے مثال ہیں۔

اس نے دیانت داری سے سوچا۔ 'میرے اپنے غلط روّیے نے اسے دشمن بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ آج بھی اس کی دوست ہے اور اس کی سب سے مضبوط سیکیورٹی ہے۔'

اس نے نماز پڑھی پھر وہ دونوں صحن میں آکر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں، مرینہ میں کھوٹ نہیں ہے۔ وہ میرے روّیے سے جھنجلا کر عارضی طور پر منفی ردعمل ظاہر کرتی ہے۔''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ''اگر میں اس سے نکاح پڑھوا لیتا تو آج وہ میری بہترین شریک حیات ثابت ہوتی۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''واقعی یہ سراسر ناانصافی ہے کہ میڈونا سے نکاح پڑھوا کر مرینہ کو نظروں سے گرا رہا ہوں۔ اس کی توہین کررہا ہوں۔''

کبڈی نے کہا۔ ''نماز ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ خود کریں۔ دل میں خوفِ خدا ہوگا تو ہم اچھائی اور برائی کی تمیز کرتے رہیں گے۔ حق اور انصاف کے مطابق کسی سے بھی تعلق ہموار کرسکیں گے۔''

''میں مانتا ہوں، وہ میرے معاملات میں سچی اور کھری ہے۔ مگر میں کیا کروں؟ انصاف کیسے کروں؟''

دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ''حق اور انصاف یہ ہے کہ میڈونا سے پہلے مرینہ کو عزت سے شریکِ حیات کا مرتبہ دوں۔ میڈونا بھی انصاف کی مستحق ہے۔''

''دونوں ہی مستحق ہیں۔''

''کیا بیویوں کا جمعہ بازار لگادوں؟''

وہ ہنسنے لگا۔ مراد نے کہا۔ ''ابھی ایک ہی مجھے سن سٹی سے یہاں تک دوڑا رہی ہے۔ اس کے بعد آنے والیاں جو تماشے کریں گی ان کے متعلق ہم ابھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ جان بوجھ کر تماشے نہ کریں پھر بھی حالات نچاتے رہیں گے۔''

حالات ایسے تھے کہ وہ فی الحال کسی ایک سے بھی کترا نہیں سکتا تھا۔ دونوں کو قبول کرنے سے ہی حالات معمول پر آسکتے تھے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے؟ وہ دونوں سے شادی کرکے نہ تماشا کرنا چاہتا تھا، نہ تماشا بننا چاہتا تھا۔

کبڈی نے کہا۔ ''دانش مندی یہ ہے کہ ابھی مرینہ سے باتیں بناؤ۔ اسے ٹالتے رہو بلکہ دونوں کو کنارے

لگانے کی ایسی تدبیر سوچتے رہو جس پر عمل کر کے تماشا بننے سے بچ جاؤ۔"

"جب تک مرینہ کو ٹالتا رہوں گا تب تک میڈونا اس کی قید میں رہے گی۔ مرینہ اسے میرے پاس آنے نہیں دے گی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتی رہے گی۔"

"تم دوستانہ انداز اختیار کرو گے تو وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی رہے گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے فون پر رابطہ کیا۔ اسے مرینہ کی آواز سنائی دی۔ "ہاں مراد! میں انتظار کر رہی ہوں بولو۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "مرینہ......! میں اس وقت مسجد میں ہوں اور قبلہ رو بیٹھا ہوا ہوں۔"

وہ بولی۔ "یہ سن کر اطمینان ہو رہا ہے۔ ان لمحات میں میرے اور تمہارے درمیان صرف خدا ہے۔"

اس نے پھر سنجیدگی اور سچائی سے کہا۔ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تمہاری توہین کرنے پر نادم ہوں۔"

مرینہ پر یکلخت سنجیدگی طاری ہو گئی۔ وہ مسجد میں بیٹھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو روبرو جان کر بول رہا تھا۔ "میں اپنی غلطی کی تلافی کروں گا۔ تمہاری قدر کروں گا اور تمہارے تمام حقوق ادا کروں گا۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح مثبت اور تعمیری انداز میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ مسجد میں بیٹھا ثابت کر رہا تھا کہ سچے ایمان والا ہے۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اب کسی طرح کی بے اعتمادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ "مراد! یہ ہمارا دین کیا ہے؟ اچانک ہی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اب تک ہم بندوق اور بارود کے سہارے کبھی دوستی کرتے رہے، کبھی دشمنی اور ابتدا سے اب تک کبھی ایک دوسرے پر پوری طرح بھروسا نہ کر سکے۔ ابھی تم مسجد میں ہو اور میں قبلہ رو ہوں۔ ابھی ہمارے درمیان اسلحہ نہیں ہے۔ صرف ایمان ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ خدا کی قسم، تم پر اندھا اعتماد کر رہی ہوں۔ اس لیے سے تم جو بولو گے وہی کروں گی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم مجھ پر بھروسا کرو گی۔"

"میں میڈونا کو ابھی تمہارے پاس پہنچاؤں گی۔"

وہ ذرا چپ رہا، پھر سوچ کر بولا۔ "ابھی رک جاؤ۔ پہلے وہ سچ سن لو، جو تم سے چھپا رہا تھا۔"

سچ یہ تھا کہ وہ مرینہ سے شادی کا وعدہ کر کے میڈونا سے نکاح پڑھانے والا تھا اور یہ بات اب اسے بتا رہا تھا۔

"کیا وہ جگہ تم دونوں کے لیے محفوظ اور مناسب ہے؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "تمہارے اس سوال نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔"

"کوئی پرابلم ہے کیا؟"

"ہاں۔ ابھی ہم دونوں ایمان کی چھاؤں میں ہیں اور میری یہ پناہ گاہ کالے جادو کا گھر ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ اپنی روداد سنانے لگی کہ مراد کے ہاتھوں نیم مردہ ہونے کے بعد تانترک مہاراج تک کیسے پہنچی تھی؟ یہ بتایا کہ ابھی اس کے مکان میں ہے اور مہاراج دن رات شمشان میں گھور تپسیا میں مصروف ہے۔ اور اس تپسیا کے نتیجے میں بابا صلاح الدین اجمیری کو جانی نقصان پہنچانے اور مراد کو مرینہ کا غلام بنانے والا ہے۔

وہ پوری روداد سنانے کے بعد بولی۔ "ہم دونوں کے خیالات میں پاکیزگی ہے اور کالے جادو میں سراسر ناپاکی رہتی ہے۔ میں ابھی میڈونا کو لے کر یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے کوئی نئی خفیہ جگہ تلاش کرنی ہوگی۔"

عبداللہ کبڈی فون کے قریب بیٹھا سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں ایک آدھ گھنٹے میں آؤں گا اور تم دونوں کو اپنی فرمونا کے پاس لے جاؤں گا۔ میرا وہ کرائے کا مکان فی الحال محفوظ رہے گا۔ ہم بعد میں کوئی مستقل خفیہ پناہ گاہ ڈھونڈ لیں گے۔"

دھرم داس کا مکان بھی محفوظ تھا۔ مراد وہیں رہنے والا تھا۔ مرینہ اور میڈونا نامحرم تھیں۔ انہیں فی الحال کبڈی کے ساتھ ہی جا کر رہنا تھا۔ وہ فون کے ذریعے بول رہے تھے اور طے کر رہے تھے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہے۔

اور آئندہ جو ہونا ہے، وہ ان کی لاعلمی میں ہو رہا تھا۔ اس مکان کے دوسرے کمرے میں میڈونا پلنگ پر گم صم سی لیٹی ہوئی تھی اور کیشو ناتھ اس کے قریب کھڑا منتر پڑھ رہا تھا۔

مرینہ نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کالے منتروں سے میڈونا کو اس طرح جکڑ دے کہ اسے اس چار دیواری سے باہر جانے کا راستہ نہ ملے اور اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلے۔ وہ تابع دار بن کر چپ چاپ احکامات کی تعمیل کرتی رہے۔

مرینہ اس وقت دوسرے کمرے میں بیٹھی فون پر مراد اور کبڈی سے باتیں کر رہی تھی۔ ابھی جا کر کیشو کو منتر پڑھنے سے روکنے والی تھی اور موجودہ پلاننگ کے مطابق میڈونا کو وہاں سے کبڈی کے مکان میں لے جانے والی تھی۔

ایسے وقت باہر کا مقفل دروازہ کھل گیا اور چابی کے

بغیر کھل گیا۔ کھلی ہوئی چوکھٹ پر بابا صلاح الدین اجمیری کھڑے ہوئے تھے۔

وہ اپنے دشمن تانترک مہاراج کی مصروفیات سے باخبر رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مہاراج اس وقت کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟ اور اس کے مکان میں مرینہ اور میڈونا کن حالات سے گزررہی ہیں۔

وہ چاہتے تو اس وقت شمشان میں جاکر اس کی گھور تپسیا میں مداخلت کرسکتے تھے۔ چالیس دن پورے ہونے سے پہلے ہی چلہ کشی کو توڑ سکتے تھے، لیکن وہ قدرتی معاملات کو سمجھ رہے تھے۔ آگے جو ہونی ہے، وہ ہونے والی تھی۔

انہیں اس حد تک روحانی صلاحیتیں حاصل تھیں کہ جو ہونی ہے، اسی کے مطابق ماحول کو بدل دیں اور کرداروں کو ادھر سے ادھر پہنچادیں۔

وہ تسبیح پڑھتے ہوئے ایک دروازے پر آئے۔ اس بند دروازے کے پیچھے مرینہ فون پر مراد اور کبڈی سے باتیں کررہی تھی۔ وہ دوسرے بند دروازے کو کھول کر اندر آگئے۔ وہاں کیشو ناتھ پلنگ کے کنارے کھڑا ہوا منتر پڑھ رہا تھا۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی میڈونا سحرزدہ ہورہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔

پھر بابا اجمیری کے کمرے میں آتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اسی لمحے میں منتر پڑھنے کے دوران میں کیشو ناتھ کی زبان دانتوں تلے آگئی۔ وہ تکلیف سے تلملا گیا۔ قریب ہی رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

منتر ادھورا پڑھنے سے الٹا اثر ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کا دماغ الٹ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ پھر پڑھنے کے لیے اٹھنا چاہتا تھا، نہ اٹھ سکا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سر گھومنے لگا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے کسی سفید پوش بزرگ کو دیکھا۔ پھر اپنے آپ سے غافل ہوگیا۔ اس کا دماغ نیند میں ڈوب گیا۔

میڈونا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ سحرزدہ سی ہوکر بیڈ سے اتر گئی تھی۔

اس کے سامنے ایک سفید پوش بزرگ تھے۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر پلٹ کر جارہے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

وہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ سحرزدہ ہوگئی ہے یا نیند میں چل رہی ہے۔ وہ مکان سے باہر آکر ان کے پیچھے چلتے چلتے غائب دماغ ہوگئی۔ اس کے وجود کو گم کردیا گیا۔ گویا وہ عارضی طور پر فنا ہوگئی۔

آگے وہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے اور کہاں جارہی ہے؟

مرینہ نے فون پر عبداللہ کبڈی کو اس مکان کا پتا بتانے کے بعد رابطہ ختم کردیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مراد اس مسجد سے دھرم داس کے مکان میں واپس جانے والا تھا۔ مرینہ اور میڈونا ابھی کبڈی کے ساتھ جانے والی تھیں۔

اسے یاد آیا کہ اس نے کیشو کو میڈونا پر کالا جادو کرنے کو کہا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنے کان پکڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی۔ کان اس لیے پکڑے کہ اب اس پر کمبختی جادو نہیں کرانا چاہتی تھی۔ کیشو کو کالے جادو سے روکنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کمرے میں پہنچ کر ٹھٹک گئی۔

وہ منتر پڑھنے والا کرسی پر بیٹھے بیٹھے سورہا تھا اور وہاں میڈونا نہیں تھی۔ وہ اسے آواز دیتی ہوئی مکان کے دوسرے حصوں میں گئی۔ پھر باہر کے کھلے ہوئے دروازے کو حیرانی سے دیکھ کر رک گئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس دروازے کو اندر سے لاک کیا تھا۔ پھر وہ چابی کے بغیر کیسے کھل گیا اور کس نے کھولا؟

وہ مکان سے باہر آکر آس پاس میڈونا کو ڈھونڈنے لگی۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ چابی کے بغیر کس طرح دروازہ کھول کر وہاں سے فرار ہوگئی ہے؟

اس نے فون پر مراد سے کہا۔ ”یہاں گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میں تم سے فون پر باتوں میں مصروف تھی۔ میڈونا چپ چاپ یہاں سے نکل کر فرار ہوگئی ہے۔ فوراً یہاں آؤ۔“

مراد اور کبڈی آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کیشو ناتھ کو کرسی پر سوتے دیکھا۔ مرینہ نے اسے آواز دی، اسے جھنجوڑا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ کرسی سے نکل کر فرش پر گر پڑا۔ لیکن اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ وہ فرش پر گرنے کے بعد بھی گہری نیند میں تھا۔

کبڈی نے اس کی نبض ٹٹول کر کہا۔ ”یہ زندہ ہے۔ کم بخت جاگتا کیوں نہیں ہے؟“

مراد نے کیشو کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ وہ اسی طرح نیم بے ہوشی کی حالت میں رہا۔ مرینہ نے کہا۔ ”میڈونا مجھے دشمن سمجھ رہی تھی اس لیے چپ چاپ یہاں سے چلی گئی ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”نہیں مرینہ! اگر وہ خود یہاں سے جاتی تو فوراً ہی کسی پی سی او سے مجھے آواز دیتی۔ مجھے اپنی

مدد کے لیے پکارتی۔ اسے اغوا کیا گیا ہے۔''
ان تینوں نے پریشان ہوکر مقفل دروازے کو کھلا ہوا دیکھا۔ مرینہ نے کہا۔ ''اغوا کرنے والے میڈونا کو پہچانتے ہوں گے۔''
کبڈی نے کہا۔ ''اور یہ تو سمجھنے کی بات ہے کہ وہ اس کے باپ میکی براؤن کے آدمی ہوں گے۔''
وہ بولی۔ ''انہوں نے مجھے موجودہ بہروپ میں نہیں پہچانا ہے۔ اس لیے مجھے نظر انداز کر کے چلے گئے لیکن انہوں نے کتنی خاموشی سے اغوا کی یہ واردات کی ہوگی، میں دوسرے کمرے میں تھی اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ میڈونا کو یہاں سے جبراً لے جانے میں کچھ تو وقت لگا ہوگا۔ کچھ تو آہٹ ملنی چاہیے تھی۔''
مراد نے کہا۔ ''ایک عجیب سی بات یہ ہے کہ وہ تانترک مہاراج کا چیلا بے ہوشی کی نیند سو رہا ہے جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ وہ میڈونا پر جادو کر رہا تھا۔''
وہ تینوں مکان کے اندر آئے۔ مراد نے ایک بالٹی پانی لا کر کیشوناتھ پر ڈالا۔ وہ سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ نیم بے ہوشی ہوتی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بے حس و حرکت ایسے پڑا تھا جیسے مر چکا ہو۔
اس کی نبض چل رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔
مرینہ نے کہا۔ ''کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے میں نے سنا ہے، منتر پڑھتے وقت غلطی ہو جائے تو پڑھنے والا پاگل ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔''
مراد نے کہا۔ ''فی الحال یہاں سے چلو اور باہر نکل کر ہوشیار رہو۔ یہ دیکھنے کی کوشش کرو کہ دشمن کہیں چھپ کر ہماری نگرانی کر رہے ہیں یا نہیں؟''
وہ تینوں مکان سے باہر آئے۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ہر سو دیکھتے رہے۔ راستے میں بھی شبہ نہیں ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔
اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ انہیں مرینہ اور مراد کی حیثیت سے پہچان لیا جائے گا۔ مراد کو موجودہ چہرے سے میڈونا، جگنی بائی، ڈاکٹر نمی سن، ایمان علی اور کبڈی پہچانتے تھے۔ مرینہ کو اب میڈونا، مراد، کبڈی اور تانترک مہاراج پہچان رہے تھے۔ ابھی وہ دونوں آزادی سے کہیں بھی رہ سکتے تھے۔ فی الحال کوئی جانی دشمن مصیبت بننے والا نہیں تھا۔
وہ دونوں کبڈی کے مکان میں آ گئے۔ مراد نے میڈونا کے فون سے میکی براؤن کو مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔
''تم میڈونا کے فون سے کال کر رہے ہو۔ تم نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے۔ لیکن کب تک اس کے ساتھ دہلی شہر میں چھپے رہو گے۔ دہلی کی پولیس اور انٹیلی جنس والے یقین سے کہتے ہیں کہ تم شہر کے باہر نہیں جا سکو گے اور یہ میں بھی کہتا ہوں۔''
میکی کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بیٹی کے اغوا سے بے خبر ہے۔ پھر بھی مراد نے کہا۔ ''زیادہ باتیں نہ کرو۔ میڈونا میرے ساتھ نہیں ہے۔ تمہارے آدمی اسے لے گئے ہیں۔''
''بکواس مت کرو۔ میرے آدمیوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ اگر وہ تمہارے پاس نہیں ہے تو کیا اسے اغوا کیا گیا ہے؟''
''یقیناً کوئی اسے جبراً لے گیا ہے۔''
''کیا اس نے چہرہ تبدیل کیا ہے؟''
''نہیں۔ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ہے۔ اسے دوست دشمن سب ہی پہچان سکیں گے۔ کوئی اسے دہلی شہر سے باہر نہیں لے جا سکے گا۔''
میکی نے رابطہ ختم کر دیا۔ اب وہ اپنے درجنوں ماتحتوں کو بیٹی کی تلاش میں دوڑانے والا تھا۔ مراد نے ماسٹر کو بوبو کو میڈونا کے سلسلے میں اطلاع دی۔ اس نے کہا۔
''فکر نہ کرو۔ وہاں میرے آدمی اسے تلاش کریں گے۔ تم اپنا خیال رکھو۔ وہاں تمہاری سب سے خطرناک دشمن مرینہ تمہیں موجودہ چہرے سے پہچان لے گی۔''
اس نے مرینہ کو مسکرا کر دیکھا پھر کہا۔ ''ماسٹر! ایک نئی خبر سنا رہا ہوں۔ مرینہ سے دوستی ہو گئی ہے۔''
وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اس سے دوستی کیسے ہو گئی؟ اس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچے ہو۔ میں کیسے یقین کروں کہ پھر موت سے دوستی کر رہے ہو؟''
''اب ایسا نہیں ہوگا ماسٹر......!''
''مراد......! ابھی ایک ماہ پہلے اس نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''
''میں بھی اسے موت کی آغوش میں پہنچا کر آ گیا تھا۔''
وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''تم دونوں کیا ہو؟ عشق کرتے ہو تو ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی لگاتے ہو۔ دشمن بنتے ہو تو ایک دوسرے کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہو۔'' وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو کر بولا۔ ''مراد......! ابھی تم مرتے مرتے بچے ہو اور بچتے ہی پھر اس سے دوستی کر رہے ہو۔ مائی گاڈ......! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

وہ اپنی آواز اور لہجے سے بہت ہی اُلجھا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اسے سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''میں کبھی تمہارے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا لیکن..... لیکن اب کہوں گا کہ حماقت کررہے ہو۔ جان بوجھ کر بلا کو پھر سے گلے لگا کر نئی مشکلات کے راستے ہموار کررہے ہو۔''

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، آئندہ ہمارے درمیان کبھی دشمنی نہیں ہوگی۔''

''پہلے بھی تمہارا یہی خیال تھا۔ جب بھی اس سے دوستی ہوئی، یہی یقین سے کہا کہ کبھی دشمنی نہیں ہوگی۔ تم برا مانو گے۔ لیکن صاف صاف کہتا ہوں کہ مجھے تم سے اختلاف ہے۔''

''میں برا نہیں مانوں گا۔ آپ میری محبت میں میری بہتری کے لیے مخالفت کررہے ہیں۔''

''یہ سن لو کہ جب تک مجھے یقین نہیں ہوگا کہ وہ تمہاری وفادار بن چکی ہے اور کبھی تمہارے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے گی، تب تک میں احتجاجاً اس سے بات نہیں کروں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں اسے دشمن ہی سمجھتا رہوں گا۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ مرینہ کے معاملے میں بہت سخت ہوگئے ہیں۔ پلیز آخری بار اسے آزمالینے دیں۔''

''تم اسے آزماتے رہو۔ میں نادان نہیں ہوں۔ تمہارے کسی دشمن کو کبھی دوست تسلیم نہیں کروں گا۔ تم دیکھ لینا' وہ جلد ہی پھر اپنی اصلیت دکھائے گی۔''

''چلیں۔ ایسا ہوا تو یہ میری یا اس کی زندگی کا آخری سین ہوگا۔ جب تک آپ کا دل نہ چاہے' اس سے نہ بولیں۔ پلیز میڈونا کے لیے کچھ کریں۔ اس کے باپ نے بھی اسے اغوا نہیں کرایا ہے' پھر اسے کون لے گیا ہوگا؟''

''میرے آدمی اسے دن رات تلاش کریں گے۔ اس کی طرف سے کوئی سراغ ملے گا، تب ہی معلوم ہوسکے گا کہ وہ کس کے شکنجے میں گئی ہے؟''

ماسٹر سے رابطہ ختم ہوگیا۔ مرینہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ماسٹر کی ناراضگی بجا ہے۔ میں جلد ہی اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میں سوچ رہی ہوں' کہیں تانترک مہاراج نے میڈونا کو غائب نہ کیا ہو۔''

مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں وہی دشمنی کررہا ہوگا۔ کیا تم جانتی ہو' وہ کہاں ہوگا؟''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''مہاراج نے کالی ودیا سے معلوم کیا ہوگا کہ وہ جن مسلمانوں کا دشمن ہے' ان سے میں دوستی کررہی ہوں۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''وہ تانترک مہاراج' بابا اجمیری سے بری طرح مات کھا چکا ہے۔ اب انتقاماً انہیں ہلاک کرنے کے لیے مکمل آتما شکتی حاصل کررہا ہے۔ یہاں کے شمشان گھاٹ میں چلہ کشی کررہا ہے۔''

مراد نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔ ''یا اللہ.....! وہ تو شیطانی عمل میں مصروف ہے۔''

وہ ایک ذرا ندامت سے بولی۔ ''میں تمہاری دشمن ہوگئی تھی۔ میں نے ناکامیوں سے جھنجلا کر مہاراج سے کہا تھا کہ وہ کالے منتروں سے تمہیں میرا غلام بنادیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ دشمنی میں دماغ یہی سوچتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہم مسلمان ہیں لیکن دشمنی میں اور انتقام کے جنون میں خدا کو بھول کر کالے جادو کا سہارا لیتے ہیں۔''

''ہاں یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اکثر مسلمان دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اپنے اعمال درست نہیں کرتے۔ خدا سے مدد نہیں مانگتے، جادو ٹونا کرنے والے فراڈ عاملوں پر ایمان لاتے ہیں۔''

اس نے مرینہ کو تعریفی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ تم مہاراج کے کالے جادو پر تھوک کر آگئی ہو۔ یہ بڑی بات ہے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''مسلمانوں کو تمام اعمال سے پہلے پاکیزگی کو اہمیت دینا چاہیے۔ جسمانی پاکیزگی سے ذہن پاکیزہ رہتا ہے۔ ذہن پاک رہے تو نیت پاک رہتی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے روح پاکیزہ ہوتی ہے اور تب نماز قبول ہوتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں نے تو اس ناپاک جادوگر کو چھوڑ دیا ہے لیکن میڈونا اس کے شکنجے میں چلی گئی ہے۔''

وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''ہمیں ابھی معلوم کرنا چاہیے۔ کیا وہ ابھی شمشان گھاٹ میں ہوگا؟''

''ہاں۔ چالیس دنوں کی تپسیا کررہا ہے۔ تیس دن گزر چکے ہیں۔ آئندہ دس دنوں تک وہیں رہے گا؟''

مراد نے کہا۔ ''میں وہاں جاؤں گا اور اس کی تپسیا کی ایسی کی تیسی کردوں گا۔''

کیڈی نے کہا۔ ''جلدی نہ کرو۔ پہلے سوچو۔ کالا جادو تمہارے اسلحے اور بارود کی دنیا سے مختلف ہے۔ وہ جو خطرناک کالے حربے آزمائے گا تو تمہاری گن فائٹنگ بے

اثر ہو جائے گی۔ تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''کبڈی! وہاں تو جانا ہی ہوگا۔ میڈونا کا سراغ لگانا ہی ہوگا۔ یہ سوچ کر رہا نہیں جا رہا ہے کہ وہ بے چاری کہیں ہیبت ناک جادو کی شکنجے میں ہوگی۔''

''خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ہمیں جانا ہی ہوگا۔''

رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ فرمونا نے آ کر پوچھا۔
''کیا آپ لوگوں کے لیے کھانا لگاؤں؟''

کبڈی نے کہا۔ ''ہمیں میڈونا کی فکر کھا رہی ہے۔ ہم ابھی جا رہے ہیں، واپس آ کر کھائیں گے۔''

مرینہ نے کچھ سوچ کر کیشو ناتھ کے فون نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ مرینہ نے پوچھا۔
''کیا تم پورے ہوش و حواس میں ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہاں دیدی! پتا نہیں میرے کو کیا ہو گیا تھا۔ میں منتر پڑھتے پڑھتے کرسی پر بیٹھ گیا تھا پھر میرے کو پتا نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔''

مرینہ نے پوچھا۔ ''پھر ایسا کیسے ہو گیا؟ تمہارے بے ہوش ہونے یا غائب دماغ ہونے کی کوئی تو وجہ ہوگی؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی نے تم پر جادو کیا تھا؟''

''میرے کو کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ سر چکرانے سے پہلے شاید میں نے بابا اجمیری کی جھلک دیکھی تھی۔''

''کیا.....؟'' مرینہ نے حیرانی سے مراد اور کبڈی کو دیکھا۔

وہ دونوں بھی حیرانی سے فون کو دیکھ رہے تھے۔ ادھر سے کیشو کہہ رہا تھا۔ ''میں نے اب سے پہلے اس بابا کو چلتی گاڑی کے بونٹ پر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ اس لیے یہاں کمرے میں ایک جھلک دیکھتے ہی پہچان گیا۔ لیکن ان کے خلاف نہ کوئی منتر پڑھ سکا، نہ کچھ بول سکا۔ یہ سمجھ نہ سکا کہ کیسے بے ہوش ہو گیا تھا۔''

''تم ابھی کہاں ہو؟ کیا مہاراج کو یہ باتیں بتائی ہیں؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوش میں آیا ہوں۔ یہاں دیکھا تو میڈونا بستر پر نہیں ہے۔ تم بھی یہاں سے کہیں چلی گئی ہو۔''

''تمہیں مہاراج سے پوچھنا چاہیے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے؟''

''گرودیو چالیس دنوں تک چپ رہیں گے۔ وہ ہم سے بھی کچھ نہیں بولتے ہیں۔ میں اور شانی انہیں کھانا پہنچاتے ہیں۔ ان کی سیوا کرتے ہیں۔ وہ کبھی ضرورت کے وقت اشاروں کی زبان سے کچھ بولتے ہیں۔''

پھر اس نے سوچ کر کہا۔ ''انہیں تو بتانا ہوگا کہ یہاں کیا ہو چکا ہے۔ آدھی رات کے بعد شانی یہاں آئے گا۔ میں ان کی سیوا کرنے وہاں جاؤں گا۔ تب ان سے بولوں گا کہ ان کے جانی دشمن بابا اجمیری نے یہاں آ کر کیا کیا ہے؟''

پھر اس نے کہا۔ ''دیدی! تم کہاں ہو؟''

''میں دوسری جگہ چھپنے آئی ہوں۔ اس گھر میں تمہارے جیسے منتر پڑھنے والے محفوظ نہیں ہیں۔ میں اپنے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ مہاراج کے واپس آنے کے بعد وہاں آؤں گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے مراد اور کبڈی کو دیکھا۔ وہ مطمئن تھے۔ مراد نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، میڈونا بابا اجمیری کی پناہ میں ہوگی۔ میں ان بزرگ سے ملنا چاہوں گا۔ ان کے عطا کیے ہوئے صرف ایک معجون اور مرہم سے میرے زخم بھر گئے ہیں اور مجھے پہلی جیسی توانائی حاصل ہوتی جا رہی ہے۔''

کبڈی نے کہا۔ ''ہمیں حجرے میں جا کر معلوم کرنا ہوگا کہ ان سے ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا ان سے فون پر باتیں ہو سکتی ہیں؟''

کبڈی نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''وہ موبائل فون جیسی دنیاوی چیزیں اپنے پاس نہیں رکھتے۔ ان کے بدن پر صرف سادہ لباس اور ہاتھ میں ایک تسبیح ہوتی ہے۔''

☆☆☆

وہ تینوں نماز عشا کے بعد حجرے کے سامنے آئے۔ انہوں نے اندر بلایا۔ ان تینوں نے حاضر ہو کر انہیں سلام کیا پھر فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ اس پاک پروردگار نے آپ کو ہمارا مسیحا بنایا ہے۔ آپ کے علاج سے مجھے شفا حاصل ہوئی ہے۔ میں شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔''

وہ بہت ہی نرم اور لطیف لہجے میں بولے۔ ''صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اسے بھول جاؤ، جس کی تلاش میں آئے ہو۔ وہ جہاں بھی ہے، محفوظ ہے۔''

وہ تینوں مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے میڈونا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ کہہ چکے تھے کہ اسے بھول جاؤ۔

بابا اجمیری نے نظریں اٹھا کر مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم کیا کر رہے ہو؟ کیسی زندگی گزار رہے ہو؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''الجھی ہوئی زندگی گزار رہا ہوں۔ حالات کہتے ہیں نماز پڑھو، میں پڑھتا ہوں۔ حالات کہتے ہیں بندوق اٹھاؤ، میں اٹھا لیتا ہوں۔''

"نمازیں پڑھنے والے حالات سے مجبور ہو کر کٹھ پتلی نہیں بنتے کبھی یہ نہیں کہتے کہ چوری میرا پیشہ ہے نماز میرا فرض۔ اسلام میرا دین ہے اور بندوق میری مجبوری۔ اے نمازی......! اپنے ربّ کو سجدہ کرنے والے حالات سے کبھی مجبور نہیں ہوتے۔ مجبوری مایوس کرتی ہے اور مایوسی گمراہ کر دیتی ہے۔ بندے کا اعتماد خدا پر کمزور کر دیتی ہے۔ یہ سن لو کہ تم دوغلے کردار کے حامل ہو۔"

ان کا یہ آخری فقرہ مراد کے دل میں دھک سے لگا۔ جیسے پتھر لگا ہو۔

انہوں نے کہا۔ "تمہارے جیسے عبادت گزاروں کے لیے سخت سزائیں ہیں۔"

وہ بڑی سخت باتیں کہہ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔

انہوں نے کہا۔ "خدا اب تک اس لیے تم پر مہربان ہے کہ تم مکمل دلجمعی سے نمازیں پڑھتے ہو اور گناہ کے معاملات میں شیطان کو شکست دیتے رہتے ہو۔ تمہارا یہ عمل جو غیر متزلزل ہے، اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ انہوں نے سوال کیا۔ "پھر مزید قوت ارادی سے کام کیوں نہیں لیتے؟ کیوں مجرمانہ زندگی سے پرہیز نہیں کرتے؟ اینٹ کا جواب پتھر سے ضرور دینا چاہیے۔ شیطانی صفات رکھنے والوں کے خلاف جہاد لازمی ہے۔ ابھی تمہاری جنگ بے مقصد ہے۔ تم ایک یا دو مجرموں کی 'تنظیم' کے غلام بن کر دوسری تمام مجرمانہ تنظیموں کے خلاف گولیاں چلاتے ہو اور ناحق خون بہاتے رہتے ہو۔ اپنی شریک حیات سے جھوٹ بولتے ہو۔ مصلحتاً دھوکے بازی کو جائز سمجھتے ہو۔ اپنا محاسبہ کرو کہ اپنے ہی دینی احکامات کے خلاف یہ کیسی زندگی گزار رہے ہو؟ تمہارے لیے تنبیہ ہے۔ اب تمہاری رسّی کھینچی جائے گی۔ اس سے پہلے ہی سنبھل جاؤ۔ دوسروں کو دھوکا دینے والا دراصل خود کو دھوکا دیتا ہے۔ فریب دہی سے باز آؤ۔ جرائم کی دنیا سے نکل آؤ۔ ہمارے دین کے دشمنوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہتھیار نہ پھینکو۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ دین کے دشمنوں کے خلاف بامقصد جنگ جاری رکھو۔ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔"

مراد سر جھکائے سن رہا تھا اور دل کی گہرائیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ ان کی ایک ایک ہدایت ذہن میں نقش ہو رہی تھی اور وہ ان لمحات میں جرائم کی دنیا سے نکلنے کا حتمی فیصلہ کر رہا تھا۔

مرینہ عبا اور نقاب میں تھی۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "آپ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی رہیں۔ مجھ ناچیز کے لیے کچھ فرمائیں؟"

انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی پھر نظریں جھکا کر کہا۔ "تم نے حالات سے اور ضرورت سے مجبور ہو کر یہ عبا اور نقاب پہنی ہے۔ تم عادتاً ضرورت کے مطابق بدل جایا کرتی ہو۔ اپنا نقصان کبھی نہیں ہونے دیتیں۔ فوراً ہی منافع کی طرف گھوم جاتی ہو۔"

وہ ان کی سچی اور کھری باتوں کو دل ہی دل میں تسلیم کر رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "تم صرف ایک ہی شخص کی وفادار ہو۔ یہ جو تمہارے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی چاہت سے کبھی باز نہیں آؤ گی۔ تم ضدی ہو۔ اس کے پیچھے بھاگتی رہو گی یہ آگے نکلتا رہے گا اور تم پیچھے تڑپتی رہو گی۔"

وہ دل توڑنے والی بات کہہ رہے تھے۔ "تم کبھی اس کے شانہ بشانہ ساتھ نہیں چل سکو گی۔"

مرینہ نے دل برداشتہ ہو کر مراد کو دیکھا۔ بابا اجمیری نے کہا۔ "اس کے مقدر میں ایک ہی شادی لکھی ہے اور وہ ہو چکی ہے۔ یہ دوسری شادی کبھی نہیں کر سکے گا۔"

یہ سراسر دل توڑنے اور رلا دینے والی بات تھی۔ مرینہ کا دل ٹوٹ رہا تھا لیکن وہ اتنی جلدی رونے والی نہیں تھی۔ بابا صلاح الدین اجمیری کی پیش گوئیاں درست ہوتی تھیں لیکن اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

انہوں نے کہا۔ "تم ضدی ہو۔ اس کی منکوحہ بننے کی تدابیر کرتی رہو گی اور تقدیر سے ہارتی رہو گی۔ میں مزید کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ میرے مشوروں اور میری ہدایات کے برعکس بہت کچھ کرنے والی ہو۔"

وہ دل برداشتہ ہو کر بولی۔ "آپ یہی مشورہ دیں گے کہ مجھے مراد سے دور ہو جانا چاہیے۔ یہ مشرق میں ہو تو مجھے مغرب میں ہونا چاہیے۔ ہمیں ندی کے دو کنارے بن جانا چاہیے۔"

"نہیں، یہ مشورہ نہیں دوں گا۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو۔ اپنے حالات سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے ملتے بچھڑتے رہو گے۔ لیکن کسی بھی حال میں ازدواجی رشتہ قائم نہیں کر سکو گے۔"

"کیا آپ سے امید نہ رکھوں؟ آپ کی دعاؤں سے میرے نصیب کبھی بدل نہیں سکیں گے؟"

"میں دل سے دعا کروں گا کیونکہ تم دل کی گہرائیوں سے مراد کو چاہتی ہو۔ لیکن صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی

حالات کو اور نصیب کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ تمہارے لیے میری دعائیں قبول ہوں گی یا نہیں؟ یہ وہی معبود جانتا ہے۔''

انہوں نے سامنے رکھی ہوئی تسبیح اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اب جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔''

وہ تینوں اٹھ گئے۔ انہیں سلام کر کے حجرے سے باہر آگئے۔ ان سب پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ حجرے سے جو سن کر آرہے تھے، وہ تمام باتیں ان کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنے سے پہلے ذہنی طور پر الجھے ہوئے تھے۔

انہوں نے بابا صاحب کے پاس جانے سے پہلے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کے خلاف ان کے حالات بدلنے والے ہیں۔ وہ مایوس ہو رہے تھے۔

وہ مختلف حالات کا سامنا تھا۔ ان میں سے ایک مایوس کرنے والی پیش گوئی ایک چیلنج بن گئی تھی کہ وہ دونوں کبھی ازدواجی رشتے میں منسلک نہیں ہو سکیں گے۔

دوسری بہترین اور ایمان افروز ہدایات یہ تھیں کہ اسے جرائم کی دنیا سے نکل کر دین کے لیے جہاد کرنا ہے۔

بابا اجمیری نے اسے اپنی نمازوں میں استحکام پیدا کرنے اور دشمنانِ دین سے نمٹنے کی راہ دکھائی تھی۔

وہ دونوں حجرے سے باہر کار کی اگلی سیٹ پر آگئے۔ کبڑی پیچھے بیٹھ گیا۔ مراد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ مرینہ نے کہا۔ ''بابا اجمیری اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ انہیں ہمارے بارے میں آگہی ہے۔ وہ ہمارے ماضی اور حال کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں بھی بہت کچھ کہہ دیا ہے۔''

مراد نے ڈرائیو کرتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کی پیش گوئی دل توڑ رہی ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ تم کبھی میری منکوحہ نہیں بن سکو گی۔''

مرینہ نے صدمے سے ایک لمبی سانس کھینچی پھر کہا۔ ''بے شک ان کی پیش گوئی درست ہوگی لیکن میں زندگی کے بڑے سے بڑے چیلنج کا منہ توڑ جواب دیتی ہوں۔ تقدیر کے اس چیلنج کو بھی الٹ کر رکھ دوں گی۔''

وہ بولا۔ ''ابھی بابا صاحب نے کہا تھا کہ تم ان کے مشوروں کے خلاف اپنی تدابیر پر عمل کرتی رہو گی۔''

وہ بولی۔ ''انسان ازل سے تقدیر کے خلاف تدبیر کرتا آیا ہے۔ کبھی ناکام ہوتا رہا ہے کبھی کامیابی حاصل کرتا رہا ہے۔''

''ہاں تقدیر اور تدبیر کے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہی ہے۔ انسان ضدی ہے۔ تقدیر کے آگے جھکتا نہیں ہے۔''

''مراد......! ہم بھی نہیں جھکیں گے۔ اپنے طور پر کوششیں کریں گے۔ کوشش نہ کرنے والے اپاہج ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کہتی ہے اور ہم دیکھتے آئے ہیں کہ کوشش کا میٹھا پھل ضرور ملتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''بے شک! کوشش کرنے والے ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ بابا صاحب جیسے بزرگ اور عالم دین نے اپنی زبان سے کہا ہے کہ تم مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہو۔ میں تمہاری محبت اور وفاداری کی قدر کروں گا۔ ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی کوششیں کرتے رہیں گے لیکن......''

وہ گاڑی کو دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے بولا۔ ''بابا اجمیری نے ہدایت کی ہے کہ مجھے جرائم کی دنیا سے نکل آنا ہے۔ صرف دین کے دشمنوں سے جنگ جاری رکھنی ہے۔''

''میں ہر پل، ہر جنگ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''بابا صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مرینہ......! جرائم کی دنیا سے نکلنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میری حمایت کرنے اور مجھے تحفظ فراہم کرنے والا ماسٹر کوبو کبھی مجھے چھوڑنا نہیں چاہے گا۔ میں اس کی وفاداری سے انکار کروں گا تو وہ بھی میرا جانی دشمن بن جائے گا۔''

یہ ہو سکتا تھا۔ وہ ماسٹر جو بڑے اعتماد سے اس کی پشت پناہی کرتا تھا، بے حساب اسلحہ اور بے شمار کرنسی اسے پہنچاتا تھا، ہر ملک میں اس کے لیے خفیہ پناہ گاہیں اور سیکیورٹی فراہم کرتا تھا، وہ اچانک بدل سکتا تھا۔ اسے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے جرائم کی دنیا میں رہنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مراد اس کے کام آنے سے انکار کرتا تو وہ دشمنوں سے زیادہ دشمن بن سکتا تھا اور ایسا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے، جو کبھی دوست رہ چکا ہو۔

اس نے حوصلے سے کہا۔ ''بے شک حالات ایسے ہوں گے کہ ہمیں کہیں چھپنے کی بھی جگہ نہیں ملے گی۔ ہم جرائم کی دنیا چھوڑنے سے پہلے ٹھوس پلاننگ کریں گے۔ اپنے لیے خفیہ پناہ گاہیں بنائیں گے۔ کرنسی اور اسلحے کے حصول کو آسان بناتے رہیں گے۔''

پھر وہ قدرے پریشان ہو کر بولا۔ ''سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ماروی کو کہاں چھپاؤں گا؟ دشمن مجھے نہ پا کر

اس کا جینا حرام کردیں گے۔ ماسٹر پہلے اسی کو ٹریپ کر کے مجھے اپنی وفاداری پر مجبور کرتا رہے گا۔"

واقعی یہ سب سے اہم مسئلہ تھا۔ جب ایسے حالات ہوتے تو ماروی کو تحفظ فراہم کرنا ناممکن ہو جاتا۔ وہ کبڈی کے مکان میں آکر رات کا کھانا کھاتے وقت اسی مسئلے پر اٹکے رہے۔ کسی بھی پہلو سے ماروی کی سلامتی نظر نہیں آرہی تھی۔

مرینہ نے کہا۔ "ابھی کھانے کے بعد تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہمیں دن رات ساتھ رہ کر بڑی ذہانت سے سوچنا' سمجھنا ہے۔ ہم فوراً ہی مجرمانہ زندگی چھوڑ نہیں سکیں گے۔ چھوڑنے سے پہلے جو رکاوٹیں پیش آنے والی ہیں انہیں دور کریں گے۔"

اس نے کہا۔ "سوری۔ ابھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ میں ایک ماہ سے میڈونا کے ساتھ رہ کر اور اس سے فاصلہ رکھ کر جذباتی جنون میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ تم سے نکاح پڑھائے بغیر ایک چھت کے نیچے رہنے کی غلطی نہیں کروں گا۔"

"نکاح خوانی کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے۔ ابھی کسی قاضی کے پاس جا کر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔"

کبڈی نے کہا۔ "آدھی رات گزر چکی ہے۔ کوئی قاضی نیند سے اٹھ کر وکیل اور گواہوں کے بغیر نکاح نہیں پڑھائے گا۔ آج کی رات الگ رہ کر گزارو۔ کل سول کورٹ کے رجسٹرار آفس میں نکاح ہو جائے گا۔"

مراد بہت ہی مضطرب تھا۔ فطری خواہشات اسے مجبور کر رہی تھیں۔ بابا اجمیری کی پیش گوئی بھی ذہن میں تھی کہ اس کے نصیب میں صرف ماروی ہے۔ صرف ایک شادی ہے۔ دوسری شادی خانہ آبادی بھی ہو نہیں سکے گی۔

انسان کو تقدیر کے خلاف کوشش کرنے سے نہ روکا جاتا ہے' نہ رکنا چاہیے۔ ناممکن کو حوصلے سے اور مسلسل کوششوں سے ہی ممکن بنایا جاتا ہے۔

وہ چاہتا تھا کہ مرینہ فوراً ہی منکوحہ بن کر اس کی تنہائی میں آجائے۔ لیکن وہ بھی مجبور ہو گئی تھی۔ دوسرے دن تک نکاح ٹل گیا تھا اور یہ اشارہ تھا کہ آئندہ بھی ٹلتا رہے گا۔

وہ کبڈی کے مکان میں رہ گئی۔ مراد اپنی پناہ گاہ میں واپس آگیا۔ وہ مایوس ہو رہا تھا۔ فطری تقاضے بھی تھے اور جرائم کی دنیا سے نکلنے اور خطرات مول لینے کا بہت بڑا چیلنج بھی تھا۔ ایسے وقت نیند اڑ جاتی ہے لیکن وہ آنکھیں بند کرنے سے پہلے مصمم ارادہ کرتا تھا کہ دو گھنٹے کی نیند لے کر [illegible] کے لیے بیدار ہو جائے گا اور وہ اس طریقہ کار کا عادی ہو گیا تھا۔ دو گھنٹے بعد جاگنے کے لیے فوراً ہی سو گیا۔

☆☆☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ شمشان بھومی کے سناٹے میں دھیمی دھیمی ہواؤں کا شور ایسا تھا جیسے چتا میں جلنے والوں کی بدروحیں روتی ہوئی ماتم کرتی ہوئی گزر رہی ہوں۔

تانترک مہاراج ایک چبوترے پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اسے چلہ کشی کے نو دن اور پورے کرنے تھے۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک الاؤ روشن تھا۔ بہت بڑی انگیٹھی میں شعلے رقص کر رہے تھے۔ ان شعلوں کا عکس مہاراج کے بھیانک چہرے کو انگاروں کی طرح سرخ بھبوکا کر رہا تھا۔

اس کی بڑی بڑی انگاروں جیسی دہکتی ہوئی آنکھیں یوں لگ رہی تھیں جیسے اپنے حلقوں سے نکل کر بابا صلاح الدین اجمیری کے وجود میں جا کر گولیوں کی طرح گھس جائیں گی۔ اور ایسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے اور بابا اجمیری کو فنا کرنے کے لیے صرف نو دن رہ گئے تھے۔ اس کا ایک چیلا [illegible] ڈیوٹی ختم کر کے گھر چلا گیا تھا۔ دوسرا چیلا کیشو ناتھ اس کی سیوا کرنے آیا تھا۔ اس نے انگیٹھی میں اور کوئلے ڈال کر اس میں تیل چھڑک کر آگ بھڑکائی۔

مہاراج زیر لب منتروں کا جاپ کر رہا تھا۔

پہلے وہ پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے دونوں پاؤں سیدھے کر لیے۔ کیشو نے اس کا ایک پاؤں دابتے ہوئے کہا۔ "گرو مہاراج کی آگیا ہو تو ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

مہاراج نے اس کے منہ پر ہاتھ مار کر اشارے سے کہا۔ "کیا بولتا ہے' بول۔"

وہ بولا۔ "کل رات وہ اجمیری ہمارے مکان میں آیا تھا۔"

مہاراج کی آنکھیں غضب ناک ہو گئیں۔ یہ ایسی خبر تھی کہ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ کیشو کو گھور کر دیکھنے لگا۔ کیشو کہہ رہا تھا۔ "دیدی کل ایک جوان لڑکی کو اغوا کر کے لائی تھی۔ اس کا نام میڈونا تھا۔ دیدی نے میرے کو کہا کہ میڈونا کو منتروں کی ان دیکھی زنجیروں سے باندھ دوں تاکہ وہ وہاں سے بھاگ نہ سکے۔"

وہ گرو دیو کا دوسرا پاؤں دابتے ہوئے بولا۔ "جب میں منتر پڑھ رہا تھا' تب میں نے اجمیری کو دیکھا۔ گرو دیو! میں کیا بولوں' وہ مہاشکتی مان ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری کھوپڑی الٹ گئی۔ میں اسی لمحے میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں

آیا تو معلوم ہوا کہ وہ میڈونا کو وہاں سے لے گیا ہے۔"
مہاراج نے غصے سے تلملا کر ایک لات ماری۔ کیشو جو پاؤں داب رہا تھا، لات کھا کر پیچھے جا کر گر پڑا۔ پھر جلدی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔
مہاراج دیدے پھیلائے خلا میں یوں تک رہا تھا جیسے بابا اجمیری کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اونچی آواز میں یوں منتر پڑھ رہا تھا جیسے خیالی دشمن پر لپک رہا ہو۔ اسے اپنے سامنے آنے کے لیے للکار رہا ہو۔ پھر وہ بیٹھے بیٹھے لیٹ گیا۔
اس نے اشارے سے چیلے کو قریب بلا کر سمجھایا کہ اس کی آتما دشمن سے نمٹنے جا رہی ہے۔ جب تک وہ وہاں مردہ پڑا رہے گا۔ کیشو آتما کو قابو میں رکھنے کا منتر پڑھتا رہے گا۔
وہ فوراً ہی اس کے سرہانے اکڑوں بیٹھ کر وہ خاص منتر پڑھنے لگا۔ مہاراج کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ بھی پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے پڑھتے پڑھتے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے ڈوبتے ڈوبتے گم ہوگئی۔ ہونٹ ساکت ہوگئے۔ جسم ساکت ہوگیا۔ آتما وہاں سے نکلتے ہی حجرے سے دور مسجد کے احاطے سے باہر آکر رک گئی۔
ارادے ناپاک تھے۔ بدن ناپاک تھا۔ اس لیے آتما بھی ناپاک تھی۔ وہ مسجد کے احاطے میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ بابا صلاح الدین اجمیری حجرے میں ہیں۔ لیکن وہ وہاں تک جا نہیں سکتی تھی۔ وہ انہیں چیلنج کرکے اپنی طرف آنے پر مجبور کرسکتی تھی۔
بابا اجمیری اس کے گھر سے میڈونا کو لے گئے تھے۔ وہ آتما چشم زدن میں میڈونا کے پاس پہنچ گئی۔ وہ کسی مکان کی چار دیواری میں ایک بیڈ پر سو رہی تھی۔ وہ اسے وہاں سے اٹھا کر شمشان میں لے جانا چاہتی تھی لیکن انجانی سی رکاوٹ ہونے لگی۔
پتا نہیں وہ مکان کہاں تھا۔ ہر سو دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ اس مکان کے آس پاس کا علاقہ دھند میں چھپا ہوا تھا۔ بابا اجمیری نے میڈونا کے اطراف حصار باندھا ہوگا۔ آتما اسے چھو نہیں پارہی تھی۔
وقت بہت کم ہوتا ہے۔ اسے دس منٹ کے اندر اپنے جسم میں واپس آنا تھا۔ سات منٹ گزر چکے تھے۔ وہ آتما فوراً ہی مرینہ کے پاس پہنچ گئی۔ اسے پلک جھپکتے ہی یہ معلوم ہوگیا کہ وہ بابا اجمیری کے پاس گئی تھی اور اب کالے جادو سے متنفر ہوگئی ہے۔
یہ بھی معلوم ہوا کہ گرو مہاراج کی کرپا سے مراد کو اپنا غلام بنانا چاہتی تھی۔ اب وہ کہانی ختم ہوچکی ہے۔ مراد سے دوستی ہوچکی ہے اور وہ کل اس سے شادی کرنے والی ہے۔
پھر وہ آتما دھرم داس کی اس کوٹھی میں پہنچی جہاں مراد نے پناہ لی تھی وہ اس کے قریب بھی نہ جاسکی۔ اس وقت وہ تہجد کی نماز میں مصروف تھا۔
وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ ایسے وقت نہ وہ اسے نقصان پہنچا سکتی تھی، نہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرسکتی تھی۔ آتما کے لیے کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہورہی تھی۔
وہ کچھ نہ کچھ معلوم کرکے صحیح وقت پر اپنے جسم میں واپس آگئی۔ وہ جے مہا کالی کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے انگیٹھی میں شعلے لپک رہے تھے۔ اس کی آتما نے لپک کر بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں۔
اسے یہ معلوم کرکے غصہ آرہا تھا کہ مرینہ نے بابا اجمیری کے مقابلے میں اسے ٹھکرا دیا ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ "جے مہا کالی! میں اس کمینی کو تیری بھینٹ چڑھاؤں گا۔"
ایسے وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ غصے میں اور بابا اجمیری سے انتقام لینے کے جنون میں بول پڑا ہے۔ اسے اپنے خاص پراسرار منتروں کا جاپ کرتے رہنے کے دوران میں کچھ اور نہیں بولنا تھا۔ چالیس دنوں تک صرف منتر پڑھتے رہنا تھا۔
لیکن چلہ کشی کا یہ بنیادی اصول ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔
غصہ حرام ہوتا ہے۔ اس نے غصے کی شدت سے تلملا کر اکتیس دنوں کی تپسیا کو حرام کردیا تھا۔ صرف نو دن رہ گئے تھے اور تپسیا بھنگ ہوگئی تھی۔ اسے آتما شکتی میں مہاشکتی مان ہونے کے لیے چلہ کشی پھر سے شروع کرنی تھی۔
اس نے دونوں مٹھیوں سے سر کے بالوں کو جکڑ لیا۔ گرجتے ہوئے بولا۔ "ہے مہا کالی! یہ میرے سے کیسی بھول ہوگئی۔ میں اس اجمیری سے پھر مقابلہ نہیں کر پاؤں گا۔ پھر مجھے چالیس دنوں کی گھور تپسیا کرنی ہوگی۔"
وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "میں تو تھک گیا ہوں۔ میرے شریر (جسم) میں اتنی جان نہیں ہے کہ اتنی لمبی تپسیا کرسکوں۔ ہے درگا میا! اس اجمیری کا سروناش کرنے کا کوئی دوسرا راستہ دکھا دے۔"
وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہاں سے دوڑتا ہوا چیختا اور بولتا ہوا شمشان کو چھوڑ کر قریبی درگا مندر کی سمت بھاگتا جارہا تھا۔

☆☆☆

ماروی بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے ایسے عاشق سے دل لگایا تھا ایسے مرد کی گھر والی بن گئی تھی جس کی زندگی میں حسین عورتیں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ مرینہ کے بعد میڈونا آئی ہے اور وہ پچھلے ایک ماہ سے مراد کے ساتھ تنہا ایک چاردیواری میں رہتی رہی ہے۔ یہ ماننے والی بات نہیں تھی کہ وہ ایک ماہ تک ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ پارسا رہا ہوگا۔

لیکن اس نے قسم کھا کر اپنی نمازوں کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ پارسا رہا ہے۔ اب نہیں رہ سکے گا۔ برداشت کی حد ہو چکی ہے۔ موجودہ حالات میں دین اجازت دیتا ہے کہ اس نامحرم سے فوراً نکاح پڑھا لیا جائے۔

اور اس نے فون پر کہہ دیا تھا کہ وہ میڈونا کو اپنی منکوحہ بنانے جا رہا ہے۔ تب سے اس کا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ چاچی اور بشریٰ اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی تھیں۔ لیکن وہ اپنی فطرت سے' اپنے مزاج سے مجبور تھی۔ کسی بھی عورت کو مراد کے قریب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پچھلی بار اس نے سن سٹی میں قیامت برپا کر دی تھی۔ اس سے شدید نفرت ظاہر کر کے پاکستان آ گئی تھی۔ یہ تاثر دیا تھا کہ مراد کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔ لیکن دل کہاں مانتا ہے؟ وہ تو بچپن سے اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ اسے تو صرف موت ہی جدا کر سکتی تھی۔

پہلے وہ مرینہ سے نکاح پڑھوانے والا تھا۔ اب میڈونا کو منکوحہ بنانے کی خبر سنا چکا تھا۔ اس بار وہ چیخ و پکار نہ کر سکی۔ مراد کو چھوڑ دینے کی دھمکی نہ دے سکی۔ یہ عقل آ گئی تھی کہ مرد جب دوسری' تیسری کرنے پر آتا ہے تو اس پر استعمال شدہ بیوی کی دھمکیاں اثر نہیں کرتیں۔

وہ روتے روتے سوچنے لگی۔ ’’میری قدر کم کیوں ہو گئی ہے؟ مجھ میں ایسی کیا کمی ہو گئی ہے؟‘‘

اسے جواب ملا۔ ’’عورت صرف حسن اور جوانی کی بنیاد پر قائم نہیں رہتی۔ اگر وہ چاہتی ہے کہ قدر و قیمت اور بڑھ جائے تو وہ اپنے مرد کو بچوں کی زنجیروں میں باندھ لے۔‘‘

لیکن وہ پیار بھرے دن رات گزارنے کے بعد بھی بانجھ رہی۔ اپنے مراد کے ایک بچے کی ماں نہیں بن پائی تھی۔

عورت سمیرا کی طرح ذہین اور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی اہمیت برقرار رکھتی ہے اور مرینہ کی طرح آگ' لہو اور بارود بن کے مرد کے حواس پر چھائی رہتی ہے۔

ماروی سوچ رہی تھی۔ ’’میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میرے حسن و شباب اور عشق و محبت کی کہانی پرانی ہو گئی ہے۔ کیا اپنی چمک دمک واپس نہیں لا سکوں گی؟‘‘

وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی۔ ’’یہ بات اب تک میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی کہ مجھے بھی ہنرمند اور باصلاحیت ہو کر اپنی اہمیت منواتے رہنا چاہیے؟ جو عورتیں صرف مرد کے بھروسے پر زندگی گزارتی ہیں۔ وہ میری طرح خاک میں رلتی رہتی ہیں۔ ساری عمر اپنا دکھڑا روتی رہتی ہیں۔ لیکن دکھڑا سننے والے کو موم نہیں کر پاتیں۔‘‘ پہلی بار اس کے اندر آگ سلگ رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ’’مجھے کچھ ایسا کرنا چاہیے۔ مجھے کچھ ایسا بن جانا چاہیے کہ مراد دنیا جہان کی عورتوں کو بھلا کر میرے ہی پیچھے بھاگتے بھاگتے زندگی گزار دے۔ میں کیا کروں؟ کس طرح نئی' انوکھی اور نایاب بن جاؤں؟ عورتیں بیوٹی پارلر میں جا کر عارضی طور پر اپنی ذات کو پرکشش بناتی ہیں پھر مرجھا جاتی ہیں۔ میں عارضی نہیں دائمی کشش پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی خوبیاں' ایسی صلاحیتیں' ایسی کشش جو میرے بعد بھی مراد کے دل میں نقش رہیں۔‘‘

وہ بیڈ پر بیٹھی کبھی ادھر کبھی ادھر پہلو بدل رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ’’ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ میری عمر کی تازگی اور شادابی برقرار ہے۔ میرے سامنے ابھی پہاڑ جیسی زندگی ہے۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔‘‘

وہ سوچتی رہی' پھر تکیے پر گر پڑی۔ ایک نئی امنگ مچل رہی تھی اور اس کے اندر طرح طرح کی سوچیں پیدا کر کے اسے تھکا رہی تھیں۔ آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ پرسکون ہو گئی۔ نیند سب کچھ بھلا دیتی ہے اور کبھی خواب نگر میں پہنچا دیتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ دشمن مراد کو گھیر رہے تھے اور وہ ادھر سے ادھر چھلانگیں لگاتی ہوئی مراد کے آگے ڈھال بنتی ہوئی فائر کر رہی تھی' دشمنوں کی لاشیں گراتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنی گن فائٹنگ کے ایسے دو مختلف مناظر دیکھے۔ پھر اسے ایک سفید پوش بزرگ دکھائی دیے۔ وہ بابا صلاح الدین اجمیری تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ’’تم نے پہلے جتنے مارے۔ دوسری بار اس سے زیادہ پیدا ہو گئے۔ شیطان کے چیلے جتنے مرتے ہیں' اس سے زیادہ پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مراد تمام عمر لڑتا رہے گا۔ دشمن کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ تم مرینہ بن کر جرائم کی دنیا میں سانسیں لیتی رہو گی اور دینی احکامات کے خلاف اس کے ساتھ زندگی

گزارتی رہوں گی۔

"جنگ لڑنا ہے تو دشمنانِ دین کے خلاف لڑو۔ ایک عورت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ لڑنے کے لیے ہتھیار اٹھائے۔ تم علوم وفنون کے ذریعے دین کے لیے ڈھال بن سکتی ہو۔ علم کی کاٹ تلوار سے زیادہ ہوتی ہے۔ دینی علوم میں ایسی دسترس حاصل کرو پھر ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرو کہ دشمنوں کے ہاتھوں سے بندوق گر جائے اور تمہارا اعجازی خدا تمہارا دیوانہ ہو جائے۔"

وہ یہی چاہتی تھی اور بزرگ یہی کہہ رہے تھے۔

لیکن دینی علوم کیسے حاصل کرے؟ پھر یہ کہ علوم کی گہرائیوں میں اتر کر کیسے دسترس اور کمال حاصل کرے؟

اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ چاروں شانے چت پڑی چھت کو تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ میں نے حوصلہ افزا خواب دیکھا ہے لیکن دل ودماغ میں رس بس جانے والا علم حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور دو چار روز میں صلاحیت اور مہارت حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے ایک عرصہ لگتا ہے۔'

کتنا عرصہ لگتا ہے؟

'جتنا بھی عرصہ لگے۔ علم بڑھاپے میں بھی حاصل کیا جاتا ہے اور میں تو جوان ہوں۔ جتنے بھی دن، مہینے اور سال گزرتے رہیں، میں بے دست وپا ہو کر خالی بیٹھی نہیں رہوں گی۔ کچھ تو حاصل کرتی رہوں گی۔ کچھ تو میری شخصیت میں آب وتاب پیدا ہوتی رہے گی۔'

اس کے اندر یہ شدید جذبہ مچل رہا تھا کہ ماروی کو گزرا ہوا وقت اور ڈوبتی ہوئی شام نہیں، ابھرتا ہوا سورج بن کر چھا جانا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خواب میں وہ بزرگ کون تھے؟ ان کی ہدایات نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب وہ اندر سے خالی نہیں ہے۔ حوصلوں سے بھرپور ہو گئی ہے۔

وہ ایک مدت کے بعد اپنی ذات کو اہم بنانے کے لیے سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی قدروقیمت کو گھٹانا نہیں، بڑھانا ہے۔ اپنی اہمیت منوانے کے لیے اسے مشکل مراحل سے گزرنا ہے۔ کچھ ایسا کرنا ہے کہ پرانی ماروی گم ہو جائے اور نئی چکاچوند کے ساتھ نئی ماروی جنم لے اور اپنے ہرجائی کی زندگی میں تہلکہ مچا دے۔

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ وضو کرنے کے لیے واش روم میں چلی گئی۔ ابھی سب سے اہم سوال یہ تھا کہ جو سوچا ہے وہ کیسے ہوگا؟ شروع کیسے کرے گی؟ کہاں سے کرے گی؟

وہ چاہتی تھی، کسی کو معلوم نہ ہو اور وہ بڑی خاموشی سے ایک نمایاں کام کر گزرے۔ عورت کسی کے سہارے کے بغیر مردوں کی اس دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ کسی کا تو سہارا لینا تھا۔ کسی کو تو رازدار بنانا تھا۔ اور وہ رازدار ایسا ہو کہ اسے تمام پیچیدہ راستوں سے گزار کر اسے مطلوبہ منزل تک پہنچا دے۔ اسے ایک نئی اور اچھوتی ماروی بنا دے۔

یہ مایوس کرنے والی بات تھی اور یہ منظور نہیں تھا کہ کسی اور کو رازدار بنائے اور کسی کو رازدار بنانے اور اس پر اندھا بھروسا کرنے کی بات پر صرف محبوب ہی نگاہوں کے سامنے آتا تھا۔

ایک وہی تھا جس کی نیک نیتی کا سکہ ماروی کی راجدھانی میں چلتا تھا۔ پھر یہ کہ جانے انجانے میں یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ وہ مراد سے بھی بچھڑے گی تو سیدھی محبوب کے پاس آئے گی۔ وہ مراد سے رشتہ نہیں توڑ رہی تھی اور سوکنوں سے کھیلنے والے مرد کے ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ خود کو ایک نئی ماروی بنانے کے بعد اس کے سامنے آنا چاہتی تھی۔ اور اس مقصد کی تکمیل میں کئی برس گزر سکتے تھے اور برسوں تک وہ صرف محبوب پر ہی بھروسا کر کے اس کے سہارے رہ سکتی تھی۔ اب سے پہلے بھی وہ اس کی عزت اور آبرو کا محافظ رہ چکا تھا۔

وہ نماز پڑھ چکی تھی۔ مصلے پر دوزانو ہو کر بیٹھی تھی۔ نماز اور نیک ہدایات کی سمت لے جانے والے مصلے پر محبوب کو ہادی اور راہنما کے طور پر دیکھ رہی تھی۔

اب تک کے تمام تجربات کہہ رہے تھے کہ وہی اسے اس کی نئی منزل تک پہنچائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ چل کر اس کی راہنمائی کرے گا۔ راستے کی تمام مشکلات کو دور کرتا جائے گا۔ اپنی ذہانت اور ذرائع سے مخالفین کو مات دیتا جائے گا اور ساری دنیا سے چھپا کر اسے حسب توقع ایک نئی ماروی بنائے گا۔

سوال پیدا ہوا، کیا وہ مکمل رازداری سے اس کے کام آسکے گا؟ سمیرا اس کی شریک حیات ہے۔ اس کے ساتھ دن رات رہتی ہے۔ کیا اس سے یہ بات چھپ سکے گی؟ اس سوال کا جواب محبوب کی دیوانگی تھی۔ وہ ماروی کے کام آنے کے لیے ناممکن کو ممکن بنا سکتا تھا۔ دل نے کہا۔ "پہلے محبوب سے بات کی جائے پھر ہر سوال کا جواب ملتا جائے گا۔"

وہ مصلے سے اٹھ گئی۔ بیڈ کے سرے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے سرہانے سے فون کو اٹھا کر احتیاطاً سوچا، پتا نہیں سمیرا کب اس کے ساتھ ہوتی ہے اور کب ساتھ نہیں رہتی۔

اسے میری کال کا علم نہیں ہونا چاہیے۔
اس نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد میسج SEND کیا۔ ''پلیز۔ کال می......''
محبوب آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ سمیرا کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ میسج پڑھتے ہی اس کے اندر بجلی کی رو دوڑ گئی۔ اس نے فوراً کال کی۔ ''ہیلو ماروی! تم نے یاد کیا ہے۔ آج کی صبح روشن اور چمکیلی ہو گئی ہے۔''
وہ بولی۔ ''آپ کے چہکنے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ سمیرا آپ کے قریب نہیں ہے۔''
''اس کی فکر نہ کرو۔ اگر آئے گی تو میں دور ہو کر بات کروں گا۔ کچھ کہنا چاہتی ہو؟''
''ہاں مگر تنہائی میں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ یہ کہہ دوں کہ میری کال کا تعلق عشق و محبت سے نہیں ہے اور مراد کے خلاف بھی نہیں ہے۔ میں اپنے ذاتی مسئلے میں الجھی ہوئی ہوں۔''
''میں تمہاری الجھنیں دور کروں گا۔ اگر لمبی باتیں ہیں تو فون پر نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی سمیرا آجائے گی۔''
''کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کروں گی۔ جب آپ مناسب سمجھیں کال کریں۔''
اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ انتظار کرنے والی تھی لیکن محبوب کے اندر ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ وہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی سمیرا کے پاس ناشتے کی میز پر بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ بے تابی کہہ رہی تھی کہ فوراً گھر سے نکل پڑے۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ سمیرا کو ایک ذرا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ماروی سے کہیں تنہائی میں جا کر گفتگو نہیں کر سکے گا۔ اسے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔
اس نے ماروی کے میسج کو اور اپنی کال کو فون سے مٹا دیا۔ ناشتے کی میز پر آکر سمیرا سے کاروباری گفتگو کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بینک کے معاملات دیکھنے ہیں۔ تمہیں آفس کے سامنے ڈراپ کر کے بینک جاؤں گا۔ نئی چیک بک بھی لینی ہے۔''
یوں اس نے ماروی سے ملاقات کا راستہ ہموار کر لیا۔ سمیرا کو آفس کے سامنے ڈراپ کر کے ایک سمت جاتے ہوئے جانِ حیات کو کال کی۔ ''میں فری ہوں۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بولو کہاں آؤں؟''
اس نے کہا۔ ''میں ابھی گھر سے نکل رہی ہوں۔ باہر اسٹاپ تک آپ بھی آجائیں۔''
''ابھی آرہا ہوں۔''

وہ مسرتوں سے سرشار ہو کر مطلوبہ اسٹاپ پر جانے لگا۔ ایک طویل مدت کے بعد اپنی معشوق سے تنہائی میں ملنے والا تھا۔ اس کا مزاج بے اختیار رومانوی ہو گیا تھا۔ اپنی محبوب ہستی سے چھپ کر ملنے کی جو جاذبیت ہوتی ہے وہ اسے کھینچے لیے جا رہی تھی۔ تقدیر نے اس کے پاس جانے کا فری پاس دے دیا تھا۔
وہ عبا اور نقاب میں تھی۔ اس کی کار بس اسٹاپ سے کچھ دور پہنچ کر رکی تو وہ اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ محبوب نے چپ چاپ ایک لمبی سانس یوں لی جیسے آنے والی کو اپنے اندر کھینچ رہا ہو۔
کار وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ آگے کہیں بھی جانا تھا کہیں بھی رکنا تھا یا پھر چلتے ہی رہنا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ماروی کو دیکھا پھر کہا۔ ''تم پھر کسی مسئلے میں الجھ گئی ہو۔ یہ سوچ کر مجھے نئی زندگی نئی تازگی ملتی ہے کہ مشکلات میں مجھے ہی یاد کرتی ہو اور دل کی گہرائیوں سے مجھ پر اعتماد کرتی ہو۔''
اس نے اعتراف کیا۔ ''بے شک! میں خدا کے بعد صرف آپ پر بھروسا کرتی ہوں۔ خدا نے آپ کو وسیلہ بنایا ہے۔ میری مشکلات آپ ہی دور کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے کہ میرا مجازی خدا مشکل ہو گیا ہے۔ ایسے وقت آپ ہی مشکل کشا ہوتے ہیں۔''
''خدا تمہیں دلی آرام اور ذہنی آسودگی عطا فرمائے۔ بولو میں تمہارے لیے کیا کروں؟''
وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''میں زیادہ نہیں بولوں گی۔ آپ بھی زیادہ نہیں پوچھیں گے۔''
''میں تمہارے مزاج کے خلاف کوئی سوال نہیں کروں گا۔''
وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں مراد سے بہت دور ہو جانا چاہتی ہوں لیکن اس کے نکاح میں رہوں گی۔ ان حالات میں آپ میری آرزو نہیں کریں گے۔''
''ماروی......!'' اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''تم نے کبھی سوچا ہے کہ مجھے کیسی کیسی آزمائشوں میں مبتلا کرتی رہتی ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مراد سے علیحدگی ہوگی تو میرے پاس آؤ گی۔''
''علیحدگی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ مراد سے صرف فاصلہ رکھوں گی۔ اس کی دنیا سے گم ہو جاؤں گی لیکن اسی کے نام سے سانسیں لیتی رہوں گی۔ میرے اس فیصلے سے آپ اپنی توہین محسوس نہ کریں۔ آپ میری زندگی میں مراد سے زیادہ اہم ہیں۔ میرا وجود اس کے لیے ہے۔ لیکن اس وجود

کو ہر مشکل میں سنبھالنے والے آپ ہیں۔ میں مراد پر رتی برابر بھروسا نہیں کرتی ہوں۔ آپ پر اندھا اعتماد کرتی رہتی ہوں۔ میرا مزاج بدلتا جارہا ہے۔ میں بیوی اس کی ہوں لیکن ایک شوہر سے زیادہ آپ کو چاہتی ہوں۔ صرف آپ کی منکوحہ نہیں ہوں۔ صرف میرا وجود آپ کے لیے ممنوعہ ہے لیکن آزمائش کی گھڑیوں میں یہ وجود آپ ہی کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔''

ماروی نے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''آخری بات یہ ہے کہ نامعلوم مدت کے لیے مراد کو چھوڑ کر آپ کے سہارے رہنا چاہتی ہوں تو پھر اہمیت کس کی ہوئی؟''

یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ اس نے فوراً ہی کار کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے حیرت اور مسرت سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ کیا واقعی مراد کو عارضی طور پر چھوڑ کر میرے ساتھ رہو گی۔''

''آپ کے ساتھ نہیں' آپ کے سہارے کہیں تنہا رہوں گی۔''

''مجھے یہ سن کر خوشی ہورہی ہے کہ ایک نامعلوم مدت تک اس سے دور میرے سہارے رہو گی۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر جینے کے لمحات حاصل ہوتے رہیں گے۔''

''میں پھر کہتی ہوں۔ کسی چار دیواری میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی اور شاید اس ملک میں بھی نہیں رہوں گی۔ چاچی چاچا سے بھی دور ہو جاؤں گی۔ ابھی یہ نہیں جانتی کہ آپ کا ساتھ کیسے ہوگا؟ اتنا چاہتی ہوں کہ صرف آپ مجھ سے باخبر رہیں اور اور مجھے تحفظ دیتے رہیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم نے کیا سوچا ہے ماروی؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''کیا میں سمیرا کی طرح ایک تعلیم یافتہ قابل عورت بن سکتی ہوں؟''

''بے شک! اگر یہ تمہارا شدید تقاضا ہے، دل میں جذبہ ہے اور محنت کی لگن ہے تو سمیرا سے بھی زیادہ قابل ہو کر نمایاں مقام حاصل کرسکو گی۔''

''میں یہی چاہتی ہوں۔ موجودہ ماروی کو ختم کرکے ایک نمایاں مقام حاصل کرکے نئی ماروی کو جنم دینا چاہتی ہوں۔''

''تمہارے یہ جذبات، یہ خواہشات بہت ہی تعمیری ہیں۔ تم بڑی ذہانت سے ایک نئی ماروی کو وجود میں لانے کا فیصلہ کرچکی ہو۔ میں بہت خوش ہوں ماروی! بہت خوش ہوں۔ اب بولو کہ اس سلسلے میں تم نے کیا سوچا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں دینی علوم میں دسترس حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''سبحان اللہ! آج تم سے باتیں کرتے ہوئے ایک نئی خوشی مل رہی ہے۔ ابھی میرے پاس ایک نئی ماروی بیٹھی ہے۔''

''آپ کی خوشیوں سے مجھے حوصلہ مل رہا ہے۔ لیکن یہ کیسے ہوگا؟ میں مکمل رازداری چاہتی ہوں۔ یوں بھی مجھے چھپ کر رہنا ہوگا۔ مراد کے تمام دشمنوں کے پاس میری تصویریں ہیں میں کسی بھی ملک، کسی بھی علاقے میں جاؤں گی تو وہ مجھے پہچان لیں گے۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''واقعی تمہارا چھپ کر رہنا ممکن نہیں ہے اور تم دن رات عبا اور نقاب میں نہیں رہ سکو گی۔''

''میں اپنی صورت شکل کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ مجھے ہر حال میں چھپ کر رہنا ہے اور یہی ایک بات سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ صورت بدل جائے۔ یہ میرے لیے بہت بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔''

''ہاں اور تو کوئی راستہ نہیں ہے۔ تم نئے چہرے کے پیچھے ہی چھپ سکو گی۔ پھر کوئی تمہیں دیکھ کر ماروی نہیں کہے گا۔''

''میں نام نہیں بدلوں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ موٹی عقل سے بھی سوچو' کیا اپنوں کو اور دشمنوں کو شبہ کرنے کا موقع دو گی؟''

''ماروی ایک میرا ہی نام نہیں ہے۔ سیکڑوں لڑکیوں کا یہی نام ہوگا۔ میرا بھی یہی رہے گا تو کیا مراد بھی دیکھ کر پہچان لے گا؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''کبھی یقین نہیں کرے گا کہ میں ہی اس کی شریک حیات ہوں۔ صرف میرا نام اسے میری طرف متوجہ کرے گا۔ میں جان بوجھ کر یہ چاہتی ہوں کہ میرا نام ہمیشہ اسے الجھاتا رہے۔''

وہ خاموشی سے سوچنے لگا۔ اچھا ہے چہرہ بدل جائے۔ نام نہ بدلے۔ یہ مراد کے لیے اجنبی ہو کر اپنے نام سے اسے الجھاتی رہے۔ یہ مجھے اہمیت دے رہی ہے۔ صرف میں ہی اس کا رازدار بن کر رہوں گا۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا میرا یہ چہرہ رازداری سے تبدیل ہو جائے گا؟''

''اس مرحلے سے گزرنے کے لیے جتنی مشکلات ہیں، انہیں میں دور کردوں گا۔ یہاں رازداری مشکوک ہو گی۔ تم یہاں سے چھپ کر لندن جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ وہاں ماہرین سے معاملات طے کروں گا۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''میں کہاں رہوں گی؟ کہاں تعلیم حاصل کروں گی؟''

''اس ملک سے نکلتے ہی تمہیں ایک تعلیم حاصل کرنے والی لڑکی کی حیثیت سے کہیں رہائش اختیار کرنی ہو گی اور تم تنہا کہیں بھی رہ کر سوالیہ نشان بنی رہو گی۔ تمہیں کسی اچھی فیملی میں ایک شریف زادی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانی ہو گی۔''

ماروی نے کہا۔ ''بڑے مسائل ہیں۔ بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی۔''

''ہاں، لیکن فکر نہ کرو۔ میں ابھی یہاں سے جا کر پلاننگ کروں گا۔ تم جس ملک میں رہ کر تعلیم حاصل کرو گی، وہاں کسی مسلم گھرانے میں تمہاری رہائش کے انتظامات کروں گا۔''

''سوچتی ہوں۔ اس میں بڑا وقت لگے گا اور میں جلد سے جلد روپوش ہو جانا چاہتی ہوں۔''

مراد نے جب سے یہ کہا تھا کہ وہ میڈونا سے نکاح پڑھانے جا رہا ہے، تب سے وہ اسی ایک فیصلے پر اٹل تھی کہ مراد کے لیے مر جائے گی، خودکشی نہیں کرے گی۔ زندہ رہ کر اس کی نظروں سے ایسے گم ہو جائے گی جیسے اس دنیا سے جا چکی ہو۔

محبوب نے کہا۔ ''تمہاری روپوشی کے سلسلے میں کئی اہم اور پیچیدہ معاملات سے نمٹنا ہو گا۔ اچھا خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ لیکن جہاں دولت ہو، وہاں وقت بھی سمٹ جاتا ہے۔ میں آج کل میں ہی تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔''

''کیا آپ بھی میرے ساتھ ہوں گے؟ میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ اپنی خاطر سمیرا سے ناانصافی نہیں ہونے دوں گی۔''

''میری شرافت پر، میری زبان پر بھروسا کرو۔ میں سمیرا سے انصاف کرتا رہوں گا۔''

وہ سمندر کے ساحل پر گاڑی روکتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم تعلیم یافتہ ہو کر نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتی ہو۔ اگر مراد سے دور رہ کر اسے ترسانا تڑپانا چاہتی ہو، اپنی شخصیت کو نکھار کر ایک نئی ماروی بننا چاہتی ہو تو مجھے آزادی سے اپنے کام آنے دو۔ سمیرا کے یا کسی کے بھی معاملے میں مجھ پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کرو۔''

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر اس کی طرف گھوم کر بولا۔ ''ابھی فیصلہ کرو، وعدہ کرو، میں تمہاری بہتری کے لیے جو کروں گا اور جو طریقہ کار اختیار کروں گا اس پر اعتراض نہیں کرو گی۔''

''کیا میرے ساتھ رہنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں۔ تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا لیکن تمہیں نظر آتا رہوں گا۔ تمہاری اجازت کے بغیر نہ کبھی قریب آؤں گا نہ کبھی ہاتھ لگاؤں گا۔''

وہ پریشان ہو گئی۔ وہ مراد سے دور ہونے والی تھی اور محبوب حالات کی دھوپ میں چھاؤں بن کر قریب آ رہا تھا۔ اس کے اپنے موجودہ فیصلے کے مطابق محبوب ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مرینہ اور مراد نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دوسرے دن سول کورٹ میں جا کر میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔ منشر دھرم داس کے پاس مراد کے قانونی کاغذات تھے۔ ان کاغذات کے مطابق وہ آباؤ اجداد کے زمانے سے ہندوستانی تھا اور اس کا نام عادل نواز تھا اور مرینہ کے پاس جو کاغذات تھے، اس کے مطابق اس کا نام رنجنا تھا اور وہ ممبئی کے ایک امیر کبیر پروڈیوسر کی دھرم پتنی تھی اور وہ دھرم پتنی اپنے پتی سے طلاق لیے بغیر ایک مسلمان عادل نواز سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔

کبڈی نے کہا۔ ''بابا اجمیری کہہ چکے ہیں، تم دوسری شادی کبھی نہیں کر سکو گے۔ دیکھو کہ یہ رکاوٹ پیش آ رہی ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''یہ کوئی پریشان کرنے والی رکاوٹ نہیں ہے ہم رجسٹرار کے آفس میں نکاح پڑھوائیں گے تو وہاں اہم شناختی کاغذات پیش کرنے ہوں گے۔ اگر کسی قاضی سے پڑھوائیں گے تو صرف مراد کا شناختی کارڈ ہی کافی ہو گا۔''

اس فیصلے کے بعد وہ مطمئن ہو کر سو گئے۔ مراد کا دل کہہ رہا تھا کہ ماروی رو رہی ہو گی۔ وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔ ''کب تک روئے گی۔ آخر صبر آ جائے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ وہ دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی ہے۔ کن سٹی میں غصہ دکھا کر آئی تھی۔ بہت دور کہیں گم ہو گئی تھی پھر مان گئی۔''

وہ بڑے فخر سے سوچ رہا تھا۔ ''وہ مرد بدلنے والی عورت نہیں ہے۔ میری جان ہے۔ آگے کچھ عرصے بعد حالات سے مجبور ہو کر سوکن کو برداشت کر لے گی۔''

پھر خیال آیا کہ ماروی اب تک یہی جانتی ہے کہ وہ میڈونا سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ ستم بالائے ستم اسے معلوم نہیں ہے کہ دلہن بدل گئی ہے۔ جس مرینہ سے وہ سخت نفرت کرتی ہے، وہی سوکن بننے والی ہے۔

یہ پریشان ہونے کی بات تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ مر جائے گی لیکن اپنے مرد کے ساتھ مرینہ کا وجود برداشت نہیں کرے گی۔ مراد کو حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ماروی سے فون پر مرینہ کی کوئی بات کرے۔

اس نے سوچا، ابھی کچھ نہ بتایا جائے۔ ماروی سے دوسری شادی کو چھپایا جائے۔ اسے یہ یقین دلایا جائے کہ اس نے دوسری شادی نہیں کی ہے۔

بابا اجمیری نے ہدایت کی تھی کہ جھوٹ اور فریب سے پرہیز کرے۔ وہ جھوٹ اور فریب سے بھرپور مجرموں کی دنیا میں رہتا ہے۔ سخت سزاؤں کا مستحق ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے اس لیے اسے ڈھیل دی جا رہی ہے۔ جلد ہی اس کی رسی کھینچی جائے گی۔

مراد نے دونوں کان پکڑ لیے۔ یہ طے کیا کہ کل مرینہ کو منکوحہ بنانے کے بعد ماروی سے فون پر سچ بولے گا۔ اسے دھوکا نہیں دے گا۔ وہ پھر پاگل ہونے اور پاگل کر دینے کی حد تک ناراض ہو جائے گی۔ پھر اسے چھوڑ کر کہیں گم ہو جائے گی۔ ایسے وقت وہ کیا کرے گا؟ پہلے بھی اس نے کیا کر لیا تھا۔ دن رات اس کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ اب بھی یہی ہوگا۔

وہ جب ناراض ہوتی تھی تو دل کو ایک ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کہیں محبوب کی آغوش میں نہ چلی جائے۔ ابھی مرینہ کو اپنی منکوحہ بنانے سے پہلے یہی اندیشہ تھا کہ اس بار وہ ضرور محبوب کے بازوؤں میں جا کر اپنی واپسی کا راستہ بند کر دے گی۔

وہ کسی قیمت پر اسے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے محبوب سے دور رکھنے اور اپنا بنائے رکھنے کے لیے جھوٹ بولنا لازمی ہو گیا تھا۔ بہت مجبور ہو کر اسے دھوکا دے رہا تھا کہ مرینہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب فیصلہ کرنا تھا۔ اب وہ ایک مومن کی طرح ایک سچے نمازی کی طرح سچ بول کر بہت بڑا نقصان اٹھانے والا تھا۔

ایمان والوں کی آزمائش ایسے ہی وقت ہوتی ہے۔ آنے والا کل اس کا امتحان لینے والا تھا۔ کل آ گیا۔ مرینہ بہت خوش تھی۔ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر مراد کو ہمیشہ کے لیے جیتنے والی تھی۔ کبڈی صبح دس بجے قاضی صاحب کو بلانے گیا تھا۔ مراد کشمکش میں تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مصلے پر بیٹھا تھا۔ نماز کا تقاضا تھا۔ یہ دینی حکم تھا کہ دوسری شادی سے پہلے اپنی پہلی بیوی کو اعتماد میں لے۔ اسے دھوکے میں نہ رکھے۔ جب سچ بولنا ہے تو شادی سے پہلے بولے۔

وہ گھبرا کر مصلے سے اٹھ گیا۔ دین کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے، سچ بولنے کے معاملے میں ٹال مٹول کی اجازت نہیں ہے۔ اسے مرینہ کو گھر لانے سے پہلے ماروی کو فون کرنا تھا۔

پھر اسے ایک ذرا وقت مل گیا۔ کبڈی نے فون پر کہا۔ ''قاضی صاحب مصروف ہیں۔ نمازِ ظہر کے بعد نکاح پڑھائیں گے۔''

ایسے وقت دو طرح کے اشارے مل رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسری شادی نہیں کر سکے گا۔ اس سلسلے میں پہلے کورٹ میرج کا راستہ رک گیا تھا۔ اب دوپہر تک شادی ٹل گئی تھی۔ دوسرا اشارہ یہ تھا کہ سچ بولنے کی مہلت مل رہی تھی۔ ایمان کا تقاضا تھا کہ ظہر کی نماز سے پہلے ماروی کو پکارو۔ جو سچ پہلے بول سکتے ہو اسے بعد میں نہ بولو۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ نماز کو ہر حال میں اوّلیت اور اہمیت دیتا تھا اور اس کا انعام بھی اسے ملتا تھا۔ وہ اب تک گناہوں سے بچتا آ رہا تھا۔ اس نے دن کے بارہ بجے فون اٹھا کر ماروی کے نمبر پنچ کیے۔

اس وقت تک ماروی اور محبوب کے درمیان بہت سے اہم معاملات طے پا چکے تھے۔ اسے تو سچ معلوم تھا کہ میڈونا ہو یا کوئی اور ہو مراد اس کی سوکن لا رہا ہے۔ ایک بیوی کی وفاداری پر دوسری بار تھوک رہا ہے۔ اب وہ برداشت کرنے والی نہیں تھی۔ اس کی زندگی سے نابود ہونے کے لیے پر تول رہی تھی۔

رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ مراد نے ہچکچاتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''ماروی! کیسی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''پاؤں تلے انگارے بچھا کر گئے ہو۔ مجھے کیسے رہنا چاہیے؟''

''میری جان......! میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میری خاطر حالات سے سمجھوتا کرو۔''

''کیا تم بھی میری خاطر حالات سے سمجھوتا کرو گے؟''

''تمہیں خوش رکھنے کی خاطر جو کہو گی، وہ کروں گا۔''

''تو پھر یہ کرو کہ جب تک تم دوسری کے پاس رہو گے، میں بھی دوسرے کے پاس رہا کروں گی۔''

''پلیز! فضول باتیں نہ کرو۔''

''میری بات فضول کیسے ہو گئی؟''

''کیا بکی ہو؟ سمجھتی نہیں ہو؟ ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے مرد کا منہ دیکھنا سراسر بے حیائی اور بے غیرتی ہے۔''

''سوکن کے نام پر اس کے ساتھ منہ کالا کرنا بے حیائی اور بے غیرتی نہیں ہے۔ اگر نکاح پڑھانے سے دوسری عورت جائز ہو جاتی ہے تو میں بھی کسی سے نکاح پڑھوا کر دوسرے مرد کو اپنے لیے جائز بنا لوں گی۔''

''تم ایسی بے غیرتی نہیں کرو گی۔ تم مجھے خوامخواہ ذہنی

اذیت میں مبتلا کر رہی ہو۔"

"تمہاری یہ خوش فہمی ختم ہو جائے گی۔ جب میں محبوب کے پاس جاؤں گی۔"

وہ محبوب کے نام پر پھٹ پڑا۔ "بکواس مت کرو۔ نہ میں تمہیں طلاق دوں گا، نہ تم اس کے پاس جاسکو گی۔"

"میں تم سے طلاق نہیں لے رہی ہوں پھر تم دوسری کے پاس کیسے جا رہے ہو؟ پہلے مجھے چھوڑو پھر جاؤ۔ دینی حکم کے مطابق جب پہلی بیوی راضی نہیں ہے اور تمہیں دوسری کرنی ہے تو پہلی کو چھوڑ دو۔"

"دیکھو ماروی! مجھ سے ناراض ہو کر میرے خلاف دنیا جہان کی باتیں کرو لیکن یہ نہ کہو کہ محبوب کے پاس جاؤ گی۔"

"پہلے نہیں گئی تھی۔ اس بار تو ضرور جاؤں گی۔ اپنی ملکیت بنائے رکھنا چاہتے ہو تو مجھ پر سوکن نہ لاؤ۔ کسی بھی پہلی فلائٹ سے آجاؤ یا مجھے اپنے پاس بلاؤ۔"

"میں آؤں گا جلد ہی آؤں گا۔ تم وعدہ کرو محبوب سے فون پر بھی بات نہیں کرو گی۔"

"پہلے تم قسم کھاؤ کہ دوسری شادی نہیں کر رہے ہو اور نہ بھی کرو گے۔"

وہ قسم نہیں کھا سکتا تھا۔ ظہر کے بعد نکاح خوانی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئے؟"

وہ شکست خوردہ ہو کر بولا۔ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ میری جان! میری اچھی ماروی! میری دوسری شادی پر اعتراض نہ کرو۔ میں بہت مجبور ہو گیا ہوں۔"

"مجبوری کیا ہے؟ کیا تمہارے سینے پر گن رکھ کر نکاح قبول کرایا جا رہا ہے؟ کیا تم انکار کرو گے تو میڈونا تمہیں گولی مار دے گی؟"

مراد نے سر پکڑ لیا۔ کیسے سچ بولے کہ وہ میڈونا نہیں، مرینہ ہے۔ وہ سچ سنے گی تو ابھی زلزلہ آجائے گا۔ وہ جنون میں مبتلا ہو جائے گی۔ حلق پھاڑ کر چیختے چیختے دماغی مریضہ بن جائے گی۔

وہ بڑی شکستگی سے بولا۔ "میں بچپن سے اب تک کی محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں۔ مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ جو ہو رہا ہے، ہونے دو۔ میں جلد سے جلد تمہارے پاس آکر تمہیں اپنی دھڑکنوں سے لگاؤں گا۔ تمہیں یقین دلاؤں گا کہ تم میرے لیے سب سے اہم ہو۔"

"ایک کو آغوش میں لے کر دوسری کو اہم کہتے رہو۔ مجھے سبز باغ دکھاتے رہو۔ آج اس شہر میں میرا آخری دن

تیماردار

کسی سڑک کے فٹ پاتھ سے ٹکرا کر ایک ادھیڑ عمر بوڑھا شخص بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایمبولینس آئی اور اسے اٹھا کر اسپتال لے گئی، راستے میں نرس نے اس بوڑھے کی جیب سے بٹوا نکال کر تلاشی لی تو اسے ایک نام اور پتا ملا جو شاید اس کے بیٹے کا تھا۔

نرس نے اسے پیغام بھیجا جلدی سے فلاں اسپتال پہنچو۔

اور نوجوان فوراً ہی مذکورہ اسپتال پہنچ گیا۔

نرس نے اس بوڑھے سے جس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا، کہا۔ "تمہارا بیٹا تم سے ملنے آیا ہے۔ تیز دواؤں کے باعث نیم بے ہوشی کی حالت میں بوڑھے شخص نے ہاتھ بڑھایا اور نوجوان کا بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔

یہ نوجوان ساری رات بوڑھے کے پاس رہا اور شفقت سے اس کا ہاتھ تھام کر بار بار، کبھی گلے سے لگاتا اور کبھی ہاتھ چومتا رہا اور اسی طرح رات بھر یہ نوجوان بوڑھے شخص کی تیمارداری اور حوصلہ افزائی کرتا رہا، اس دوران نرس نے کئی بار نوجوان سے آرام کرنے یا ادھر ادھر چلنے پھرنے کو کہا مگر نوجوان نے انکار کر دیا اور اس بوڑھے کے پاس ہی رہا، صبح کے وقت بوڑھے کی وفات ہو گئی۔

نوجوان نے نرس سے پوچھا۔ "یہ بوڑھا آدمی کون تھا؟"

نرس نے حیرت سے کہا۔ "کیا یہ تمہارا والد نہیں تھا؟"

نوجوان نے کہا۔ "نہیں میں تو اسے جانتا بھی نہیں مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ اسے تکلیف کے وقت اپنے بیٹے کی اشد ضرورت ہے جو اس وقت اس کے قریب رہ کر اس کی تیمارداری کرے اور اس کی محرومیوں کا ازالہ کرے، بس اس لیے میں اس کے پاس رہا۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزدنی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہے۔ یہ آخری کال ہے۔''

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں جلد ہی آنے والا ہوں۔''

''اور میں جانے والی ہوں۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ گونگا فون کہہ رہا تھا کہ ماروی پھر ہاتھ سے نکل گئی ہے اور اس بار وہ رقیب کے گھر جائے گی۔

اس نے فوراً ہی اس کے نمبر ری ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے بیل کی آواز ابھری۔ پھر ٹیپ ریکارڈنگ سنائی دی کہ فی الحال رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ اس نے پانچ منٹ کے بعد پھر کال کی تو معلوم ہوا کہ اس فون کا سوئچ آف کر دیا گیا ہے۔

وہ فون کو مٹھی میں جکڑ کر سوچنے لگا' کیا کرے؟ اگر دوبارہ رابطہ ہوگا بھی تو کیا کہے گا؟ ماروی نے کہا تھا کہ اس شہر میں اس کا آخری دن ہے۔ وہ کہاں جائے گی؟ اسے یقیناً ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ اس شہر میں نہیں رہے گی۔ اچھا ہے محبوب سے دور چلی جائے گی۔ وہ جلد ہی وہاں جا کر پھر اسے ڈھونڈے گا اور منالے گا۔

اس نے خود کو سمجھایا۔ 'ماروی نے مجھے تڑپانے کے لیے جھوٹ کہا ہے کہ محبوب کے پاس جائے گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ اس نے محض دھمکی دی ہے۔ مجھے صبر و تحمل سے حالات سازگار ہوتے ہی وہاں جانا چاہیے۔''

ظہر کا وقت ہو گیا۔ کبڈی نے فون پر پوچھا۔ ''یہاں کب آ رہے ہو۔ قاضی صاحب نماز کے بعد یہاں آئیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''میں مسجد میں ہوں۔ نماز پڑھ کر آؤں گا۔''

کبڈی نے فون بند کر کے مرینہ کو دیکھا۔ وہ بہت خوش تھی' اس نے ایک بوتیک سے بہت ہی دیدہ زیب لباس خرید کر پہنا تھا۔ دلہن جیسی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک مصلیٰ بچھا کر کبڈی سے پوچھا۔ ''کتنی رکعتیں پڑھنی ہیں۔ پلیز مجھے گائیڈ کرو۔''

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بھول جاتی ہو؟ کتنے دنوں کے بعد پڑھ رہی ہو؟''

''مجھے یاد نہیں ہے۔ کبھی دینی باتوں کا کوئی ماحول ہی نہیں ملا' نماز کیا پڑھتی؟ ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔''

وہ بولا۔ ''آج ضروری ہو گئی ہے۔ تمہارے دل میں اندیشہ ہے' ابھی اس کی دلہن بن سکو گی یا نہیں؟ بابا صاحب پیش گوئی کر چکے ہیں کہ مراد کے نصیب میں دوسری شادی لکھی ہے۔''

''ہاں' میرے اندر یہ اندیشہ چھپا ہے لیکن کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا۔ میں دیکھ رہی ہوں' کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آ رہی ہے۔ میں نماز پڑھ کر دعا مانگوں گی۔ تقدیر بدل رہی ہے۔ ابھی ایک گھنٹے میں قاضی صاحب آئیں گے۔ پلیز مجھے گائیڈ کرو۔''

اس نے سمجھایا کہ اسے کس طرح پڑھنا چاہیے۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں عبادت کے لیے چلا گیا۔

وہ نماز کے لیے سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے کلام پاک کی کوئی آیت یاد نہیں تھی۔ لیکن وہ مراد کو ہمیشہ کے لیے جیت لینے کی خاطر دل کی گہرائیوں سے خدا کو پکار رہی تھی۔ اپنے ربّ سے وعدہ کر رہی تھی کہ مراد کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ اس کی طرح نمازیں پڑھنے لگے گی۔ جھوٹ اور فریب کی' جرائم کی دنیا سے نکل کر مراد کے ساتھ دینی مقاصد حاصل کرنے کے لیے جنگ لڑتی رہے گی۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ پوری سچائی سے مراد کی تھی اور پوری نیک نیتی سے اپنے ربّ کے آگے سجدے کر رہی تھی۔ آئندہ بھی کرنے والی تھی۔ لیکن توبہ کرتے ہی نماز پڑھنے سے صلہ نہیں مل جاتا۔ نماز جادو نہیں ہے' صبر ہے' استقلال ہے اور اللہ پر بھروسا ہے۔ باقی اللہ جانتا ہے کہ کب کسے عزت دینا ہے اور کب تک کسی کو آس میں رکھنا ہے۔

قاضی صاحب آ گئے۔ مراد بھی مسجد سے آ گیا۔ ایک کمرے کے فرش پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب وہاں بیٹھ کر نکاح نامے کی خانہ پُری کرنے لگے۔

مراد وہاں مرینہ' کبڈی' فرمونا اور اس کے والدین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اب سے پہلے کراچی کی کوٹھی میں ماروی اور محبوب کی نکاح خوانی کا یہی ماحول تھا۔ وہاں بھی نکاح نامہ کی خانہ پُری ہو چکی تھی۔ وہاں بھی قاضی صاحب نے ماروی سے پوچھا تھا۔ کیا اسے محبوب علی چانڈیو سے نکاح قبول ہے؟

یہاں بھی قاضی صاحب نے مرینہ سے پوچھا۔ کیا اسے مراد علی منگی سے نکاح قبول ہے؟

وہ فوراً ہی کہنا چاہتی تھی۔ ''قبول ہے......''

لیکن نہ کہہ سکی۔ بابا اجمیری کی پیش گوئی آڑے آ گئی۔

مقدر نے جب کہہ دیا۔ ''نہیں......'' تو پھر نہیں۔

اچانک ہی مرینہ کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس نے شدید تکلیف محسوس کرتے ہوئے اپنی پیشانی کو تھام لیا۔

یکلخت دیدے پھیلا کر خلا میں تکنے لگی۔ آہستہ آہستہ آگے پیچھے جھومنے لگی۔

مراد نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر پوچھا۔ ''مرینہ! کیا ہوا؟ تم لرز رہی ہو؟''

اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی پیشانی میں سوئی پیوست ہے اور وہ انگارے کی طرح دہک رہی ہے۔

پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی تھوڑی کے نیچے رکھے۔ اب حلق میں ایک نادیدہ سوئی آکر پیوست ہوگئی تھی۔ وہ تکلیف سے تڑپتی ہوئی مراد کی آغوش میں ڈھلک گئی۔

وہاں سے دور تانترک مہاراج اپنے مکان کے پوجا گھر میں تھا۔ کالی مائی کی مورتی کے سامنے ڈنڈوت کی حالت میں تھا۔ سر کے پاس بڑی سی پیتل کی تھال میں ماش کے آٹے سے گوندھا ہوا ایک پتلا پڑا تھا اور وہ پتلا مرینہ سے منسوب تھا۔

تانترک مہاراج نے تیسری سوئی کو پتلے کے شانے میں پیوست کرتے ہوئے کہا۔ ''سالی..... حرام زادی! علاج میں نے کیا، نیا جیون میں نے دیا اور میرے کو لات مار کے اجمیری کے پاس چلی گئی۔''

اس نے چوتھی سوئی اٹھا کر اس کے پیٹ میں پیوست کردی۔

مرینہ کے حلق سے پھر ایک چیخ نکلی۔ اس کی قوتِ مدافعت جواب دے رہی تھی۔ اس نے تاریکیوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''وہ..... دشمن جادوگر..... تان..... ترک.....''

وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔ بے ہوش ہوگئی۔ مراد اور کبڈی کی سمجھ میں آگیا۔ وہ فوراً معوذتین پڑھنے لگے۔ کبڈی نے کہا۔ ''مراد! اس شیطان کو جادو کرنے سے روکنا ہوگا۔''

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ''اسے کیسے روکیں؟ وہ کہاں ہوگا؟''

''مرینہ نے کہا تھا، وہ شمشان گھاٹ میں رہتا ہے۔''

اس نے مرینہ کو بڑے صدمے سے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ایک لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اگر اس جادوگر مہاراج کو شیطانی عمل سے نہ روکا جاتا تو وہ سچ مچ لاش میں تبدیل ہو جاتی۔

اس نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس کے پاس معوذتین پڑھتے رہو۔ میں دیکھتا ہوں وہ خبیث کہاں ہے۔''

باہر مرینہ کی رینٹڈ کار کھڑی ہوئی تھی۔ مراد ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا شمشان بھومی کی سمت جانے لگا۔

بابا صلاح الدین اجمیری اپنے حجرے کے اندر مراقبے میں تھے۔ وہ بصارت سے نہیں' بصیرت سے بہت کچھ دیکھ رہے تھے۔ مرینہ ان کے سامنے تھی۔ وہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ رہے تھے۔

مراد آندھی کی رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا شمشان گھاٹ میں آیا۔ وہاں ویرانی اور سناٹا تھا۔ ایک چبوترے کے پاس کالا جادو کرنے کا کچھ سامان پڑا تھا۔ انگیٹھی کی آگ بجھی ہوئی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ خبیث جادوگر وہاں تھا۔

مراد نے مردے جلانے والے دو چماروں سے پوچھا۔ ''کیا یہاں کوئی تانترک مہاراج تپسیا کر رہا تھا؟''

ایک نے کہا۔ ''ہاں، کل رات اس کی تپسیا بھنگ ہو گئی تھی۔ وہ یہاں سے گرجتا ہوا کہیں چلا گیا ہے۔''

وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں سے تانترک خبیث کے مکان کی طرف جانے لگا۔ اس نے فون کے ذریعے کبڈی سے پوچھا۔ ''مرینہ کس حال میں ہے؟''

''بے ہوش پڑی ہے۔''

''کیا بے ہوشی کی حالت میں وہ شیطانی عمل کو محسوس کر رہی ہے؟''

''میرا خیال ہے' شیطانی عمل رک گیا ہے یا پھر بے ہوشی کے باعث کالے جادو کا اثر نہیں ہو رہا ہے۔''

پھر وہ بولا۔ ''مراد! اس کی حالت قابلِ رحم ہے۔ صورت سے برسوں کی بیمار لگ رہی ہے۔''

''میں اس خبیث تک پہنچنے والا ہوں۔ اسے منتر پڑھنے اور کسی طرح کا جادو کرنے نہیں دوں گا۔ اسے گولی مار دوں گا۔''

بابا اجمیری مراقبے میں گم تھے۔ ان کے آس پاس کی دنیا بھی گم ہو چکی تھی۔ وہ کسی عالم نامعلوم میں تھے۔ ان کے سامنے پیتل کی تھال پر ماش کے آٹے سے گوندھا ہوا پتلا پڑا تھا۔ وہ زیرِ لب معوذتین پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے پتلے کے حلق کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہاں پیوست کی ہوئی سوئی کا اوپری سرا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے بسم اللہ کہتے ہوئے اس سوئی کو ایک چٹکی میں پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

وہ حلق سے نکل گئی۔ ادھر مرینہ نے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ

تکلیف محسوس کرتے ہوئے کراہنے لگی۔ ابھی تین سوئیاں اس کے جسم میں باقی تھیں۔ ان سب کے نکلنے کے بعد ہی اسے آرام آسکتا تھا اور نہ نکلنے کی صورت میں موت واقع ہو سکتی تھی۔

تانترک مہاراج ڈنڈوت کی حالت میں کالی مائی کے سامنے اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ سر کے پاس اسی پیتل کی تھال میں مرینہ کا پتلا پڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ ایک سوئی پتلے کے حلق سے نکل کر تھال میں جا پڑی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر کالی بھیانک مورتی کو دیکھ کر کہا۔ ''ہے مہا کالی! کو کلتے والی۔ تیرا وچن نہ جائے خالی۔ ماں! یہ کیا ہو گیا؟ یہ سوئی آپ ہی آپ کیسے نکل گئی؟ ہے مہا کالی! کس نے سوئی نکالی؟ میرے منتر پڑھنے میں بھول ہو رہی ہے یا وہ دُشٹ مسلمان اجمیری توڑ کر رہا ہے؟''

وہ بلند آواز سے منتر پڑھنے لگا۔ اس نے تھال پر سے سوئی کو اٹھا کر کہا۔ ''نہیں، اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اجمیری کے توڑ کا توڑ کروں گا۔ اس بار سوئی کو اس کے دل میں گھساؤں گا تو ادھر وہ پھڑ پھڑا کر مر جائے گی۔''

وہ سوئی کو ایک چٹکی میں لے کر بڑے جوش و خروش سے جان لیوا منتر پڑھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے سوئی کو پتلے کے سینے پر لے آیا تو اس کی نوک ٹھیک دل کی جگہ تھی۔ وہ سیدھی مرینہ کے دل میں پیوست ہونے والی تھی۔

لیکن رک گئی۔ اس نے حیرانی اور پریشانی سے دیکھا۔ کوئی رکاوٹ نظر نہیں آرہی تھی اس کے باوجود وہ رک گئی تھی۔

دوسری طرف بابا اجمیری نے پتلے کے سینے پر اپنی ہتھیلی رکھی تھی۔ وہ سوئی کی نوک ان کی ہتھیلی پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

ادھر سے منتروں کے شبد سوئی کو لرزا رہے تھے۔ ادھر معوذتین کے الفاظ اسے ہتھیلی سے دور کر رہے تھے۔

کالے جادو اور روحانیت کے درمیان نادیدہ ٹکراؤ تھا۔ کوئی کسی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ شیطان اس سوئی کو سینے میں اتارنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اچانک ہی مہاراج کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ سوئی اس کی چٹکی سے نکل کر تھال پر گر پڑی۔

مراد نے وہاں پہنچ کر مہاراج کے منہ پر زور کی ٹھوکر ماری تھی۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سہم کر آواز دی۔ ''شانی......! کیشو......! جلدی آؤ۔ یہ اکیلا ہے۔ اسے نرک میں پہنچا دو۔''

مراد نے ریوالور کے دستے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ بیٹھے بیٹھے دوسری طرف الٹ گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شانی اور کیشو حملہ کرنے پوجا گھر میں آئے۔ دروازے پر آتے ہی تڑاتڑ کی آواز کے ساتھ دو گولیاں چلیں۔ وہ دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔

مہاراج کو اب اپنی موت نظر آرہی تھی۔ مراد نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس پتلے سے سوئیوں کو نکالو۔''

وہ بولا۔ ''مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں منتر پڑھتا جاؤں گا، تمام سوئیاں نکل جائیں گی۔ وہ نہیں مرے گی زندہ رہے گی۔''

مراد نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ان سوئیوں کو نکالو۔''

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''مار ڈالو۔ میرے ساتھ وہ بھی مرے گی۔ اسے مارنا چاہتا ہے تو چل مجھے مار ڈال۔''

وہ ایسا کہتے ہوئے پتلے کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس پتلے کی پیشانی سے ایک سوئی ابھرتی ہوئی باہر آکر تھال پر گر پڑی۔ مہاراج سمجھ گیا کہ روحانی علم حاوی ہو رہا ہے۔

بابا اجمیری زیر لب پڑھ رہے تھے اور ہاتھ بڑھا کر تیسری سوئی نکال رہے تھے۔ ادھر مراد نے دیکھا، ایک سوئی پتلے کے شانے سے نکل کر تھال پر آگئی تھی۔ جادو پانی ہو رہا تھا۔ وہ پتلا آہستہ آہستہ موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ ماش کا آٹا گیلا ہو کر پانی کی طرح پتلا ہوتا جا رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتلا نابود ہو گیا۔

موبائل فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ کبڑی نے پوچھا۔ ''مراد! تم نے کیا کیا ہے؟ کیا اس شیطان جادوگر کو مار ڈالا ہے؟ مرینہ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔ اٹھ کر بیٹھ گئی ہے۔''

پھر مرینہ کی آواز سنائی دی۔ ''تھینکس گاڈ! مجھے پھر ایک بار نئی زندگی مل رہی ہے۔ تم کہاں ہو؟ اس ذلیل تانترک مہاراج کو زندہ نہ چھوڑو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی مراد نے اسے گولی مار دی۔ شیطان کبھی نہیں مرتا لیکن وہ اپنی آتما شکتی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نابود ہو گیا تھا۔

بابا اجمیری نے مراد اور مرینہ سے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے ایک ہی بات کہہ دی تھی کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکیں گے۔ ان کی پیش گوئی درست ثابت ہو رہی تھی۔

وہ مراقبے سے نکل آئے تھے۔ مرینہ اور مراد کے

لیے دعا مانگ رہے تھے کہ ان کے نصیب بدل جائیں۔ دیر سویر سے وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو کر ایک دوسرے کی زندگی بن جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ مراد سخت آزمائشوں سے گزرتا ہوا اپنی پارسائی برقرار رکھتا آ رہا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی بہتری کے لیے دعا مانگ رہے تھے اور اس کی بہتری کے لیے ہی انہوں نے میڈونا کو اس سے جدا کر دیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ سحر زدہ ہو کر کہاں پہنچی ہوئی تھی؟ وہ کسی کی آواز سن رہی تھی۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔ ''مراد مر چکا ہے۔ اب کیا کرو گی؟''

وہ بولی۔ ''افسوس کروں گی۔ اپنوں کی موت کا دکھ ہوتا ہے۔ پھر صبر آ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہی دستور دنیا ہے۔ کوئی دن رات ماتم نہیں کرتا۔''

''تم اکیلی رہ گئی ہو۔''

''نہ میں اکیلی تھی، نہ اکیلی رہوں گی۔ دنیا میں اور بھی مرادیں پوری کرنے والے ہیں۔''

''تم نے مراد کے علاج کے لیے ہزاروں میل کا سفر کیا تھا۔ دن رات اس کی تیمارداری کی تھی۔''

''وہ تو کرنی تھی۔''

''وہ ملا تھا لیکن تم اسے پا نہ سکیں۔''

''ہاں۔ اب سے پہلے جسے چاہا اسے جھپٹ لیا۔ بس وہی ایک ہاتھوں سے پھسل گیا۔''

''تم نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اپنے ماں باپ کو اور اپنے حصے کی دولت اور جائداد کو چھوڑ دیا تھا۔''

''میں پاگل نہیں ہوں کہ دولت اور جائداد سے محروم ہو جاؤں گی۔ مام اور پاپا میری فطرت کو خوب سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرا دل بھر جائے گا تو میں لوٹ کر آ جاؤں گی۔''

وہ سحر زدہ تھی۔ اچانک ہی سحر سے نکل آئی۔ اس نے ہوش و حواس میں آ کر حیرانی سے دیکھا۔ وہ ائرپورٹ کی وزیٹرز لابی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

میکی براؤن کے آدمی اس کے چاروں طرف بیٹھے اور کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے فون اس کی طرف بڑھایا اس نے اسے کان سے لگا کر باپ کی آواز سنی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ڈریم گرل جیسی بیٹی کے آنسو پھر اس کے یہودی خاندان میں اسے پہنچانے والے تھے۔

یہ مقدر میں لکھ دیا گیا تھا کہ ایک یہودی لڑکی کا دل [illegible] گیا۔ اس طرح وہ لکھی ہوئی لکیر کی فقیر بن کر ایک

نیم مردہ کو حاصل کرنے کے لیے اسے شملہ سے دہلی تک زندہ رکھتی آئے گی اور جب وہ صحت یاب ہو کر اسے اپنی منکوحہ بنانا چاہے گا تو وہ ناکام و نامراد ہو کر اپنے یہودی ماحول میں واپس چلی جائے گی۔

صرف میڈونا ہی نہیں، مراد کے بھی حالات بدل رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کب تک مرینہ کا ساتھ رہے گا؟ یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ منکوحہ نہ بن سکی تو اس سے دور بھاگنا ہو گا۔ دور نہ ہوا تو گناہ گار بن جانا ہو گا۔

وہ اس معاملے میں مستقل مزاج تھا۔ پھر جان کی بازی لگانے والا ایک اور چیلنج تھا۔ اسے جرائم کی دنیا سے نکل کر ماسٹر جیسے دوستوں اور محافظوں کو بھی اپنا دشمن بنانا تھا اور دین کے دشمنوں سے جنگ جاری رکھنی تھی۔ اس کی زندگی سے ماروی کا وجود نامعلوم مدت کے لیے فنا ہونے والا تھا۔ آئندہ پھر بھی وہ ایک نیا جنم لے کر آنے والی تھی۔ آئندہ ماروی کو سنبھالنے اور اس کی قوت بن کر رہنے کے لیے محبوب کی زندگی کا بھی رخ بدلنے والا تھا۔ سب ہی کے حالات بدلنے والے تھے۔ چہرے بدلنے والے تھے۔ شناخت بدلنے والی تھی۔ جب دل بدل جاتا ہے ارادے اور مقاصد بدل جاتے ہیں تو زندگی کی پوری کہانی بدل جاتی ہے۔ ماروی، مراد علی تنگی اور محبوب علی چانڈیو کی ایک ڈگر پر چلنے والی کہانی یکسر بدلنے والی تھی۔

☆☆☆

ماروی نے ایک نامعلوم مدت تک مراد سے دور رہنے کا فیصلہ کر کے محبوب کو مسرتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ مراد سے دوری اسے محبوب کے بہت قریب لا رہی تھی۔

یہ سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا کہ آئندہ ماروی اس کے سہارے اس کی نگرانی میں زندگی گزارے گی۔ اس کے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ پوری زندگی اس کے سامنے کسی روک ٹوک کے بغیر گزارے۔ مراد سے جدائی کی مدت بھی ختم نہ ہو۔ اس کے اور مراد کے درمیان جو شکایتیں ہیں، وہ برقرار رہیں۔ ماروی ادھر کا رخ نہ کرے۔

محبوب کا دل کہتا تھا کہ اس بار ایسا ہی ہو گا۔ وہ مجرمانہ زندگی گزارنے اور حسین عورتوں کے قریب رہنے سے باز نہیں آئے گا۔ وہ پہلے مراد سے ناراض تھی۔ اب نفرت سے دور ہو رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ نفرت طلاق تک پہنچ جاتی۔

وہ بڑے یقین سے سوچ رہا تھا اور بڑی تیزی سے آئندہ کے لیے اپنے راستے ہموار کر رہا تھا۔ اب سے پہلے بھی وہ خوش فہمی سے سوچتا تھا کہ کبھی ماروی کے ساتھ چھپ

کر زندگی گزارنی پڑے تو کیا کرے گا؟

یہی کرے گا کہ اپنی اور ماروی کی شناخت بدل دے گا۔ نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ اس طرح رہے گا کہ مراد کبھی ان دونوں کو پہچان نہیں سکے گا۔

اس نے سمیرا سے کہا۔ ”میں یہاں کے ماحول سے اور زندگی گزارنے کی یکسانیت سے بیزار ہو گیا ہوں۔ کہیں دور جا کر کچھ روز بالکل تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”مجھے آپ کے ساتھ رہنا چاہیے۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تم تو ساتھ رہتی ہی ہو۔ واپس آؤں گا تو تم ہی میری تنہائیوں کی ساتھی رہا کرو گی۔ فی الحال میں بالکل تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کہاں جائیں گے؟“

”واپس آؤں گا تو میرا پاسپورٹ دیکھ لینا۔ ابھی تو میں خود نہیں جانتا کہ کہاں جا کر وقت گزارنا ہے۔ کل کسی فلائٹ میں میرے لیے سیٹ حاصل کرو۔ جو اہم کاروباری کاغذات ہیں ان پر میرے دستخط لو۔ میں نے تمہارے نام پاور آف اٹارنی لکھ دی ہے۔ تم کسی رکاوٹ کے بغیر بزنس کو ہینڈل کرتی رہو گی۔ پھر فون پر ہمارا رابطہ رہے گا۔“

وہ حیرانی اور پریشانی سے بولی۔ ”آپ تو ایسے انتظامات کر کے جا رہے ہیں جیسے لمبی مدت تک واپس نہیں آئیں گے۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری دولت' جائداد اور کاروبار آخر تمہارا ہی ہے۔ ابھی تمہارے نام مختار نامہ لکھا ہے۔ کسی دن سب کچھ تمہارے نام لکھ دوں گا۔“

وہ بڑی محبت سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آپ مراد کے... ہم شکل ہیں۔“

وہ اسے چومتے ہوئے بولا۔ ”فکر نہ کرو، میں نے ایک ماہر سے بات کی ہے۔ لندن پہنچتے ہی چہرے پر ہلکی سی تبدیلی کراؤں گا کوئی مجھے مراد نہیں سمجھے گا۔“

محبوب در پردہ کروڑوں روپے ایک نئی شناخت کے ساتھ نئے اکاؤنٹ میں منتقل کر چکا تھا اور ایسی پلاننگ پر عمل کر رہا تھا' جس کے نتیجے میں کبھی مالی مشکلات کا سامنا نہ ہوتا۔

اس نے پھر ماروی سے ملاقات کی۔ وہ اس کی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم نے روپوش رہنے کا فیصلہ کر کے میرے اندر ہلچل پیدا کر دی ہے۔ میں کل سے اب تک تمہاری روپوشی کے لیے ٹھوس انتظامات کر چکا ہوں۔ یہ بتاؤ' تم آج یا کل کسی بھی فلائٹ سے لندن جا سکو گی؟“

وہ بولی۔ ”میں تنہا زندگی گزارنے کے لیے' یہاں سب کو چھوڑ کر جانے کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ اگر آپ ساتھ نہ دیتے، تب بھی تنہا کہیں نکل جاتی۔“

”میں تمہیں تنہا بھٹکنے نہیں دوں گا۔ تم یہاں سے صرف لندن تک تنہا رہو گی۔ وہاں پہنچتے ہی دور سے یا قریب سے میرا اسہارا ملتا رہے گا۔ تم وہاں محفوظ جگہ رہو گی۔ میں سرجری کے ماہرین سے ملوں گا۔ جلد ہی تمہارا چہرہ تبدیل ہو جائے گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ میرے دور یا نزدیک کیسے رہیں گے...... ہزاروں دشمن آپ کو مراد سمجھیں گے؟“

”میری فکر نہ کرو اور کوئی سوال نہ کرو کہ میں وہاں کیسے رہوں گا اور مخالف حالات سے کیسے نمٹتا رہوں گا۔“

”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔ اپنے مسئلے سے تمہیں دور رکھ رہا ہوں تاکہ تم صرف اپنے معاملات پر توجہ دیتی رہو۔“

وہ ذرا چپ رہی۔ بے چینی سے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میں سمیرا کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ پتا نہیں میرے معاملات میں وہاں کتنے دنوں تک مصروف رہیں گے۔ اس کا وقت مجھے دیتے رہیں گے۔“

”میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ اس کی حق تلفی نہیں ہو گی۔ جب ساری دنیا کو چھوڑ کر اپنی الگ حیثیت منوانے جا رہی ہو تو یہاں کسی کی فکر نہ کرو کہ تمہارے بعد یہاں کون کیسے جی رہا ہے۔ پچھلے تعلقات پر مٹی نہیں ڈالو گی تو آزادی اور بے فکری سے ایک نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکو گی۔“

ماروی نے کچھ کہنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”یہ ماروی جو میرے پاس بیٹھی ہے اسے یہیں مار ڈالو۔ لندن میں کسی ماروی کا وجود نہیں ہو گا کیونکہ تم ایک نیا جنم لینے کے مراحل سے گزرتی رہو گی۔“

”میں مانتی ہوں۔ مجھے کئی پہلوؤں سے اپنے دل پر جبر کرنا ہو گا اور اپنے مزاج کے خلاف بہت کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ تب ہی میں اپنے لیے کچھ کر پاؤں گی۔“

”ہاں، یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے تمہیں اپنے مزاج کے خلاف بہت کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت حوصلے سے انجانے ماحول میں نئی زندگی گزارو گی۔“

”کیا میں وہاں کسی فیملی کے ساتھ رہوں گی؟“

”ہاں۔ میں ایک شناسا کے ذریعے دو مسلم گھرانوں

میں بات چلا رہا ہوں۔ جب تمہارا چہرہ بدل جائے گا، نئے شناختی کاغذات تیار ہو جائیں گے، تب کسی مسلم فیملی میں تمہیں لے جاؤں گا۔''

''پتا نہیں شناخت بدلنے میں کتنے دن لگیں گے۔ کیا اتنے دنوں تک فیملی کے بغیر اکیلی رہوں گی؟''

''ہاں، یہ مجبوری ہے۔ تم تنہا رہو گی۔ لیکن تمہاری ہر ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ وہاں چار دیواری میں کوئی تم سے سوالات کرنے نہیں آئے گا۔ کبھی تم چاہو گی تو آؤٹنگ کے لیے کہیں بھی لے جاؤں گا۔''

وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا طارق روڈ سے گزر رہا تھا۔ ماروی نے کہا۔ ''واپس چلیں۔ ہمیں زیادہ دیر ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ واپسی کے لیے دوسری سڑک پر آتے ہوئے بولا۔ ''میں کل کسی فلائٹ سے لندن چلا جاؤں گا۔ وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔ فون کے ذریعے ہمارا رابطہ رہے گا۔ تم بتاؤ گی کہ کس دن کس فلائٹ سے وہاں پہنچو گی۔ میں ایئرپورٹ میں تمہیں ریسیو کرنے کے لیے موجود ہوں گا۔''

اس سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا۔ گاڑیاں رک رک کر آگے بڑھنے لگیں۔ محبوب بھی اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر آگے جارہا تھا۔ ایسے ہی وقت بلا سڑک پار کرنے کے لیے گاڑیوں کے درمیان سے گزرتا جارہا تھا۔ وہ اچانک ہی محبوب کی کار کے سامنے آکر رک گیا۔

محبوب پر نظر پڑتے ہی یوں لگا جیسے اپنے یار مراد کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے چند لمحوں کے لیے اسے مراد ہی سمجھا۔ اس نے بے اختیار پکارا۔ ''مراد......''

ادھر ماروی پریشان ہو گئی۔ نقاب میں چھپتی ہوئی دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہ بلا ہے۔ مجھے پہچان لے گا۔ فوراً یہاں سے نکلیں۔''

محبوب نے بلے کو کبھی دیکھا ہوگا لیکن اسے نئے روپ میں نہیں پہچان رہا تھا۔ بلے کو فوراً غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا یہ محبوب علی چانڈیو ہے۔ لیکن وہ عبا میں کون ہے؟ سمیرا تو کبھی نقاب میں نہیں رہتی ہے۔

وہ کھڑکی کے قریب آنے اور اسے پہچاننے کے لیے آگے بڑھا۔ اپنوں کو قریب سے برقع میں بھی پہچان لیا جاتا ہے لیکن کھڑکی تک پہنچنے سے پہلے ہی محبوب نے ایک بٹن دبا کر کلرڈ شیشے چڑھا دیے۔ اندر بیٹھنے والے نظروں سے گم ہو گئے۔ وہ باہر سے دیکھے نہیں جاسکتے تھے۔

محبوب کے لیے اجنبی تھا۔ اس سے کچھ کہنے سننے کے بہانے کھڑکی نہیں کھلوا سکتا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑکی کے کلرڈ شیشے کو دیکھ رہا تھا۔ محبوب سڑک کو چھوڑ کر گاڑی کو ایک گلی کی طرف موڑنے لگا۔ وہ راستہ بدل کر فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

ٹریفک کے ہجوم سے نکلنے تک بلا اس کار کے ساتھ چل رہا تھا اور فون پر ماروی کے نمبر پچ کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ہی ماروی کے فون نے چیخ کر بتایا کہ وہ اسے پکار رہا ہے۔

وہ پریشان ہو کر محبوب سے بولی۔ ''اسے شبہ ہو گیا ہے۔ مجھے کال کر رہا ہے۔ آپ فوراً مجھے پاپوش پہنچائیں۔''

پھر اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔

''ہاں بلے! میں بول رہی ہوں۔''

وہ کار کے ساتھ چلتے ہوئے کلرڈ شیشے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم ابھی کہاں ہو؟''

''میں بقائی اسپتال میں ہوں۔ اب گھر جارہی ہوں۔ بات کیا ہے؟ تم نے کال کیوں کی ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں یہاں طارق روڈ پر ہوں۔ ابھی محبوب علی چانڈیو کے ساتھ ایک برقع والی کو دیکھا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ تم ہو۔''

''کیا پاگل ہوئے ہو؟ میں محبوب صاحب کے ساتھ گاڑی میں کہاں جاؤں گی۔ تم نے ان کی بیوی سمیرا کو دیکھا ہوگا۔''

''نہیں ماروی! وہ کوئی اور ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سمیرا پردہ کرنے والی عورت نہیں ہے۔'' پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے، محبوب رنگین مزاج ہو گیا ہے۔ باہر کسی کو لفٹ دے رہا ہے اور لفٹ لے رہا ہے۔''

''مجھے محبوب صاحب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔ بشریٰ سے کہنا' میں شام تک آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گی۔''

اس نے فون بند کر کے گہری سانس لی۔ محبوب نے ایک گلی میں مڑتے ہی کار کی رفتار بڑھا دی۔ پھر کہا۔ ''ہم جو سوچتے نہیں' وہ ہو جاتا ہے۔ اگر میں تمہیں نہ چھپاتا تو وہ شاید پہچان لیتا۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں، آئندہ ہمیں اس طرح ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔''

''آج یہ آخری ملاقات ہے۔ کل میں جارہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو وہاں ملیں گے۔ کل یہاں سے جانے تک موقع دیکھ کر تنہائی میں تمہیں کال کرتا رہوں گا۔''

وہ اپنے گھر سے بہت دور کار سے اتر کر پیدل جانے لگی۔ اب ان کی ملاقات لندن میں ہونے والی تھی۔

☆☆☆

مرینہ کو پھر ایک بار نئی زندگی مل گئی۔ بابا اجمیری نے روحانی قوتوں سے کالے جادو کو بے اثر کر دیا تھا اور مراد نے تانترک مہاراج کو جہنم میں بھیج دیا تھا۔ مرینہ بچ تو گئی تھی لیکن بیمار اور کمزور ہو گئی تھی۔ آئندہ دو چار روز تک بستر پر رہنے والی تھی۔ ان کی زندگی میں اچھی خاصی ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ وہ پہلی بار کالے جادو کے خطرناک ہنگامے سے گزرے تھے۔ اب انہیں سکون نصیب ہو رہا تھا۔ آگے بھی کئی چیلنجز تھے اور سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ جرائم کی دنیا سے نکل کر دشمنانِ دین سے نمٹنا تھا۔

ابھی وہ کچھ روز تک چھپ کر سکون سے رہنا چاہتے تھے۔ یہ طے کیا تھا کہ مرینہ صحت یاب ہونے تک عبداللہ کبڈی کے گھر میں رہے گی اور کسی بھی ضرورت سے باہر نہیں جائے گی۔ مراد پہلے کی طرح اسی خفیہ پناہ گاہ میں رہے گا اور وہ چپ چاپ جرائم کی دنیا سے نکلنے کی پلاننگ کرتے رہیں گے۔

چھپ کرنے کے لیے خفیہ پناہ گاہوں سے نکلنے کے لیے پھر ایک بار چہروں کو بدلنا ضروری تھا۔ چہرے بدل جاتے تو پھر کسی پناہ گاہ میں چھپ کر نہ رہنا پڑتا۔ وہ آزادی سے کہیں بھی اپنا ٹھکانا بنا سکتے تھے۔

کہیں بھی ٹھکانا بنا کر ایک ساتھ رہنا لازمی تھا۔ پھر ایک بار رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے لیے نکاح پڑھانے کی کوشش کرنی تھی۔ وہ ایک بار ناکام ہو کر مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ آئندہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ جو رکاوٹیں پیش آئیں گی، انہیں دور کر کے نکاح پڑھوا سکیں گے یا نہیں؟

پھر نکاح پڑھوانے کے لیے مرینہ کی صحت یابی کا انتظار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے چہروں کی تبدیلی کا علم کسی کو نہ ہو۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ خطرناک مرینہ اور خطرات سے کھیلنے والا مراد کہاں گم ہو گئے ہیں؟ دنیا انہیں ڈھونڈتی رہے اور وہ دونوں ڈھونڈنے والوں کے درمیان سکون اور سلامتی سے رہیں۔

ایسا تب ہی ممکن تھا جب کوئی انہیں تبدیل ہوتے نہ دیکھتا لیکن چہرے کی سرجری کرنے والا تو ضرور دیکھتا ہے۔ یہ مراد کی خوش قسمتی تھی کہ ڈاکٹر ممی سن قابلِ اعتماد تھا اور اسے دل سے اپنا بیٹا مانتا تھا۔

اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈیڈ! پھر ایک بار میرے چہرے کی سرجری اور تبدیلی لازمی ہو گئی ہے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''کوئی بات نہیں بیٹے؟ جب چاہو گے جتنی بار چاہو گے، تمہیں بدلتا رہوں گا۔''

''ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ مرینہ سے میری دوستی ہو گئی ہے۔''

ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کیا پھر اس ظالم عورت پر بھروسا کرو گے؟''

''ڈیڈ! غلطی میری بھی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہے۔ آئندہ ہمارے درمیان کبھی دشمنی نہیں ہو گی۔ کیا آپ میری خاطر اس کے چہرے کی سرجری کریں گے؟''

''تم کہو گے تو کیا نہیں کروں گا۔ تم عجیب حالات سے گزر رہے ہو۔ اب تبدیلی کے بعد کیا ارادہ ہے؟''

''نیک ارادے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے۔ میں مجرمانہ زندگی سے توبہ کر رہا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''شاباش۔ میں تمہیں نمازیں پڑھتے دیکھتا تھا تو یہ سوچتا تھا کہ عبادت گزار ہو اور جھوٹ اور فریب سے باز نہیں آتے ہو۔ آج تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

''ڈیڈ! میں نئے چہرے کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی رازداری چاہتا ہوں۔ آپ ماتاجی (جگنی بائی) کو اور اپنے بیٹے ایمان علی کو بھی اس نئی تبدیلی کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔''

''میں اپنے سائے کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ ایمان علی ممبئی گیا ہوا ہے۔ میں یہاں اکیلا ہوں۔ بڑی رازداری سے تم دونوں کو تبدیل کر دوں گا۔''

تبدیلی کے مراحل آسان تھے۔ دو ہی دنوں میں مراد اور مرینہ تبدیل ہو گئے۔ ماروی بھلائی جانے والی ہستی نہیں تھی اور نہ ہی مراد اس کی یادوں سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ اس نے دوسرے دن بھی اسے کال کی تھی۔ ماروی نے لائن کاٹ دی تھی۔

وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ ابھی دوسری شادی نہیں کی ہے۔ جب اس پر سوکن آئے گی تب اسے ناراض ہونا چاہیے۔

اس نے پریشان ہو کر مرینہ کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''میں دیکھ رہی ہوں وہ لائن کاٹ رہی ہے۔ بات نہیں کرنا چاہتی۔ تم اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک جاؤ گے۔ وہ پہلے کی طرح پھر کہیں جا کر چھپ جائے گی۔''

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''میں بھی

تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک رہی ہوں۔ اسے ناراض ہونے دو۔ غصہ دکھانے دو۔ بالآخر دیکھ لینا۔ وہ کچھ عرصے بعد پھر واپس آئے گی۔ اسے گم ہونے دو۔ آخر کراچی میں ہی ہے۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں' اس کے لیے اپنے دماغ کو نہ تھکاؤ۔"

اب تو ساری تھکن مرینہ ہی دور کرنے والی تھی۔ وہی ساتھ رہنے والی تھی۔ مراد نے کبڈی سے کہا۔ "قاضی صاحب کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو آج شام کو ہمارا نکاح پڑھائیں۔ اللہ نے چاہا تو اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔"

کبڈی نے کہا۔ "رکاوٹ تو پیدا ہوگئی ہے۔ وہ دو روز پہلے میرے اس گھر میں جن کا نکاح پڑھانے آئے تھے اب تم دونوں وہ نہیں ہو۔ چہرے بدل گئے ہیں۔"

مرینہ اور مراد نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بولی۔ "یہ تو گڑبڑ ہوگئی۔"

مراد نے کہا۔ "ہاں۔ قاضی صاحب پوچھ سکتے ہیں کہ دو ہی دنوں میں شادی کرنے والے کیسے بدل گئے؟ یہ کون ہیں؟"

کبڈی نے کہا۔ "نکاح نامے میں تم دونوں کے نام بھی مرینہ اور مراد لکھوائے جائیں گے۔ چہرے بدل گئے ہیں اور نام وہی رہیں گے۔ وہ پوچھیں گے کہ یہ بھید کیا ہے؟"

وہ دونوں بہروپیے تھے لیکن نکاح تو اصل نام سے ہی پڑھایا جاتا۔ غلط ناموں سے شرعی نکاح نہ ہوتا۔

مراد نے کہا۔ "کسی نہ کسی بہانے رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ ویسے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ حل نہ ہوسکے۔ تم کسی دوسرے قاضی صاحب سے بات کرو۔"

مسئلہ بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔ نکاح خوانی رُک رہی تھی۔ وہ کبڈی کے ساتھ مکان سے باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے مرینہ کو بلایا۔ اس سے کہا۔ "تم بھی چلو۔ ہم دہلی سے باہر کسی چھوٹے ٹاؤن میں نکاح پڑھائیں گے۔ وہاں کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔"

وہ بولی۔ "چھوٹی آبادیوں میں بات جلدی پھیلتی ہے۔ یہ خبر جلد ہی گشت کرے گی کہ دو اجنبیوں نے آکر وہاں نکاح پڑھایا تھا پھر وہاں سے کہیں چلے گئے ہیں۔"

کبڈی نے کہا۔ "ہاں جہاں آبادی کم ہوگی، وہاں جلد ہی نظروں میں آؤ گے۔ بہتر ہے آگرہ میرے سسرال چلو۔ وہاں سارے انتظامات ہوجائیں گے۔"

مرینہ مکان کے اندر جاکر اپنا اور مراد کا سفری بیگ لے آئی۔ وہ تینوں وہاں سے آگرہ کی سمت چل پڑے۔ وہ

وجہ

دلہن اپنے گھر والوں سے رخصت ہوتے ہوئے بہنوں کے گلے لگ کر رونے لگی۔ دلہا نے جیسے ہی دیکھا کہ دلہن رو رہی ہے تو خود بھی رونے لگ گیا۔

کسی نے پوچھا۔ "دلہن تو اپنوں سے بچھڑنے کے غم میں رو رہی ہے لیکن تم کیوں رو رہے ہو؟"

دولہا نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے آتے ہی (میرے گھر میں) میں اپنوں سے بچھڑ جاؤں گا۔"

مختصر۔ مختصر

ماسٹر شاگرد سے۔ "سونا سب سے زیادہ کہاں ہوتا ہے؟"

شاگرد۔ "جناب چارپائی پر۔"

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

☆☆☆

بولی۔ "مراد! ہمارے سامان میں گن اور بلٹس ہیں۔ کیا اب یہ ضروری ہیں؟"

وہ بولا۔ "اس لیے ضروری ہیں کہ ہم جرائم سے باز آگئے ہیں لیکن دشمن ہم سے باز نہیں آئیں گے۔"

کبڈی نے کہا۔ "باز آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک دشمن بھی اب تم دونوں کو پہچان نہیں سکے گا۔ نہ پہچانے گا، نہ پریشان کرے گا۔ تم دونوں اب سیدھے سادے سے پرامن شہری بن گئے ہو۔"

مرینہ نے کہا۔ "کبھی کسی وجہ سے تلاشی لی جائے گی اور ہمارے سامان سے اسلحہ برآمد ہوگا تو ہم مشکوک اور ناقابلِ اعتماد ہوجائیں گے۔ مجرموں کی فہرست میں آجائیں گے۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے آگے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایسا ہوسکتا ہے۔ جرائم سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز ہمارے ساتھ نہ رہے۔ لیکن ایک طویل عرصے سے میں اسلحہ پکڑنے کا عادی ہوگیا ہوں۔ بعض اوقات پیش آنے والا کوئی خطرہ.... سمجھ میں نہیں آتا لیکن چھٹی حس چونکا دیتی ہے اور مجھے چونکاتی ہے۔ ان لمحات میں اسلحہ ضروری ہوجاتا ہے۔"

کبڈی نے کہا۔ "بے شک کسی وقت بھی کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ ایسا کرو کہ اسلحہ کہیں چھپا کر رکھو۔ لیکن اسے ساتھ

لے کر نہ پھرو۔"

"پہلے رہنے کا کوئی مستقل ٹھکانا تو ہو۔ ابھی مرینہ تمہارے گھر میں ہے اور میں خانہ بدوش ہوں۔ اپنی نئی شناخت کے ساتھ دھرم داس کے اس مکان میں نہیں رہ سکتا۔ آج مرینہ سے نکاح ہوگا، تب ہی ہم کسی چار دیواری میں کچھ عرصے تک رہ سکیں گے۔"

مرینہ نے کہا۔ "اور تب ہی گھر میں اسلحہ چھپا کر باہر نکل سکیں گے۔ فی الحال تو یہ ساتھ رہے گا۔"

مراد زیرِ لب بڑبڑایا۔ "ہم جگہ بدل رہے ہیں۔ پتا نہیں اب بھی ہمارا نکاح ہو سکے گا یا نہیں؟"

مرینہ نے کہا۔ "ضرور ہوگا۔ وہ نا مترک مہاراج جو مجھے جانتا تھا، مر چکا ہے۔ اب ہم دونوں کو پہچاننے والا اور رکاوٹیں بننے والا کوئی دشمن نہیں ہے۔"

کبڈی نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہم جھاڑو دے کر کچرا گھر سے باہر پھینکتے ہیں، ہوا سے دوسرا کچرا چلا آتا ہے۔"

وہ بولی۔ "دل توڑنے کی نہیں، دل رکھنے کی بات کرو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مراد نے تمہارا دل سنبھال کر رکھا ہے۔ بے چارہ اسے لیے پھر رہا ہے شاید آگرہ کے تاج محل میں تمہارے دل سے نکاح ہو جائے۔"

وہ بولی۔ "دیکھو مراد! یہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔"

"مرینہ! آگے کی سوچو کہ تقدیر پھر ہم سے مذاق نہ کرے۔"

یہ پوری دنیا والے امید سے جیتے رہتے ہیں۔ مراد کو امید تھی کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ کوشش کامیاب رہے گی۔ وہ عبداللہ کبڈی کے سسرال میں پہنچ گئے۔

اس کے ساس سسر نے اپنے داماد کے ان ساتھیوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کبڈی نے انہیں بتایا کہ وہ دونوں اس کے پرانے شناسا ہیں۔ اس گھر میں ان کا نکاح پڑھایا جائے گا پھر وہ کسی ہوٹل میں چلے جائیں گے۔

مرینہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی لمبے سفر سے تھک گئی تھی۔ مراد نے کہا۔ "تم یہاں آرام کرو۔ میں کبڈی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا۔"

"نہیں مراد......! میرے دل میں ایک ہلچل سی ہے۔ میں یہاں تنہا نہیں رہوں گی۔ آرام سے گاڑی میں بیٹھی رہوں گی۔"

وہ میاں بیوی بننے والے دونوں ہی امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکے ہوئے تھے۔ گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ وہاں سے کسی قاضی صاحب کی طرف جانے لگے۔ کبڈی راہنمائی کر رہا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد ایک قاضی صاحب کے مکان کے قریب آئے پھر کچھ فاصلے پر رک گئے۔

آگے گلی میں راستہ رکا ہوا تھا۔ وہاں زمین پر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں درجنوں افراد سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف خالی جنازہ رکھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ قاضی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

مرینہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ونڈ اسکرین کے پار گلی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ مراد بھی حیران تھا اور سوچ رہا تھا۔ تقدیر کیسی اٹل ہوتی ہے۔ جو لکھ دیا ہے اس سے ٹلتی نہیں ہے جو کہہ دیتی ہے وہ کرتی ضرور ہے۔

وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں گلی سے باہر لے آیا۔

کبڈی نے کہا۔ "رکو۔ یہاں شہر کے دوسرے قاضی بھی کاندھا دینے آئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر کسی سے بات کرتا ہوں۔"

وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر گلی میں چلا گیا۔ مرینہ جیسے ڈوب رہی تھی۔ اس نے دل برداشتہ ہو کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے مراد......؟"

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکتے ہوئے بولا۔ "مایوسی کفر ہے۔ دین اور ایمان یہ ہے کہ ہم حالات سے لڑتے رہیں۔ پھر یہ کہ ہم گناہ سے بچنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اللہ ہماری نیک نیتی کو سمجھتا ہے۔ فی الحال ہماری آزمائش یہ ہے کہ ہم ناکام ہو کر مجبور ہو کر ایک چار دیواری میں گناہ گار بنتے ہیں یا نہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہو کر دل سے طہارت اور ایمان کی سلامتی مانگتے ہیں یا نہیں؟"

وہ اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔ "اور دھیان رکھو۔ ہم نامحرم ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو چھونا بھی نہیں چاہیے۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "ہم فاصلہ رکھیں گے۔"

کبڈی تھوڑی دیر میں واپس آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "گھر چلو۔ قاضی مولانا عبدالرحمٰن سے بات ہو گئی ہے۔ وہ جامع مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے آئیں گے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر آکر نکاح پڑھا دیں گے۔"

مراد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مرینہ نے اطمینان کی ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "تھینک یو عبداللہ! تم ابھی اور اسی وقت ہماری بگڑی بنا رہے ہو۔"

وہ کبڈی کے سسرال میں آ گئے۔ مراد نے ایک صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے مرینہ سے کہا۔ "ان شاء اللہ

ہم بعد نمازِ مغرب رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں گے۔ اب ہمیں دوسرے معاملات پر بھی توجہ دینی چاہیے۔''

اس نے کہا۔ ''آئندہ کیسے زندگی گزارنی ہے' یہ سوچتی رہتی ہوں۔ کہاں رہیں گے؟ کس ملک میں رہیں گے، معاشرے میں اپنی کیا حیثیت بنائیں گے؟''

''ہم اپنے وطن میں پرامن شہری بن کر رہیں گے۔ میرے پرسنل اکاؤنٹ میں تین کروڑ روپے ہیں۔ انہیں لندن سے پاکستان لانا ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''میرے پاس بھی تقریباً اتنی ہی رقم ہے۔ ہم وہاں کچھ ایسا کریں گے کہ اچھی خاصی ماہانہ آمدنی ہوتی رہے۔''

''میں بلّے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی جرائم سے توبہ کرنا چاہتا ہے۔ وہی میرا ایک وفادار ساتھی ہے۔''

مرینہ نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''کراچی میں اپنی شریکِ حیات بشریٰ کے ساتھ ہے۔ ماروی کے قریب ہی ایک مکان میں رہتا ہے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''اوگاڈ! مجھے یاد آرہا ہے۔ میں نے اس کی عورت کو دیکھا ہے۔ وہ میڈونا کو اوندھے منہ گرا کر ۔گی براؤن کے لیے چیلنج بن گئی تھی۔ لندن ائرپورٹ میں گولیاں چلا کر ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ڈی ڈی ٹی تنظیم کے تین ٹیگروز کے پیچھے پولیس لگا دی تھی۔''

مراد نے کہا۔ ''اس نے اور بھی چونکا دینے والے کارنامے انجام دیے ہیں۔ مکی کے دوسرے اور آخری بیٹے جیکی کو گولی مار کر اسپتال پہنچا دیا تھا۔''

مرینہ نے حیرانی سے دیدے پھاڑ کر پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''وہ فطرتاً ضدی ہے۔ جو ٹھان لیتی ہے وہ کر گزرتی ہے۔ اس نے ایسٹ بورن کے ایک ہوٹل میں ڈی ڈی ٹی کے بگ باس میکانو رابرٹ کے دستِ راست کو گولی ماری تھی اور کسی کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔''

''مائی گاڈ! پھر تو وہ بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔ میں اس سے دوستی کروں گی۔''

''وہ تم سے کبھی دوستی نہیں کرے گی۔ وہ ماروی کو ایک سگی بہن سے بھی زیادہ پیار دیتی ہے۔ وہ تمہیں ماروی کی سوکن سمجھتی ہے۔ اس سے دور ہی رہنا۔ وہ بہت ہی سرپھری ہے۔''

مرینہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے کہا۔ ''بلّے سے کہو، اسے سمجھائے۔ مانا کہ وہ دلیر' بے باک اور ارادوں کی پکی ہے۔ پھر بھی میرے سامنے بچی ہے۔ اسے تم بھی سمجھاؤ کہ ماروی کی محبت میں مجھے دشمن نہ سمجھے اور کبھی میرے منہ نہ لگے۔ ورنہ ایک ہی پھونک میں اڑا دوں گی۔''

''میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم مجبور ہو کر اسے نقصان پہنچاؤ۔ میں اسے چھوٹی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔ وہ بہت ہی سیدھی' سچی اور کھری محبت کرنے والی عورت ہے۔ میں تم دونوں کی وجہ سے بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔''

''میرا مشورہ ہے، بلّے کو اپنے سے دور ہی رکھو۔ اس کو اور بشریٰ کو کبھی معلوم نہ ہو کہ ہم موجودہ شناخت کے ساتھ ایک نئی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''ہاں۔ ابھی ہمارے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہمیں مجرموں کی دنیا سے نکلتے ہوئے اپنی سلامتی اور تحفظ کے لیے دن رات محتاط رہنا ہے۔ ہم کسی اور معاملے میں نہیں الجھیں گے۔''

پھر اس نے فون کو ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''ماروی میری کال اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ محبوب کی پناہ میں چلی جائے گی۔''

''یہ محض دھمکی ہے۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں مرینہ! وہ ایک بار محبوب کے پاس چلی گئی تو میں اسے واپس نہیں لا سکوں گا اور کسی معقول جواز کے بغیر محبوب کے خلاف کچھ کروں گا تو یہ دین و ایمان کے خلاف ہوگا۔ خدا جانتا ہے۔ میں ماروی کے لیے کتنا پریشان ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس حال میں ہے اور کیا کرنے والی ہے۔''

وہ فون پر نمبر پنچ کرنے لگا۔ مرینہ نے کہا۔ ''وہ تم سے بات نہیں کرے گی۔''

مراد نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو بلّے! میں بول رہا ہوں۔''

''ہاں بولو مراد! میرے پاس تمہارا نمبر نہیں ہے اور ماروی نہیں چاہتی کہ میں اس کے لیے تم سے محبت کی بھیک مانگوں۔ اس لیے اس نے تمہارا نمبر مجھے نہیں دیا ہے۔''

''بلّے! میں بہت پریشان ہوں۔ اسے کسی طرح سمجھاؤ۔''

''کیا سمجھاؤں کہ وہ کسی سوکن کو برداشت کرلے؟ ویسے میں نے اس سے یہ بات کی تھی۔ اس نے جواب دیا ہے تم رقیب کو برداشت کرلو گے تو وہ بھی سوکن کو برداشت کر لے گی۔ بولو تمہارا کیا جواب ہے؟''

''وہ سراسر بکواس کر رہی ہے۔''

''مرد کے لیے رقیب بکواس ہے۔ عورت کے لیے سوکن۔ پھر بولو۔ بات کیسے بنے گی؟''

''بلّے! تم جانتے ہو۔ ہم جیسی زندگی گزار رہے ہیں اس میں عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

''تو پھر ایک نماز پڑھنے والا ایسی زندگی کیوں گزار رہا ہے؟ کیا تم جان کی بازی لگا کر ایسی زندگی سے توبہ نہیں کر سکتے؟''

وہ کہہ سکتا تھا کہ توبہ کر چکا ہے۔ لیکن نئی زندگی کے سلسلے میں اب بلے کو بھی رازدار بنانا نہیں چاہتا تھا۔

بلے نے کہا۔ ''بشریٰ میرے دماغ میں ہتھوڑے مارتی رہتی ہے۔ مجھے مجرمانہ زندگی سے توبہ کرنے کو کہتی رہتی ہے اور اچھا ہی کرتی ہے۔ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔ تم دیکھ لینا۔ کسی دن اچانک ہی ماسٹر کی دنیا سے' جرائم کی دنیا سے غائب ہو جاؤں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''خدا تمہیں نیک ارادوں میں کامیابی عطا فرمائے۔ ماروی کی بات کرو۔ تم تو اس سے ملتے رہتے ہو۔''

''اس سے نہ ملتا' اس سے جان پہچان نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ اسے دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے۔ وہ مرجھا گئی ہے۔ ہنسنا بولنا بھول گئی ہے۔ اگر تمہارے احسانات مجھ پر نہ ہوتے تو میں تمہارا دشمن بن جاتا۔''

''میری ماروی کی خاطر مجھ سے دشمنی کرتے رہو۔ مجھے دلی اطمینان حاصل ہوتا رہے گا۔ یہ سوچ کر مطمئن رہوں گا کہ تم میاں بیوی اسے بہن مانتے ہو۔ اس کے لیے فکرمند رہتے ہو۔ مجھے یقین ہے' کبھی اس کے پاؤں میں کانٹا چبھنے نہیں دو گے۔ میرے دشمن! میرے دوست! صرف ایک وعدہ کرو کہ اسے کبھی محبوب کی پناہ میں جانے نہیں دو گے۔''

''جس کا شوہر نامعلوم مدت کے لیے چھوڑ دیتا ہے' اسے راضی نہیں کر پاتا اس کی طلاق خودبخود ہو جاتی ہے۔ ایک مرد سے محروم رہنے والی عورت کو دوسرا گھر بسانے کی قانونی اجازت مل جاتی ہے پھر بھلا میں ماروی کو محبوب کی پناہ میں جانے سے کیسے روک سکوں گا؟''

مراد جواب نہ دے سکا۔ فون بند کر کے مرینہ کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''تم نے خوامخواہ بلے سے بات کی۔ تمہارے دماغ پر اور بوجھ پڑ گیا ہے۔ پلیز مراد! میری بات کا یقین کرو۔ ماروی تمہارے سوا کسی کو منہ نہیں لگائے گی۔ مجھ سے زیادہ تمہیں سمجھنا چاہیے۔ تم اسے بچپن سے دیکھتے سمجھتے آ رہے ہو۔''

اس نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''ہاں' وہ بچپن سے مجھے چاہتی ہے۔ وہ صرف میری ہے۔ میری محبت کسی کو نہیں دے گی۔''

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی نے کبھی اسے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا کہ دو روز سے ماروی اسے تھکا رہی تھی۔

وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ مرینہ اسے پیار سے دیکھنے لگی۔ وہ تو اس کی رگ رگ میں رچا بسا تھا۔ وہ جیل میں اسے پہلی بار دیکھتے ہی اسے چاہنے لگی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے شاید کسی چاہنے والی نے اتنے زخم نہیں کھائے ہوں گے جتنے وہ کھاتی آ رہی تھی اور اس پر قربان ہوتی آ رہی تھی۔

تقدیر نے پہلے ہی دن سے یہ لکھ دیا تھا کہ اسے کبھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ پہلے بھی بار بار قریب آ کر دور ہوتی رہی تھی۔ اب بھی یہی تماشا ہو رہا تھا۔

یہ انسانی ضد ہے کہ تدبیر سے تقدیر بدل دیتی ہے۔ وہ یہی کر رہی تھی۔ آخری دم تک اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہنے والی تھی۔

عصر کی اذان سنتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے صرف آدھے گھنٹے کی نیند لی تھی۔ پھر بیدار ہو کر عصر اور مغرب کی نمازیں پڑھنے کے لیے کبڈی کے ساتھ مسجد میں چلا آیا۔ اس نے کبڈی سے کہا۔ ''میں مسجد میں قاضی صاحب سے ملاقات نہیں کروں گا۔ تم میرے موجودہ فرضی نام سے تعارف کراؤ گے جبکہ میرا نام مراد علی منگی ہے۔ میں اپنی اصلی شخصیت چھپا کر مسجد میں ان سے جھوٹ بولنا' انہیں دھوکا دینا نہیں چاہتا۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''مسجد کے باہر حالات سے مجبور ہو کر دشمنوں سے چھپتے رہنے کی خاطر جھوٹ بولوں گا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں نیک مقاصد کی خاطر تمام عمر بہروپ میں رہوں گا۔''

وہ دونوں مسجد میں آ کر ایک دوسرے سے دور رہے۔ کبڈی نے قاضی عبدالرحمٰن کے ساتھ رہ کر نماز پڑھی۔ مراد ان سے کئی قطار پیچھے تھا۔ نماز کے بعد اس نے بڑے دل سے بڑے جذبے سے دعا مانگی کہ نکاح خوانی کسی رکاوٹ کے بغیر ہو جائے۔

مرینہ ایک کمرے میں مصلے پر سجدے کر رہی تھی۔ دل ہی دل میں گڑگڑا رہی تھی۔ ''یا خدا! میں نماز پڑھنا نہیں جانتی ہوں۔ پھر بھی تیری وحدانیت کو' تیری کبریائی کو مان کر سجدے کر رہی ہوں۔ میری تقدیر بدل دے میرے معبود! میں روز نمازیں پڑھا کروں گی۔''

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اسے نمازوں سے کیا لینا؟ نماز تو بندوں کی اپنی فلاح اور اصلاح کے لیے ہے۔

ویسے بھی حالات کہہ رہے تھے کہ راستہ صاف ہے۔

نکاح خوانی کے وقت کبڑی کے سوا کوئی دوست یا دشمن آنے والا نہیں تھا۔

کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔ کوئی انہیں مرینہ اور مراد کی حیثیت سے بھی نہ جانتا تھا نہ وہاں آکر پہچان سکتا تھا۔

وہ عصر کے بعد تلاوت کرنے بیٹھ گیا۔ یوں مغرب کی نماز تک وقت گزر گیا۔ وہ نماز پڑھنے کے بعد مسجد کے باہر اپنی گاڑی کے پاس آیا۔ اسی وقت کبڑی قاضی صاحب کے ساتھ اس کے پاس آگیا۔ وہ مراد سے ان کا تعارف کرانا چاہتا تھا لیکن ......

لیکن اسی وقت وہ ہوگیا۔ جو سوچا بھی نہ تھا۔

قاضی صاحب نے اسے دیکھتے ہی غصے سے تلملا کر کہا۔ ''الّو کے پٹھے! تو زندہ ہے؟''

مراد حیرت سے اچھل کر ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ وہ غصے میں بول رہا تھا۔ ''ابے تُو تو مر گیا تھا۔ پھر میری جان جلانے کے لیے کہاں سے آگیا؟''

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ''جناب! آ...... آپ کو کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

قاضی صاحب نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''اچھا تو میں آپ جناب ہو گیا۔ بچپن سے تو تڑاخ کی بولی بولتا رہا۔ مجھے ابا کہتا رہا اور اب آپ کی بولی بول رہا ہے۔''

''ابا......؟'' مراد کے دماغ نے چیخ کر کہا۔ ''یہ خود کو میرا باپ کہہ رہا ہے...... یہ میں کہاں آکے پھنس گیا ہوں؟ ڈیڈ نے یہ کس کی صورت بنا دی ہے؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے کبڑی کو دیکھا۔ کبڑی نے کہا۔ ''مولوی صاحب! یہ...... یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ اچھی طرح دیکھیں۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔''

قاضی صاحب نے کہا۔ ''ابے بونے! یہ میرا بیٹا نہیں ہے تو کیا تیرا بیٹا ہے؟''

پھر انہوں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''ارے واہ! کیا باپ اپنے بیٹے کو نہیں پہچانے گا۔ خدا اس کی ماں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ وہ اس جہنمی کو میرے پاس چھوڑ گئی تھی۔ یہ ہڈحرام کچھ کرتا نہیں تھا۔ میری کمائی کھاتا تھا۔ میں بہو لانے کے لیے اسے دلہا بنا کر لے گیا تھا۔ یہ نکاح پڑھانے ...... سے پہلے ہی دلہن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔''

انہوں نے مراد کا گریبان پکڑ کر پوچھا۔ ''اب کہاں بھاگ کر جائے گا۔ وہ تیرے انتظار میں اب تک بیٹھی ہے۔ چل آج ہی تیرا نکاح اس سے پڑھاؤں گا۔''

مراد کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اس کے انتظار میں ایک اور دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ پیش گوئی کے مطابق وہ کسی سے شادی کر ہی نہیں سکتا تھا۔

کبڑی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کی ہونے والی دلہن میرے گھر میں بیٹھی ہے۔''

مراد نے بڑی سہولت سے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ سے گستاخی نہیں کر سکتا۔ پلیز آپ اس پہلو سے سوچیں کہ میں آپ کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہوں۔ اس کی شکل مجھ سے ملتی ہے۔ آپ کو مغالطہ ہو رہا ہے۔ آپ دھوکا کھا رہے ہیں۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں۔ تم سر سے پیر تک میرے بیٹے جان محمد ہو۔''

''میرے بزرگ میرا نام عزت علی ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ گھر چلو۔ وہاں تمہارے اسکول اور کالج کے سرٹیفکیٹ، شناختی کارڈ اور پاسپورٹ میں جان محمد لکھا ہے۔ تمہاری جتنی تصویریں ہیں ان میں یہی تمہاری منحوس صورت ہے۔ خاندان کے تمام افراد تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے اور پہچان کر جوتے ماریں گے۔''

پتا نہیں اس کے بیٹے جان محمد نے کیا کیا تھا کہ وہ باپ ہو کر اسے گالیاں دے رہا تھا اور اس خاندان کے افراد اسے جوتوں سے مارنے کے لیے تیار تھے۔

مرینہ کو دلہن بنانا مہنگا پڑ رہا تھا۔ کبڑی نے کہا۔ ''مراد! تمہیں ماروی کی ہائے لگ رہی ہے۔''

ڈاکٹر ٹمی سن نے ایک ویکلی میگزین سے ایک تصویر دیکھ کر مراد کی وہی صورت بنائی تھی۔ تصویر والے کا نام جان محمد لکھا ہوا تھا اور وہ مر چکا تھا۔

اس میگزین میں لکھا تھا کہ چانپا کے پل سے گزرنے والی ٹرین دریا میں گر پڑی تھی۔ ٹرین کے ساتھ ڈوبنے اور مرنے والے مسافروں میں جان محمد کا بھی نام تھا۔ وہ تصویر اور چند ضروری کاغذات اس کی بند اٹیچی سے نکالے گئے تھے۔

اب مراد اور کبڑی سمجھ گئے تھے کہ قاضی صاحب اس بدنصیب جان محمد کے والد محترم تھے۔ مراد نے کہا۔ ''میں نے اپنے ایک ہم شکل کی تصویر دیکھی تھی۔ اس رسالے میں لکھا تھا کہ اس کا نام جان محمد ہے اور وہ دریا میں ڈوب کر مر گیا ہے۔''

کبڑی نے کہا۔ ''وہی آپ کا بیٹا ہوگا اور آپ فرماتے ہیں کہ وہ اپنی شادی کے دن دلہن کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔''

قاضی صاحب نے کہا۔ ''میں نے بھی وہ رسالہ دیکھا

ہے اور پڑھا ہے۔ وہ شادی کے دن اسی ٹرین سے فرار ہوا تھا۔ دوسرے ڈبے والے کچھ مسافر زندہ بچ گئے تھے۔ آج اسے آنکھوں کے سامنے دیکھ کر کہتا ہوں کہ یہ زندہ ہے اور مجھے شرمندہ کرنے اور میرا سر جھکانے واپس آگیا ہے۔''

مراد نے پوچھا۔ ''جان محمد نے ایسا کیا کیا تھا کہ آپ شرمندہ ہیں اور آپ کا سر جھک جاتا ہے؟''

انہوں نے مراد کے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''بے غیرت! مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ کیا یاد نہیں ہے۔ میں گھر میں بھولا نا چاہتا تھا اور تو انکار کر رہا تھا۔ جب میں زبردستی دلہا بنا کر نکاح پڑھانے لے گیا تو تو اچانک ہی فرار ہوگیا۔ تو نے بعد میں فون پر بتایا کہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مراد نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ ''جان محمد نے شادی نہ کرنے کی کیا وجہ بتائی تھی؟''

''جان محمد تُو ہے۔ تُو نے ٹرین میں فرار ہوتے ہوئے فون پر کہا تھا کہ پورا مرد نہیں ہے۔ عورتوں کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے منہ چھپا کر جا رہا ہے۔''

مراد اور کبڈی نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر مراد نے کہا۔ ''جناب میں جان محمد نہیں ہوں۔''

''تُو ہے۔ پکا فراڈ ہے۔ میری پسند کی بھولا نے سے انکار کیا اور فرار ہوگیا۔ اب عزت علی نام رکھ کر اپنی پسند سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔''

آہ......! مراد کے دل سے آہ نکلی۔ یہ پیش گوئی سن چکا تھا کہ دوسری شادی اس کے نصیب میں نہیں ہے اور خود نکاح پڑھانے والے قاضی صاحب شادی روکنے آگئے تھے۔

ایسے ہی وقت گشتی پولیس کی ایک گاڑی وہاں آکر رُکی۔ پولیس افسر جمال شاہ قاضی صاحب کا بھتیجا تھا۔ اس نے مراد کو دیکھا تو حیرانی سے گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ''جان محمد......! یہ تم ہو......؟''

وہ بڑی حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے قریب آیا۔ ''مائی گاڈ......! تم زندہ ہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

اس نے قاضی سے کہا۔ ''انکل! یہ ہمارا جان محمد ہے نا؟ یہ اب تک کہاں تھا۔ آپ سے دور کیوں کھڑا ہے؟''

وہ بولتا ہوا مراد کے اور قریب آیا۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اسے چھونے اور ٹٹولنے لگا۔ ''مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے۔''

قاضی عبدالرحمان نے کہا۔ ''مجھے تو دیکھتے ہی یقین ہوگیا تھا کہ یہ کمبخت فریبی بہانے باز میرے دماغ کا پھوڑا ہے۔''

پولیس افسر جمال شاہ نے مراد کو محبت سے کھینچ کر گلے سے لگالیا۔ اب وہ جان محمد ہونے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

اگر انکار کرتا تو وہ پولیس افسر انکوائری کرتا کہ جان محمد کا ہم شکل کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟

خود کو ایک ہندوستانی اور آگرہ کا شہری ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی مستند قانونی کاغذ نہیں تھا۔ وہاں ایک نئے مراد نئے عزت علی کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ کوئی فیملی بیک گراؤنڈ تھا۔

یہ بھید کھل سکتا تھا کہ عزت علی کے پیچھے قانون کا ایک مطلوبہ خطرناک مجرم مراد علی منگی چھپا ہوا ہے۔

وہ کبڈی کو آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''بھئی عبداللہ صاحب! آپ کا احسان ہے۔ آپ نے یہاں تک میرا ساتھ دیا ہے۔ اب میں عزت علی کے نام سے چھپ کر نہیں رہ سکوں گا۔ ابا کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔''

قاضی صاحب نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ''ہاں پولیس والے کو دیکھتے ہی نانی یاد آگئی۔ ابھی تک اپنے باپ کو بھولا ہوا تھا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ بے آسرا تھا تو میں نے آسرا دیا تھا۔ دریا میں ڈوبنے کی وجہ سے اس کی یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ یہ آپ کے ساتھ گھر جا کر اپنے دوسرے رشتے داروں کو بھی نہیں پہچانے گا۔''

پھر کبڈی نے پولیس افسر سے کہا۔ ''جمال صاحب! آپ اس کے کزن ہیں۔ الٹی سیدھی باتیں کرے گا تو آپ اسے محبت سے سمجھایئے گا۔ قاضی صاحب تو بیٹے کو معاف نہیں کر رہے ہیں۔ غصے میں اس سے باتیں کر رہے ہیں۔''

جمال شاہ نے مراد کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں کسی بڑے ڈاکٹر سے اس کا علاج کراؤں گا اور انکل! آپ غصہ کم کیا کریں۔ چلیں اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔''

قاضی صاحب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اس نے پورے خاندان کے سامنے میری ناک کاٹ دی ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''ابا! میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا آپ نہیں مان رہے تھے۔ آپ کی ناک نہیں کٹی ہے۔ میں شادی کروں گا لیکن ایک برس کے بعد۔''

وہ بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ میں ابھی گھر لے جا کر تیرا نکاح پڑھاؤں گا۔''

جمال شاہ نے کہا۔ ''انکل غصے سے کہہ رہے ہیں۔ آج ہی تمہاری شادی نہیں ہو جائے گی۔ یہاں سڑک کے کنارے ایسے اہم معاملات پر باتیں نہ کی جائیں۔ چلیں یہاں سے۔''

اس نے مراد کو اور قاضی صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھایا پھر کبڈی سے مصافحہ کر کے انہیں وہاں سے لے گیا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ مرینہ بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ کبڈی تنہا واپس آیا تو اس نے پوچھا۔ ''مراد کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''اسے پولیس والے لے گئے ہیں۔''

وہ یکبارگی لرز گئی۔ اس نے گھبرا کر حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی کہہ رہا ہوں جو تقدیر کر رہی ہے اور جس کی پیش گوئی پہلے سے ہو چکی ہے۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ اچانک پولیس والے اسے کیوں لے گئے ہیں؟ کیا بھید کھل گیا ہے؟ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ مراد علی منگی ہے؟''

''نہیں۔ ابھی یہ بھید نہیں کھلا ہے۔ صرف تم دونوں کی شادی خانہ آبادی میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ یہاں کے ایک پولیس افسر جمال شاہ کا کزن جان محمد ہمارے مراد کا ہم شکل تھا۔ مراد کے ڈاکٹر ڈیڈی بھی کیا کر بیٹھے ہیں؟ انہوں نے اسے انجانے میں پولیس والوں کے خاندان میں پہنچا دیا ہے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ کبڈی قاضی صاحب کے بارے میں بتانے کے بعد بولا۔ ''مان لو کہ تقدیر سے لڑ نہیں سکو گی۔ ہم ہر بار یہ سمجھتے ہیں کہ کہیں سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور اچانک ہی ہماری توقع کے خلاف شادی رک جاتی ہے۔''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''اب تو لگتا ہے، دور تک شادی رک گئی ہے۔ پتا نہیں وہ کب اور کیسے پولیس والے کے گھر سے نکل پائے گا؟ وہ بری طرح پھنس گیا ہے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے کہہ دوں کہ وہاں بھی ایک دلہن مراد کے نکاح میں آنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہی کہہ رہا ہوں۔ واہ ری قسمت...... میرے یار کی زندگی میں پھول ہی پھول آ رہے ہیں اور پتھر کی طرح لگتے جا رہے ہیں۔''

وہ اپنے فون کو دیکھتے ہوئے بے چینی سے بولی۔ ''وہ ابھی مجبور ہو گا۔ مجھ سے باتیں نہیں کر رہا ہے۔ پتا نہیں کب اس سے باتیں ہو سکیں گی۔ ہمیں جلد سے جلد یہ شہر یہ ملک چھوڑ دینا چاہیے۔''

کبڈی نے کہا۔ ''ایزی مرینہ! اپنے اندر کی بے چینی پر قابو پاؤ۔ پھر سکون اور سہولت سے سوچو کہ مراد وہاں سے کیسے نکلے گا؟ اور تم دونوں کب اور کس طرح یہ ملک چھوڑ سکو گے؟''

اچھے نصیب بنانے کے لیے کوششیں کرتے رہنا اچھی بات ہے۔ لیکن اب یہ کوششیں مہنگی پڑ رہی تھیں۔ اس بار وہ پولیس والوں میں پھنس گیا تھا اور تقدیر کہہ رہی تھی کہ جو کرنا ہے کر لو۔ جو ہونا ہے وہی ہو گا۔ اب تک انسانی حوصلہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایک کے بعد دوسری تیسری ناکامیاں ہوں تو کوئی بات نہیں۔ گرتے رہنے کے باوجود شہسوار ایک دن ضرور میدان جیت لیتا ہے۔ مرینہ بھی یہی کہتی آ رہی تھی کہ بدنصیبی اور رکاوٹیں عارضی ہیں وہ مقدر کی مرضی کے خلاف مراد کی منکوحہ ضرور بنے گی، اس بار تو پورا یقین تھا کہ کہیں سے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا تھا ہی نہیں۔ کوئی ایک دشمن بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور کس بھیس میں چھپے ہوئے ہیں۔

یہ سمجھنے اور سیکھنے کا مقام ہوتا ہے کہ جہاں سے کوئی توقع نہیں ہوتی، وہیں سے پتھر آ کر لگتے ہیں۔ کبھی ہنستے ناچتے گاتے وقت اچانک ہی آخری ہچکی آتی ہے۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ہنستے ہنستے شامت آ جاتی ہے اور وہ سوچ کے خلاف آ جاتی ہے۔

اب مرینہ کا حوصلہ ذرا کمزور ہو رہا تھا۔ وہ چپکے چپکے قائل ہو رہی تھی کہ تقدیر کے فیصلے کے خلاف مراد کی شریک حیات بن نہیں پائے گی۔

ویسے کچھ بھی ہوتا رہے ارادے ضدی تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچ رہی تھی کہ وہ ابھی حوصلہ رکھے گی۔ پھر کوشش کرے گی۔ ضرور کرے گی۔ اسے جیت کر رہے گی لیکن کیسے؟ وہ پولیس افسر کے گھر سے نکل پائے گا۔ تب ہی آگے کوشش جاری رہے گی۔ اس نے پریشان ہو کر کبڈی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''یہ پولیس افسر جمال شاہ کون ہے؟ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے کہ مراد وہاں سے کیسے نجات پائے گا؟''

وہ مایوسی سے بولی۔ ''ابھی تو یہی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ وہاں سے بہ آسانی نکل نہیں پائے گا۔ پولیس انکوائری سے بچنے کے لیے خود کو قاضی صاحب کا بیٹا جان محمد کہتا رہے گا۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس پولیس افسر کا نام جمال شاہ ہے۔ وہ جان محمد کا چچازاد بھائی ہے۔ وہاں سے بھاگ کر آنے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اس خاندان کا فرد جان محمد نہیں ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''بھید کھل جائے گا کہ دریا میں ڈوب کر مرنے والے جان محمد کے چہرے کے پیچھے کوئی مجرم چھپا ہوا ہے۔ وہ پولیس افسر جمال شاہ فوراً ہی انڈیا کی تمام پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو مراد کے پیچھے لگا دے گا۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہوئی بولی۔ ''کیا تقدیر کا تماشا

ہے۔ وہ ایک پولیس والے کے گھر میں جاکر پھنس گیا ہے۔"

پھر وہ اپنے فون کو دیکھ کر بولی۔ "کسی طرح اس سے دو باتیں ہو جائیں۔ میری تسلی کے لیے کچھ تو معلوم ہو جائے کہ ابھی اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"صبر کرو۔ معلوم ہو جائے گا۔ تم سمجھ دار ہو پھر بھی سمجھاتا ہوں۔ اسے کال نہ کرنا، چھپ کر ملنے کی غلطی نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے بارے میں انکوائری ہو گی کہ تم جان محمد کی کیا لگتی ہو؟"

وہ قائل ہو کر بولی۔ "ہاں۔ میرے پاس موجودہ چہرے کے قانونی ڈاکیومنٹس نہیں ہیں۔ میرے عزیز و اقارب نہیں ہیں، کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ مجھے کسی بھی طرح کی انکوائری سے بچ کر رہنا چاہیے۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر چونک کر بولی۔ "ڈاکٹر ڈیڈی نے مجھے یہ جو نیا چہرہ دیا ہے، یہ کس کا ہو گا؟"

کبڈی اس کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "انہوں نے انجانے میں مراد کو جان محمد بنا کر مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میری یہ صورت بھی آگے جا کر مصیبت نہ بن جائے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ڈاکٹر انکل سے پوچھنا چاہیے۔"

اس نے ڈاکٹر ممین سن کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ "انکل! گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آپ نے مراد کے چہرے پر متوفی جان محمد کا چہرہ بنایا تھا۔ اس کے رشتے دار اُسے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ ان رشتے داروں میں ایک پولیس افسر ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہاں، یہ پریشانی کی بات ہے۔ لیکن مراد نادان نہیں ہے۔ وہ باتیں بنا کر اس خاندان میں خود کو ایڈجسٹ کر لے گا۔ کیا وہ لوگ کسی شبہے کے بغیر اسے جان محمد تسلیم کر رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "ہاں۔ قاضی صاحب تو اسے بیٹا سمجھ کر بڑی اپنایت سے اسے گالیاں دے رہے ہیں۔ اس سے جھگڑا کر رہے ہیں اور پولیس انسپکٹر نے تو اسے گلے سے لگایا ہے۔"

"پھر پریشان کیوں ہوتے ہو۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ مراد کو وہاں ٹھوس فیملی بیک گراؤنڈ مل رہا ہے۔ متوفی جان محمد کے تمام قانونی کاغذات اس کے کام آئیں گے۔"

مرینہ وائڈ اسپیکر کے باعث یہ باتیں سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اس پہلو سے مراد وہاں محفوظ ہے لیکن میرے پاس واپس نہیں آسکے گا۔ وہاں اس کی شادی کسی اور سے کرائی جا رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ مجھے یقین ہے

مراد وہاں کے پیچیدہ معاملات سے نمٹ لے گا۔ شکر کرو وہ کبھی دشمنوں کی نظروں میں نہیں آئے گا۔ جان محمد کے گھر میں پہنچ کر وہ گویا فولادی قلعے میں پہنچ گیا ہے۔''

ڈاکٹر نے انجانے میں ہی سہی، مراد کو ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والا ایک فرد بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

مرینہ نے پوچھا۔ ''پلیز! یہ بتائیں۔ میرا یہ چہرہ کس کا ہے؟ میں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسوں گی نا؟''

''میں نے تم دونوں کو مصیبتوں سے نکالنے کے لیے چہرے تبدیل کیے ہیں۔ تم بالکل محفوظ رہو گی۔''

''معلوم تو ہو میرے یہ چہرے والی کون تھی؟''

وہ یکلخت جذباتی ہو کر بولا۔ ''آہ...... ! کیا کرو گی پوچھ کر؟''

''بتائیں تو سہی؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اسے میرے دل میں رہنے دو۔ کہہ دیا نا کہ یہ صورت تمہارے لیے مسئلہ نہیں بنے گی۔ تمہیں پوری طرح مطمئن رہنا چاہیے۔''

کبڈی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے انکل؟ آپ کی آواز میں جوانی آگئی ہے۔ پلیز بتائیں۔ اتنے حسین مکھڑے والی کون تھی؟''

وہ چپ رہا پھر بولا۔ ''ہائے میری لیلیٰ۔ ہائے میری شیریں۔ ہائے میری جولیٹ......''

مرینہ اور کبڈی ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگے۔ کبڈی نے کہا۔ ''آپ کی جوانی کی حسین یادگار میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بتائیں؟''

وہ بولا۔ ''یہ دو لفظوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہ نہیں تو جوانی نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے کسی کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ جانتے ہو، یہ کون ہے......؟''

اس نے یہ سوال کر کے سسپنس پیدا کیا پھر کہا۔ ''یہ میری شریکِ حیات ہے۔ یہ میرے ایمان علی کی ماں کا چہرہ ہے۔''

مرینہ نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''مائی گڈنس! آپ کی وائف اس قدر حسین تھیں؟''

وہ پرس سے بے بی مرر نکال کر اپنی موجودہ صورت دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بائی گاڈ! آپ نے مجھے بہت ہی خوب صورت بنا دیا ہے۔ لیکن اپنے جوان بیٹے کی ماں بنا دیا ہے۔''

''یہ آج کی نہیں اٹھائیس برس پہلے کی صورت ہے۔ اس وقت وہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اس حساب سے تم ابھی اٹھارہ برس کی ہو۔ میں تمہارے وجود میں ماضی کی ہیلن کو زندہ متحرک دیکھ رہا ہوں۔ اس کا نام ہیلن تھا۔''

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''بڑھاپے میں بیوی کی جوانی دیکھ رہے ہیں۔ حالِ دل سنائیں۔ ارادے کیا ہیں؟''

اس بات پر ڈاکٹر اور کبڈی سب ہی ہنسنے لگے۔ وہ بولا۔ ''میں نے اپنے لیے نہیں، اپنے بیٹے کے لیے تمہیں تبدیل کیا ہے۔ یہ سوچا ہے کہ وہ یہاں آکر مجھے دیکھتا ہے۔ آئندہ ماں کو بھی دیکھتا رہے گا۔ میں اس کے تاثرات دیکھنا چاہتا ہوں۔''

مرینہ نے کہا۔ ''انکل! کیا آپ نے سوچا ہے کہ ماں اور بیٹے کے درمیان عمر کا فرق مٹ گیا ہے؟ میں بیٹے کے سامنے نوخیز حسینہ دکھائی دیتی رہوں گی۔''

''میں نے تمہیں اس کی ماں کا چہرہ دیا۔ تم جوان ہو اسے ممتا نہیں دو گی۔ وہ جوان ہے، تمہاری صورت دیکھ کر احترام تو کرے گا لیکن ماں نہیں کہے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہم سب دیکھیں گے کہ وہ کیسے اُلجھتا ہے۔ بڑی دلچسپ اُلجھن ہو گی۔''

پھر وہ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں دو بار دور سے چھپ کر دیکھا ہے۔''

''چھپ کر کیوں دیکھا ہے؟''

''عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چھوڑ کے جانے والی کو چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔ مت پوچھو کہ میں کس دنیا میں پہنچ رہا تھا۔''

وہ ذرا چپ رہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرے بڑھاپے میں تمہاری جوانی ہیلن کا چہرہ لائی ہے۔ کبھی کبھی سامنے آتی رہو گی تو وہ گمشدہ چہرہ دیکھتا رہوں گا اور دور بہت دور ماضی کے سبز باغ میں پہنچ جایا کروں گا۔ میرے اور تمہارے درمیان...... تمہارے اور ایمان علی کے درمیان خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ دنیا کے دستور کے مطابق کوئی سماجی رشتہ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی ہیلن کے ایک چہرے نے ہم تینوں کو عجیب سے بے نام رشتوں میں منسلک کر دیا ہے۔''

مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک عجیب سا جذباتی تماشا کر رہے ہیں۔''

''زندگی میں طرح طرح کے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک یہ بھی سہی۔ کل ہی ایمان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا آج کل میں آنے والا ہے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں دیکھے گا تو کیا ردِعمل ہو گا۔ مرینہ! کل میرے ساتھ لنچ کرو۔ جب تک ساتھ رہو گی، میں ہیلن کو دیکھتا رہوں گا۔''

''میں ضرور آؤں گی لیکن میری شادی مشکل میں پڑ

گئی ہے۔ میں مراد سے کب مل پاؤں گی آج میری سہاگ رات تھی۔ اوکاڑا میں سو نہیں سکوں گی۔ اسے خواب میں بھی نہیں پاسکوں گی۔"

"اس کی بہتری چاہو۔ وہ محفوظ جگہ پہنچ گیا ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر موقع دیکھ کر تمہارے پاس آنے کا راستہ بنالے گا۔ آج کل میں دیکھو تو سہی ہوتا کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے رابطہ ختم کردیا۔ وہ فون کو سینے سے لگا کر زیرلب بولی۔ "کس ماحول میں پہنچ گئے ہو مراد؟ وہاں کن حالات سے گزر رہے ہو؟ کیا کررہے ہو؟"

☆☆☆

قاضی اپنے پولیس افسر بھتیجے جمال شاہ کے ساتھ ایک پرانی سی حویلی میں رہتا تھا۔ مراد نے ان کے ساتھ وہاں آکر دیکھا۔ حویلی کے نیچے سے اوپر تک کی منزلوں میں رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ مرد کم تھے عورتیں زیادہ تھیں۔ بے شمار بچے بھاگتے دوڑتے، کھیلتے اودھم مچاتے دکھائی دے رہے تھے۔

مراد نے پوچھا۔ "کیا یہاں کسی کی شادی ہے؟"

قاضی نے کہا۔ "تیرے باپ کی شادی ہے۔ کم بخت دلہن کو چھوڑ کر بھاگا تھا۔"

جمال شاہ نے کہا۔ "انکل! آپ دماغ ٹھنڈا رکھیں۔ یہ بیٹا ہے۔ محبت سے بولا کریں۔"

پوری حویلی میں شور اٹھا کہ مردہ زندہ ہوگیا ہے۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب ہی آرہے تھے اور مراد کو دیدے پھاڑ کر بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔

جمال شاہ ان سے کہہ رہا تھا۔ "معجزہ ہوگیا ہے۔ یہ ڈوبنے سے بچ گیا تھا۔ لیکن گھر واپس نہیں آیا۔ ہم سے چھپ رہا تھا۔ ہم اسے پکڑ کر لائے ہیں۔"

وہ سب سن رہے تھے اور خوش ہورہے تھے۔ مرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آتا۔ وہ واپس آکر ان کے لیے عجوبہ بن گیا تھا۔ بچے اسے قبرستان سے آنے والا بھوت سمجھ کر ڈر رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں اور مرد اُسے گلے لگا رہے تھے۔ اسے لمبی عمر کی دعائیں دے رہے تھے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے اس سے بے تکلف ہونے کے لیے ساتھ ہنسنے بولنے لگے تھے۔

مراد کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ وہاں رشتے داروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ وہ ان کی باتوں سے سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ کس کے ساتھ جان محمد کا کیا رشتہ رہا ہے؟

جمال شاہ نے انہیں بتایا کہ دریا میں ڈوبنے کے باعث اس کا دماغ متاثر ہوا ہے۔ اس کی یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ لہٰذا اس کے قریب آنے والے اپنے ساتھ اس کا رشتہ بتاتے جارہے تھے۔

وہ کنبہ بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا۔ ماں باپ، چاچا چاچی، بھائی بہنیں، بیٹے بہوئیں، پوتے پوتی اور نواسے نواسی اتنے تھے کہ وہ شادی کا گھر لگتا تھا۔ مراد نے کہا۔ "میرا حافظہ کمزور ہوگیا ہے۔ میں سب ہی کے نام لکھ کر دن رات یاد کرتا رہوں گا۔ تب ہی پہچان سکوں گا کہ کس سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

ایسے وقت وہ آگئی جس سے رشتہ ہونے والا تھا اور جان محمد جسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کا نام نورالنسا تھا، سب اسے نوری کہتے تھے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ مراد کے سامنے آکر شرما رہی تھی۔

یک نہ شد، دو شد اور اب تو چار شد کی گنتی تھی۔ ایک ماروی کراچی میں بیٹھی تھی۔ دوسری میڈونا گم ہوگئی تھی۔ تیسری مرینہ کو بابا امیری کی پیش گوئی نے لٹکا دیا تھا۔ اب چوتھی مسلط ہونے آگئی تھی۔ حالات کہہ رہے تھے کہ نوری کسی روک ٹوک کے بغیر اس کے گلے پڑ جائے گی۔

جرائم کی دنیا میں کہیں سے بھی گولیاں آکر لگتی ہیں۔ اس کی زندگی میں کہیں سے بھی عورتیں آکر شائیں سے لگتی رہتی تھیں۔

قاضی نے کہا۔ "یہ میری بہن کی بیٹی ہے۔ ہاتھ میں سورج لے کر ڈھونڈے گا تب بھی ایسی نیک پروین کہیں نہیں ملے گی۔ کل صبح دس بجے تم دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

مراد نے نوری پر ایک نظر ڈالی۔ پھر پریشان ہوکر کہا۔ "ابا......! یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

نوری شرما کر دوسری عورتوں کے پیچھے چلی گئی۔

قاضی نے پوچھا۔ "کیا پھر انکار کرے گا پھر یہاں سے بھاگ جائے گا؟ میں اس بار تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

مراد نے پولیس افسر سے کہا۔ "جمال بھائی! مجھے شادی سے انکار نہیں ہے۔ آپ ابا کو سمجھائیں۔ جلدی نہ کریں۔ پہلے میرا علاج کرائیں۔ شادی بعد میں ہوجائے گی۔"

نوری عورتوں کے پیچھے سے گھور کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں شکایت تھی۔ وہ آنکھیں پوچھ رہی تھیں کہ وہ آنے والی رنگین راتوں کو کیوں ٹال رہا ہے؟

ایک بزرگ نے کہا۔ "علاج تو ہوتا ہی رہے گا۔ شادی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

ایک خاتون نے کہا۔ "تم عین شادی کے روز منہ چھپا کر بھاگ گئے تھے۔ ہمارے سر شرم سے جھک گئے تھے۔"

ایک اور بزرگ نے کہا۔ "اے میاں! اگر بچہ شادی کے قابل نہیں ہو تو ابھی سب کے سامنے صاف صاف کہہ دو۔"

''وہ...... وہ، بات یہ ہے کہ......''
وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بولے؟ کس طرح شادی کو ٹالے؟
قاضی نے کہا۔ ''یہ شادی کے قابل ہے۔ جھوٹا مکار ہے۔ یہ انکار کرے گا تو اس کا طبی معائنہ کراؤں گا پھر سب کے سامنے اس کا جھوٹ کھل جائے گا۔''
ایک بوڑھی خاتون نے پوچھا۔ ''کیوں برخوردار! تمہارا معائنہ کرایا جائے؟''
وہ شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ ''میں کہہ تو رہا ہوں کہ شادی کروں گا۔ لیکن کل نہیں۔ ٹائم ذرا بڑھا دیں۔ میں سب کے سامنے وعدہ کرتا ہوں۔ دو روز کے بعد ضرور کروں گا۔''
وہ دو دنوں کی مہلت لے کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ جمال شاہ نے کہا۔ ''جان محمد! تم خوامخواہ آج کا کام کل پر ٹال رہے ہو۔ اپنے بزرگوں سے بحث نہ کرو۔ میں بھی کہتا ہوں کل صبح دس بجے نکاح خوانی ہوگی۔''
وہ پولیس افسر اس حویلی میں جیسے منصفِ اعلیٰ تھا۔ اس کا حکم سن کر سب ہی کہنے لگے کہ شادی کل ہی ہوگی۔ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ناچنے گانے لگے۔ ڈھول اور دف بجنے لگے۔ مراد نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ ''پلیز مجھے بتاؤ۔ میرا کمرا کہاں ہے؟ میں تنہائی چاہتا ہوں۔''
اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر کوئی نہ آئے۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔ کوئی آئے گا تو دروازہ نہیں کھولوں گا۔''
وہ رشتے داروں کے ہجوم سے نکل آیا۔ اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر فوراً ہی مرینہ کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف وہ انتظار میں تڑپ رہی تھی۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے مراد! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم خیریت سے ہونا؟''
وہ بولا۔ ''ابھی تک خیریت ہے۔ یہاں کوئی نہ مجھے پہچانتا ہے نہ کوئی جانی دشمن ہے۔ میں کل صبح دس بجے تک بالکل خیریت سے رہوں گا۔''
اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''پھر دس بجے کے بعد کیا ہوگا؟''
''مجھے نکاح کے نام پر عمر قید کی سزا دی جائے گی۔''
''کیا کہہ رہے ہو؟ وہاں سے بھاگو۔''
''میرے پیچھے وہ پولیس افسر اپنی پوری فورس کے ساتھ بھاگنا شروع کر دے گا۔ ہمارے ساتھ تم بھی دوڑ لگاؤ گی۔ پھر نتیجہ کیا ہوگا۔ ہم پاسپورٹ کے بغیر بارڈر کراس نہیں کر سکیں گے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار جانے کے لیے چیپت راؤ اور ماسٹر کو بوبو سے مدد لینی ہوگی جبکہ ہم تمام جرائم پیشہ افراد سے دور رہنا چاہتے ہیں۔''
''مراد! ہم آخری بار ماسٹر کی مدد حاصل کریں گے۔''
''یہ آخری بار اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں سرحد پار پاکستان گیا ہوں۔ پھر چیپت راؤ اور ماسٹر کے دوسرے ماتحت ہمارا موجودہ چہرہ دیکھ لیں گے۔''
وہ تڑپ کر بولی۔ ''پھر کیا کرو گے؟ کیا وہاں شادی رچاؤ گے؟ وہاں کسی سے نکاح قبول کرو گے؟''
''اب تک کا تجربہ کہہ رہا ہے کہ میرا نکاح کسی سے ہو ہی نہیں سکے گا۔ بابا اجمیری کہہ چکے ہیں۔ میں کبھی دوسری شادی کر ہی نہیں سکوں گا اور یہ تم دیکھتی آرہی ہو۔''
''میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ کیا پتا اس لڑکی کے نصیب سے تمہارا نصیب بدل جائے اور وہ تمہاری دلہن بن جائے۔ تمہاری راتوں میں آجائے۔''
وہ باغیانہ انداز میں بولا۔ ''آنے دو۔ اب تو کوئی بھی عورت آئے گر آجائے۔ میں انسان ہوں۔ فرشتہ نہیں ہوں۔ کب تک پارسا رہوں؟ میں گناہوں سے دامن بچاتے بچاتے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اللہ کرے کل نوری سے میرا نکاح ہو جائے اور کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔''
وہ جیسے ٹوٹتے ہوئے، بکھرتے ہوئے بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا مجھے چھوڑ دو گے؟''
''جب نوری کے نصیب سے پیش گوئی بدل جائے گی تو پھر تمہارے لیے بھی راستہ کھلے گا۔ تم میرے لیے بہت ضروری ہو۔ یہ دیکھ رہی ہو کہ اپنی ماروی کی مخالفتیں مول لے کر تمہیں لائف پارٹنر بنا لینا چاہتا ہوں۔''
وہ اطمینان کی سانس لے کر بولی۔ ''آئی لو یو مراد۔ تمہاری اس شادی سے ہماری ازدواجی زندگی کا راستہ کھلے گا۔ ماروی نادان ہے۔ اس نے مجھے برداشت نہیں کیا۔ تم سے دور ہو رہی ہے۔ میں نوری کو برداشت کروں گی صرف تمہاری خاطر...... تمہاری منکوحہ بن کر رہنے کے لیے۔''
وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے یقین نہیں ہے کہ نوری کو دلہن بنا سکوں گا۔ بابا اجمیری کی پیش گوئی پھر رنگ لائے گی۔''

وہ بولی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگا؟''
''آنے والے لمحو...... بتاؤ، کیا ہوگا؟''

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

انتقام

ثمر عباس

نا انصافی کیسی بھی ہو دلوں میں اکثر غم و غصے اور حسد کو ہوا دیتی ہے... اگر اس کی بروقت تلافی نہ کی جائے تو یہی جذبات انتقام میں بدل جاتے ہیں... اس کے دل میں بھی ایک چھوٹا سا دکھ دھیرے دھیرے بدلے کی چنگاریوں میں ڈھلنے لگا تو قدرت نے بھی موقع فراہم کردیا اور اگر وہ موقعے سے فائدہ نہ اٹھاتا تو شاید ناکامی کی آگ اسے تمام عمر جلاتی رہتی جس کے لیے وہ ہرگز راضی نہ تھا۔

وقت کی راکھ میں دبی چنگاری سے بھڑکنے والے شعلوں کا انجام

ٹیری نائف نے اپنی عادت کے مطابق مہمانوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان دونوں کو دھکے دے کر باہر نکال دے لیکن ان کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ اس لیے اسے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ کر منافقت سے کام لینا پڑا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

ایلنس نے کوئی لگی لپٹی کے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ شب قصبے کے پب کو لوٹا گیا ہے اور عینی شاہدوں

کے مطابق تم اس ڈکیتی میں ملوث ہو۔"

ٹیری نائف نے سر ہلایا اور منہ بند کر کے ہنستے ہوئے بولا۔ "موسم کے لحاظ سے یہ ایک اچھا لطیفہ ہے۔"

"ویڈیو میں تمہارے جیسے قد و قامت کے آدمی کو دکھایا گیا ہے جس نے چمڑے کی جیکٹ پہنی ہوئی ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چل رہا ہے۔"

ایلنس نے باہر کھڑی ہوئی کیڈی لاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کار میں ایک شاٹ گن بھی رکھی ہوئی ہے جو یقیناً اس واردات میں استعمال ہوئی ہوگی اور اسے تم کار سے نکالنا بھول گئے۔"

"شاٹ گن... میرے پاس کوئی شاٹ گن نہیں ہے۔" اس نے حیرت سے ساسبری کی طرف دیکھا جو بڑی بے نیازی سے کتے کی پیٹھ سہلا رہا تھا پھر اس نے ایلنس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ شاٹ گن میری ہوسکتی ہے۔ میری عمر کا آدمی گیس اسٹیشن لوٹ سکتا ہے۔ کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟"

"یقیناً نہیں۔" ایلنس نے کہا۔ "لیکن شاید تمہیں ہمارے ساتھ چلنے کے لیے لباس تبدیل کرنا ہوگا۔"

مونٹانا کے قصبے دورلینڈ کے رہنے والوں کے لیے ڈکیتی کی اس واردات میں دلچسپی کا واحد سبب ٹیری نائف کی ذات تھی۔ جب اس کی کہانی زبان زد عام ہوئی تو کسی کو یقین نہیں آیا کہ ٹیری جیسا شخص اس قسم کی بچکانا حرکت کرسکتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسے نری حماقت قرار دیا۔ جبکہ زیادہ تر کا یہی خیال تھا کہ ٹیری سے اس حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ کم از کم اس کے پس منظر سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

وہ 1952ء میں ٹیرینس ڈیان نائٹ کے گھر پیدا ہوا اور دورلینڈ میں ہی پلا بڑھا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ خوش شکل ہونے کے علاوہ اچھا ڈانسر بھی تھا اور لڑکیاں اس کی مردانہ وجاہت پر فدا تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گریجویشن کرنے کے بعد...... چند سالوں ہی میں اس کے کئی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات ہوگئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ مزید بدنامی سے بچنے کے لیے وہ فوج میں بھرتی ہو کر ویت نام چلا گیا۔

ٹیری 1973ء کے موسم خزاں میں واپس آگیا اور باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا لیکن اس کا رجحان اس جانب نہیں تھا۔ اس لیے وہ کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ اس کے بعد اس نے کئی دوسرے کام کیے لیکن ناکام رہا۔ اس نے موسم سرما کا زیادہ حصہ نائٹ پارٹیوں یا اپنے باپ کی نئی برف گاڑیوں پر سواری کرتے گزارا اور صرف چار مہینے میں تین گاڑیوں کو تباہ اور ایک کو بیچ دیا۔ باپ سے اس کی یہ حرکتیں برداشت نہ ہوئیں اور اسے دکان سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد دونوں میں بات چیت بند ہوگئی لیکن ٹیری کو اس پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے برف گاڑی پر سواری کرنے کی صلاحیت حاصل کرلی تھی اور اسسٹنٹ پرفارمر کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو دی آئس مین کہلوانا شروع کردیا تھا اور اس کے کرتبوں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ مقامی ریڈیو اسٹیشن کے اناؤنسر نے اسے برف پر شیطان، کا خطاب بھی دے ڈالا تھا۔

اس کے کارناموں کی کامیابی اور ناکامی کا تناسب برابر تھا لیکن ٹیری کو اس سے غرض نہ تھی، بعد میں اس نے کئی مرتبہ شیخی بگھاری کہ اس مختصر سے کیریئر کے دوران اس کی درجن بھر ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں جبکہ حقیقت میں ان کی تعداد صرف دو تھی جن میں سے ایک اس کی کلائی میں ہونے والا معمولی سا فریکچر تھا۔

اس کے نام کی تبدیلی بھی حادثاتی طور پر ہوئی تھی۔ ایک مقابلے کے لیے اس کے جو پوسٹر چھاپے گئے، وہ ان سے مطمئن نہیں تھا، چنانچہ اس نے خود ہی یہ پوسٹر چھپوانے کا فیصلہ کیا لیکن اس روز شدید سردی کے باعث اس کی پک اپ اسٹارٹ نہ ہوسکی تو اس نے ٹیلی فون پر ہی پرنٹر کو یہ لائنیں لکھوا دیں اور دوسرے دن اسے ڈاک کے ذریعے اپنی تصویریں بھی بھیج دیں۔ ایک ہفتے بعد جب پوسٹرز چھپ کر آئے تو ان میں ٹیری نائٹ کی جگہ ٹیری نائف، چھپا ہوا تھا۔ شاید پرنٹر سے سننے میں غلطی ہوگئی تھی یا اس کی قوت سماعت کمزور تھی۔ پہلے تو ٹیری کو بہت غصہ آیا اور وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا لیکن بعد میں اس نے سوچا کہ ٹیری نائف میں بھی کیا برائی ہے۔ یہ چونکا دینے والا نام ہے اور اس طرح وہ اپنے باپ کو بھی نیچا دکھا سکتا ہے۔ ویسے بھی اب اتنا وقت نہیں تھا کہ دوسرے پوسٹرز چھپوائے جائیں۔

نیا نام اس کے لیے خوش بختی کی علامت ثابت ہوا۔ اس کی شہرت مونٹانا سے نکل کر دوسری ریاستوں تک پھیل گئی، اس کو شاپنگ مال کے افتتاح اور مقامی تہواروں میں بلایا جانے لگا اور بڑے بڑے تجارتی ادارے اسے اسپانسر کرنے لگے۔ اسے شاید ہی کبھی اپنے مشروبات کے لیے ادائیگی کرنا پڑی ہو جس کی وجہ سے اس کی بچت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسے

اپنا مستقبل روشن نظر آرہا تھا گو کہ ابھی وہ ایلڈوریڈو جیسی گاڑی رکھنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس نے آنے والے موسم بہار میں کسی نہ کسی طرح وہ گاڑی خرید ہی لی۔

بہت جلد ٹیری کو احساس ہوگیا کہ اس کیریئر کے سہارے وہ اپنے اخراجات پورے نہیں کرسکتا کیونکہ مونٹانا میں سردیوں کا موسم صرف پانچ مہینے رہتا ہے جبکہ کیڈی لاک کی قسطیں اسے سارا سال ادا کرنا ہوتی تھیں۔ اسی دوران اسے کرتب دکھانے کے دوران ایک اور حادثہ پیش آگیا جو پہلے کے مقابلے میں زیادہ سنگین تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی اور ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق گھٹنا بھی اصلی حالت میں واپس نہیں آسکتا تھا۔

☆☆☆

''وہ صحت یاب ہونے کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا۔'' چک ٹیلر نے اس کی کہانی پڑھنے کے بعد کہا۔ ''لیکن لگتا یہ ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد اس کی دلچسپی اس کام سے ختم ہوگئی تھی اور وہ پورا وقت شراب نوشی اور آوارہ گردی میں صرف کرنے لگا۔''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس حادثے کی وجہ سے اس کی شہرت پر منفی اثر پڑا اور اس کے کیریئر کا سورج تیزی سے غروب ہونے لگا تھا۔'' ایلنس نے کہا۔

''ہاں میں سمجھتا ہوں کہ دو ناکام شادیوں اور اس صورتِ حال میں مبتلا ہونے کے بعد اس کے پاس اس کیڈی لاک کے علاوہ شاید ہی کچھ بچا ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ وہ خود تو برے حالات سے دوچار ہوگیا لیکن یہ گاڑی آج بھی ایسی ہے جیسے ابھی شوروم سے آئی ہو۔ اس نے اپنی انشورنس پالیسی اور جائداد بیچنے کی کوشش کی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کے بارے میں آخری بات یہ سنی تھی کہ وہ اپنی خاندانی اشیا بیچ کر گزارہ کررہا ہے۔''

ایلنس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد اب وہ لوٹ مار پر اتر آیا ہے۔''

''لیکن وہ یہ کام بڑی ہوشیاری سے کررہا ہے اور اپنے آپ کو ابھی تک معزز ثابت کیے ہوئے ہے۔''

''اس کی یہ شرافت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہے گی۔ ہم بہت جلد اس کی اصلیت بے نقاب کردیں گے۔''

چک نے اپنا سر ہلایا اور تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تم کچھ بھی کہتے رہو۔ اگر میں تمہاری جگہ اس کیس پر کام کررہا ہوتا تو اس کی دونوں ٹانگیں اسی کی شاٹ گن سے بے کار کردیتا۔ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

ایلنس کی تیوریوں پر بھی بل پڑ گئے۔ اس کی نظریں قصبے کے پمپ کے سامنے والی کھڑکی اور اس کے پار نیلی پہاڑیوں کے درمیان بھٹک رہی تھیں۔ ''میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔'' وہ گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں ایک بار پھر ویڈیو دیکھنی چاہیے۔''

ایلنس نے ٹیپ کی رفتار آہستہ رکھی تاکہ وہ پمپ کے کاؤنٹر، سامنے کے دروازے، اسٹور اور کیسینو کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ کچھ دیر بعد کسی کار کی ہیڈلائٹس نمودار ہوئیں۔ چند لمحوں بعد کار سے ایک تنومند شخص برآمد ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو کولہوں تک اسی جیکٹ میں چھپایا ہوا تھا جو ٹیری نائف گزشتہ تیس سال سے پہن کر قصبے میں گھومتا تھا۔ کیمرے کی خرابی کے باوجود شاٹ گن اور اسکائی ماسک بھی نظر آرہا تھا۔

ایلنس نے ٹیپ کو ری وائنڈ کیا اور آہستہ آہستہ دوبارہ چلانے لگا تاکہ اس شخص کو کاؤنٹر تک جاتا دیکھ سکے۔ ''یہ دیکھو۔ اس کی دائیں ٹانگ میں لنگڑاہٹ نظر آرہی ہے۔''

''ہاں۔ واقعی اب تو کوئی شبہ نہیں رہا۔''

''ابھی اور بھی دیکھنا باقی ہے۔'' ایلنس بولا۔

کاؤنٹر کلرک نے نقد رقم اور سگریٹ کا ایک کارٹن نکال کر کاؤنٹر پر رکھا اور جیسے ہی ڈاکو واپس جانے کے لیے مڑا تو ایلنس نے ایک بار پھر ٹیپ کو آہستہ کردیا اور بولا۔ ''دیکھو، اب وہ بائیں ٹانگ کے سہارے چل رہا ہے۔''

''کمال ہے۔'' چک بولا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

ایلنس نے اپنی کرسی گھمائی اور اسکرین پر دیکھنے لگا۔ اب کاؤنٹر کلرک ڈیبی اوٹیرو کا بیان ہورہا تھا۔ وہ ابھی تک شاٹ گن کے خوف سے باہر نہیں آسکی تھی اور اسی لیے کچھ بولتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

''اس نے زیادہ بات نہیں کی۔ بس اپنی گن نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ اس کی نال کا رخ کیش رجسٹر کی جانب تھا۔''

''کیا وہ نشے میں تھا؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے بیئر کی بو آرہی تھی۔''

''تم نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی وہاں آیا کرتا تھا؟''

''ہاں۔ اس نے کبھی پمپ پر ادائیگی نہیں کی۔ وہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ بیس ڈالرز خرچ کرسکتا تھا، پھر وہ اندر آتا کچھ دیر مجھ سے فلرٹ کرتا اور اپنی مرضی کی چیزیں لے کر چلا جاتا۔''

''تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی تھا؟''

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا لیکن چند گھنٹے پہلے کے مقابلے میں اس کے لہجے میں اتنا یقین نہیں تھا۔'' وہ سرگوشیوں میں بول رہا تھا۔ اس لیے نہیں جان سکی کہ یہ وہی تھا۔ اسی طرح میں اس کی جیکٹ اور لنگڑاہٹ کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''اور کار کے بارے میں؟''

''اسے اس کار پر بہت فخر ہے۔'' اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ''یہ بالکل ایک بڑی زمینی کشتی کی طرح ہے اور شاید ایک گیلن میں دس میل جاتی ہوگی۔ اس نے ہمیشہ یہی تاثر دیا کہ ایک دن وہ مجھے اس کار کی سیر کروائے گا لیکن میں اس کی لچھے دار باتوں میں نہیں آئی۔''

☆☆☆

ڈونا بیٹی نے روایتی مسکراہٹ کے ساتھ ایلنس کا استقبال کیا اور بولی۔ ''ایک دن میں یہ تمہارا دوسرا چکر ہے۔ اگر مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو کہو؟'' وہ ایک طویل قامت اور دبلی پتلی عورت تھی لیکن ساٹھ سال کی عمر میں بھی بڑی کامیابی سے گوز سیلون چلا رہی تھی۔

''مجھے ایک بار پھر ٹیری نائف کے بارے میں بتاؤ؟'' ایلنس نے کہا۔

ڈونا نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''وہ یہاں ڈرنک کرنے آیا تھا لیکن اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ جب میں نے اس سے پیسے مانگے تو وہ چلانے لگا اور بولا لعنت ہے تم پر۔ یہاں ایک شریف آدمی کو شراب نہیں مل سکتی۔ ٹھیک ہے۔ اب مجھے کسی شراب کی دکان کو ہی لوٹنا ہوگا۔''

''اس کے فوراً بعد وہ چلا گیا؟''

''اس نے دو تین گلاس پیے۔ اس دوران ویسکوز اور اس کے ساتھیوں نے اسے چھیڑنا شروع کردیا۔ وہ اس سے تفریح لینا چاہ رہے تھے۔''

''ویسکوئز!'' ایلنس نے یہ نام دہرایا۔ ''یہ وہی لڑکا ہے نا جسے میں نے پچھلے سال یہاں دیکھا تھا؟''

''ہاں..... وہ لڑکا نہیں، تیس سال کا جوان ہے اور اب اس نے اپنا نام بھی تبدیل کرلیا ہے۔ کوبرا یا شاید کچھ اور۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ماں کے مرنے کے بعد بھی اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں اب بھی سوچتی ہوں کہ اسی نے دو ہفتے پہلے ایک ڈسپنسر پر لوہے کی سلاخ سے حملہ کیا تھا۔ اس کیس کا کیا بنا؟''

''میں تمام شواہد اکٹھے کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ وہ لوگ ٹیری سے پہلے چلے گئے تھے یا بعد میں گئے؟''

''میں وہاں سے ہٹ گئی تھی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان کے درمیان جھگڑا نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے بھی پارکنگ لاٹ میں ان کی لڑائی ہوچکی تھی لیکن ٹیری بہت زیادہ پی چکا تھا۔ اس لیے اس نے ان لوگوں کے مذاق کا زیادہ اثر نہیں لیا۔''

''تم نے اسے اس حالت میں جانے دیا؟''

ڈونا نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور بولی۔ ''میں نے اس سے گاڑی کی چابی لینے کی کوشش کی اور کہا کہ بار بند ہونے کے بعد میں اسے چھوڑ آؤں گی لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوا۔ اسی دوران میں فون سننے چلی گئی جب واپس آئی تو وہ جاچکا تھا۔ بہرحال میں اس کی ماں تو ہوں نہیں۔''

سوپ اوپیرا دوبارہ شروع ہوچکا تھا۔ ڈونا نے ٹی وی کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔ شاید ماضی کا کوئی یادگار لمحہ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

''مجھے ٹیری کا اس طرح جانا اچھا نہیں لگا۔'' ڈونا سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ میں اور وہ ہائی اسکول ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ میں اس سے ایک سال آگے تھی۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں لیکن میں بھی اس کی بہت سی گرل فرینڈز میں سے ایک تھی اور کبھی کبھی سوچتی کہ شاید ہم دونوں میں کوئی خاص تعلق قائم ہوگیا ہے۔''

اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''اسے لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کا طریقہ آتا تھا اور ہر لڑکی اس کے بارے میں ایسا ہی سوچتی تھی۔''

☆☆☆

بڑے سے پیلے رنگ کے لباس میں ٹیری نائف اپنے قد سے چھوٹا اور کسی حد تک عمر رسیدہ نظر آرہا تھا۔ جیل کی کوٹھری میں بیٹھا وہ فرش پر اپنے ہاتھ پھیر رہا تھا اور ساتھ ہی بڑبڑاتا جارہا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ مجھے کیوں اس جرم میں ملوث کیا جارہا ہے۔ واقعی مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں میں پلا بڑھا ہوں۔ تمہارے پاس سگریٹ ہوگی؟''

ایلنس نے اسے بتایا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ ٹیری یہ سن کر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ سر کے بالوں پر پھیرا جو اس کی چھوٹی سی ڈاڑھی کے مقابلے میں زیادہ سیاہ تھے۔ اس سے ایلنس کو اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اپنے بالوں کو رنگنے کا عادی ہے۔

''میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ پہلی بار ایک ہی جوڑے سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے یہاں اپنا نام بھی کھودا تھا لیکن اب وہ مٹ گیا ہے۔''

''تمہیں اس سے کیا ملا؟ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ تم یہ ڈاکا نہ ڈالتے۔''

ٹیری تلخی سے ہنسا۔ ''میں نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے گھر جانا بھی یاد نہ رہا۔ جب آنکھ کھلی تو زمین پر پڑا ہوا تھا اور ایک کتا میرا منہ چاٹ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''میں تھوڑی سی پی لوں، اس کے بعد بتاؤں گا۔''

''یہاں پینے کی سہولت بھی نہیں ہے۔'' ایلنس نے کہا۔ ''میں تمہیں نصیحت نہیں کر رہا لیکن کیا کبھی تم نے شراب چھوڑنے کے بارے میں سوچا؟''

''ہاں۔ میں یہ روز ہی سوچتا تھا اور مجھے احساس تھا کہ اس کا برا انجام ہو سکتا ہے۔''

''بہر حال اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو پھر یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہے جو تم سے ملتا جلتا ہے۔ اس شہر میں کون ہے جو تمہیں تنگ کر سکتا ہے؟'' ایلنس نے پوچھا۔

''ایسے کچھ لوگ تو ضرور ہوں گے۔'' ٹیری نے سرسری سا جواب دیا۔

''کسی ایک کا نام بتا سکتے ہو؟''

ٹیری نے اپنے ماتھے کو رگڑا اور بولا۔ ''میں خاص طور پر کسی ایک کا نام نہیں لے سکتا۔''

ایلنس کچھ دیر انتظار کرتا رہا مگر ٹیری کے پاس کہنے کے لیے مزید کچھ نہ تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑا تو ٹیری بولا۔ ''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہت جلد میرا وکیل آئے گا اور مجھے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔''

ایلنس نے سر ہلایا اور بولا۔ ''بائی دی وے تم کون سا سگریٹ پیتے ہو؟''

ٹیری کا چہرہ چمک اٹھا اور بولا۔ ''میرٹ لائٹ۔ تمہارا بہت شکریہ۔''

☆☆☆

کارلو ویسکوئز ان دنوں بے روزگار تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے اسے لکڑی کا کارخانہ بند ہونے کی وجہ سے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ کارخانے سے جو واجبات ملے، وہ عرصہ ہوا ختم ہو چکے تھے۔ اب اس کا گزارہ عارضی نوعیت کے چھوٹے موٹے کاموں پر تھا اور اسی سلسلے میں وہ گوز سلوان بھی آتا جاتا رہتا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اب کوبرا بریکسٹن کہلوانا پسند کرتا ہے۔''

''میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔'' ایلنس نے کہا۔ ''دیکھنا یہ ہے کہ نام کی تبدیلی سے اس کی شخصیت پر کیا اثر پڑا ہے؟''

''وہ بہت زیادہ پراعتماد ہو گیا ہو گا یا پھر ایسا شخص جس کی ذات کا کھوج لگانا مشکل ہو۔''

''دیکھنا پڑے گا کہ یہ مسٹر بریکسٹن کیا چیز ہے؟''

''اس کے لیے تمہیں اس کی شخصیت کو سرے سے کھنگالنا ہوگا۔'' چک مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ کارلو یا کوبرا جو کوئی بھی ہے۔ اس کے نام سے ہی لگتا ہے کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے۔''

''ماں کے مرنے کے بعد سے وہ کافی پریشان ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی تک اسی کے گھر میں رہ رہا ہے لیکن تمہیں اس سے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی ہے؟'' چک نے پوچھا۔

ایلنس نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے ایک مرتبہ پھر ملنا ہوگا۔ پچھلی بار جب ہم ملے تو وہ نشے میں تھا، اسے شاید وہ ملاقات یاد بھی نہ ہو۔''

''تم ہمیشہ سے ہی اتنے ملنسار واقع ہوئے ہو۔ میں اس کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ان دنوں خاصا پریشان ہے۔''

''اس کے خاندان کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟'' ایلنس نے تجسس سے پوچھا۔

''اس کی ماں کسی زمانے میں انگریزی اور ٹائپنگ سکھاتی تھی۔ بریکسٹن اس کا خاندانی نام تھا پھر وہ وہاں سے چلی گئی یا نکال دی گئی۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا پھر اس نے ارمانڈو ویسکوئز سے شادی کر لی جو ٹرک چلاتا تھا۔ اس سے کارلو پیدا ہوا پھر ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ پھر اس نے ایک کرافٹ شاپ اور کیفے کھولا پھر اس نے دوسرے مردوں سے تعلقات استوار کیے لیکن کوئی بھی رشتہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اس کے یہاں اور بھی بچے پیدا ہوئے لیکن وہ سب پل بڑھ کر اس قابل ہو گئے کہ اس قصبے میں زندگی گزار سکیں۔''

''میں اسی لیے تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں چک کہ تم اس نامعقول قصبے کے انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتے ہو۔''

☆☆☆

ویسکوئز کا گھر کافی اچھے محل وقوع پر تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر مکانات تعطیلات کے دنوں میں کرائے پر دیے

جاتے تھے۔ ان سے چوتھائی میل کے فاصلے پر ویسکوئز کا مکان تھا۔ ایلنس نے اپنی گاڑی پارک کی اور مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نو سالہ لڑکی دروازے کے اندر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایلنس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ''ہائے! تمہارا نام کیا ہے؟''

''جیسمین!'' لڑکی نے جواب دیا۔

''کیا کارلو موجود ہے؟''

''کون؟'' لڑکی نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''اوہ۔ میرا مطلب ہے کوبرا۔'' ایلنس کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ ''میں اس سے ایک منٹ کے لیے ملنا چاہتا ہوں۔'' لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

اسی وقت مکان کے عقب سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ یہ کوئی پٹاخہ یا فائر کریکر نہیں تھا۔ بلکہ واقعی گولیوں کی آواز تھی۔ تقریباً چھ فائر ہونے کے بعد ایک وقفہ آیا پھر چار پانچ فائر مزید ہوئے۔

''یہ شوٹنگ وہی کررہا ہے؟'' ایلنس نے پوچھا۔

جیسمین نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور سر ہلانے لگی۔

''ٹھیک ہے۔ میں خود ہی مکان کے پچھلے حصے میں جا کر دیکھ لیتا ہوں۔'' ایلنس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ لڑکی اسے بے زاری سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ آج کہیں نہیں گیا ہے۔''

''یہ سن کر خوشی ہوئی لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ یہاں نہیں ہے۔'' ایلنس نے جرح کی۔

''میرا مطلب تھا کہ وہ یہاں پورچ میں نہیں ہے۔'' لڑکی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''میں لنچ کے لیے جارہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

کارلو ویسکوئز عرف کوبرا ریکسٹن، چوڑی چھاتی اور گھنے بالوں والا صحت مند شخص تھا۔ جب ایلنس مکان میں داخل ہوا تو وہ اپنے پستول میں کارتوس ڈال رہا تھا۔ ایلنس نے اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کارلو! ایک منٹ کے لیے میری بات سنو۔''

کارلو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

''میں ہفتے کی شب ہونے والے ایک ڈاکے کی تفتیش کررہا ہوں۔ تم نے بھی اس کے بارے میں سنا ہوگا؟''

''اس واقعے کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟'' کارلو نے بے رخی سے پوچھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اس وقوعہ سے پہلے تم گوز سیلون کے باہر ٹیری نائف سے اس بارے میں باتیں کررہے تھے۔''

''وہ وہاں بیٹھ کر اس بارے میں بھونک رہا تھا۔''

''تم اس کے دوست ہو؟''

''نہیں۔''

''تم اس کے جانے سے پہلے ہی وہاں سے چلے گئے تھے؟''

''ہم تقریباً ساتھ ساتھ ہی وہاں سے چلے تھے۔''

''تم جانتے ہو، وہ کہاں رہتا ہے؟''

''اگر جانتا بھی ہوں تو کیا ہوگا؟''

''زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے کارلو۔'' ایلنس نے سختی سے کہا۔

''میرا نام کوبرا ہے۔''

''ٹھیک ہے کوبرا... میں صرف یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں صحیح آدمی سے بات کررہا ہوں۔ یقیناً تم نہیں چاہو گے کہ ایک بے گناہ شخص جیل چلا جائے۔''

''وہ بے گناہ نہیں ہے۔ اسٹور میں کیمرے لگے ہوتے ہیں۔ تم نے بھی اسے وہاں لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھا ہوگا، اس کے علاوہ ایسی جیکٹ کون پہنتا ہے۔ اس گدھے کو جیل میں ڈال دو اور وہیں رکھو۔''

ایلنس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے شاٹ گن کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

☆☆☆

سیاہ دھوئیں کے مرغولوں نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایلنس تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا اس جانب بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ دھواں ٹیری نائف کے گھر سے اٹھ رہا تھا۔ آگ کے نارنجی شعلے دور سے دیکھے جاسکتے تھے لیکن اس کے وہاں پہنچنے تک ٹیری کی کیڈی لاک پوری طرح جل چکی تھی۔ فیول ٹینک پھٹ چکا تھا اور ٹائروں کے جلنے کے بعد اس کا ڈھانچا لان میں موجود تھا۔ اس نے اپنی گاڑی تقریباً چالیس فٹ دور کھڑی کی لیکن آگ کی تپش وہاں بھی پہنچ رہی تھی۔

اس نے آخری بار اس گاڑی کو بہترین حالت میں دیکھا تھا لیکن اب وہ ایک ڈراؤنا خواب لگ رہی تھی۔ وہ

تصور کرسکتا تھا کہ اپنی گاڑی کا یہ حال دیکھ کر ٹیری کے دل پر کیا گزرے گی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جیکٹ اور کار کی چابی کی تلاش میں اندر چلا گیا لیکن یہ دونوں چیزیں اسے کہیں نہیں ملیں۔ وہ پورچ میں کھڑا دھوئیں کے بادل دیکھتا رہا تبھی فائر بریگیڈ کا ایک ٹرک وہاں پہنچا۔ اس کا ڈرائیور دوڑتا ہوا کار تک پہنچا اور جوش سے بولا۔ ''جلدی سے پانی ڈالو۔ اس کار نگ اب بھی اچھی حالت میں ہے۔''

عملے نے اسپرے کرنا شروع کردیا اور جب آگ مکمل طور پر بجھ گئی تو ایک فائر مین نے گیس سیلنڈر کے ڈھکنے کی طرف اشارہ کیا جو گھاس پر پڑا ہوا تھا۔ ''لگتا ہے کہ کسی شخص نے کوئی جلتی ہوئی چیز گاڑی میں چھوڑ دی تھی جس نے ایک گھنٹے میں آگ پکڑ لی۔ ممکن ہے کہ ٹیری نے گیس کی بڑھتی ہوئی قیمت سے گھبرا کر خود ہی یہ حرکت کی ہو۔''

''وہ اس وقت جیل میں ہے۔'' ایلنس نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ آج سہ پہر تک ضمانت پر رہا ہو جائے۔''

''یہ کام کسی دوسرے شخص کو معاوضہ دے کر بھی کروایا جاسکتا ہے۔'' فائر مین نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''جو لوگ اپنی گاڑیاں بیچ نہیں سکتے اور نہ ہی ایندھن کا خرچ برداشت کرسکتے ہیں، وہ اپنی گاڑیوں کو اسی طرح آگ لگا کر انشورنس کی رقم حاصل کر لیتے ہیں۔''

ایلنس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ ٹیری ایسا کرسکتا ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سلور ٹویوٹا پورچ میں آکر رکی اور اس میں سے ٹیری نائف برآمد ہوا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں تباہ شدہ کار کی طرف دیکھا اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک نوجوان خاتون باہر نکلی اور ایلنس فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ ٹیری کی وکیل ہوگی۔ ٹیری اپنی کار کی جانب بڑھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن الفاظ حلق سے باہر نہ آسکے۔ وہ وہیں لان پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد بولا۔ ''کاش میں اس گاڑی کا انشورنس کروالیتا۔''

''تم نے اس بارے میں سوچا تو ہوگا؟''

''اس طرح کی کار رکھنا بہت مہنگی پڑتی ہے۔ میں نے اسے بیچنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن اس پر عمل نہ کرسکا۔''

فائر مین اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ ٹیری کی وکیل تھوڑی دور آگے نکل کر کسی سے سیل فون پر باتیں کرنے لگی اور ایلنس نے پوچھنے لگا کہ جلے ہوئے ٹائروں کی بو کئی دن تک نہیں

> بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے مل کر انسان سلجھ جاتا ہے اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے مل کر انسان الجھ جاتا ہے۔
>
> ☆ اگر انسان کسی صحیح راستے پر گامزن ہے تو منزل کے حصول کے لیے کسی جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں، بڑی کامیابیاں بڑی دیر کے بعد آتی ہیں۔
>
> ☆ تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے ہیں جو اتنا مہربان ہے کہ ہماری عبادت اور تقویٰ کو تو ہمارے چہروں سے ظاہر کردیتا ہے مگر ہمارے گناہ ساری دنیا سے پوشیدہ رکھتا ہے۔
>
> ☆ ایک معاشرہ تب پروان چڑھتا ہے جب وہاں کے عمر رسیدہ افراد یہ جانتے ہوئے بھی پودے لگائیں کہ وہ اپنے لگائے گئے پودوں کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھ پائیں گے۔
>
> مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

جائے گی۔

''مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ کار خریدی تھی اور اس عرصے میں اس پر ایک نشان یا دھبا بھی نہیں لگا۔ مجھ سے زیادہ اس کا اور کون خیال رکھ سکتا تھا۔''

''بے شک یہ ایک عمدہ کار تھی۔'' ایلنس نے کہا۔

''اسے کون آگ لگانا چاہے گا۔''

ٹیری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑا ہوگیا اور جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس بارے میں کچھ سوچا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ جلد ہی کوئی اندازہ لگالوں گا۔''

☆☆☆

شام کا دھندلکا سا پھیل چکا تھا مگر ویسکوئز ہاؤس کی بتیاں گل تھیں۔ اس بار جیسمین ڈرائیو وے میں بائیک چلا رہی تھی۔ جب اس نے ایلنس کی گاڑی آتے دیکھی تو بائیک چھوڑ کر گھر کی طرف چل دی مگر چند قدم جانے کے بعد رک گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایلنس کے پاس آئی اور بولی۔ ''کارلو سو رہا ہے۔''

''مجھے شاید اسے اٹھانا پڑے گا۔''

''اس نے بہت زیادہ پی رکھی ہے۔''

"میں کچھ نہیں جانتا۔" ایلنس نے رکھائی سے کہا۔

جیسمین نے بائیک لی اور گھر کی طرف چل دی۔ ایلنس بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے بائیک ایک طرف کھڑی کی اور ایلنس کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلنس بولا۔ "میں اندر آجاؤں؟"

کارلو ایک کاؤچ پر سویا ہوا تھا۔ اس کا منہ آدھا کھلا ہوا تھا اور وہ زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ ایلنس نے اسے اٹھانے کے لیے دروازہ زور سے بند کیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"کیا یہ ہمیشہ اسی طرح سوتا ہے؟" ایلنس نے پوچھا۔

لڑکی نے کندھے اچکائے اور بولی۔ "ہاں جب بہت زیادہ نشے میں ہو۔" پھر اس نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا بیڈروم اوپر ہے۔"

"کیا تم مجھے وہ کمرا دکھا سکتی ہو؟"

وہ اسے اوپر لے گئی۔ پہلا دروازہ بند تھا، البتہ دوسرا کھلا ہوا تھا۔ ایلنس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ فرش پر میلے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ اعشاریہ دو دو کا ریوالور بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ایلنس کو دروازے پر لٹکی ہوئی چمڑے کی جیکٹ بھی نظر آگئی۔ ایلنس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اس کی نظریں ایک سرخ رنگ کے پلاسٹک باکس پر جم گئیں جو خطوط اور پرانی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔

"میرا بھائی نہیں چاہتا کہ کوئی اس باکس کو ہاتھ لگائے۔" جیسمین بولی۔ "اس میں میری ماں کی چیزیں ہیں۔"

ایلنس نے سر ہلا دیا۔ اسے اس باکس کو ہاتھ لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سب سے اوپر ہی ایک شکن آلود لفافہ رکھا ہوا تھا جس پر 1973ء کی مہر لگی ہوئی تھی۔ لفافے پر سوسن بریکسٹن کا نام لکھا ہوا تھا اور بھیجنے والا ٹیریسن دی نائٹ تھا۔

ایلنس سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ اس نے غور سے سوئے ہوئے کارلو کو دیکھا۔ یقیناً اس کی ٹھوڑی اپنے باپ سے مشابہ تھی۔

☆☆☆

"میرا خیال ہے کہ سوسن نے یہ بات اسے نہیں بتائی ہوگی۔" ٹیری نائف نے کہا۔ وہ اس وقت کچن میں کھڑا ٹوٹی ہوئی چھاننے کی مشین کو دیکھ رہا تھا۔ برابر میں رکھی میز پر اس کی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ "مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس خط میں کیا لکھا تھا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ میں احمق تھا اور فوج میں جانے کے بعد بھی ان حماقتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں مجھ سے ہمیشہ غلطیاں ہی ہوئیں۔"

ایلنس نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں کارلو ویسکوئز نے جیل جانے سے پہلے وہ خط اس کے حوالے کر دیا تھا جس میں ٹیری نے اپنی سابقہ انگلش ٹیچر کو لکھا تھا کہ حاملہ ہونا اور اس وجہ سے ملازمت کا ختم ہونا اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ خط کی آخری سطور زیادہ تکلیف دہ تھیں جن میں سوسن کو ایک ایسی عورت قرار دیا گیا تھا جو باپ بننے کے حوالے سے ہمیشہ مرد کو ہی ذمے دار ٹھہراتی ہیں۔ کارلو نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ٹیری نائف ہی اس کی ماں کی زندگی تباہ کرنے کا ذمے دار ہے۔ اس لیے اس سے انتقام لینا ضروری ہے۔

"تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں اسے الزام دے رہا ہوں۔" ٹیری نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "میں اس پرکار کے حوالے سے بھی کوئی الزام نہیں لگانا چاہتا۔ کہہ دوں گا کہ میں نے ہی جلتا ہوا سگریٹ کار میں چھوڑ دیا تھا یا اسی طرح کی کوئی اور بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ لڑکا پہلے ہی بہت تکلیفیں اٹھا چکا ہے۔ بے شک وہ اس جیکٹ کو اپنے پاس رکھے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

ایلنس کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ ایک باپ کی حیثیت سے ٹیری نائف یہی کچھ کر سکتا تھا۔ وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "وہ کوئی عام کار نہیں بلکہ کیڈی لاک تھی۔"

"ہاں۔ تیس سال سے زیادہ پرانی ہونے کے باوجود تم اس کی باڈی میں اپنا چہرہ دیکھ سکتے تھے۔ میں اسے بھلا نہیں سکتا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر میں اپنے آپ کو بہتر شخص محسوس کر رہا ہوں اور اب مجھے شریف بنے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ مبارک ہو۔ امید ہے کہ تم اس پر قائم رہو گے۔" ایلنس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

ایلنس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ چلاتا ہوا باہر لے آیا۔ اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ ٹیری نائف لنگڑاتا ہوا اندر جا رہا تھا۔ اس بار بھی اس نے دوسری ٹانگ کا سہارا لیا ہوا تھا۔ ایلنس نے محسوس کیا کہ وہ کوئی عکس دیکھ رہا ہے۔ اسے ہنسی آگئی۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا تو جلی ہوئی کیڈی لاک سے دھوئیں کا ایک چھوٹا سا مرغولہ نکلا اور فضا میں تحلیل ہو گیا۔

پتلی اور سیدھی رسّی پر پیر جما کر چلنا اور خود کو گرنے سے بچائے رکھنا کس قدر دشوار ہوتا ہے اس کا احساس انہی لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اس کا تجربہ ہو، ورنہ مشاہدہ کرنے والے فقط حیران ہوکر انگلیاں دانتوں تلے داب کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے والے بھی مہد سے لحد تک ایسے ہی اللہ کی راہ میں عمر کی نقدی خرچ کرتے ہیں اور بظاہر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہوکر آخرت کا بے شمار سرمایہ پالیتے ہیں۔۔۔ آپ کا تعلق بھی ایسے ہی نیک اور عبادت گزار لوگوں میں ہوتا تھا۔

جان جاناں کا خلیفہ

دنیا کی دلدل سے دامن بچا کر منزلِ مقصود پالینے والے ایک ولی کا قصہ

ضیا تسنیم بلگرامی

پنجاب کے قصبہ پٹیالہ میں شاہ عبداللطیف زہد و تقویٰ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی چالیس دن یوں گزر جاتے کہ پل بھر بھی پلک نہ جھپکاتے۔ ذکر و فکر میں سب کچھ بھلا دیتے یہاں تک کہ آرام و سکون بھی۔ نفس زیادہ تنگ کرتا اور کھانے کو مانگتا تو کریلے کو جوش دے کر کھانے لگتے اور طنزاً فرماتے۔ ”لے کھا، اور مانگ کھانا۔“

شاہ عبداللطیف نے عالمِ رویا میں سنا، کوئی کہہ رہا ہے ”تیرے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے اس کا نام علی رکھنا۔“

لیکن اس دوران شاہ عبداللطیف کے بھائی نے خواب میں دیکھا۔۔۔ ”تم اپنے بھتیجے کا نام عبداللہ رکھنا۔“

چنانچہ اسی سال 1158 ہجری میں شاہ عبداللطیف کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ نے بپاسِ ادب لڑکے کا نام غلام علی رکھ دیا لیکن چچا نے عبداللہ نام رکھ دیا۔ آگے چل کر یہ بچہ شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی کہلایا۔

ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، کے مصداق، انہیں جو کچھ بتایا یا سکھایا جاتا یہ اس میں غیر معمولی ثابت ہوتے۔ باپ کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ان کے نقشِ قدم پر چلے لیکن اس وقت تک انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر بہتوں کو اپنے نقشِ قدم پر چلائے گا۔

جوان ہوتے ہوتے شاہ غلام علی کہلائے جانے لگے۔ باپ کو فکر تھی کہ بیٹا کسی کے حلقۂ ارادت اور بیعت میں داخل ہو جائے۔ ان کے اپنے پیر دہلی میں قیام فرما تھے اور ان کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ خواجہ خضر علیہ السلام کے صحبت دار ہیں۔ باپ نے دہلی سے بیٹے کو خط لکھا۔ ”بیٹے! تم دہلی آجاؤ تاکہ تمہیں میرے پیر سے بیعت ہو جانے کا شرف حاصل ہو جائے۔“

بیٹے کو کیا انکار تھا، جس حال میں تھے اسی میں چل کھڑے ہوئے اور سیدھے اپنے باپ کے پاس پہنچے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ باپ اپنے حجرے میں حزن و ملال کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ بیٹا کس وقت حجرے میں داخل ہوا انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ یہ جا کر چپ چاپ باپ کے پاس کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر انہیں محویت سے دیکھتے رہے۔ آخر جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ والد صاحب یوں متوجہ نہیں ہوں گے تو نہایت ادب سے باپ کو مخاطب کیا۔ ”پدر بزرگوار! آپ کا تابعدار غلام علی حاضر ہے اس کا سلام قبول فرمائیں۔“

باپ نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ”بیٹے غلام علی! تو آ گیا؟ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔“

غلام علی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آج میں آپ کو افسردہ اور اداس دیکھ رہا ہوں، خیریت تو ہے؟ اس مایوسی کا سبب؟ افسردگی کی وجہ اور اس کا باعث؟“

باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غلام علی نے جھلملاتے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے، بے چینی سے پوچھا۔ ”باوا جان! آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟“

باپ نے پوچھا۔ ”تو یہاں میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”آپ کے پیر و مرشد سے بیعت ہونے۔“

باپ نے پوچھا۔ ”میرا پیر و مرشد کہاں ہے، اس سے ملاقات کہاں ہوگی؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں ہیں۔ آپ نے مجھے طلب فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔“

باپ نے کہا۔ ”بیٹے غلام علی! یہ میری بدقسمتی کہ میرے پیر کا آج سہ پہر وصال ہو گیا۔ اب تجھے کسی اور پیر کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میرا پیر تو چلا گیا۔ اب وہ تمہیں بھی نہیں مل سکتا۔“

بیٹے نے باپ کے غم میں اس کا ساتھ دیا اور مغموم ہو کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”باوا جان! میری بابت کیا حکم ہے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! چند یوم صبر کر، خاموش رہ، میں سوچ کر تیری بات کا جواب دوں گا۔“

بیٹا خاموش ہو گیا اور باپ کی طبیعت کے ٹھہرنے کا انتظار کرنے لگا۔

جس حجرے میں یہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کئی دن تک خاموشی طاری رہی۔ باپ نے بولنا بند کر رکھا تھا اور بیٹا باپ کے احترام میں خاموش تھا۔ نوجوان شاہ غلام علی نے محسوس کیا کہ باپ پر اپنے پیر و مرشد کے وصال نے اتنا شدید اثر کیا ہے کہ ان کی صحت تباہ ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے کھانے پینے تک پر اثر پڑ رہا ہے۔ عالم یہ تھا کہ دونوں ہفتوں خاموش رہے۔

باپ بھی بیٹے کی فرمانبرداری سے بہت متاثر ہوا۔ آخر ایک دن شاہ عبداللطیف نے اپنے بیٹے سے دریافت کیا۔

”بیٹے غلام علی! کیا بات ہے، میں چپ ہوا تو تو نے بھی سکوت اختیار کر لیا، کیوں؟“

غلام علی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! یہ میری مجال کہ میں اس حالتِ دل گرفتگی میں آپ کو چھیڑوں۔“

باپ نے اپنے بیٹے کو بغور دیکھ کر سوال کیا۔ ”کیا تو نے اپنے پیر کا انتخاب کر لیا؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں، کیونکہ میں آپ کے مشورے اور مرضی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیونکر کر سکتا ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے لیکن مسئلہ بہت نازک ہے۔ میں نے جس ذات کو... سمجھ رکھا تھا اور جس کے کمالاتِ ظاہری اور باطنی کو میں نے سمجھ رکھا تھا اسی کے بارے میں، میں تائید کر سکتا تھا، لیکن اب وہ ہم میں جسمانی طور پر موجود نہیں رہے تو میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ تو خود ہمت کر اور اپنے لیے پیر و مرشد کا انتخاب تو خود ہی کر لے۔ اس حجرے سے نکل اور گھوم پھر کر اسے تلاش کر۔“

شاہ غلام علی نے عرض کیا۔ ”باوا جان! آپ تو مجھ کو تنہا چھوڑے دے رہے ہیں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں تجھے تنہا نہیں چھوڑ رہا ہوں، بلکہ تجھ کو اس لائق کر رہا ہوں کہ دوسروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے۔ اپنے فیصلے خود کرنے کے لائق کیے دے رہا ہوں۔“

شاہ غلام علی نے پوچھا۔ ”آپ کا ارشاد بجا لیکن میں اپنے پیر کو کہاں تلاش کروں؟“
باپ نے جواب دیا۔ ”اسی دہلی میں یہاں اور بھی باکمال شخصیتیں موجود ہیں۔ ان سے ایک زمانہ واقف ہے اور پورے ملک کے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ انہی میں تیری مراد بھی موجود ہوگی۔ اس حجرے سے نکل اور اس کو تلاش کرلے۔“
شاہ غلام علی خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ اتنا بڑا کام کریں، باپ کے اصرار پر انہوں نے حجرہ چھوڑ دیا اور دہلی کے نامور بزرگوں سے ملاقاتیں شروع کردیں۔ وہ ان کی صحبتوں میں جاتے اور اٹھتے بیٹھتے رہے لیکن ان میں بھی ان کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔
آخر ایک دن وہ حضرت مظہر جانِ جاناں کی خدمت میں بھی پہنچ گئے۔ یہاں کا حال ہی کچھ اور تھا۔ خانقاہ میں عسرت اور ضروریاتِ دنیا کی کمی کا یہ حال تھا کہ مرزا مظہر جانِ جاناں کے کپڑے تک اس کی چغلی کھاتے تھے۔ شیخ غلام علی ان کی صحبت میں پہنچے تو ان کے سامنے امرا اور غربا کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھا، سخت سردیوں کے دن تھے لیکن مرزا مظہر جانِ جاناں کے پاس اس سردی سے بچاؤ کے لیے صحیح کپڑے تک نہ تھے۔ غلام علی پر یہ باتیں بڑی شدت سے اثر انداز ہو رہی تھیں۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اس نوجوان کو اپنی صحبت میں دیکھتے تو متبسم ہو کر فرماتے۔ ”تجھے یہاں کیا ملے گا؟ کوئی اور در دیکھ۔“
غلام علی فرماتے۔ ”مجھے یہاں سے جو کچھ مل رہا ہے اسی نے مجھے آپ کی صحبت میں بٹھا رکھا ہے۔“
مرزا نے جواب دیا۔ ”تیری مرضی۔“
غلام علی نے کچھ عرصہ سکوت اختیار کیے رکھا۔ وہ اپنے ہونے والے پیر و مرشد کے اعمال و اشغال کا نہایت گہری نظروں سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ غلام علی نے ایک دن بادشاہ کے وزیر قمرالدین کو آپ کی صحبت میں بیٹھے دیکھا۔ وہ نہایت ادب سے بادشاہ کا پیغام آپ کے گوش گزار کر رہا تھا۔ ”پیر و مرشد! بادشاہ نے عرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ملک عطا فرمایا ہے۔ آپ جس قدر چاہیں بطور ہدیہ قبول فرمائیں۔ وہ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔“
مرزا جانِ جاناں نے جواب دیا۔ ”اللہ تعالیٰ نے متاعِ دنیا کو قلیل فرمایا ہے اور یہ دنیا سات اقلیموں پر مشتمل ہے۔ تیرے بادشاہ کے پاس سات میں سے ایک اقلیم ہے جملہ اقالیم کا ساتواں حصہ۔ اب تو ہی بتا میں اس میں سے کیا قبول کروں۔“
وزیر شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ غلام علی اس قناعت پر اش، اش کر اٹھے۔
سخت سردی پڑ رہی تھی۔ مرزا جانِ جاناں ایک پرانی چادر میں اپنے ارادت مندوں میں تشریف فرما تھے۔ ان میں اس دور کی مشہورِ زمانہ شخصیت نواب خان فیروز جنگ بھی شامل تھے۔ نواب صاحب کو یہ بات معلوم تھی کہ مرزا جانِ جاناں اس چادر کے عوض نئی چادر نہیں قبول کریں گے۔ اپنی بے بسی پر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنے ایک مصاحب سے کہا۔ ”افسوس کہ یہ ہماری بدبختی اور بدقسمتی کی انتہا ہے کہ پیر و مرشد ہمارا ہدیہ قبول نہیں کرتے۔“
مصاحب نے مرزا جانِ جاناں سے عرض کیا۔ ”حضور! ہم مجبوروں پر رحم فرمائیں اور خدمت کا موقع دیں۔“
مرزا جانِ جاناں نے فرمایا۔ ”فقیر نے روزہ رکھا ہوا ہے یہ روزہ کہ میں امیروں کی نیاز نہیں قبول کروں گا۔ اب جب کہ آفتاب غروب ہونے والا ہے اگر میں اپنا روزہ توڑ دوں گا تو مجھے اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے دس لاکھ درکار ہوں گے تاکہ غریبوں کی دیگ گرم ہوجائے۔“
نواب نے ایک دوسرے موقع پر تیس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ ”آپ اس سے غریبوں کی دیگ گرم کردیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”نواب! میں تیرا خانساماں نہیں ہوں یہ کام تو خود بھی کرسکتا ہے۔“
غلام علی ہی کی موجودگی میں ایک افغان سردار نے آپ کی خدمت میں تین سو اشرفیاں پیش کیں اور درخواست کی کہ انہیں قبول فرمائیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”کیا تو نے نواب خان فیروز جنگ کی پیش کش کا حشر نہیں دیکھا؟“
افغان سردار نے کہا۔ ”دیکھا ہے مگر پیر و مرشد ہدیہ کی قبولیابی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے اگرچہ ہدیہ کو رد کردینے سے منع کیا گیا ہے لیکن اس کے قبول کرنے کو واجب بھی نہیں بتایا گیا۔ اگر مجھ کو معلوم ہوجائے کہ پیش کیا جانے والا مال حلال کمائی کا ہے تو میں قبول بھی کرلوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ امیروں کا مال اکثر مشتبہ ہوتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کے حقوق ضرور ہوتے ہیں اور اس حال میں قیامت کے دن اس کا حساب دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔ اس لیے میں نے اس در ہی کو بند کردیا ہے۔“
غلام علی ابھی تک ان کے حلقۂ بیعت میں داخل نہیں ہوئے تھے لیکن انہیں صاف صاف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہو چکا ہے اور ان واقعات کی شکل میں انہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اصل درویشی کیا ہے اور لباسِ فقیری پہن لینے کے بعد کتنی ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔
مرزا جانِ جاناں نے غلام علی کو متفکر دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے غلام علی! تو فکر مند نظر آتا ہے؟“

غلام علی نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد آپ کے اعمال اور اشغال سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ درویشی کتنی مشکل ہے، مجھ پر تو ایک دہشت سی طاری ہو گئی ہے۔''

مرزا جانِ جاناں نے فرمایا۔ ''میں نے ایک بات جو کہی ہے تو اس پر غور کر۔ امراء کا مال مشتبہ ہوتا ہے کیا تو اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے؟''

غلام علی نے عرض کیا۔ ''جی پیر و مرشد! میں اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ توجہ فرمائیں گے تو نوازش ہو گی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''چند دن انتظار کر، تو اس کا بھی مشاہدہ کر لے گا۔''

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ غلام علی اس کے منتظر رہے کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔

آموں کی فصل تھی۔ ایک امیر آپ کی خدمت میں آموں کے کئی ٹوکرے لے کر آیا اور عاجزانہ عرض کیا۔ ''حضرت! آج میں نہیں مانوں گا آپ کو میرا یہ ہدیہ قبول کرنا ہی پڑے گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں آموں کا یہ ہدیہ نہیں قبول کروں گا کیونکہ یہ میرے مسلک کے خلاف ہے۔ آموں کے ٹوکرے واپس لے جا۔''

امیر نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرا دل نہ توڑیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے جو بات کہہ دی، کہہ دی۔ میں تیرے آموں کا ہدیہ نہیں قبول کر سکتا۔''

امیر آموں کے ٹوکرے لے کر واپس چلا گیا۔ آپ نے غلام علی سے فرمایا۔ ''میں اس مشتبہ مال کو کس طرح قبول کر لیتا۔''

ابھی اس امیر کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ ''پیر و مرشد! میں نے روزی کے لیے ایک باغ لے رکھا ہے اسی پر میری اور میرے کنبے کی گزر بسر ہے۔ اس سال میرے باغ میں آموں کی فصل بہت اچھی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں اچھی کمائی کر لوں گا۔''

یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''ہاں ہاں کہو کہو، میں سن رہا ہوں۔''

اس نے عرض کیا۔ ''بادشاہ کے امیر ذوالفقار خان نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ وہ آپ کے پاس بھی آتا رہتا ہے اس سال اس نے میری آم کی فصل کو بہت نقصان پہنچایا۔ آج ہی اس نے میرے باغ کے آموں سے کئی ٹوکرے بھر لیے اور اس کا ایک پیسا بھی نہیں دیا۔ آپ ہی بتایئے، میں کیا کروں؟ آپ خدا کے لیے اس کو سمجھایئے کہ وہ مجھ کو برباد نہ کرے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس کو سمجھاؤں گا لیکن مجھ کو یقین نہیں کہ میری نصیحت اس پر اثر کر جائے۔ ابھی تیری آمد سے پہلے وہ تیرے باغ کے آموں کے ٹوکرے میرے پاس لے کر آیا تھا لیکن میں نے انہیں نہیں قبول کیا۔ میں نے آموں کے ٹوکرے واپس کر دیے۔ میں پہلے ہی یہ سمجھتا رہا ہوں کہ امرا کا مال مشتبہ ہوتا ہے چنانچہ آج اس کی صداقت ظاہر ہو گئی۔''

غلام علی جملہ مراحل طے کر چکے تھے چنانچہ انہوں نے مرزا جانِ جاناں سے درخواست کی۔ ''حضرت! اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی خدمت میں مرید ہونے آیا ہوں۔ مجھے اپنے حلقہ بیعت میں داخل فرمالیں۔''

مرزا نے جواب دیا۔ ''غلام علی! اتنی جلدی نہ کر، یہاں اور بھی بزرگ ہیں۔ انہیں بھی دیکھ لے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہاں سنگ بے نمک لیسیدن کا مضمون ہے۔ کیا مزہ آئے گا۔''

غلام علی نے عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! مجھے یہی پسند ہے۔ میرا یہ فیصلہ انتہائی غور و فکر اور تجربوں اور مشاہدوں کا رہینِ منت ہے۔''

مرزا جانِ جاناں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو بسم اللہ!''

شاہ غلام علی کو مرید کر لیا گیا۔ مرزا جانِ جاناں نے آپ پر خصوصی توجہ دی اور آپ نے پورے پندرہ سال آپ کی صحبت میں گزار دیے۔ اس کے بعد مرزا جانِ جاناں نے انہیں اجازت دے دی۔ ''اب تم اپنے طور پر کوشش کرو اور لوگوں کو مرید کرو تم نے یہاں جو کچھ دیکھا ہے اور درویشی میں جو پابندیاں اور شرائط ملحوظ رکھی گئی ہیں ان پر تم بھی سختی سے کاربند رہنا اور اپنے مریدوں کو اس کی تلقین کرتے رہنا۔''

شاہ غلام علی کو اپنے پیر و مرشد کی جدائی گراں ضرور گزر رہی تھی لیکن اس کی تعمیل بھی اتنی ہی ضروری تھی چنانچہ انہوں نے مرزا جاناں سے جدا ہونے کے بعد توکل کو اپنا شعار بنا لیا۔ پرانے بوریے کا ایک بستر اور تکیے کی جگہ ایک اینٹ کا انتخاب کیا! اس حال میں انہیں سب سے زیادہ دشواری معاش کی پیش آئی۔ کئی کئی وقت کا فاقہ ہو جاتا۔ نفس اکساتا کہ ''اس آزمائش میں تو اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔ اس لیے اپنے حجرے سے نکل اور دنیا کی فکر کر۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو اپنے پیر و مرشد مرزا جانِ جاناں کا..... خیال آ گیا جہاں سرتا پا قناعت تھی، توکل تھا، اللہ پر بھروسا تھا۔ آپ نے اپنے نفس کو جھڑک دیا کہ ''اے نفس! میں نے درویشی کا جو لباس پہن لیا ہے تو اب اس کو نہیں اتار سکتا۔''

اس عہد کے بعد مشکلات میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا اور فقر و فاقہ نے کمزوری اس حد تک بڑھا دی کہ آنکھوں کے آگے تتلیاں ناچنے

لگیں۔ بیٹھے بیٹھے غشی طاری ہونے لگتی لیکن اس حال میں بھی انہیں ذکر و فکر کا پورا پورا ہوش تھا۔ غشی طاری ہوتی تو زبان پر اللہ ہوتا۔ ہوش میں آتے تو زبان سے اللہ نکلتا۔ آخر آپ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ ان کا آخری وقت ہے اور وہ اسی حال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں گے۔ انہوں نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور خود سے خطاب کیا۔ "غلام علی! اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ موت کا خوف تجھے حجرے سے نکال سکتا ہے اور تو دنیا کی طلب میں مارا مارا پھرنے پر مجبور ہو جائے گا تو یہ تیری خام خیالی ہے۔ اگر تیرا وقت آچکا ہے اور تیری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں تو یہ سمجھ لے کہ یہ حجرہ، جو ابھی تک تیرا مسکن رہا ہے اب تیرا مدفن بن جائے گا۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے حجرے کو اندر سے بند کر لیا۔ غشی نے غلبہ پا لیا اور وہ حواسِ خمسہ سے دور ہو گئے۔ معلوم نہیں یہ غشی کب تک طاری رہی لیکن جب انہیں ہوش آیا تو بند حجرے میں کسی کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔ "غلام علی! تو آزمائش میں پورا اترا۔ اٹھ اور اپنی روزی مجھ سے لے۔"

انہوں نے دیکھا ان کے پاس ہی کھانا پانی رکھا تھا۔ انہیں شک گزرا کہ یہ وسوسۂ شیطانی تو نہیں۔ انہیں کھانے پینے میں تامل ہوا تو اس شخص نے کہا۔ "غلام علی! وسوسوں میں نہ پڑ۔ یہ تیرے رب نے بھیجا ہے اس کے انعام کو شک و شبے سے آلودہ نہ کر۔ کفرانِ نعمت سے بچ۔"

غلام علی نے کھایا پیا اور خدا کا شکر ادا کیا، پوچھا۔ "اے شخص! تو کون ہے اور تو اس بند حجرے میں کس طرح داخل ہوا؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ سارے فضول سوال ہیں، کوئی اور بات کر۔"

غلام علی نے مزید کہا۔ "یہ رزق وقتی ہے یا دائمی؟ وقتی سے میری یہ مراد ہے کہ اس ایک وقت کے لیے اور دائمی سے میری مراد یہ ہے کہ تا حیات، جب تک زندہ ہوں۔ زندگی بھر کے لیے۔"

اس نے جواب دیا۔ "زندگی بھر کے لیے، جب تک زندہ ہو۔"

غلام علی نے پھر سوال کیا۔ "تم اس بند حجرے میں کس طرح داخل ہوئے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جو خدا اپنی مخلوق کو پتھروں میں غذا پہنچا سکتا ہے، کیا وہ اس بند حجرے میں نہیں پہنچا سکتا۔ غلام علی خدا...... کی قدرت اور رسائی کو محدود اور متناہی نہ سمجھو۔"

غلام علی شرمندہ ہو گئے، کہا۔ "اے شخص! میں شرمندہ ہوں، واقعی مجھ کو اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ اندازِ فکر تو شیطانی ہے اور میں شیطان مردود پر لعنتیں بھیجتا ہوں۔"

انہوں نے خجل ہو کر اپنی گردن جھکالی۔ کچھ دیر بعد سر جو اٹھایا تو اس شخص کا کہیں پتا نہ تھا۔ حجرہ بدستور اندر سے بند تھا آپ اٹھے اور حجرے کا در کھول کر باہر نکل گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ اس کے بعد پھر حجرے میں واپس آ گئے۔ شام کو انہیں پھر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ "دیکھیے کھانے پینے میں اور کچھ ملتا ہے یا نہیں!"

رات کو جب وہ مراقبے میں تھے اور انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا، جب سر اوپر اٹھایا اور وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اس شخص کو ایک بار پھر حجرے میں موجود دیکھا۔ وہ کھانا پانی لیے سامنے کھڑا تھا۔ غلام علی نے حیرت سے پوچھا۔ "ارے یہ تم! یہ تم کہاں تھے اور کہاں سے آ گئے بھئی کمال ہی کر دیا تم نے۔ جب چاہتے ہو بند حجرے میں داخل ہو جاتے ہو اور جب نہیں چاہتے تو تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچا جا سکتا ہے۔"

انہوں نے رات کا کھانا بھی ابھی نہیں کھایا تھا جب یہ سامانِ خورد و نوش ان کے پاس پہنچا تو انہیں کھانے پینے سے کون روک سکتا تھا۔ آپ نے برائے نام کھانا کھایا اور پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد انہیں زندگی بھر معاش کی فکر نہیں کرنا پڑی۔

اب غلام علی کے پاس بھی لوگ آنے لگے تھے اور ان آنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا وطن برصغیر نہیں تھا۔ ایران، شام، عراق، ہر جگہ کا طالبِ حق آپ کے پاس آنے لگا اور آپ ان کو مطمئن کر کے اپنے پاس سے جانے دیتے۔

آپ کے پاس جو بھی آتا، آپ خدا سے فرماتے۔ "یا اللہ! میرے گھر میں جو بھی آتا ہے میں اس کو وسیلہ نہیں بنانا چاہتا۔ اس کے لیے تو مجھ پر رحم فرما۔ میں آنے والے کے واسطے سے تیرے قرب کا طالب ہوں۔"

آپ ہر روز دس پارے ختم کرتے تھے۔ سوتے بہت کم تھے۔ رات کو تہجد پابندی سے پڑھتے تھے۔ اپنے ارادت مندوں کو بڑی مستعدی سے خدا کی طرف رجوع کرتے۔ اگر کوئی صرف ملنے آتا تو آپ اس کو بہت کم وقت دیتے تھے۔ جب وہ زیادہ دیر تک باتیں کرنے کی خواہش کرتا تو آپ فرماتے۔ "بابا فقیر کو اپنی قبر کی فکر ہے اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

آپ کی صحبت میں جو لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان میں مشہورِ زمانہ بزرگوں کی اولاد بھی شامل تھی۔ خواجہ باقی باللہ کے نواسے نواب امیر خان بھی شامل تھے۔ وہ آتے تو گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ شاہ غلام علی ان کے نانا کے ادب و لحاظ میں اپنی زبان بند رکھتے۔

ایک دن نواب امیر خان اس طرح چپک کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ "زندگی مختصر ہے اور بندگی لازم، اس کے لیے یک سوئی اور خلوت درکار ہے لیکن دوسروں کو اس کا کوئی خیال نہیں۔"

نواب امیر خان آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھے اور بدستور بیٹھے رہے۔ آخر آپ نے خادم سے کہا۔ "ذرا اندر سے مکان کے قبالہ جات تو لانا۔"

خادم نے حیرت سے پوچھا۔ "پیر و مرشد! یہ اس وقت مکان کے قبالہ جات کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟"

آپ نے نواب امیر خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں اس مکان کے قبالہ جات نواب کی نذر کر دینا چاہتا ہوں، کیونکہ اگر یہ نہیں اٹھتے تو نہ اٹھیں، میں ہی مکان ان کے حوالے کر کے اٹھ جاؤں گا۔"

نواب امیر خان فوراً اٹھ کر چلے گئے، آپ نے فرمایا۔ "دنیا کی چند روزہ زندگی میں اتنی فرصت کہاں جو کہیں بے کار بیٹھ کر ضائع کر دی جائے۔"

آپ کے پڑوس میں حکیم قدرت اللہ خان کا گھر تھا۔ اس کو آپ سے چڑ تھی اور آپ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ کے مریدوں کو یہ بات گراں گزرتی تھی۔ وہ آپ سے اجازت چاہتے۔ "حکم دیجیے ہم حکیم کو صحیح کر دیں گے۔"

آپ فرماتے۔ "بندہ بندے کو کیا ٹھیک کرے گا۔ یہ کام خدا کا ہے وہی بندے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ وقت کا انتظار کرو، اللہ نے چاہا تو یہ جیسا ہے ویسا نہیں رہے گا۔"

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکیم قدرت اللہ خان کی کسی بات پر بادشاہ ناراض ہو گیا اور اس نے حکیم صاحب کو قید میں ڈال دیا۔ یہ خبر عام ہوئی تو آپ کے مریدوں کو بڑی خوشی ہوئی، کہا۔ "پیر و مرشد! حکیم ملعون اپنی سزا کو پہنچا۔ اس کی بدباطنی اس کو قید خانے تک لے گئی۔"

آپ نے مریدوں کو اس خوشی پر لعن طعن کی اور فرمایا۔ "اللہ کا ایک بندہ مصیبت میں گرفتار ہوا تو اس پر خوش ہونے کا یہ کون سا پہلو ہے۔ خدا سے توبہ استغفار کرو تاکہ وہ اس سے دوسروں کو محفوظ رکھے۔"

ایک مرید نے کہا۔ "پیر و مرشد، یہ وہی شخص ہے جو اٹھتے بیٹھتے آپ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آپ اس بدخو سے ہمدردی فرما رہے ہیں آخر یہ کیوں؟ ایسا کیوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "حکیم قدرت اللہ خان مسلمان ہے اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی مصیبت پر کس طرح خوش ہو سکتا ہے۔ میں بہت جلد بادشاہ سے ملنے اور حکیم صاحب کو رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔"

مریدوں کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔ اب ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

آپ دوسرے دن بادشاہ کے پاس پہنچ گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ وہ آپ سے بہت متاثر تھا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ شاہ غلام علی اس سے ملنے آئے ہیں تو بے اختیار استقبال کو دوڑا اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ آپ نے اندر جانے میں تامل سے کام لیا۔ فرمایا۔ "بادشاہ! میں ایک شرط پر تیرے ساتھ اندر چل سکتا ہوں۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "سیدی و مولائی! آپ شرط کی کیا بات کرتے ہیں، اس ناچیز کو حکم دیجیے ان شاء اللہ اس کی تعمیل ہوگی۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو نے حکیم قدرت اللہ خان کو قید میں کیوں ڈال دیا ہے؟"

بادشاہ سناٹے میں آ گیا۔ فوری طور پر اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، بالآخر کہا۔ "حضور! یہ نہ دریافت فرمائیں کہ میں نے حکیم قدرت اللہ خان کو قید کیوں کر دیا ہے، کیونکہ اس کے جان لینے سے حضور کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ آپ تو مجھ کو حکم دیجیے کہ اے بادشاہ تو یہ کر۔ بخدا مجھ میں اتنی ہمت ہے نہ اتنی مجال کہ میں آپ کے حکم کے خلاف کچھ کروں۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں تیرے ساتھ محل کے اندر چل رہا ہوں لیکن تو بھی اسی وقت اور اسی لمحے حکیم قدرت اللہ خان کو رہا کر دے کیونکہ میں اسی غرض سے تیرے پاس آیا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "شاہ صاحب! یہ عجیب سی بات ہے کہ حکیم قدرت اللہ خان نے آپ کی ہمیشہ ہی مخالفت کی ہے لیکن آپ ہیں کہ اس کی رہائی کے درپے ہیں، اس کی آزادی کے خواہشمند ہیں حالانکہ یہ بہترین موقع تھا کہ آپ اس کو سزا دلوا دیتے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بادشاہ! میں نے اس سلسلے میں تجھ سے مشورہ نہیں طلب کیا۔ اگر تو میری بات رکھنا چاہتا ہے تو میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کر، ورنہ جو تیرے جی میں آئے کر تا رہ۔"

بادشاہ آپ کو محل میں لے گیا اور کچھ دیر آپ کی باتیں سنتا رہا۔ آپ کو یہاں بھی حکیم قدرت اللہ خان کا خیال ستاتا رہا۔ آپ بار بار بادشاہ سے حکیم ہی کا ذکر کرتے۔ بادشاہ نے کہا۔ "اے کاش اتنی ہی فکر کسی بادشاہ کو اپنی رعایا کی اور آقا کو اپنے نوکروں کی، مالک کو اپنے غلاموں کی، زبردستوں کو زیردستوں کی ہوتی تو اس دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔"

بادشاہ کے پاس سے جب گھر واپس آئے تو اپنے در پر حکیم قدرت اللہ خان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی اٹھا اور نہایت ادب سے

سر جھکا کر بولا۔ ”حضرت! خدا گواہ ہے کہ آپ کی عظمت اور بڑائی کا اتنا شاندار تجربہ اور نا قابلِ تردید شعور آج سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”شکر اپنے رب کا ادا کر، جس نے میری بات رکھ لی اور تجھ کو بادشاہ کی قید سے رہائی دلائی ورنہ اگر بادشاہ میری نہ سنتا تو، تو اس وقت بھی اس کی قید میں ہوتا۔“

حکیم کو رونا آ گیا، اس کی آواز بھرا گئی، بولا۔ ”حضرت! میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی غیبت کی اور اپنی نجی محفلوں میں آپ کی برائیاں کرتا رہا لیکن آپ نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور مجھ پر یہ احسان کیا کہ بادشاہ کی قید سے رہائی دلائی۔“

ایک مرید نے بادشاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ”شاہ عالم اپنے مصاحبوں اور خوشامدیوں میں گھرا ظلم کرتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ اس کو عورتوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ ہر وقت عیش و عشرت میں ڈوبا رہتا ہے اور خوشامدی لوگ کسی طرح ان عورتوں ہی کے توسط سے اپنے حریفوں اور مخالفوں کو زک پہنچاتے ہیں۔“

شاہ صاحب کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا، آپ نے غصے میں پوچھا۔ ”کیا تو بادشاہ کو قریب سے جانتا ہے؟ اور یہ ساری باتیں جو تو نے کہیں، کیا تیرے اپنے علم اور مشاہدے کی ہیں؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں بادشاہ کی محفل میں کس طرح جا سکتا ہوں جو اپنے ذاتی تجربے، علم اور مشاہدے کی بات کروں۔ میں نے یہ باتیں دوسروں سے سنی ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”افسوس کہ جو بات تو نہیں جانتا، دوسروں کی سنی سنائی کو اس طرح بیان کر رہا ہے گویا تو اس کا عینی شاہد ہے۔ تو نے بادشاہ کی غیبت کی اور گناہ کا مرتکب ہوا۔“ پھر بڑے دکھ سے کہا۔ ”میں روزے سے تھا لیکن تیری غیبت سے میرا روزہ جاتا رہا۔“

ایک دوسرے مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! غیبت تو اس نے کی ہے، پھر آپ کا روزہ کیوں جاتا رہا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے غیبت نہیں کی لیکن سنی تو ہے۔ غیبت میں ذاکر اور سامع برابر ہیں۔“

☆☆☆

اپنے پیر و مرشد کی طرح آپ بھی امرا کی نذر نیاز سے ہمیشہ گریز اور پرہیز کرتے۔ بادشاہ نے کئی بار کوشش کی کہ آپ اپنی خانقاہ کے لیے کچھ لیں لیکن آپ ہر بار انکار کر دیتے۔

نواب امیر خان والیِ ٹونک نے جب بھی حاضری دی، درخواست کی کہ خانقاہ کے خرچ کے لیے کچھ قبول فرما لیں۔ آپ نے ہر بار یہی عذر کیا کہ اس بات کو نہ تو میرے پیر و مرشد نے گوارا کیا اور نہ میں اختیار کر سکتا ہوں۔

نواب امیر خان نے اصرار کیا۔ ”آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”حرج ہے تبھی تو میں انکار کر رہا ہوں۔“

نواب برا مان گیا، بولا۔ ”اس طرح تو آپ زحمتوں میں گھرے رہیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں بھی جاگیر رکھتا ہوں نواب، اور میری جاگیر ہیں مواعیدِ الٰہی۔ میں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں چار چیزیں بہت ضروری ہیں۔ دست شکستہ، پا شکستہ، دین درست، یقین درست۔“

آپ اپنے مریدوں میں آتشِ دوزخ کا ذکر کرتے تو خوف سے چہرے کا رنگ ہی بدل جاتا، فرماتے۔ ”میں دوزخ کی آگ سے بہت گھبراتا ہوں۔ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔“

مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ جیسا حدیث نبوی ﷺ اور سنتِ رسول ﷺ کا پیرو بھی اگر آتشِ دوزخ سے ڈرے گا تو ہم جیسے گناہ گاروں کا کیا حال ہونا چاہیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں ڈرتا رہتا ہوں کہ نادانستگی میں کہیں کوئی ایسا گناہ نہ سرزد ہو جائے جس کی سزا جہنم ہو۔“

مریدوں نے عرض کیا۔ ”کیا نادانستہ گناہوں کی بھی سزا ملے گی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”لیکن نادانستہ گناہ بھی کیوں ہوں؟“

ایک دن آپ خواب سے بیدار ہوئے تو آپ کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی، فرمایا۔ ”آج میں بے حد خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ آج سے پہلے اتنا خوش کبھی نہیں ہوا۔“

مرید حیرت و استفسار سے آپ کی صورت دیکھتے رہے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پوچھتا یہ کیوں؟ اس خوشی کا سبب؟

آپ نے خود ہی ارشاد فرمایا۔ ”ابھی ابھی میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔ ”غلام علی! جو شخص ہم سے محبت رکھتا ہے اس

پر آتش دوزخ حرام ہوجاتی ہے۔" پھر مزید کہا اور رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا۔ "تجھ کو لوگ غلام علی کہتے ہیں جبکہ تو عبداللہ اور عبدالمبین ہے۔"

آپ کے تصرفات کا چرچا دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ اس سے نہ صرف وہ لوگ جو آپ کے پاس ہوتے، فائدہ اٹھاتے بلکہ وہ بھی فیض یاب ہوتے جو آپ سے دور ہوتے مگر دل سے قریب ہوتے۔ میاں احمد یار خان نامی ایک تاجر کا بھی انہی میں شمار ہوتا تھا۔ جن پر آپ کی نوازشیں تھیں اور جنہیں آپ کے روحانی تصرفات سے فیض حاصل ہوتا تھا۔ میاں احمد یار خان اپنی تجارت کے سلسلے میں دور دور تک جایا کرتا تھا اس کا سامان تجارت تو مویشیوں پر بار ہوتا اور خود بہلی میں سفر کرتا لیکن سفر پر جانے سے پہلے وہ آپ کی خدمت میں حاضری ضرور دیتا۔

ایک دن احمد یار خان نے ظہر کی نماز آپ کے ساتھ پڑھی اور اس کے بعد آپ سے عرض کیا۔ "حضرت! میں اپنی تجارت کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں، دعا فرمائیں خدا کامیابی سے ہمکنار کرے۔"

آپ نے دریافت کیا۔ "کیا تو سامانِ تجارت لے کر جا رہا ہے؟"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "جی پیر و مرشد لیکن بہت کم۔ مگر واپسی میں بہت کچھ لانے کا ارادہ ہے۔"

آپ نے ارشاد فرمایا۔ "میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ تو اپنے ساتھ اتنا ہی سامان تجارت لے جا، جتنا اپنے ساتھ اپنی بہلی میں رکھ سکے۔"

احمد یار خان نے دریافت کیا۔ "حضور کا فرمان سر آنکھوں پر لیکن کیا اس میں بھی کوئی مصلحت ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اللہ کی مصلحت تو ہر کام میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہی ہوگی جو اس نے تجھ کو باخبر کیا کہ میں تجھ کو اس سفر میں زیادہ سامانِ سفر لے جانے سے منع کر دوں۔"

احمد یار خان نے آپ کے ہاتھوں کو فرطِ محبت میں بوسہ دیا اور عرض کیا۔ "آپ نے فرمایا ہے تو اس پر عمل بھی ہوگا۔ آپ خدا کے قریب ہیں۔ خدا آپ کو ہم میں ہمیشہ قائم اور موجود رکھے۔"

احمد یار خان اپنے ساتھ مختصر سا سامانِ تجارت لے کر سفر پر روانہ ہوگیا۔ قافلہ کئی دن سفر کرتا رہا۔ یہ کبھی کسی آبادی سے گزرتا، کبھی کسی جنگل سے کبھی کسی صحرا سے، یہاں تک کہ ایک دن وہ ایک صحرا سے گزر رہا تھا کہ احمد یار خان کو اپنی بہلی کے پاس شاہ غلام علی نظر آئے۔ وہ بہلی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، احمد یار خان نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے پیر و مرشد کو دیکھا پہلے تو اس کو یہ وہم ہوا کہ شاید یہ اس کا حسنِ خیال ہے مگر بار بار غور کرنے سے بھی اس کو شاہ غلام علی ہی نظر آتے رہے، آخر اس سے رہا نہ گیا، پوچھا۔ "حضرت! آپ یہاں کیسے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں ایک بات تیرے گوش گزار کرنے آیا ہوں، اب وقت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہوں اس پر فوراً عمل کر۔"

احمد یار خان نے عرض کیا۔ "آپ مجھ کو حکم دیجیے۔ میں اس کی فوراً تعمیل کروں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اپنی بہلی کو قافلے سے جدا کر لے اور تیزی سے آگے نکل جا، کیونکہ اس قافلے پر قزاقوں کا حملہ ہونے والا ہے۔"

احمد یار خان نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی بہلی کو قافلے سے الگ کر لیا اور تیزی سے کافی دور نکل گیا۔ قافلے والوں نے اس کو الگ ہوتے جو دیکھا تو انہیں گمان گزرا کہ اس تاجر کا شاید دماغ چل گیا ہے جو قافلے سے علیحدگی اختیار کر کے تباہی اور بربادی سے ہمکنار ہونے جا رہا ہے۔ کسی ہمدرد نے احمد یار خان کو روکنے کی کوشش کی اور کہا۔

"بھائی! جماعت میں عظمت ہے۔ قافلے سے الگ ہو جاؤ گے تو کوئی بھی تمہیں لوٹ سکتا ہے۔"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "اجی جناب۔ میرے پیر و مرشد نے ابھی ابھی مجھ کو خبردار کیا ہے کہ اس قافلے سے الگ ہو جا کیونکہ اس پر عنقریب ڈاکا پڑے گا اور قافلہ لٹ جائے گا۔ اس لیے میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔"

اس شخص نے احمد یار خان کے دماغ میں فتور محسوس کیا پوچھا۔ "تیرا پیر و مرشد کون ہے اور وہ کہاں ہے ذرا میں بھی تو اس کو دیکھوں اور پوچھوں کہ اس نے ان ڈاکوؤں کو کہاں دیکھ لیا۔"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "میرے پیر و مرشد دہلی میں ہیں۔"

اس شخص نے سن کر کہا۔ "دہلی میں ہیں! کیا مطلب؟ کیا وہ دہلی سے تیرے پاس آئے تھے یہ بتانے کہ قافلے پر ڈاکا پڑنے والا ہے؟"

احمد یار خان نے جواب دیا۔ "ہاں وہ دہلی سے یہ بتانے آئے تھے۔ تجھ کو میرے بیان پر اتنا تعجب کیوں ہے؟"

اس شخص کا ہنسی کے مارے برا حال ہوگیا۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ بولا۔ "اے شخص! ابھی تک تو مجھ کو تیری صحیح الدماغی پر شبہ تھا لیکن اب تیری باتیں سن کر یقین ہوگیا کہ تیرا دماغ واقعی چل چکا ہے اور اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے، خدا تجھ پر رحم کرے۔"

احمد یار خان نے کہا۔ "اور خدا تجھ پر بھی رحم کرے۔"

احمد یار خان قافلے سے الگ ہوگئے اور اپنی بہلی کو دور نکال لے گئے کئی دن بعد وہ شخص تباہ حال ایک شہر میں احمد یار خان سے ملا اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ ''احمد یار خان!''
''اور تمہارے پیر و مرشد کا؟''
احمد یار خان نے جواب دیا۔ ''شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی۔'' اس شخص نے درخواست کی۔ ''احمد یار خان! میں تمہارے پیر و مرشد سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔''
احمد یار خان نے جواب دیا۔ ''مگر وہ یہاں کہاں، ان کا تو دہلی میں قیام ہے وہیں ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔''
اس شخص نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ دہلی چلوں گا اور تمہارے پیر و مرشد سے ضرور ملوں گا۔''
احمد یار خان نے پوچھا۔ ''میں قافلے سے الگ ہو گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں قافلے پر کیا بیتی؟''
جواب دیا۔ ''جو کچھ تمہارے پیر و مرشد نے کہا تھا، پورا ہوا، قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور انتہائی خوں ریزی اور قتل و غارت گری کے بعد سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ میں نے اپنا مال و اسباب ڈاکوؤں کے قبضے میں چلا جانے دیا اور خود جان بچا کر بھاگ آیا۔''
احمد یار خان نے دل ہی دل میں اپنے پیر و مرشد کا شکر یہ ادا کیا۔ اور جس غرض سے یہ سفر کیا تھا اس میں مشغول ہو گئے۔
آپ کی صحبت میں مختلف عقائد کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ ان میں دہلی کے ایک امیر میاں زلف خان بھی شامل تھے۔ بیعت ہونے سے پہلے یہ دہلی سے باہر تھے اور انہوں نے شاہ غلام علی کا نام سنا تھا۔ ان کے دل میں تحریک ہوئی کہ بیعت ہونے سے پہلے ان سے ملا جائے اور ان میں وہ خصوصیات تلاش کی جائیں، جو ان کے بیعت ہونے پر آمادہ کریں۔
امیر میاں زلف خان اپنے قافلے سے بچھڑ گئے اور ساتھ ہی دہلی کا راستہ بھی بھول گئے۔ وہ بڑی دیر تک ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ کسی سے راستہ پوچھنا اس لیے بے کار تھا کہ آس پاس دور دور تک آبادی کا پتا نہ تھا۔ جدھر بھی جاتے جنگلات ہی جنگلات نظر آتے تھے۔ انہیں خوف سا آنے لگا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی درندہ نکل کر ان کا کام تمام نہ کر دے۔ یا اگر درندہ نہیں تو کوئی قزاق ہی نہ نکل پڑے۔ یہ اکیلے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان پر پریشانی اور خوف نے ایسا غلبہ کیا کہ سفر کرنے کی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ عاجز آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس امید موہوم کے سہارے کہ شاید کسی طرف سے کوئی شخص یا قافلہ نمودار ہو جائے اور یہ اس کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر دیں۔
کافی دیر بعد انہیں ایک شخص اپنی ہی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سیدھا ان کے درخت کی طرف آیا اور انہیں سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ ''امیر زلف خان! کیا بات ہے؟''
امیر میاں زلف خان کو ایسا لگا جیسے وہ اس شخص سے واقف ہیں۔ پوچھا۔ ''جناب میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ ہیں کون اور یہ اکیلے کہاں جا رہے ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''زیادہ سوال جواب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ اپنی راہ لوں۔''
میاں زلف خان گھبرا گئے۔ پوچھا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''دہلی!''
سوال کیا۔ ''کیا اکیلے ہی؟''
جواب دیا۔ ''نہیں خدا بھی میرے ساتھ ہے!''
میاں زلف خان نے پوچھا۔ ''آپ کو تنہا سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ اکیلا کہاں ہوں خدا میرے ساتھ ہے۔''
میاں زلف خان نے سوچا کہ اگر اس شخص سے زیادہ سوال جواب کیے گئے اور یہ ناراض ہو کر چلا گیا تو وہ ایک بار پھر اکیلے ہی رہ جائیں گے چنانچہ انہوں نے کہا۔ ''جناب والا! میں دہلی جا رہا تھا کہ قافلے سے بچھڑ گیا۔ تنہا چلا مگر دہلی کا راستہ بھول گیا۔ یہاں میں کسی راہبر کی تلاش میں بیٹھا تھا کہ آپ آ گئے اور یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ آپ بھی دہلی ہی جا رہے ہیں۔ اب میں آپ ہی کے ساتھ دہلی چلا چلوں گا۔''
ان صاحب نے جواب دیا۔ ''تو پھر دیر نہ کر میرے ساتھ چل۔ راستہ میں فی الحال کہیں رکنے یا پڑاؤ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''
میاں زلف خان اسی وقت اس شخص کے ساتھ چل پڑے۔ وہ دونوں ایک ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہونے سے پہلے ہی یہ دونوں ایک بستی میں داخل ہو گئے یہاں انہوں نے شب بھر کے لیے ایک مسجد میں قیام کیا۔ رات کو غسل کیا یہ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن کچھ دیر بعد ہی اس شخص نے کہا۔ ''امیر زلف خان! اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں اس لیے باتوں کا سلسلہ سرِدست موقوف دہلی پہنچ کر باتیں کر لوں گا۔''
امیر میاں زلف خان نے پوچھا۔ ''دہلی میں آپ کس جگہ ملیں گے؟''
... نے جواب دیا۔ ''وہیں، جہاں آپ بیعت کریں گے!''

امیر میاں زلف خان کو یہ شخص انتہائی پراسرار اور آسیبی سا لگا۔ اس سے کوئی اور سوال کیے بغیر ہی خاموش ہو گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن وہ پھر آرام کرنے کے بجائے نماز میں مشغول ہو گیا امیر میاں زلف خان کو نیند آ گئی اور اتنی گہری نیند سوئے کہ صبح آنکھ کھلی۔ فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ساتھی کو تلاش کیا لیکن اس کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے انتظار میں اپنا سفر بھی نہیں شروع کر سکے۔ آخر یہ سوچ کر کہ کہاں تک انتظار کریں گے اور دہلی میں تو ان سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ یہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب دہلی زیادہ دور نہیں تھا اور قریب قریب اس کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ آگے چل کر انہیں ایک قافلہ بھی مل گیا جو جنوبی ہند کے طویل سفر سے چلا آ رہا تھا۔ امیر میاں زلف خان اس میں شامل ہو کر دہلی میں داخل ہو گئے۔ وہ اپنے پڑاؤ سے سیدھے شاہ غلام علی کی خانقاہ پہنچے اور شاہ غلام علی کے خادمِ خاص سے کہا۔

"بھائی! میں ایک لمبے سفر سے تمہارے شاہ صاحب کی زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ان سے فوراً ہی ملاقات ہو جائے۔"

خادم نے جواب دیا۔ "پہلے میں شاہ صاحب سے پوچھ لوں، اگر وہ اجازت دے دیں گے تو میں اسی وقت ان سے ملوا دوں گا۔ لیکن اگر انہوں نے ملاقات کے لیے کوئی اور وقت مقرر کر دیا تو میں آپ کو اس سے مطلع کر دوں گا۔"

امیر زلف خان چپ چاپ بیٹھ گئے۔ خادم کچھ دیر بعد اندر سے نمودار ہوا اور خوش خبری لایا کہ شاہ صاحب اسی وقت یاد فرما رہے ہیں۔

امیر میاں زلف خان بے تابانہ حجرے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت شاہ غلام علی دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔ امیر نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ "السلام علیکم یا سیدی و مولائی!"

آپ نے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام امیر زلف خان!"

امیر کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ یہ آواز وہ پہلے بھی کہیں سن چکا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہ غلام علی مڑے اور اپنا چہرہ امیر کی طرف کر دیا۔ امیر خوفزدہ ہو گیا۔ اور اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ یہ تو وہی شخص ہیں جو دورانِ سفر اس کو ملے تھے اور اس کو راہ دکھائی تھی۔ امیر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "حضرت! آپ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ میں۔ کیوں؟ کوئی اور بات؟"

امیر نے کہا۔ "اب میں کیا عرض کروں، مجھ میں تو اب اتنی ہمت ہی نہیں کہ آپ کے روبرو زبان کھولوں۔ میں نے تو اپنی زبان کو تالا لگا دیا۔"

شاہ غلام علی نے فرمایا۔ "تو، تو مرید ہونے آیا ہے۔ اب دیر نہ کر۔"

امیر میاں زلف خان اسی وقت سے بیعت ہو گیا اور اپنے بیعت ہونے کے بعد وہ کچھ دیر وہیں رہا۔ اس کے بعد فرطِ جذبات میں پوچھا۔ "حضرت! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "تیرے لیے یہی حکم ہے کہ سردست تو یہیں اس خانقاہ میں رہ۔" پھر اس کے کئی دن بعد جب امیر میاں زلف خان کو...... یہاں رہنے میں کچھ تامل سا ہونے لگا تو انہوں نے ایک بار پھر رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

شاہ غلام علی نے فرمایا۔ "میں بھی یہاں کسی کو ہمیشہ کے لیے تو نہیں روک سکتا تو اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے جانا چاہتا ہے تو بصد شوق چلا جا لیکن اگر کہیں بھی ضرورت پیش آ جائے تو ضرور یاد کرنا، میں خود چلا آؤں گا۔"

امیر میاں زلف خان نے فرطِ عقیدت میں آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دہلی میں ہی اپنے عزیز کے گھر چلے گئے۔ وہ بہت دنوں تک اس معمے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر وہ شخص کون تھا۔ جو انہیں جنگل میں ملا تھا اور اس نے امیر کی راہبری کی تھی۔ اس کی آواز اور اس کی صورت تک میں شمہ برابر بھی فرق نہیں تھا۔

کبھی کبھی وہ یہ سوچتا کہ شاہ غلام علی اور اس جنگل والے شخص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ہی ایک ہیں۔ اس نے ایک دوبارہ یہ بھی سوچا کہ کیوں نہ اس بات کی شاہ صاحب ہی سے تصدیق کر لی جائے۔

اپنی سوچ کے اس موڑ پر کھڑے ہونے کے بعد وہ لرز گیا۔ اس نے سوچا۔ اس اندیشے کو بس یہیں تک رہنے دیا جائے۔ اس کے آگے جانے میں خطرہ بھی ہے اور تشویش بھی۔

☆☆☆

ایک ہندو لڑکے کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ مسلمانوں کا لباس پہن کر ان کی وضع قطع بنا کر آپ کی محفل میں پہنچ گیا۔ وہاں دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بیان کے درمیان میں اس طرح بیٹھ گیا کہ اس پر آپ کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ آپ حاضرین سے خطاب فرمانے لگے۔

آپ نے فرمایا:

"لوگو! یہ فقیری بڑی دشوار شے ہے۔ وہ کون ہے جو فقیر نہیں بننا چاہتا۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو اس کی دولت حاصل کرنے میں کامیاب

ہوئے ہیں؟"
محفل پر ایک سناٹا طاری تھا۔ آپ فرماتے رہے۔
"فقیر میں چار حرف ہیں۔ ف، ق، ی اور ر۔ جانتے ہو، ان چار حرفوں کا مفہوم کیا ہے۔ یہ چار حرف انتہائی وسیع معانی کے حامل ہیں۔ اگر فقیر بننا ہے تو ان کے معانی اور مطالب کا جاننا ازحد ضروری ہے۔ فقیر کی ف کا مطلب فاقہ۔ ق سے مراد قناعت ہے اور ی سے یادِ الٰہی ہے اور باقی رہا حرف ر، تو یہ ریاضت کے لیے ہے۔"
کسی نے سوال کیا۔ "اگر کوئی شخص اس پر پورا اتر گیا تو؟"
آپ نے جواب دیا۔ "تو اس کا مطلب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ ف سے فضل ربی۔ ق سے قرب الٰہی ی سے یاری اور ر سے رحمت الٰہی لیا جائے۔ جس کو یہ چاروں چیزیں حاصل ہو جائیں پھر اس کو اور کیا درکار ہو گا۔"
کسی مرید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اور شاہ صاحب قبلہ! اگر کوئی شخص فقیر تو بن گیا مگر اس کو وہ چیزیں نہ مل سکیں جس کا ابھی ابھی آپ نے ذکر کیا ہے، تو فقیر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "پھر فقیر کی ف اس کی فضیحت کا باعث بن جائے گی۔ ق، قہر الٰہی کی، ی یاس کی، اور ر رسوائی کی ہو جائے گی۔"
لوگ لرز گئے اور کسی میں اتنی ہمت نہ پیدا ہوئی کہ اس سلسلے میں کوئی اور سوال کر سکتا۔ ہندو نوجوان ان باتوں سے بہت متاثر ہوا آپ نے اچانک حاضرین سے فرمایا۔ "لوگو! تم میں ایک ایسا نوجوان بھی موجود ہے جو مسلمانوں کے لباس میں اس محفل میں آیا ہے مگر اندر سے وہ اس وقت بھی ہندو ہی ہے۔ اس کو میرے پاس لایا جائے۔"
حکم کی دیر تھی کہ لوگوں نے اس نوجوان کو پکڑ کر آپ کے روبرو پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "نوجوان! کیا بات ہے۔ تو یہ چھپ چھپ کر اور مسلمانوں کی نظروں سے بچ کر یہاں تک کس طرح آ گیا۔ میں تو حیران ہو رہا ہوں کہ آخر یہ تجھ کو سوجھی کیا؟"
نوجوان نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "حضرت، میں آپ کو بہت عرصے سے پہچانتا ہوں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ میں آج اور ابھی سے پہلے تک یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں پہچانا جاؤں گا۔ چنانچہ میں اسی اطمینان سے ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا کہ جولانیٔ طبع نے مجھ کو اس محفل میں آنے پر اکسایا اور میں مسلمانوں کا لباس پہن کر چلا آیا۔"
آپ نے جواب دیا۔ "مسلمان دور ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ چنانچہ تو بھی دور ہی سے پہچان لیا گیا۔"
ہندو نوجوان نے کہا۔ "جناب! میں تو حیران اور پریشان ہوں کہ یہ محفل ہے یا کوئی طلسمی خانقاہ۔"
آپ نے فرمایا۔ "تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"
اس نے پوچھا۔ "کون سا سوال؟ آپ پوچھیے میں اس کا جواب ضرور دوں گا۔"
آپ نے فرمایا۔ "تو نے مسلمانوں کا لباس پہن لیا ہے۔ اب اس لباس کی لاج رکھنا۔ عزت و آبرو رکھنا کیونکہ یہ لباس نہ تو اتنا عام ہے اور نہ ہی اتنا ارزاں۔ چنانچہ جب یہ قیمتی لباس تو نے زیب تن کیا تو میں بہت خوش ہوا۔ لیکن اب بھی میں اس کی اصل خوشی کا حظ نہیں اٹھا سکتا۔"
ہندو نوجوان تو از خود رفتہ تھا۔ بولا۔ "آپ فرمائیں شاید وہ حظ بھی حاصل ہو جائے۔"
آپ نے فرمایا۔ "اسلام کا لباس پہنا ہے تو اسے مستقل ہی پہن دے یعنی اسلام قبول کر لے۔"
ہندو نوجوان نے کہا۔ "مسلمان ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی آپ کلمہ پڑھا یئے۔ میں مسلمان ہوا جاتا ہوں۔"
چنانچہ آپ نے اس کو مسلمان کر لیا اور وہ مسلمان ہو کر اتنا خوش ہوا گویا اس کو سب کچھ مل گیا تھا۔
☆☆☆
میاں احمد یار خان آپ کی خدمت میں یوں حاضر ہوا کہ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے، بات کرنا چاہتا تھا مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی۔ آپ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے میاں احمد یار خان؟"
احمد یار خان نے مریدوں کے ہجوم کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔
"حضرت! سب کے سامنے کیا عرض کروں، بات نازک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ سب کے سامنے بولتے ہوئے خوف لگتا ہے۔"
آپ نے فرمایا۔ "یہ ہجوم تو رہے گا ہی، تو سرگوشی میں میرے کان میں کہہ دے۔"
احمد یار خان کو پھر تامل ہوا آپ نے ناگواری سے کہا۔ "دیکھ، شاید ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تیرے کام آ سکتے ہیں اس لیے تو جو کچھ کہنا چاہتا ہے ان کے سامنے ہی کہہ دے۔"
میاں احمد یار خان نے کہا۔ "حضرت، بادشاہ کو ان دنوں مال و زر کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے بہتوں کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ انہی میں

میرے چچا بھی شامل ہیں، بادشاہ نے انہیں بھی قید کر دیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کیجیے۔"
آپ نے فرمایا۔ "بس اتنی سی بات یا کچھ اور بھی؟"
میاں احمد یار خان نے جواب دیا۔ "حضرت! میری ناقص رائے میں یہ بس اتنی سی بات نہیں ہے!"
آپ نے فرمایا۔ "لیکن میں جو کہہ رہا ہوں یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔"
میاں احمد یار خان نے کہا۔ "اگر یہ اتنی اہم بات نہیں ہے تو پھر یہ مسئلہ حل کس طرح ہوگا؟ میرے چچا بادشاہ کی قید سے رہائی کس طرح پائیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے مریدوں میں سے چند کو اپنے ساتھ لے جا اور اپنے چچا کو قید خانے سے نکال لا۔"
احمد یار خان نے آپ کے مریدوں میں سے چند طاقتور اور توانا مریدوں کو الگ کیا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر شاہی قید خانے کی طرف چل پڑے۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ شاہی قید خانے کے سامنے پہنچ گئے۔ ساتھیوں میں سے چند نے کہا۔ "ہمیں پہرے داروں پر حملہ کر دینا چاہیے۔ یہی پیر و مرشد نے بھی فرمایا تھا۔"
احمد یار خان نے جواب دیا۔ "نہیں پیر و مرشد نے یہ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ چند مریدوں کو ساتھ لو اور انہیں چھڑا کر لے آؤ۔"
ایک مرید نے کہا۔ "شاہی قید خانے میں یوں کسی مزاحمت کے بغیر داخل ہو جانا اور چچا کو باہر لے آنا کم از کم اپنی سمجھ میں تو آ نہیں رہا۔ ویسے جو تم سب کی رائے وہی میری رائے۔"
احمد یار خان نے آگے بڑھ کر پہرے داروں سے بات کرنا چاہی لیکن اس کو اچانک ایسا لگا گویا وہ اس کو دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ احمد یار خان نے اپنے آدمیوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ سب اس کے قریب پہنچ گئے۔ اب یہ سب پہرے داروں کے بالکل سامنے کھڑے تھے لیکن وہ ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ احمد یار خان نے کہا۔ "دوستو! یہاں کی بینائی کو کیا ہو گیا۔ یہ ہماری طرف دیکھ کیوں نہیں رہے؟"
ایک مرید نے جواب دیا۔ "شاید پیر و مرشد کے التفات نے ان کی بینائی کو کم از کم ہمارے لیے سلب کر لیا ہے۔ اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"
میاں احمد یار خان اپنے ساتھیوں کو لے کر قید خانے میں داخل ہو گئے۔ کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ احمد یار خان نے اپنے چچا کو ساتھ لیا اور باہر آ گئے۔ پہرے داروں نے انہیں دیکھا تک نہیں۔ یہ لوگ سیدھے شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچے اور احمد یار خان نے اپنے چچا کو ان کی خدمت میں کھڑا کر دیا اور کہا۔ "اب ان کی حفاظت آپ کے سپرد ہے۔ کیونکہ جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوگا کہ قید خانے میں نہیں ہیں تو ان کی گرفتاری کا نیا حکم جاری کر دے گا اور اس وقت ان پر اور زیادہ سختی کی جائے گی۔"
آپ نے جواب دیا۔ "بادشاہ کے آدمی اگر تیرے چچا کی گرفتاری کو آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ چچا، شاہ غلام علی کی مہمانی میں ہیں، وہاں سے لے آئیں۔" پھر چچا سے کہا۔ "اور تم کچھ عرصہ یہیں رہو گے۔"
چند دنوں بعد بادشاہ نے احمد یار خان کے چچا کو یوں طلب کیا گویا اس کو ان کی گرفتاری اور رہائی کا کوئی علم ہی نہ تھا۔ شاہ غلام علی کی اجازت سے یہ بادشاہ کی خدمت میں چلے گئے۔ بادشاہ نے ان کی یوں پذیرائی کی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے بعد بھی بادشاہ نے ان پر نہ تو سختی کی اور نہ ہی کسی قسم کے سوال جواب کی نوبت آئی۔

☆☆☆

آپ کو آخری عمر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ زیادہ نہیں جئیں گے۔ چنانچہ ایک دن فرمایا۔ "جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ جامع مسجد میں اس جگہ لے جائیں جہاں آثار نبویہ ﷺ رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ان کے واسطے سے میرے لیے رسول اللہ ﷺ سے شفاعت کی درخواست کی جائے بعد میں دفن کیا جائے۔"
چنانچہ 22 صفر 1240ھ کو جب آپ کا وصال ہوا تو اس وصیت پر عمل کیا گیا۔ جنازے کے آگے عربی کے چند اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ جن کا مفہوم تھا۔ "میں کریم کے آگے بغیر توشہ صفات و قلب سلیم گیا کیونکہ جب جانا کریم کے پاس ہو تو توشے کا لے جانا سب سے بری چیز ہے۔"
آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں چار قسم کے مرد پائے جاتے ہیں، نامرد، مرد، جواں مرد، فرد۔ دنیا کا طالب نامرد ہے۔ عقبیٰ کا طالب مرد ہے۔ عقبیٰ اور مولیٰ کا طالب جواں مرد اور صرف مولیٰ کا طالب فرد ہے۔"

ماخذات

بساتین السلاطین	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	بزم تاریخ	فرمانروایان اسلام	آثار امرا
مرزا ابراہیم زبیری	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	طباطبائی	لین پول	صمصام الدولہ شاہنواز خان

چرب زبان

سلیم انور

کچھ لوگ ہاتھوں کی روٹی کھاتے ہیں اور کچھ لوگ باتوں کی... اس کا تعلق بھی انہی انسانوں میں ہوتا تھا جو محنت کرنے کے بجائے الٹی سیدھی تدبیروں سے تقدیر بنانے کے گُر آزماتے رہتے ہیں... اس بار تو گویا اس کی لاٹری نکل آئی تھی کیونکہ اس کی چرب زبانی نے نہ صرف سامنے والے کی زبان بند کردی بلکہ آنکھوں پر بھی چربی چڑھا دی۔ تو ثابت ہوا کہ قسمت کی دیوی اس پر مہربان تھی۔

بات سے بات نکالنے والے ایک کہانی ساز کا دلچسپ انداز

وہ اجنبی فلائی بائی نائٹ نامی استعمال شدہ کاروں کی لاٹ میں موجود چھ کاروں کا دو منٹ سے جائزہ لے رہا تھا جب اس لاٹ کے تنہا مالک اور سیلز مین سولومن کی آنکھ کھل گئی جو ایک کوپے میں لیٹا اونگھ رہا تھا۔ وہ بطخ کی سی چال چلتا ہوا کوپے سے باہر نکل آیا۔ جب اس نے متوقع گاہک کی عمدہ پوشاک اور نفاست سے سلے ہوئے لباس کا جائزہ لیا... تو دل ہی دل میں خوش ہو گیا کہ ایک اچھا سودا اس کا منتظر ہے۔

''ایوننگ برادر!'' سولومن نے خوش مزاجی سے اس

اجنبی کو مخاطب کیا۔ ''تم نے ان دلکش بے بیز کے بارے میں کیا سوچا؟''

''تم اس ٹوٹی پھوٹی کار کی کیا قیمت طلب کررہے ہو جو سامنے کھڑی ہے؟'' اجنبی نے کار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''برادر! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' سولومن نے کہا۔ ''یہ کار دیکھنے اور چلنے دونوں میں بالکل نئی کے مانند ہے۔''

''تو پھر جارج واشنگٹن نے اسے یہاں کیوں ڈال دیا تھا؟'' اجنبی نے کہا۔

''ہا...... ہا۔'' سولومن اجنبی کی شگفتگی پر اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا۔ ''تمہاری فقرے بازی اچھی لگی برادر! لیکن تمہیں اس جیسی فرسٹ کلاس گاڑی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ یہ ایک سستے سودے کی چیز ہے۔''

''میں بھی کسی سستی سی شے کی تلاش میں ہوں...... جس سے سودا بن جائے۔'' اجنبی نے کہا۔ ''ارے...... وہ وہاں بھاپ سے چلنے والی کیسی کار ہے؟'' اس نے ایک اور کار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بھاپ سے چلنے والی کار! برادر کیا تمہیں ٹوئن سکس لینیئر کو دیکھنے کے باوجود اس کی پہچان نہیں ہے؟'' سولومن نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''کیا یہ ٹو کیے بغیر...... چلتی بھی ہے؟''

''کسی قسم کے شک وشبہے سے بالاتر! میرے پاس اس کار کی مکمل ہسٹری موجود ہے۔ اب سنو، لیکن یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان ہی رہنی چاہیے۔ یہ کار پیٹر سوینی نامی شخص نے کار کے ڈیلر سے اوریجنل اور بالکل نئی خریدی تھی۔ ویل، یہ پیٹر سوینی کسی غیر قانونی کاروبار میں پکڑا گیا۔ سو ہم نے یہ کار کھٹارا کے طور پر خرید لی......!''

''کھٹارا سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''ویل، تم اس کی بولی لگاؤ تو تمہیں پھر حیرت ہوگی کہ میں اس کی کیا قیمت طلب کرتا ہوں۔''

''اگر اس کے ہڈ کے نیچے واقعی موٹر موجود ہے اور اس کے ٹائر اتنے عمدہ ہیں کہ دس میل تک چل سکتے ہیں تو میں اس کے سو ڈالرز دے سکتا ہوں۔'' اجنبی نے کہا۔

''سو ڈالرز! برادر تم کیا سمجھ رہے ہو کہ تم کہاں پر ہو...... ایں؟'' سولومن نے چڑ کر کہا۔

''ریاست ہائے متحدہ امریکا۔ میں یہ بات ان گاڑیوں کی نمبر پلیٹس اور تعداد کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں جو یہاں سے گزر رہی ہیں۔''

''ہا...... ہا...... ہا!'' سولومن نے قہقہہ لگایا۔ ''لیکن سنو، یہ کار بالکل برانڈ نیو کی طرح ہے۔''

''جیسے تمہارے پردادا کی سب سے پہلی گاڑی تھی۔''

''یہ دو سال پہلے کی اسپیشل کسٹم بلڈ ایڈیشن ہے اور شہر میں اس جیسی دوسری کوئی کار نہیں ہے۔'' سولومن نے بتایا۔

''تب پھر یہ میٹر کو خرید لینی چاہیے۔'' اجنبی نے کہا۔ پھر دوسری کار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس کے برابر میں کھڑی ہوئی شے کیا ہے؟''

''تمہارا مطلب اس تیز رفتار ڈیٹرائٹر کوپے سے ہے؟ اس کی تو آواز بھی بے حد ہلکی ہے۔''

''اب تم اپنا دماغ درست رکھو اور بتاؤ کہ تم اس کی کیا قیمت لینا چاہو گے؟'' اجنبی نے کہا۔

''سنو برادر! اگر تم واقعی سودا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمام سودوں میں سب سے شاہی سودا ہوگا۔''

''میں واقعی سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔ ''اس بارے میں فکر نہ کرو۔''

''کیا تم ایک راز رکھ سکتے ہو؟''

''کہو...... تم مجھ پر اعتماد کرسکتے ہو۔''

''تو پھر سنو، میرے خیال سے یہ کار ''ہاٹ'' ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے؟'' سولومن نے کہا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کار ایماندارانہ سودے کے قابل نہیں ہے؟''

''بے شک تم چیک کرسکتے ہو۔ یہ مسروقہ کار ہے۔ میں اس قسم کا کاروبار نہیں کرتا۔ تم سمجھ رہے ہو نا! لیکن چند روز قبل ایک شخص میرے پاس آیا تھا۔ وہ شکستہ اور بھوکا لگ رہا تھا۔ اس نے نہایت کم قیمت پر یہ کار مجھے فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ کار خود اسی کی ہے تو اس نے بتایا کہ کار اس کے والد کی ہے اور وہ کسی عورت کی محبت میں سب کچھ لٹا کر اپنا اکاؤنٹ خالی کرچکے ہیں اور اب کسی مشکل میں گرفتار ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں احساس ہوا جیسے وہ سچ نہیں بول رہا تھا۔ سمجھے؟ بے شک میں ہر بات کا سراغ تو نہیں لگا سکتا لیکن میں نے اسے پیسے ادا کردیے۔ اب تمہارے خیال میں تمہارے لیے اس کی کیا قیمت ہوسکتی ہے؟ یہ دوڑنے میں ٹاپ پر ہے اور سڑک پر ہر کسی کو مات دے سکتی ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک پیاری آسودہ خاطر...... بے بی کے مانند ہے جو اطمینان اور سکون کا باعث ہوتی ہے۔''

''سویٹ بے بی کے مانند تم نے ٹھیک کہا کیونکہ میں

اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔'' اجنبی نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ کار میں نے چھ ماہ قبل بالکل نئی خریدی تھی!'' اجنبی نے کہا۔

''تم نے......کیا؟''

''لگتا ہے تم نے میری بات صحیح طور پر نہیں سنی۔ میں نے کہا کہ میں نے یہ کار چھ ماہ قبل بالکل نئی خریدی تھی۔'' اجنبی نے اپنی بات دہرائی۔ ''کسی عادی مجرم نے یہ کار گزشتہ ہفتے کی رات اس وقت چوری کر لی تھی جب یہ ایک تھیٹر کے سامنے پارک تھی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اس پر ایک نیا چمک دار رنگ کر دیا ہے لیکن میں اپنی کار کی اپنائیت محسوس کر سکتا ہوں چاہے اس پر سرخ، گلابی یا پیلا رنگ چڑھا دیا جائے۔''

یک بارگی سولومن کے ذہن نے تیزی سے ہسٹریائی انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ قانون سے الجھنے کا تصور اس کے لیے کسی طور پر دلکش نہیں تھا۔

''سنو برادر!'' سولومن نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''مجھے امید ہے تم یہ خیال نہیں کرو گے کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے تم سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ اس کار کے عوض میں نے اس نوجوان کو کچھ رقم ادا کی تھی لیکن میری بیان کردہ بقیہ کہانی بالکل سچ ہے۔ میں ایمان داری سے کہہ رہا ہوں۔ وہ اس کار کو یہیں چھوڑ گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ اس کے عوض مجھے جو کچھ ملے گا، وہ اس کا نصف مجھے دے دے گا۔ یہ بالکل سچ ہے جو میں بتا رہا ہوں۔''

''اور تم تمسخر کا ہدف بن بیٹھے!'' اجنبی نے کہا۔ ''میرے خیال سے مجھے تمہیں پولیس اسٹیشن لے جانا پڑے گا۔''

''سنو برادر......پلیز سنو! میری ایک بیوی اور فیملی ہے اور یہ کار میں نے چوری نہیں کی ہے۔ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تم اپنی کار لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ بالکل صحیح حالت میں ہے۔ صرف اس پر نیا رنگ چڑھایا گیا ہے اور اسے کسی قسم کی گزند نہیں پہنچی۔ اور مذاق نہیں، میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مسٹر...... مجھے خوشی ہے کہ تمہیں تمہاری کار مل گئی۔ اب ایک اچھے شخص کی طرح تم بس یہ کار لے جاؤ......ٹھیک ہے؟''

''ویل، یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں بے حد مصروف شخص ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ عدالت کے چکر کاٹتا رہوں لیکن...... اگلی مرتبہ ایسی غلطی

کترنیں

☆ حکیم لقمان کہتے ہیں ''میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لیے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''اگر یہ اثر نہ کرے تو؟''

حکیم لقمان مسکرائے اور بولے۔ ''تو دوا کی مقدار بڑھا دو۔''

☆☆☆

☆ سب سے بہتر سبق وہ ہوتا ہے جو ہم خود چوٹ کھا کر حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں اور مشاہدوں سے انسان سیکھتا ضرور ہے مگر جو بات خود تکلیف سہہ کر سمجھ میں آتی ہے وہ کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا۔

☆☆☆

ہرگز نہ کرنا۔ اس کاروبار میں قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔'' اجنبی نے تاکیدی لہجے میں کہا۔

سولومن نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

''ارے ہاں! کیا اس میں تیل اور پیٹرول موجود ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''اس کی ٹنکی میں پیٹرول فل ہے اور اس کا تیل میں نے کل صبح ہی تبدیل کیا تھا۔'' سولومن نے تسلی دی۔ ''یہ ایک لمبے سفر پر نکلنے کے لیے بالکل تیار ہے۔''

''او کے۔'' اجنبی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور ......اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے ایک اچھا سبق ہوگا۔''

وہ اجنبی کار میں سوار ہو گیا اور انجن اسٹارٹ کر کے استعمال شدہ گاڑیوں کی لاٹ سے مین روڈ پر لے آیا پھر رفتار بڑھا دی۔

''واقعی یہ ایک پیاری سویٹ بے بی کے مانند ہے۔'' اس نے کار کی سریلی مدھم آواز پر سر دھنتے ہوئے خود سے کہا۔ ''وہ احمق اس کار کے بارے میں بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ لیکن میں حیران ہوں کہ یہ کار کس کی ہے!''

گُم گشتہ

ڈاکٹر ساجد امجد

ازل سے نیکی اور بدی کے درمیان جنگ جاری ہے جو ابد تک جاری رہے گی... یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جسے جانتے سب ہیں مگر اسے ماننے کے لیے نفس کو مارنا لازم ہوتا ہے جو ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں... اور جہاں مسلم امہ اور صیہونی سازشوں کے درمیان معرکہ آرائی کا قصہ چھڑ جائے وہاں عالمی سطح پر بہت واضح طور پراندازہ ہوجاتا ہے کہ شیطانی طاقتیں، روحانی طاقتوں پر غلبہ پانے کے لیے کیسی کیسی شرانگیزیاں پھیلانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں۔ اب بات وہی نفس کشی اور صحیح غلط میں تمیز کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی آجاتی ہے... کتنی نسلیں تباہ ہوچکی ہیں اور جانے کتنی اور ہونگی... نتائج سے بے خبر اور خونی حالات کے سامنے سینہ سپر ہونے کے لیے دل اور حوصلہ چاہیے جو الحمدللہ مسلم امہ کے پاس ہے جنھوں نے وسائل کی کمی اور بے بسی وبے کسی کے باوجود آج بھی ظالموں اور ظلمتوں کے آگے سر نہیں جھکایا... دیکھتے ہیں کہ یہ خونی داستان کب اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

صراط مستقیم پر چلنے والے سیسہ پلائی دیوار کے مانند ڈٹے ہوئے مظلوم لوگوں کی روداد

گاؤں میں یہ کہتے ہوئے کسی کو بھی تکلف نہیں ہوتا تھا کہ جس طرح خدیجہ کے چھ بچے اللہ کو پیارے ہوگئے، یہ ساتواں بھی شاید ہی زندہ رہے۔ یہ رائے اس لیے قائم ہوگئی تھی اور سب کو یقین بھی آگیا تھا کہ خدیجہ کا ساتواں بیٹا احمد خلیل دو سال کا ہوگیا تھا لیکن چلنا تو دور کی بات اس نے گھٹنوں گھٹنوں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ اس کے پیروں میں اتنی جان ہی نہیں تھی کہ اٹھ کر کھڑا ہوسکتا۔

''بہن، تم خود بھی کاہل ہو۔ اسے سہارا دے کر چلانے کی کوشش کیا کرو۔ آہستہ آہستہ چلنے لگے گا۔'' خدیجہ کے ساتھ کی عورتیں اس سے کہتیں۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میں نے کوشش نہیں کی ہوگی مگر میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ قسمت اچھی ہوتی تو اللہ نے مجھے چھ بچے دیے، کوئی ایک تو زندہ بچ جاتا۔ اب یہ ہے تو کیا خبر معذوری کی زندگی گزارے۔''

''خدیجہ! یوں تو نہ کہو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ سوکھے میں جان ڈالتا ہے۔''

''میں اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوں۔ یہ کیا کم ہے کہ یہ اب تک زندہ ہے۔'' خدیجہ ان عورتوں سے کہتی اور احمد خلیل کو اس کے پیروں پر کھڑا کرتے ہوئے اسے پیدل چلانے کی کوشش کرتی لیکن اس کی پتلی پتلی ٹانگیں چلنے سے پہلے ہی لچک جاتیں۔ عورتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتیں اور مایوسی سے گردن جھکالیتیں پھر ان میں سے کوئی کہتی۔

''تم نے اس کی ٹانگوں پر زیتون کی مالش کی؟''

''سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔'' خدیجہ بےزاری سے کہتی اور اپنے کاموں میں لگ جاتی۔

یہ ایک دن کا نہیں ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول تھا۔ عورتوں کو جیسے ایک شغل ہاتھ لگ گیا تھا۔ بہت سی عورتیں خدیجہ سے واقعی ہمدردی رکھتی تھیں لیکن بیشتر کے ہاتھ تو بس ایک تماشا سا لگ گیا تھا کہ احمد خلیل اٹھتا ہے، لڑکھڑاتا ہے

اور گر جاتا ہے۔ وہ چار سال کا ہو گیا تھا اور اب بھی اس کی وہی حالت تھی۔

صحرا میں حدِ نگاہ تک چپٹی چھت والی جھونپڑیاں نظر آتی تھیں اور یہ بے آب و گیاہ سنگلاخ خشک زمین سے اتنی ہم آہنگ تھیں کہ زیادہ دور سے دیکھنے پر بہ مشکل نظر آتی تھیں۔ ان جھونپڑیوں میں ایک پختہ مکان بھی تھا جو مضبوطی سے باہم جڑے ہوئے پتھروں سے بنا ہوا تھا۔ اس کی موٹی دیواریں شدید گرمی سے تحفظ مہیا کرتی تھیں لیکن موٹی دیواروں میں دھوپ کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے موسمِ سرما کی شدید بارشوں میں سخت سردی ہوتی تھی۔

یہ سرزمین فلسطین پر آباد ایک بستی ''عراق المنشیا'' تھی اور یہ پختہ مکان احمد خلیل کے بزرگوں کی نشانی تھا۔ اس کے اجداد اور اب اس کے دادا قبیلے کے سردار تھے اس لیے یہ مکان بھی دوسروں سے ممتاز و نمایاں تھا۔

عراق المنشیا سے متصل ''نجبا'' تھا جہاں یہودی آباد تھے۔ آباد کیا تھے، انہوں نے طویل جنگوں کے بعد مسلمانوں کو ان علاقوں سے نکال دیا تھا اور خود ''نجبا'' پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے تھے۔ اب ''عراق المنشیا'' پر دانت لگے ہوئے تھے۔ آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

یہودیوں کا کہنا تھا کہ ان کے پاس کوئی وطن نہیں لہٰذا یہ ملک ان کی ملکیت ہے کیونکہ قدیم زمانوں میں یہ ملک ان کے آباو اجداد کے زیرِ تسلط رہ چکا ہے۔ ''نجبا'' کے جنوب میں نیفود کا وسیع و عریض صحرا پھیلا ہوا تھا جو احمد خلیل کے اجداد کا وطن تھا جہاں سے وہ اسلام کی عظیم فتوحات کے زمانے میں یہاں فلسطین میں آکر آباد ہوئے تھے اور یہودیوں کے مظالم کا سامنا کر رہے تھے اور اب ایک نئی افتاد انگریزوں کی صورت میں آگئی تھی جو پڑوس کے شہر ''غزہ'' پر مسلط تھے اور یہودیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

☆☆☆

مفتی اعظم یروشلم الحاج امین الحسینی کی قیادت میں جب عربوں نے بغاوت کی تو ''نجبا'' کے یہودیوں اور عراق المنشیا کے دیہاتیوں کے درمیان کشیدگی عروج کو پہنچ گئی۔

یہی وہ دن تھے جب خدیجہ کے والد اور احمد خلیل کے نانا شیخ الحق اہم ترین شخصیت بن گئے۔ جب قبیلے کا بوڑھا شیخ فوت ہوا تو شیخ الحق نے قبیلے کی قیادت سنبھال لی۔ اس اعزاز کے حصول میں موروثی حق کا نہیں بلکہ ان کی شخصیت اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا عمل دخل تھا۔ ان کی معاشی حیثیت ایک مزارع سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی شخصیت ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح تھی لہٰذا دوسرے کسانوں نے کسی حیل و حجت کے بغیر انہیں اپنا راہبر مان لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عرب میں ابنِ سعود کی حکومت مستحکم ہوئی تھی۔ شیخ الحق کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی جنہوں نے ابن سعود کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیا تھا اور اسے حکومت کے حصول میں مدد دی تھی۔ اس ملاقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ شیخ الحق نے خود کو ایک انقلابی مسلمان کی صورت میں ڈھال لیا۔ وہ جلد ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ گاؤں کے ان پڑھ کسان اسلام کی صحیح روح سے اسی وقت آشنا ہو سکتے ہیں جب انہیں دین کی تعلیم دی جائے۔ انہوں نے منصوبہ بنایا کہ گاؤں میں بچوں اور بالغوں کے لیے الگ الگ اسکول قائم کیے جائیں لیکن انہیں اس کوشش میں زبردست ناکامی ہوئی۔

اسکول چلانے کے لیے اساتذہ کی ضرورت تھی جو غزہ اور دوسرے بڑے شہروں سے ہی مل سکتے تھے۔ شیخ الحق نے غزہ کے کئی پھیرے لگائے لیکن ہر مرتبہ انہیں ناکامی ہوئی۔ ان اساتذہ نے بھاری معاوضوں کی پیشکش کے باوجود گاؤں میں رہنے اور مشکلات کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔

اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ مسجد کے منبر کو تبلیغ گاہ بنائیں اور کسانوں کو دین کی صحیح تعلیم سے آراستہ کریں۔ وہ ایک روز منبر پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے بدن پر ایک بھاری، بھورے رنگ کا چوغہ تھا جس پر کئی جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر پیوندوں سے بھری عبا تھی۔ سر پر صافہ لپٹا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ کسی کا دھیان پیوند لگی قبا کی طرف نہیں جا رہا تھا۔ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے کسانوں کا دھیان تو ان الفاظ کی طرف تھا جو شیخ الحق کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کوششوں کا نتیجہ صرف اتنا نکل سکا کہ گاؤں کے لوگ نماز روزے کے سختی سے پابند ہو گئے اور ان رسومات کا خاتمہ ہو گیا جو اسلام کے نام پر غیر اسلامی تھیں لیکن دنیاوی تعلیم کے اعتبار سے وہ پہلے کی طرح ... ان پڑھ ہی رہے۔

ملک عبدالوہاب واحد پڑھا لکھا آدمی تھا جسے شیخ الحق نے اپنا سیکریٹری مقرر کر لیا تھا جس کے ذریعے اس نے شاہ ابن سعود کو ریاض میں، حسن البنا کو قاہرہ میں اور امین الحسینی کو یروشلم میں ارسال کرنے کے لیے خطوط لکھوائے۔ ان خطوط میں اس نے بیان کیا تھا کہ مختلف جاگیردار ''عراق المنشیا''

کی باقی ماندہ زمینیں یہودی جاگیرداروں کو فروخت کرنے کے لیے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہو آپ ہماری مدد کریں۔ ان خطوط نے کوئی خاص اثر نہیں دکھایا۔

شیخ اسحٰق غزہ کے گردونواح کے قبائل اور دیہات کو متحد کر کے مسلمانوں کی طاقت کو مجتمع کرنے کی کوشش میں تھے تاکہ اس علاقے میں نئی بننے والی یہودی نوآبادیوں پر سب مل کر حملہ کریں۔ انہیں اس طرح محصور کیا جائے کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری حکام اس کے عزائم کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے لیکن وہ برابر کوششیں کیے جارہا تھا۔

اب وہ ایک انقلابی بن چکا تھا۔ اس کے ارادے برطانوی اہلکاروں پر بھی ظاہر ہو چکے تھے۔ ان کی جانب سے بار بار یہ دھمکیاں مل رہی تھیں کہ اگر اس نے ہتھیار اٹھائے اور امن خراب کرنے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ بوڑھا شیخ ان دھمکیوں پر ہنسے بغیر نہ رہتا تھا لیکن خطرہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ گردونواح کے قبائلی اس پر ایسا اعتماد کرنے لگے تھے کہ اگر وہ حکم دیتا تو ہتھیار اٹھاتے اور یہودیوں کی بستی میں گھس جاتے لیکن شیخ اسحٰق پہلے سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کے حق میں تھا۔ وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

☆☆☆

ملک وہاب، احمد خلیل کے والد تھے۔ یہ بھی جاگیردار نجم آفندی کے باپ فواد آفندی کی ملازمت کرتے تھے بلکہ بعض لوگ تو یہ کہتے تھے کہ ملک وہاب ان کا ملازم نہیں غلام ہے۔ فواد آفندی اتنا رحم دل اور نیک انسان تھا کہ جب اس نے ملک وہاب کا رجحان پڑھنے لکھنے کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے بیٹے نجم آفندی اور ملک وہاب کو ایک ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ ملک وہاب ایسا ذہین ثابت ہو رہا تھا کہ ہر مرتبہ نجم آفندی پر بازی لے جاتا تھا۔ نجم آفندی کی کینہ پرور طبیعت یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ایک غلام اس سے آگے بڑھ جائے۔

فواد آفندی نے ارادہ کرلیا کہ وہ ملک وہاب اور اپنے بیٹے نجم آفندی کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیج دے گا لیکن یورپ کی پہلی جنگ عظیم نے اس کے ارادوں کا گلا گھونٹ دیا۔

جب جنگ ختم ہوئی تو نجم آفندی اور ملک وہاب نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے امتحان دیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ دونوں کو امید تھی کہ وہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے اور یورپ میں ایک ساتھ رہیں گے۔ دن رات وہاں کی رنگین زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی نتائج کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ فواد آفندی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ نجم آفندی کو باپ کے مرنے کا صدمہ تو بہت ہوا لیکن یہ خوشی بھی تھی کہ اب وہ بلا روک ٹوک جو چاہے کرسکتا ہے۔ اب وہ جاگیر کا بیٹا نہیں خود جاگیردار ہے۔ وہ ملک وہاب پر اور زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔ اس سے اکثر کہا کرتا تھا کہ دونوں یورپ جا کر خوب عیاشی کریں گے۔ ملک وہاب یہ سوچ کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا کہ مخالفت کرنے پر کہیں وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار نہ کر دے ورنہ وہ کہہ سکتا تھا کہ ہم تعلیم حاصل کرنے جارہے ہیں عیاشی کرنے نہیں۔

آخرکار امتحان کے نتائج سامنے آئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے ملک وہاب کو بہ حیثیت طالب علم داخلہ دینا منظور کرلیا تھا جبکہ نجم آفندی کی درخواست مسترد کردی گئی۔ نجم آفندی نے اسے اپنی ذلت سمجھا کہ ایک غلام نے اسے شکست دے دی۔ وہ یہ کیسے گوارا کرسکتا تھا کہ ملک وہاب اس کے پیسوں سے یورپ چلا جائے اور وہ یہاں غزہ میں پڑا رہے۔ وہ ملک وہاب کی شکل سے نفرت کرنے لگا۔ وہ سامنے آتا تو نجم آفندی غصے سے مٹھیاں بھینچ لیتا۔ طویل دوستی دشمنی میں بدل گئی۔ اب وہ دوست نہیں، ایک غلام تھا اور وہ ایک آقا۔ آقا نے غلام کو حکم دیا۔

''کوڑا، کوڑے کے ڈھیر ہی میں صحیح رہتا ہے۔ میرے باپ نے غلطی کی تھی کہ تمہیں گلدان میں سجانا چاہا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میری جاگیر ''عراق المنشیا'' چلے جاؤ۔ میرے مزارعوں کے ساتھ مل کر کام کرو۔ جتنا کام کرو گے اتنا اناج تمہیں مل جایا کرے گا۔''

''تم اگر میرے یورپ جانے سے خوش نہیں ہو تو میں نہیں جاتا مگر مجھے اپنی خدمت سے تو دور مت کرو۔ اس ویرانے میں جا کر میں کیا کروں گا۔''

''وہاں کھیتوں میں کام کرنا۔ تمہارے ہاتھوں کو بہت آرام مل چکا، اب کچھ دن محنت بھی کرو۔''

''تم کہو گے تو میں پڑھنے لکھنے کا نام بھی نہیں لوں گا۔''

''میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ جتنی جلدی ہو یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ میں تمہاری جان لینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

ملک وہاب نے بھی سوچا کہ ایسے نفرت انگیز ماحول میں رہنے کا کیا فائدہ۔ جان بچ جائے یہی بہت ہے۔

آفندی سے کچھ بعید نہیں۔ وہ نفرت کی آگ میں جل رہا ہے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس نے عراق المنشیا کی راہ لی۔ ریت میں اس کے نقوشِ قدم آگے بڑھتے گئے۔

وہ عراق المنشیا پہنچا تو ان دنوں وہاں ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی تھی۔ خدیجہ کی بڑی بہن نے ایک یہودی سپاہی کے ساتھ خفیہ مراسم استوار کرلیے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کو کھیتوں میں چپکے چپکے ملتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا اور دبے دبے لفظوں میں ایک دوسرے کو بتا بھی رہے تھے لیکن شیخ الحق کا سب اتنا احترام کرتے تھے کہ کسی کو کھل کر کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی بلکہ جو سنتا اسے افواہ سمجھ کر چپ سادھ لیتا۔ یہ افواہیں جب بہت پھیل گئیں تو شیخ الحق کے بھی کان کھڑے ہوئے لیکن اس وقت تک اس نے کوئی کارروائی نہیں کی جب تک اس افواہ کی تحقیق نہیں ہوگئی لیکن اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ تحقیق کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ لڑکی اتنی جلدی میں تھی کہ ایک رات اپنے آشنا سے ملنے کھیتوں میں چلی گئی۔ اس کے بھائی یوسف ملک کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ اس نے اپنے دو بڑے بھائیوں کو بھی بیدار کیا۔ گاؤں میں باتیں تو بن ہی رہی تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ یہ تینوں خنجروں اور چھروں سے لیس ہوکر کھیتوں میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی بہن کو اس یہودی نوجوان کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا۔ خنجر تو پاس تھے ہی۔ اس پر پل پڑے اور اسی وقت دونوں کا کام تمام کردیا۔

شیخ الحق نے اپنی بیٹی سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے بھی انکار کردیا۔

”ایسی بے حیا لڑکی میری بیٹی نہیں ہوسکتی۔ میں اسے عراق المنشیا کی زمین پر دفن بھی نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے جس بدبخت کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اسی کی زمین پر لے جاکر کسی گڑھے میں ڈال دو۔ یہودی جب ان دونوں کی لاشوں کو دیکھیں گے تو آئندہ ان میں سے کسی کی ہمت نہ ہوگی کہ مسلمان عورتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھیں۔“

وہ لڑکی تو وہاں دفن کردی گئی لیکن اپنی بدنامی یہیں چھوڑ گئی۔ باتیں بنانے والے طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ کسی کی زبان بند نہیں کی جاسکتی۔ کہنے والے تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ جب بڑی بہن فاحشہ تھی تو چھوٹی بھی کچھ کم نہیں ہوگی۔ وقت آنے پر یہ بھی پر پرزے نکالے گی۔

شیخ الحق کے بھی کندھے جھک گئے تھے۔ وہ بھی یہ سوچنے لگے تھے کہ بڑی بہن کی بدنامی کے بعد کون خدیجہ سے شادی کرے گا۔ یہی وہ دن تھے جب ملک وہاب نے گاؤں میں قدم رکھا اور رواج کے مطابق شیخ الحق کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اس کا ان کی شخصیت سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ ان کی شخصیت تھی ہی ایسی کہ جو ملتا اس پر ان کا رعب طاری ہوجاتا تھا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن عالمی سیاست پر بڑی گہری نظر ہے۔ فلسطین کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ جذبۂ اسلامی سے سرشار ہیں۔ جہاد کی تیاری کر رہے ہیں اور پورے گاؤں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

وہ وہاں سے اٹھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر بھی انقلابی روح اتر گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ نجم آفندی نے اس کا لہو گرما دیا تھا۔ غصہ اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ وہ مختلف جھگیوں سے گزرتا ہوا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کچھ لوگ بیٹھے قہوے کے گھونٹ لے رہے تھے۔ یہ ایک بڑی جھگی میں بنا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ وہ بھی لکڑی کے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک آدمی قہوے کی پیالی لے کر اس کے پاس آگیا۔ وہ قہوے کے گھونٹ لیتے ہوئے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ شیخ الحق سے مل کر اسے معلوم ہوچکا تھا کہ اسے کھیتوں کے کس حصے میں کام کرنا ہے۔ شیخ الحق نے اسے ایک شخص کا نام بھی بتا دیا تھا جس سے مل کر وہ اپنے لیے ایک جھگی ڈال سکتا تھا۔

”تم اس گاؤں میں نئے معلوم ہوتے ہو۔“ ایک شخص نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں آج ہی غزہ سے یہاں پہنچا ہوں۔ جاگیردار نے مجھے یہاں کام کرنے کے لیے بھیجا ہے۔“

”جاگیردار کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوگی۔ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہی رہتا ہے۔ چلو خیر، شکل سے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر کام کرو گے تو ہمیں اچھا لگے گا۔“

”مجھے بھی خوشی ہوگی۔“

”ویسے تمہیں سب سے پہلے گاؤں کے شیخ سے ملنا چاہیے تھا۔“

”اتنی عقل تو مجھے بھی ہے۔ پہلے میں وہیں گیا تھا۔ اس کے بعد یہاں آیا ہوں۔“

”شیخ تم سے اچھی طرح ملا؟“

”کیوں کیا وہ تم لوگوں سے اچھی طرح نہیں ملتا؟“

”آج کل اس کے ساتھ بہت برا ہوگیا ہے۔“

''کیا ہوا ہے؟''

''اس کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ پھر ایک یہودی کے ساتھ کھیتوں میں ملی۔ شیخ کے بیٹوں نے اسے قتل کر دیا لیکن بدنامی تو ہو گئی نا۔ شیخ کو یہی دکھ کھائے جا رہا ہے۔''

''اس میں شیخ کا کیا قصور۔ ہر شخص اپنے اعمال کا حساب دہ ہے۔''

''اسے اب یہ فکر ہے کہ اتنی بدنامی کے بعد اس کی دوسری بیٹی سے کون شادی کرے گا۔''

''دوسری بیٹی کا کیا قصور ہے؟''

''اس کا قصور نہ ہو لیکن اثر تو پڑتا ہے نا۔''

''ہاں لوگ اتنے ہی تنگ نظر ہیں۔''

''کیوں تم اسے غلط نہیں سمجھتے؟''

''میں تو نہیں غلط سمجھتا ہوں۔'' ملک وہاب نے کہا۔

''اگر تم مجھے یہ سب نہ بتاتے تو شیخ کا پردہ رکھ سکتے تھے۔''

''میں نہ بتاتا تو کوئی اور بتا دیتا۔ میں نے تو تمہیں اس لیے بتا دیا کہ تم یہاں نئے ہو، چھوٹی بیٹی سے ہوشیار رہنا۔'' اس شخص نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

ملک وہاب وہاں سے اٹھا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے ایسی باتیں سن لی تھیں کہ اس کی شرافت اسے پریشان کر رہی تھی۔

وہ کئی دن تک شیخ اسحٰق اور اس کی بدنامی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے لگا کہ شیخ اسحٰق جیسے شریف آدمی کی مدد کرنی چاہیے۔ ایک صبح وہ سو کر اٹھا تو رات دیر گئے تک جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ باہر نکلا اور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ گندم اور جو کی اگی ہوئی فصلیں، مسور، پیاز اور ککڑی کی کیاریاں اور کھیتوں کی بے مثال خوب صورتی بھی اسے اپنی جانب نہ کھینچ سکی۔ وہ الٹے قدموں لوٹا اور پتھر کی بنی ہوئی موٹی دیواروں کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ یہ شیخ اسحٰق کا گھر تھا جہاں وہ کچھ روز پہلے بھی آیا تھا۔

شیخ کے دروازے کسی کے لیے بھی بند نہیں تھے۔ اسے بھی اندر پہنچا دیا گیا۔ شیخ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ ایک معمولی کسان ہے اور غلامی کی زندگی گزار چکا ہے۔

''میں آپ کے پاس ایک سوال لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ نے اس سوال کا مثبت جواب نہ دیا تو بھی میں شکایت نہیں کروں گا لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میرے سوال کی نزاکت آپ کو خفا نہ کر دے۔''

''نہیں میرے بچے! اگر تمہارا سوال پورا کرنے کی مجھ میں طاقت ہوئی تو میں ضرور پورا کروں گا۔''

ملک وہاب نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

''مجھے اس گاؤں میں آئے چند روز ہوئے ہیں لیکن یہ چند روز ہی میرے لیے نہایت تکلیف دہ ہو گئے ہیں۔ جو کچھ آپ پر بیتی ہے یا جو بیت رہی ہے اس کے بارے میں مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ مجھے...... اندازہ ہے کہ آپ کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔ اس گاؤں کی جہالت آپ کو کتنا دکھ پہنچا رہی ہو گی۔ ہمارا دین تو یہ کہتا ہے کہ جس کا قصور ہو سزا اسی کو ملے۔ آپ کی بڑی بیٹی کے گناہوں کی سزا آپ کی چھوٹی بیٹی کو کیوں ملے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے کبھی کوئی طعنہ نہیں دوں گا۔''

شیخ کا سر جھکا ہوا تھا۔ انہیں شاید فیصلہ کرنے اور کوئی جواب دینے میں دیر لگ رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے میں نے اپنی حیثیت سے بڑا سوال کر دیا ہے۔ آپ بے شک انکار کر سکتے ہیں۔'' ملک وہاب نے کہا۔

''میری خاموشی انکار کے لیے نہیں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہی ہے کہ تم نے میرے دکھ کو محسوس کیا۔''

ملک وہاب اپنی جگہ سے اٹھ کر شیخ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ شیخ نے اسے سہارا دے کر پھر اسے اس کی جگہ پر بٹھا دیا۔

''میں تمہارے سوال کا مثبت جواب دے رہا ہوں۔ میں اپنی بیٹی خدیجہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کو تیار ہوں۔'' شیخ نے کہا۔

اس کی بڑی بہن کے کرتوت کے سبب خدیجہ کی حیثیت گاؤں میں اتنی گر گئی تھی کہ شیخ نے ملک وہاب کے سیاہ رنگ، معمولی شکل اور ادنیٰ معاشرتی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے خدیجہ کی شادی اس سے کر دی اور اپنی جائداد میں سے ایک کمرا بھی اسے رہنے کے لیے دے دیا۔

یہ شادی یوں بھی بے جوڑ تھی کہ ملک وہاب تیس سال کا پختہ کار مرد تھا جبکہ خدیجہ ابھی صرف تیرہ سال کی ہوئی تھی۔ تیرہ سال بھی ایسے کہ اس گاؤں میں قدم نہ نکالتے ہوئے گزارے تھے۔

ملک وہاب جب شہر میں تھا تو ہمیشہ شہر کی رہنے والی تعلیم یافتہ بیوی کا خواہش مند تھا لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ اسے خدیجہ سے شادی کرنی پڑی۔ اس کے باوجود

وہ اس کوشش میں تھا کہ خدیجہ کو لے کر شہر چلا جائے گا۔ اس کی عمر کچی ہے بڑی آسانی سے شہر کے ماحول میں ڈھل جائے گی۔ اس نے ایک منصوبے کے تحت خدیجہ کو قاہرہ کی گلیوں کی کہانیاں سنانی شروع کردیں۔ جب خدیجہ اس کی زبانی بلندوبالا عمارتوں، برقی روشنیوں، وسیع وعریض سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹر کاروں اور بسوں کے قصے سنتی تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔

وہ جب ان باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگی تو ملک وہاب کو یقین ہوگیا کہ وہ مرعوب ہوچکی ہے۔ اس نے اسے مزید مرعوب کرنے کے لیے ایک دن اپنا مقفل ٹرنک کھولا۔ اس میں رکھے ہوئے اپنے مغربی ملبوسات کو باہر نکالا۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں نکٹائی تھی۔ پاؤں میں جرابیں اور بوٹ تھے۔ انگریزی ہیٹ ہاتھ میں تھا۔ ابھی وہ ہیٹ پہننے نہیں پایا تھا کہ خدیجہ نے ہیٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور زمین پر پھینک کر اسے پیروں سے مسل دیا۔ ملک وہاب نے خدیجہ کو دھکا دیا اور ہیٹ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

''میں تمہیں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مہذب لوگوں کا لباس یہ ہوتا ہے۔ تم جب شہر جاؤ گی تو تمہیں بھی وہاں کا لباس پہننا پڑے گا۔''

''اس لباس کو ابھی اسی وقت اتارو۔''

''وہ تو میں اتاردوں گا۔ ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ یہ لباس تمہیں پسند آیا؟''

''میں کہتی ہوں اس لباس کو فوراً اتارو۔'' خدیجہ نے غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

''کبھی نہیں۔ اب میں یہی لباس پہنا کروں گا۔''

چودہ سال کی لڑکی میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی۔ اس نے وہ کیا جو ملک وہاب کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر رائفل اٹھائی اور اس کا رخ ملک وہاب کی جانب کردیا۔

''خدیجہ! کیا پاگل ہوگئی ہو۔ بندوق ہٹاؤ۔''

''پہلے تم یہ بتاؤ تم ہم میں سے ہو یا کفار کی قوم سے۔ غدار ہو، انگریزوں کے جاسوس ہو کیا ہو۔ اب تو مجھے اپنے باپ کو بتانا پڑے گا۔''

''اچھا اچھا۔ اپنے باپ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی لباس تبدیل کرکے آتا ہوں۔'' ملک وہاب نے وہی ڈھیلا ڈھالا لباس پہن لیا۔

اس دن کے بعد سے اس نے شہر جانے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ اس کی باقی زندگی انہی کھیتوں میں گزر گئی۔

خدیجہ کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا ضرور لیکن چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کی جدائی کا داغ دل پر لے کر بھی وہ خدا کا شکر ادا کرتی رہی اور جب احمد خلیل پیدا ہوا تو اس کی معذوری بھی کسی اچھے مستقبل کی نشاندہی نہیں کررہی تھی۔

☆☆☆

ملک وہاب دن بھر کا تھکا ماندہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ خدیجہ باورچی خانے میں بیٹھی اسٹوو جلانے میں مشغول تھی تاکہ رات کے کھانے کا بندوبست کرسکے۔ ملک وہاب اسے نظرانداز کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آج کھیتوں سے گزرتا ہوا ''نجبا'' کی سرحد کے قریب ایک باغ میں چلا گیا تھا اور کچھ نارنگیاں توڑ کر جیبوں میں بھر لی تھیں۔ وہ جلد سے جلد اس خوشی کے رنگ دیکھنا چاہتا تھا جو ان نارنگیوں کو دیکھ کر احمد خلیل کے چہرے پر ابھرنے والی تھی۔

احمد خلیل بدستور اکڑوں بیٹھا دیواروں کو گھور رہا تھا۔ باپ پر نظر پڑنے کے باوجود بھی اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ ملک وہاب نے اپنی جیب سے دو نارنگیاں نکال کر اسے دکھائیں۔ احمد خلیل کی چمک دار آنکھیں مزید چمکنے لگیں۔ وہ خوشی سے چلا اٹھا۔ ''ابا یہ نارنگیاں مجھے دو۔'' ملک وہاب بھی اسے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''اگر چل سکتے ہو تو اٹھو اور یہ نارنگیاں لے لو۔''

احمد خلیل کی پتلی ٹانگوں میں جنبش ہوئی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ملک وہاب کی آنکھوں میں حیرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ٹنگنے میں جان پڑگئی تھی۔

ملک وہاب نے بے انتہا خوشی اور کسی قدر گھبراہٹ کے عالم میں خدیجہ کو آواز دی۔ خدیجہ اس کی آواز پر دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے بھی یہی دیکھا کہ احمد خلیل کوئی معجزہ دکھا رہا ہے۔ ملک وہاب نے بازو پھیلائے اور احمد خلیل کو آگے بڑھنے پر زور دیا۔ اس نے قدم بڑھایا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ گر پڑا۔ وہ ہمت کرکے پھر اٹھا اور بالآخر اس نے رینگنا شروع کردیا اور باپ تک پہنچ گیا تاکہ نارنگیاں لے سکے۔ اس کا باپ اور پیچھے ہٹ گیا۔ احمد خلیل اور آگے بڑھ گیا۔ جس طرح وہ چل رہا تھا اسے چلنا ہرگز نہیں کہہ سکتے تھے لیکن یہ کیا کم تھا کہ وہ کسی سہارے کے بغیر رینگ رہا تھا۔

خدیجہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ تو... بہ مشکل اکڑوں بیٹھتا تھا اور اب چل رہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ بیٹھی

تھی کہ جو بچہ چار سال کا ہو کر بھی نہیں چل سکتا، اب کیا چلے گا۔ اس نے آگے بڑھ کر احمد خلیل کو گود میں اٹھالیا اور بے تحاشا اس کے رخساروں کو چومنے لگی۔

"اتنی مشکل سے تو اس نے چلنا شروع کیا ہے تم پھر اسے گود میں لے کر کھڑی ہو گئیں۔"

"میرا بچہ تھک جائے گا۔ میں اسے روزانہ تھوڑا تھوڑا چلاؤں گی۔" خدیجہ نے کہا اور اسے گود سے نیچے اتار دیا۔

ملک وہاب نے یہودیوں کے باغ سے چرائی ہوئی نارنگیاں اس کے آگے رکھ دیں۔

خدیجہ کو ابھی تک حیرت ہو رہی تھی کہ احمد خلیل کس طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ملک وہاب نے اسے اپنی چوری کی داستان سنائی۔

"احمد خلیل کی کمزوری ہماری غربت تھی۔ مجھے داد دو کہ میں... سرحد عبور کر کے انڈے اور پھل چرا کر لاتا اور احمد خلیل کو کھلاتا رہا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یہ اسی غذا کا اثر ہے کہ احمد خلیل چلنے کے قابل ہو گیا۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو خدیجہ یقیناً ملک وہاب سے لڑتی کہ اس نے چوری کی لیکن اس وقت تو وہ نہ صرف خوش ہوئی بلکہ شوہر کے ساتھ مل کر خود بھی اس چوری میں شریک ہو گئی۔

احمد خلیل کو بہترین پھل، بھیڑ کا گوشت اور دوسری چیزیں کھانے کو ملنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھا کر بھاگنے کے قابل ہو گئیں۔ اب اس کا زیادہ تر وقت اپنے ماموں زاد بھائی عبدالعزیز اور ماموں زاد بہن اسما کے ساتھ کھیلنے میں گزرتا۔ جیسے ہی صبح ہوتی اور اس کی آنکھ کھلتی وہ تنگ سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچ جاتا اور پھر تینوں مل کر ایک چھت سے دوسری چھت پر بھاگتے پھرتے۔

ملک وہاب کو جیسے ہی یہ یقین ہوا کہ اب احمد خلیل معمول کی زندگی گزار سکے گا، اس نے وہ تمام خواب احمد خلیل کی سماعتوں کے حوالے کرنے شروع کر دیے جو اس نے کبھی دیکھے تھے لیکن خوابوں کی ان تصویروں میں رنگ نہیں بھر سکا تھا۔ اب اسے امید ہونے لگی تھی کہ احمد خلیل ان خوابوں کو ضرور پورا کرے گا۔ وہ اپنی محرومیاں احمد خلیل کے ذریعے پوری کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب سونے کے لیے اس کے پاس لیٹتا تو وہ اسے جدید دنیا کی نئی نئی چیزوں کے بارے میں بتاتا رہتا۔

"تم نے آسمان پر اڑنے والے جہاز کو دیکھا ہے؟" ملک وہاب اس سے پوچھتا۔

"ہاں دیکھا تو ہے۔"

"تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم بھی اس میں بیٹھو۔"

"دل چاہتا تو ہے۔"

"تم بہت جلد اس میں بیٹھو گے۔"

"مگر کب؟"

"بہت جلد۔ تم ہمیشہ یہاں نہیں رہو گے۔ عراق المنشیا، فلسطین میں سب سے زیادہ مفلس اور پسماندہ علاقہ ہے۔ میں تو یہاں رہنے پر مجبور تھا لیکن تم یہاں نہیں رہو گے۔ میں تمہیں جدید اسکول میں تعلیم دلواؤں گا۔ قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرو گے پھر تم وکیل یا ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ میں تمہیں کسان بنانا نہیں چاہوں گا میرے بیٹے۔"

وہ یہ باتیں روز ہی کرتا تھا۔ احمد خلیل ان باتوں کو سنتا بھی تھا اور دل ہی میں دعائیں بھی کرتا تھا کہ کاش! اس کا باپ اسے لے کر بھی قاہرہ جائے۔

دوسری طرف اس کے نانا شیخ الحق تھے جو چھ سالہ احمد خلیل کو ایک مجاہد کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسے یہودیوں کے مظالم اور فلسطین کی آزادی کی راہ میں رکاوٹوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

"آزادی کی اس جنگ میں میرے چھ بیٹے شہید ہو چکے ہیں۔ اب صرف یوسف ملک بچا ہے۔ تم جلدی سے جوان ہو جاؤ تاکہ یہودیوں سے بدلہ لے سکو۔"

"یہ یہودی لوگ ہمارے دشمن کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ ہماری زمینوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ جب تک ہماری بندوقوں میں دم ہے، ہم انہیں اپنے گاؤں میں گھسنے نہیں دیں گے۔ میں تمہیں بھی بہت جلد بندوق چلانا سکھاؤں گا۔"

یہودیوں کے مظالم کی داستانیں سن کر ننھے احمد خلیل پر ایسا اثر ہوا کہ دن بھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا۔ کوئی خواب تھا جو وہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا بالکل ترک کر دیا تھا بس ایک اسما تھی جو اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی لیکن وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کی کیفیت کے بارے میں اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اگر کچھ بتاتا بھی تو وہ سمجھنے سے قاصر رہتی۔

شیخ الحق نے احمد خلیل کا یہ ذوق و شوق دیکھا تو وہ اسے مستقل اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ جہاں کہیں جاتے احمد خلیل ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ اسے گرد و نواح کے دیہات، صحراؤں میں رہنے والے بدوؤں کے ڈیروں، نجبا اور دوسری یہودیوں کی نوآبادیوں حتیٰ کہ خوفناک صیہونی دہشت گردوں کی تنظیم "ارگن" کے خفیہ اڈوں تک پہنچ جاتے۔

برطانوی اہلکاروں کے ساتھ مذاکرات شروع ہو گئے تھے۔ انہیں غزہ کے برطانوی گورنر نے مذاکرات کے لیے طلب کیا تو وہ احمد خلیل کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ پیدل ہی غزہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ احمد خلیل چلتے چلتے تھک جاتا تو وہ اسے کندھے پر اٹھا لیتے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے پھر نیچے اتار دیتے۔ اسی طرح باریاں بدلتے بدلتے وہ غزہ تک پہنچ گئے۔ احمد خلیل پہلی مرتبہ غزہ آیا تھا۔ اس کے لیے تو یہی قاہرہ تھا۔ بڑے بڑے بازاروں سے گزرتا ہوا وہ برطانوی گورنر کی وسیع وعریض رہائش گاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ گورنر باہر آیا ضرور لیکن شیخ اسحٰق کے ننگے پاؤں اور پیوند لگے کپڑے دیکھ کر برہم ہو گیا۔

''یہاں بھکاریوں کا داخلہ منع ہے۔''

''میں بھکاری نہیں ہوں۔ آپ نے خود ہی مجھ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ میں آپ کے بلانے پر آیا ہوں۔''

''کون ہو تم؟''

''میں عراق المنشیا کا شیخ ہوں۔''

یہ سنتے ہی گورنر کا لب ولہجہ تبدیل ہو گیا۔ ''معاف کیجیے گا۔ میں تو آپ کو بلا کر بھول ہی گیا تھا۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔'' شیخ نے احمد خلیل کی انگلی تھامی اور گورنر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

''یہ میرا نواسہ احمد خلیل ہے۔''

گورنر نے بچے کی طرف دیکھا جو تقریباً بے لباس تھا اور ایک صوفے کی طرف اشارہ کر کے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ احمد خلیل نے اس سے پہلے نہ تو صوفے دیکھے تھے نہ زمین پر پڑا ہوا دبیز قالین۔ کمرے میں جو کچھ تھا، وہ سب اس کے لیے نیا تھا اور دلکش بھی۔ وہ مبہوت ہو کر ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اسے باپ کی بتائی ہوئی۔۔ایک ایک بات یاد آ رہی تھی کہ شہروں میں کیا کیا ہوتا ہے۔ ابھی وہ اس حیرانی سے دوچار تھا کہ ایک ایسی چیز کمرے میں داخل ہوئی جس نے احمد خلیل کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ یہ گورنر کی بیوی تھی۔ احمد خلیل نے اس سے پہلے کسی انگریز عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے شانوں سے بھی اوپر چھوٹے بالوں، گھٹنوں سے اوپر اسکرٹ، موٹی ننگی پنڈلیوں اور اونچی ایڑھی والے جوتوں کو دیکھتا رہا۔ اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ وہ ان باتوں پر بھی غور نہیں کر رہا تھا جو اس کے نانا اور انگریز گورنر کے درمیان کچھ انگریزی کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی میں ہو رہی تھیں۔ اس کی توجہ میں ہلچل اس وقت ہوئی جب چند انگریز کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ برطانوی اہل کار تھے جو مذاکرات میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا۔ گورنر تو کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی بول لیتا تھا لیکن یہ لوگ عربی سے قطعی ناواقف تھے اس لیے مترجم کا ہونا ضروری تھا۔

گورنر کی بیوی اٹھ کر چلی گئی۔ احمد خلیل کسمسا کر رہ گیا۔ اسے مجبوراً ہونے والی گفتگو پر کان لگانے پڑے۔ مذاکرات کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

شیخ اسحٰق کا اصرار اس بات پر تھا کہ مزید یہودیوں کو آبادکاری سے روکا جائے ورنہ جس امن وامان کی حکومت برطانیہ خواہاں ہے وہ کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔

گورنر کا کہنا تھا کہ یہ آبادکار باقاعدہ زمین خرید کر آباد ہو رہے ہیں اس لیے شیخ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

شیخ کا کہنا تھا۔

''بعض جاگیردار لالچ میں آ کر زمین فروخت کر رہے ہیں۔ اس کاروبار کو روکنے کے لیے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے سخت ممانعت کا اعلان کرنا بہت ضروری ہے۔''

دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم تھے بالآخر شیخ کو نہایت سختی سے کہنا پڑا۔

''میں طاقت کے ذریعے زمینوں کی فروخت کی حوصلہ شکنی کروں گا۔ انگریزوں کے مفاد میں بہت بہتر ہو گا کہ وہ میرے کام میں مداخلت نہ کریں۔''

یہ کھلی دھمکی تھی لہٰذا ہر طرف سے شور مچنے لگا لیکن گورنر نے دانش مندی سے کام لیا اور یہ کہہ کر غم و غصے کو کم کر دیا کہ یہ بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ ایک نشست میں ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ہم پھر مل کر بیٹھیں گے اور کوئی فیصلہ کریں گے۔ شاید یہ دونوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔

مذاکرات ختم ہوتے ہی گورنر کی بیوی ایک مرتبہ پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ احمد خلیل کی دلچسپی کا سامان پھر آ گیا۔ اس کی آنکھیں اس گوری عورت کے چہرے پر پھر جم گئیں۔

اس عورت کے آتے ہی پٹی دار کوٹ پہنے ہوئے ایک لمبی ترکی ٹوپی والا نوکر ایک بڑی ٹرے میں مہمانوں کے لیے چائے وغیرہ لے آیا۔ اب احمد خلیل کو اس گوری عورت میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس کی نگاہیں پلیٹ پر جم گئیں۔ پلیٹ اس عورت کی گود میں رکھی ہوئی تھی اور وہ اس امید میں تھا کہ وہ اس سے کھانے کے لیے کہے گی۔

اس کھانے میں زیادہ تر حرام چیزیں تھیں یا ان پر حرام ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا اس لیے شیخ اسحٰق نے بھی کچھ

نہیں لیا تھا۔ بہت اصرار کے بعد اس نے کچھ پنیر کھا لیا تھا۔ اس نے احمد خلیل کو بھی کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

احمد خلیل بڑی بے تابی سے گورنر کی بیوی کی پلیٹ خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ان چیزوں پر اس کی نظر لگی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جب وہ عورت ان چیزوں میں سے کچھ چیزیں کھا چکے گی تو باقی چیزیں اسے دے دے گی۔ یہ امید اسے اس لیے تھی کہ ایسے ہی ایک واقعے سے وہ پہلے بھی دو چار ہو چکا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ گاؤں میں کسی کے گھر گیا تھا۔ اس گھر کی عورت ایک پلیٹ میں کچھ کھا رہی تھی۔ جب وہ کھا چکی تو بچی ہوئی باقی چیزیں اس نے اس کی طرف بڑھا دی تھیں۔ گورنر کی بیوی مزے سے کھا رہی تھی اور باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ پھر اسے جتنا کھانا تھا، کھا چکی۔ پیسٹری اور کیک کے چند ٹکڑے تھے جو اس کی پلیٹ میں رہ گئے تھے۔ اس نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا اور وہ عورت پلیٹ اس کی طرف بڑھانے لگی۔ اس سے پہلے کہ نوکر ہاتھ بڑھاتا، احمد خلیل نے ہاتھ بڑھایا اور جھپٹا مار کر بچا کھچا مال اٹھا لیا اور منہ میں ٹھونس کر حلق سے اتار لیا۔

وہ عورت اس بدتمیزی پر غصے سے لال ہو گئی۔ اس کی نیلی آنکھیں زہریلی ہو گئیں۔ وہ اس وقت ایک ناگن نظر آ رہی تھی جو کسی بھی وقت احمد خلیل کو ڈس لے گی۔ یہ عربوں سے اس کی بے پناہ نفرت ہی تھی جو بچے کی اس حرکت کو نظرانداز نہیں کر پا رہی تھی ورنہ وہ خود ہی اس کی طرف پلیٹ بڑھا دیتی۔

احمد خلیل اس عورت کے اس طرح گھور کر دیکھنے سے ایسا سہم گیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیخ اسحٰق اس صورت حال کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے احمد خلیل کا ہاتھ پکڑا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''آپ لوگوں نے اپنا قیمتی وقت مجھے دیا اس کے لیے شکرگزار ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔''

احمد خلیل ان کے ساتھ چل تو دیا لیکن باہر نکلتے ہی باقاعدہ رونے لگا۔

''کیوں روتے ہو۔ اب تو بس گھر ہی جانا ہے۔''

''میں اس لیے نہیں رو رہا ہوں۔'' اس نے اپنے میلے کرتے سے ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اس عورت کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ کتنی بے ہودگی سے مجھے گھور رہی تھی جیسے مجھے زندہ چبا جائے گی۔''

''غلطی اس کی نہیں تمہاری تھی۔ جب تمہیں کھانے کے لیے نہیں کہا گیا تو تم نے ان چیزوں کی طرف کیوں ہاتھ بڑھایا۔ انگریز ان باتوں کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ مجھے خود بہت شرم آ رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی ہو گی کہ عراق المنشیا کے لوگ کتنے ندیدے ہوتے ہیں۔''

''نانا! ایک بات کہوں؟''

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''جب یہ انگریز اپنے آگے کا بچا کھچا بھی ہمیں نہیں دے سکتے تو ہمارا حق ہمیں کیا دیں گے؟''

شیخ اسحٰق چلتے چلتے رک گئے اور اسے گود میں اٹھا لیا۔

''بیٹا، آج تو نے وہ بات کہہ دی جو آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ اپنی پلیٹ کبھی ہماری طرف نہیں بڑھائیں گے، ہمیں خود ہی چھیننا ہو گی۔''

''یہ عورت مجھے اس نفرت سے گھور رہی تھی کہ اگر کبھی آپ کے ساتھ یہاں آیا تو اس کی طرف اسی نفرت سے دیکھوں گا۔''

''تم نے یہ بھی ٹھیک کہا احمد خلیل۔ ان لوگوں کی چمڑی جتنی گوری ہے دل اتنے ہی کالے ہیں۔ یہ قوم اسی قابل ہے کہ اس سے نفرت کی جائے۔''

''پھر آپ ان لوگوں سے اتنا ہنس ہنس کر کیوں مل رہے تھے؟''

''برطانیہ کے پاس طاقت ہے۔ ہم طاقت سے نہیں لڑ سکتے۔ میں ان تک اپنی بات پہنچا دوں، یہی بہت ہے اور میں یہی کر رہا ہوں۔''

''ہمارے پاس طاقت کیوں نہیں ہے؟''

''تم ابھی چھوٹے ہو۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔''

اس کے بعد احمد خلیل کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ چپ ہو گیا اور اسی خاموشی میں راستہ کٹتا رہا۔ جب وہ عراق المنشیا کے قریب پہنچنے لگے تو احمد خلیل کو اسما کی یاد آئی۔ پورا دن ہو گیا تھا اس نے اسما کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسما سے اتنی دیر دور رہا تھا۔ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ شیخ اسحٰق کے آگے آگے چلنے لگا اور جونہی اسے صحرا میں پڑی ہوئی جھگیاں نظر آئیں، وہ بھاگتا ہوا گاؤں میں داخل ہو گیا اور نانا سے پہلے ہی اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اسما اس کے انتظار میں اس کی ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بھی اسی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اسما نے اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے خفا ہے۔ اس کی ماں نے اسما کی طرف دیکھا اور اپنی ہنسی روکے بغیر نہ رہ سکی۔

''اسما تم سے ناراض ہے۔'' اس کی ماں نے اس سے کہا۔

''ناراض ہے تو ہوا کرے۔ میں کیا کروں۔''

''یہ نہیں پوچھو گے کیوں ناراض ہے؟''

''میں کیوں پوچھوں؟''

''تم دن بھر کے بعد آئے ہو اس لیے تم سے ناراض ہے۔''

''میں تو نانا کے ساتھ گیا تھا۔ آپ نے اسے بتایا نہیں؟''

''میں نے تو بتا دیا تھا اب تم بھی بتا دو۔''

احمد خلیل نے اسما کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ماں نے تجھے بتا تو دیا تھا کہ میں نانا کے ساتھ گیا ہوں۔''

''ماں نے تو بتایا تھا مگر تم بتا کر کیوں نہیں گئے؟ میں ہی نہیں عبدالعزیز بھی تم سے خفا ہے۔ اب کوئی تمہارے ساتھ نہیں کھیلے گا۔''

''تم دونوں اتنا تو سوتے ہو۔ میں نانا کے ساتھ صبح ہی صبح نکل گیا تھا۔ تمہیں کیسے بتاتا؟''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ میں سو رہی تھی تو تم کیسے مجھے بتاتے۔ آؤ کھیلتے ہیں۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ دونوں چھت پر چلے گئے۔ احمد خلیل نے اپنی جیب سے کیک کے چند ٹکڑے نکالے۔

''یہ لو کھاؤ۔ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔''

''میرے لیے...... کہاں سے لائے ہو؟''

''میں نانا کے ساتھ انگریزوں سے ملنے گیا تھا۔ وہاں ایک انگریز عورت بھی تھی۔ اتنی گوری تھی کہ تمہیں کیا بتاؤں، یہ کیک اسی نے مجھے دیا تھا۔ میں نے تھوڑا سا تمہارے لیے رکھ لیا تھا۔''

''احمد! تم کتنے اچھے ہو۔ اب میں روز تمہارے ساتھ کھیلا کروں گا۔''

☆☆☆

ایک روز ایک اجنبی مہمان شیخ اسحٰق کے دروازے پر آیا۔ یہ ایک نوجوان تھا جس کے بدن پر پھٹا پرانا لباس تھا۔ اس نے اپنا تعارف شمالی علاقے کے ایک دور دراز گاؤں کے ایک دہقان کی حیثیت سے کرایا۔

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، آپ کے حوصلے اور شجاعت کی تعریف سنی ہے۔ میں ایک عام سا نوجوان ہوں لیکن آپ کی تعریف سن کر میرے دل میں جہاد کی آرزو مچلنے لگی ہے۔ میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ آپ کے زیرکمان دشمن سے لڑوں گا لیکن میرے پاس جنگ کرنے کے لیے ہتھیار نہیں ہیں۔ مجھے حکم دیجیے میں آپ کے لیے کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں۔''

''میں تمہارے جذبے کو سراہتا ہوں۔ ہم ضرورت کا ہر ہتھیار تمہیں مہیا کریں گے۔ ہمیں تو ایسے نوجوانوں کی تلاش رہتی ہے جن کے دلوں میں آزادی کا جذبہ کروٹیں لیتا ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے قبول کیا۔ اسی طرح میری طرف سے یہ ہدیہ بھی قبول فرمائیے۔'' اس نے آٹے کا ایک تھیلا ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ میں صبح کو دوبارہ آؤں گا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم ہمارے ساتھ یہیں کھانا کھاؤ اور رات یہیں بسر کرو۔''

''میں صبح پوری تیاری سے آؤں گا۔ اس وقت مجھے جانے دیجیے۔''

''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم مہمان کو بھوکا نہیں جانے دیتے۔''

شیخ نے خدیجہ کو حکم دیا کہ وہ مہمان کے لیے جلدی سے کھانا پکائے۔ خدیجہ نے آٹے کا تھیلا اٹھایا اور کھانا تیار کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلی گئی۔

ان لوگوں سے کچھ دور احمد خلیل اور اس کا ماموں زاد عبدالعزیز ایک چٹائی پر بیٹھے خالی کارتوسوں سے کھیل رہے تھے۔

''یہ آپ کے لڑکے ہیں؟'' مہمان نے پوچھا۔

''ایک میرا پوتا ہے ایک نواسا۔''

''یہ بچے تو بہت دبلے ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں عراق المنشیا کی غربت کا اندازہ کرسکتا ہوں۔''

''اسی کا تو رونا ہے۔ برطانوی پالیسی یہودیوں کی طرف داری کر رہی ہے۔ یہودی آبادکار فلسطینی علاقوں میں برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ جاگیرداروں کو خرید لیا گیا ہے جو اپنی زمینیں یہودیوں کے آگے گوشت کی بوٹیوں کی طرح ڈال رہے ہیں۔ یہودیوں کا جہاں بس چلتا ہے زمین خریدنے کی زحمت بھی نہیں کرتے، زبردستی قبضہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں۔ انہی چیرہ دستیوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے کھیت سمٹ سکڑ کر چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بدل گئے ہیں۔ ان یہودیوں نے ہماری زمینیں چھینیں، ہمارے مویشیوں، فصلوں اور پانی پر قبضہ کرنے کے بعد ہمیں یہاں سے باہر نکالنے کی کوششیں کیں۔ ان جھڑپوں میں، میں اپنے چھ بیٹے گنوا چکا ہوں۔ یہ میرے بیٹوں کی بہادری تھی کہ ہم نے انہیں ہمیشہ مار بھگایا۔ جب میرے سارے بیٹے صحرا کی وسعتوں میں اونٹوں پر سوار ہوکر انہیں تیز رفتاری سے بھگاتے تھے اور ان کے ہتھیار سورج کی روشنی میں چمکتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے صحرا میں زلزلہ آگیا ہو۔ ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ یہودی اور برطانوی آبادکار انہیں ان

کے اصلی ناموں کے بجائے ''صحرا کی دہشت'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

''ہمیں ان یہودی آبادکاروں نے اس حال کو پہنچا دیا ورنہ ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ ہمارے برتن گھی میں پکائے ہوئے گوشت، کھجوروں اور دودھ سے لبالب بھرے رہتے تھے تاکہ ان مہمانوں کی تواضع کر سکیں جو ہماری مہمان نوازی کا شہرہ سن کر آتے تھے اور کئی کئی دن قیام کرتے تھے۔ میرے عزیز مہمان! اب یہ حال ہے کہ تمہاری تواضع کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

''آپ کی محبت ہی میری تواضع ہے۔ خدا نے چاہا تو آپ یہودیوں پر ضرور غلبہ پالیں گے اور پھر وہی سہانے دن لوٹ آئیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' شیخ نے کہا اور خدیجہ کو ایک مرتبہ پھر آواز دی کہ وہ کھانا جلدی لے آئے۔

کھانا آگیا تو بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ پہلے مہمان کھائے اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ گھر کے دوسرے افراد کھائیں گے تاکہ مہمان کو کھانا کم نہ پڑ جائے۔ اجنبی مہمان نے یہ ضد ضرور کی تھی کہ بچوں کو بھی ساتھ بٹھالیا جائے لیکن شیخ نے اصرار کر کے بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

جب مہمان اور شیخ کھانے کے لیے بیٹھے تو مہمان نے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا اور چھری سے اس کے ٹکڑے کرنے لگا۔

شیخ نے کئی دن ہو گئے تھے، پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ کئی دن سے ابلے ہوئے چاولوں پر اس کا گزارہ تھا۔ گرم گرم روٹیاں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ایک بڑے ڈونگے میں شوربا انڈیلا اور روٹی کے ٹکڑوں کو اس میں بھگو لیا۔

''یہ بازار کا سب سے عمدہ آٹا ہے جو میں آپ کے لیے لایا ہوں۔'' مہمان نے کہا۔

''اس کی سوندھی خوشبو بتا رہی ہے کہ یہ بہت عمدہ آٹا ہے۔'' شیخ نے کہا اور جلدی جلدی روٹی کے ٹکڑے منہ میں رکھنے لگا۔

مہمان نے روٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ وہ گوشت کے ٹکڑے چبا رہا تھا اور ترچھی آنکھوں سے شیخ کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔

شوربے میں بھیگی ہوئی روٹی ختم کرنے کے بعد شیخ نے ڈونگے کو منہ سے لگالیا اور ایک ہی سانس میں شوربا ختم کرلیا۔ آٹے میں ملا ہوا زہر شوربے میں حل ہو گیا تھا۔ زہر نے فوراً اثر دکھایا۔ شیخ اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ قاتل مہمان نے اپنے جوتے سنبھالے اور بھاگنے کی فکر کی۔ شیخ کی قسمت اچھی تھی کہ شیخ کا بیٹا یوسف ملک یہ دیکھنے کے لیے کمرے میں داخل ہوا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ شیخ اس وقت آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''یہ آٹا زہر آلود ہے۔''

مہمان نے دیکھا کہ راز کھل گیا ہے تو بھاگنے لگا مگر یوسف نے قاتل کو دبوچ لیا۔ قاتل بھی جوان آدمی تھا اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن یوسف ملک کے مضبوط ہاتھوں میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ شور سن کر ملک وہاب بھی دوڑتا ہوا آیا۔

خدیجہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ چند لمحے نہیں گزرے تھے کہ شیخ کا کمرہ تند خو قبائلیوں سے بھر گیا۔ شیخ اسحٰق اس دوران دم توڑ چکا تھا۔

یوسف ملک نے ملک وہاب کی کمر میں بندھا ہوا خنجر نکالا اور چاہا کہ قاتل کو قتل کر دے لیکن ملک وہاب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہمیں قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔''

''اس صحرا میں کوئی قانون نہیں چلتا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا، ہم نے اسے مار کر کہاں دفنا دیا۔''

''اس صورت میں یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ یہ شخص کون تھا اور کس کے کہنے پر یہاں آیا تھا۔''

''خنجر کی نوک پر یہ سب کچھ بتا دے گا۔''

''دنیا کو پھر بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ برطانوی پارساؤں کو بھی تو معلوم ہو کہ ہماری جانوں کو کس کس سے خطرہ ہے۔ شیخ چند ماہ پہلے ہی برطانوی گورنر سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔ وہ ضرور ان کے قتل کی تفتیش میں دلچسپی لے گا اور ہمیں انصاف ملے گا۔''

''تمہیں تمہاری تعلیم نے ناکارہ کر دیا ہے۔ صحرا کا یہ دستور نہیں کہ قاتل کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔''

''میں زندہ چھوڑنے کی صلاح نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اسے غزہ کے پولیس اسٹیشن لے جایا جائے جہاں اسے قانون کے مطابق سزا ملے گی اور دنیا کو معلوم بھی ہو جائے گا کہ عرب مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے۔''

یوسف ملک نے اپنے خنجر کی نوک قاتل کی گردن سے ہٹالی۔

"جو تمہارا جی چاہے کرو۔"

دیگر قبائلیوں نے بھی ملک وہاب کی تجویز کے سامنے سر جھکا دیا۔ ملزم کو زنجیروں میں جکڑ کر قافلے کی صورت میں غزہ کے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔

شیخ الحق کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دوسرے دن کے اخباروں نے اس خبر کو سرخی بنا کر لگایا۔ عراق المنشیا میں تو اخبار آتا ہی نہیں تھا لیکن غزہ اور دوسرے شہروں میں اس خبر نے خوب شور مچایا۔

جنوب کی طرف سے اخوان المسلمون کے کارکن گروہ در گروہ گاؤں میں داخل ہونے لگے اور شیخ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔

سیکڑوں قبائلیوں اور دیگر سوگواروں کا ماتمی جلوس خاموشی سے گلی میں سے گزرتا رہا۔ احمد خلیل دروازے پر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔

اخوان المسلمون کے کارکن جنازہ اپنے کندھے پر اٹھائے گاؤں کے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ گاؤں سے باہر نکل کر ایک انتہائی سادہ قبر بنا دی گئی۔ صحرا کے سناٹے میں آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شہیدوں کی قبروں میں ایک قبر کا اور اضافہ ہو گیا۔

ملک وہاب چونکہ روانی سے انگریزی بول سکتے تھے اس لیے ان کی ڈیوٹی یہ لگائی گئی تھی کہ وہ غزہ پولیس اسٹیشن سے برابر رابطے میں رہیں کہ قاتل سے کیا تفتیش کی جا رہی ہے۔ ملک وہاب ہر دوسرے تیسرے دن پولیس اسٹیشن جا کر معلومات لے لیتے تھے۔

تفتیش کے مراحل کے دوران ان کے علم میں یہ بات آئی کہ قاتل کی شناخت گاؤں کے جاگیردار نجم آفندی کے چچا زاد بھائی کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ اس کے قبضے سے برآمد شدہ کاغذات میں سے تل ابیب کی ایک یہودی ایجنسی کا واضح ٹائپ شدہ ایک خط بھی ملا۔ خط میں اسے پیشکش کی گئی تھی کہ اگر وہ صحرا کے دہشت گرد (شیخ الحق) کو ٹھکانے لگا دے تو اس کے صلے میں اسے پانچ سو برطانوی پاؤنڈ کا انعام دیا جائے گا۔ اسے آزادی دی گئی تھی کہ طریقۂ قتل وہ جو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

یہ ایسی سخت گرفت تھی کہ اس ثبوت کے بعد قاتل کا بچ نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ قاتل ثابت ہو چکا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے کس کے کہنے پر یہ قدم اٹھایا۔

گاؤں کے کھلے میدان میں جلتے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے قبائلیوں کو ملک وہاب نے بتا بھی دیا کہ قاتل کی شناخت بھی ہو چکی ہے اور ثبوت بھی مل گئے ہیں۔ اس نے اقرارِ جرم بھی کر لیا ہے۔ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت سزا سے بچا نہیں سکتی۔

جس روز ملک وہاب نے گاؤں والوں کو یہ اطلاع پہنچائی، اس سے اگلے ہی دن غزہ کے برطانوی گورنر نے پولیس کو اس کی رہائی کا حکم دے دیا۔ قاتل حیفہ شہر کے شمالی علاقے کی جانب بھاگ گیا۔ گاؤں والوں نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

☆☆☆

ملک وہاب عشا کی نماز کے بعد گھر میں داخل ہوا تو احمد خلیل جاگ رہا تھا لیکن باپ کی آواز سنتے ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خود کو سویا ہوا ظاہر کرنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسے جاگتا ہوا دیکھ کر ماضی کا کوئی قصہ سنانے بیٹھ جائے یا نصیحتیں کرنے لگے۔ اس کے باپ نے آتے ہی اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسے آواز بھی دی تھی لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے سوتا ہوا دیکھ کر وہ بھی اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر کمرے میں گہری خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ کی آواز آئی۔

"احمد کے ابا، کیا سو گئے؟"

"نہیں تو، کیوں پوچھ رہی ہو...... کچھ کہنا ہے کیا؟"

"میں کئی دن سے آپ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔"

"جو کہنا ہے جلدی کہو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"میں ایک مرتبہ پھر ماں بننے والی ہوں۔"

"کیا؟ پھر سے کہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" ملک وہاب اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کئی سالوں سے احمد خلیل اپنے دل میں ایک بھائی یا ایک بہن کی آرزو رکھے ہوئے تھا۔ آخر اس کی دعا قبول ہو گئی۔"

"خوشی تو مجھے بھی بہت ہوتی ہے لیکن یہ ڈر لگتا ہے کہ ہمارے بچے زندہ نہیں رہتے۔"

"کیوں زندہ نہیں رہتے۔ احمد خلیل زندہ ہے کہ نہیں۔"

"کتنی مشکلوں سے اسے زندگی ملی ہے۔ معذور ہوتے ہوتے بچا ہے۔"

"اس مرتبہ ہم اپنے بچے کو شروع سے ہی اچھی غذائیں کھلائیں گے تاکہ وہ جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔"

احمد خلیل یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ سویا ہی کب تھا اور اب تو بالکل نہیں سو سکتا تھا۔ اسے یہ غصہ بھی تھا کہ جو بات

اماں کو مجھے بتانی تھی ابا کو بتا رہی ہیں۔ البتہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ماں بننا کیا ہوتا ہے۔ اگر میرے لیے کوئی بھائی لانا ہے تو پہلے ہی لے آئیں۔ سات سالہ احمد خلیل بہت سی باتیں سمجھ سکتا تھا، بہت سی باتیں اس کے لیے اجنبی تھیں۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو کمرے میں اکیلا تھا۔ خدیجہ اور ملک وہاب دونوں کھیتوں پر جا چکے تھے۔ ایک پلیٹ میں ابلے ہوئے چاول اس کے سرہانے رکھے تھے۔ یہ کوئی آج ہی نہیں ہوا تھا، روز ہی ایسا ہوتا تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھوئے بغیر جلدی جلدی چاول کھائے، کرتے سے ہاتھ پونچھے اور کمرے سے باہر آگیا۔ اسما اس کے انتظار میں کب سے ٹہل رہی تھی۔ سب ایک ہی گھر میں تو رہتے تھے بس کمرے الگ الگ تھے۔ اسے خود بھی اس وقت اسما کی ضرورت تھی۔ رات کی باتیں اب تک اس کے دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے تھیں۔ وہ اسے لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔

''تمہارے نخرے بہت جلد ختم ہونے والے ہیں۔'' احمد خلیل نے کہا۔

''کیوں، کیا تمہارے سینگ نکلنے والے ہیں؟''

''جی نہیں، میرا اپنا بھائی آنے والا ہے۔ اب مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''مجھے بھی تمہارے ساتھ کھیلنے کا شوق نہیں۔ میرا اپنا بھائی موجود ہے۔''

''ناراض ہوگئیں؟''

''اور نہیں تو کیا۔''

''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ یہ ماں بننا کیا ہوتا ہے۔ تم تو لڑکی ہو تمہیں معلوم ہوگا۔''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اماں رات ابا سے کہہ رہی تھیں کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔''

''جب وہ کہہ رہی تھیں تو انہی سے پوچھو، مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔''

اسما کو تو شاید کچھ معلوم ہی نہیں تھا اس لیے کچھ بھی بتانے سے قاصر رہی لیکن عبدالعزیز اس سے دو تین سال بڑا تھا، اس نے سب کچھ بتا دیا۔

''تمہاری اماں کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ یہی ماں بننا ہوتا ہے۔ جب اسما پیدا ہونے والی تھی، میری ماں نے بھی میرے ابا سے کہا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ پھر اسما پیدا ہوگئی تھی۔''

''پیدا کیسے ہوتے ہیں؟''

''بھئی یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ بہت سی عورتیں جمع ہوتی ہیں اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

احمد خلیل کچھ سمجھ سکا تھا کچھ نہیں لیکن اس دن کے بعد سے وہ اس انتظار میں رہنے لگا کہ کب عورتیں جمع ہوتی ہیں اور کب اس کا بھائی پیدا ہوتا ہے۔

عبدالعزیز کے بتانے پر وہ بہت کچھ سمجھنے لگا تھا لیکن اس گھر میں بچوں کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ بڑوں سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ ماں کو تکتا رہتا۔ پھر اس کا دھیان کچھ دنوں کے لیے کسی اور طرف ہوگیا۔ اس کے چچا منصور کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام رشید رکھا گیا۔ یہ بچہ احمد خلیل کے لیے کھلونا بن گیا۔ وہ چچا کے گھر چلا جاتا اور گھنٹوں رشید کو گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ کچھ دنوں کے لیے وہ یہ بھول ہی گیا کہ اس کا بھی کوئی بھائی آنے والا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے گھر میں معمول سے مختلف سرگرمیاں دیکھیں۔ اس کا باپ کسی جگہ سے ایک گدا اور ایک پلنگ مانگ کر لے آیا۔ اس کی ماں اس روز کھیت پر کام کرنے بھی نہیں گئی۔ صبح ہی سے اس کی دونوں چچیاں اور کچھ دوسری عورتیں بھی آگئیں۔ اس کے باپ نے اسے حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ کھیتوں پر چلے یا جہاں چاہے کھیلنے کے لیے چلا جائے لیکن اسے یاد تھا کہ جب رشید پیدا ہوا تھا تو اس کے گھر اسی طرح عورتیں جمع ہوئی تھیں اور پھر رشید پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے گھر میں بھی آج وہی چہل پہل تھی۔ وہ کمرے میں جا کر کئی مرتبہ دیکھ آیا تھا کہ اس کی ماں پلنگ پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے باپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ نہ تو کھیتوں پر گیا اور نہ کہیں اور کھیلنے کے لیے گیا۔ عبدالعزیز اور اسما بھی آگئے۔ تینوں بچے صحن میں کھیلتے رہے۔

دوپہر کے وقت بچے کی ولادت ہوئی۔ کسی عورت نے باہر آکر اسے خوش خبری دی۔ ''تیرے گھر بھائی آیا ہے۔''

''آگیا وہ۔ مجھے دیکھنے دو۔'' وہ بند دروازے کی طرف بھاگا لیکن دروازے پر ہی روک لیا گیا۔

''مجھے جانے دو۔ میں اندر جاؤں گا۔ مجھے اپنا بھائی دیکھنا ہے۔''

''نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی وہ نہائے گا۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے گا۔ پھر دیکھ لینا۔''

''اس گھر میں کس کے پاس اچھے کپڑے ہیں جو وہ اچھے کپڑے پہنے گا۔ میں اس کو ایسے ہی دیکھ لوں گا۔''

''تمہارے ابا آجائیں اس کے بعد دیکھ سکو گے۔''

"میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف دوڑ گیا۔

جب تک ملک وہاب آئے، عورتوں نے بچے کو نہلا دھلا کر تیار کر دیا۔ ملک وہاب نے اسلامی شعار کے مطابق بچے کے کان میں اذان دی۔ تب کہیں احمد خلیل کو اس کے بھائی کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے پہلی بار اپنے بھائی کو دیکھا۔ وہ قدرے ننھا منا لیکن صحت مند متناسب جسم، نرم جلد اور گھنگرالے بالوں والا بچہ تھا۔

بچے کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو خدیجہ نے ضد کر کے اس کا نام خلیفہ رکھا یعنی زمین پر اللہ کا نائب۔

خلیفہ چند ہفتوں کا ہوا تھا کہ خدیجہ نے محسوس کیا کہ وہ عام بچوں کی طرح چونچال نہیں۔ بالکل ساکت پڑا رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں چلاتا۔ رونا تو جیسے اسے آتا نہیں۔ خدیجہ رات بھر آرام سے سوتی رہتی۔ خود ہی چاہتی تو دودھ پلا دیتی ورنہ وہ تو دودھ کے لیے بھی نہیں روتا تھا۔

اس نے اس کا تذکرہ ملک وہاب سے کیا تو وہ بھی سوچ پڑ گیا۔ پھر اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔

"خدیجہ! تمہیں یاد ہے۔ احمد خلیل کتنا کمزور و ناتواں تھا۔ چار سال کا ہو گیا تھا، اپنے پیروں پر کھڑا تک نہیں ہو سکتا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"پھر کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے اچھی غذا دینی شروع کی تھی اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔"

"ہاں، یہ بھی یاد ہے۔"

"خلیفہ بھی کمزور ہے۔ اسی لیے وہ ہاتھ پاؤں نہیں چلاتا۔ رونے تک کی طاقت اس میں نہیں۔ اسے بھی اچھی غذا کی ضرورت ہے۔"

"یہ ابھی غذا کھانے کے لائق کہاں ہے۔"

"تمہارا دودھ تو پیتا ہے۔ تمہارے دودھ میں طاقت نہیں۔"

"میں بھی اچھی غذا کہاں سے کھاؤں۔ اب کی سردیوں میں بارش ہی نہیں ہوئی، گندم کی فصل بس اتنی ہوئی کہ جاگیردار کے آدمی سمیٹ کر لے گئے۔ ہمارے پاس کھانے کو کیا بچا ہے۔"

اس بات کا ملک وہاب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

دوسرے دن وہ موقع دیکھ کر یہودیوں کے علاقے "نجبا" میں داخل ہو گیا۔ واپس آیا تو اس کی جیبیں پھلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک زندہ مرغی بھی وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

"یہ خوراک میں بچے کے لیے نہیں تمہارے لیے لایا ہوں۔ تم اچھی خوراک کھاؤ گی تو تمہارے دودھ میں بھی طاقت آئے گی۔"

ملک وہاب کا جہاں تک بس چلتا، نجبا سے خوراک چرانے اور لوٹ مار کرنے میں مصروف رہنے لگا۔

خلیفہ کی پرورش اور دیکھ بھال میں مصروف ہو کر احمد خلیل کی طرف سے دھیان ہی ہٹ گیا۔ اسے باقاعدہ خوراک نہیں مل رہی تھی۔ وہ صرف دعوتوں اور تقریبات میں سے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے کھا کر پیٹ بھرنے لگا۔ گھر والوں نے بھی بچے کھچے پھینکے ہوئے کھانے پر گزارہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کم خوراکی نے اسے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ کمرے کے تاریک کونے میں اکڑوں بیٹھا اپنی ماں کو کھڈی پر کپڑا بنتے دیکھتا رہتا۔ قریب ہی ننھا خلیفہ ترسل کی بنی چٹائی پر لیٹا اپنے ہاتھ پاؤں ہوا میں چلاتا رہتا۔

اس دن بارش ہوئی تھی اور بارش کے بعد نہایت چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ سردیوں کی دھوپ تھی لہٰذا سب جھگیوں سے باہر نکل کر بیٹھ گئے۔ خدیجہ بھی کھلے دروازے کے قریب پاؤں پسارے بیٹھی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ احمد خلیل نے کھیل کے طور پر کنگھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور خدیجہ کے بال سنوار رہا تھا۔

ملک وہاب گھر سے باہر بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بھائی منصور اور کچھ دوسرے لوگ اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے جنہیں وہ اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے ان خبروں پر تبصرے بھی ہوتے جا رہے تھے۔ یہ اخبار تقریباً ایک ماہ پرانا تھا۔ عراق المنشیا میں ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی آتی تھیں۔ اس اخبار میں ہٹلر کی تصویر چھپی تھی اور اس کے نیچے اس کی ایک تقریر کا عربی متن شائع ہوا تھا لہٰذا اس وقت ہٹلر ہی کے بارے میں تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔

"ہٹلر ہمارا خیر خواہ اور دوست ہے۔" ملک وہاب پرزور دعوے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "اگر جرمن یہ جنگ جیت جائیں تو یہودی تباہ و برباد ہو جائیں گے اور فلسطین ایک آزاد عرب ریاست بن جائے گا۔"

"کمال ہے، تم ہٹلر کے مظالم کو جانتے ہو اس کے باوجود اس کی حمایت کر رہے ہو۔" یوسف ملک نے حجت کے انداز میں کہا۔ "صرف یہودی ہی اس کے مظالم کا شکار

نہیں بلکہ وہ تو خود ہمارا بھی دشمن ہے۔"
"وہ ہمارا دشمن نہیں دوست ہے۔" ملک وہاب نے اصرار کیا۔
"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" یوسف ملک نے پوچھا۔
"دشمن کا دشمن دوست ہی تو ہوتا ہے۔ ہٹلر یہودیوں کا دشمن ہے لہٰذا ہمارا دوست ہے۔"
"تمہارا نقطۂ نظر غلط ہے۔ ہٹلر ہمارا دوست نہیں دشمن ہے۔ یہودی آبادکاروں کے ریلے پہ ریلے صرف اس کی وجہ سے یہاں آرہے ہیں۔ اگر وہ یہودیوں کو تنگ کرنے کے بجائے ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرتا تو وہ اپنے آبائی وطن میں مطمئن رہتے اور ہمیں تنگ کرنے کے لیے یہاں وارد نہ ہوتے۔ یہ سب ہٹلر کی وجہ سے ہوا ہے۔"
اب اس بحث میں منصور بھی شامل ہوگیا۔
"تمہارے خیال میں کیا یہ جنگ فلسطین تک پھیل جائے گی؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو؟"
"ایسا ہو بھی سکتا ہے کیونکہ یہودی جہاں ہوتے ہیں ہٹلر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے جہاز بمباری کرتے ہیں۔"
"تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ جرمنی عنقریب حملہ کرنے والا ہے۔"
ابھی یوسف ملک کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ جھونپڑی کے اندر سے خلیفہ کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ ملک وہاب نے اخبار گلی میں پھینکا اور اندر پہنچ گیا۔ خدیجہ اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ خلیفہ ننگ دھڑنگ فرش پر لیٹا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اس کے بازو پر چوہے نے کاٹ لیا تھا۔ یہ راز اس لیے کھل گیا کہ خدیجہ کو ایک زرد رنگ کا چوہا نظر آگیا۔ ملک وہاب کے پہنچنے تک بھی وہ وہیں تھا لیکن جب ملک وہاب نے اپنا بھاری جوتا اس کی طرف پھینکا تو وہ ایک سوراخ میں غائب ہوگیا۔
ملک وہاب نے آگے بڑھ کر وہ سوراخ بند کردیا۔ خلیفہ درد کی شدت سے بری طرح چلا رہا تھا۔ خدیجہ اسے گود میں اٹھائے کمرے میں ٹہل رہی تھی اور اسے چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتی جارہی تھی۔
"یہ چوہے تو پورے گھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی کتنے سوراخ بند کرائے گا۔"
"میں انہیں پکڑنے کے لیے زہریلا پھندا لگاؤں گا۔" ملک وہاب کہہ رہا تھا۔
"ناممکن ناممکن۔ یہ بڑے ہوشیار ہیں، کبھی ہاتھ نہیں آئیں گے۔"
خلیفہ مسلسل روئے جارہا تھا۔ دوپہر تک اس کی یہی حالت رہی پھر اسے آرام آگیا۔
گاؤں میں چوہوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ بہتات کیا رنگ دکھائے گی۔ انہیں تو اس وقت معلوم ہوا جب بچوں میں بخار کی بیماری پھیلنے لگی۔ کئی بچے اس بخار کی وجہ سے مر بھی گئے۔ گاؤں میں نہ تو کوئی علاج کا بندوبست تھا اور نہ اس بیماری کے متعلق انہیں کوئی شعور تھا۔ بیماروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ ہر روز ان میں سے کئی مر بھی جاتے تھے۔
خدیجہ اور بہت سوں کی طرح مطمئن تھی کہ بیماری پھیل ضرور رہی ہے لیکن اس کا گھر تو محفوظ ہے لیکن ایک روز اس بیماری نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا۔ بیماری اور دشمن کمزور پر حملہ کرتے ہیں۔ احمد خلیل ہی سب سے کمزور تھا لہٰذا سب سے پہلے وہی بستر پر لیٹا۔ دن کا وقت تھا مگر وہ سو رہا تھا۔ خدیجہ کو اسے اس وقت سوتا ہوا دیکھ کر سخت غصہ آیا۔
"یہ دن ہے رات نہیں جو تم اس وقت پڑے سو رہے ہو۔ جاؤ کھیتوں پر جاؤ اور اپنے باپ کی مدد کرو۔"
اس طرح پکارنے پر بھی وہ اسی طرح ساکت پڑا رہا جیسے وہ سو نہیں رہا ہو بے ہوش ہوگیا ہو۔ خدیجہ نے اسے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ ہلکے سے کراہا۔ "میرا سر...... اماں میرا سر درد کی شدت سے پھٹا جارہا ہے۔"
"کیا ہوگیا تمہیں؟" خدیجہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اچھل پڑی۔ "تمہیں تو شدید بخار ہے۔ کہیں یہ وہی بخار تو نہیں۔"
وہ بھاگتی ہوئی گئی اور ایک بڑا کمبل اٹھا کر لے آئی جو وہ اس خوف سے استعمال بھی نہیں کرتی تھی کہ خراب ہوجائے گا۔ اس نے احمد خلیل کو اس کمبل میں لپیٹ دیا۔ پھر بھاگتی ہوئی اس پڑوسن کے گھر گئی جس کے بچے کو کچھ دن پہلے بخار آیا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا بلکہ کچھ دن بیمار رہ کر ٹھیک ہوگیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے کون سا ٹوٹکا استعمال کیا تھا۔
وہ وہاں سے جو کچھ پوچھ کر آئی اسے احمد خلیل پر آزماتے آزماتے شام ہوگئی۔ گھر میں خوفناک اندھیرا پھیل گیا تھا لیکن اس نے ابھی تک چراغ نہیں جلایا تھا۔ اس نے اسی اندھیرے میں تیمم کیا اور مغرب کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔
ملک وہاب اسی اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ پھر اس نے پتھر کا بنا ہوا چھوٹا سا چراغ جلایا اور دیوار کے طاق میں عین اپنے سر کے اوپر کی سیدھ میں

رکھ دیا۔

خدیجہ نماز سے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ ملک وہاب کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

''تمہیں معلوم بھی ہے یہاں کیا ہو گیا۔''

''مجھے منصور اور یوسف ملک نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ وہی منحوس بخار ہے۔''

''میں نے کہا نا تم فکر مت کرو۔ میں اسے کل ہی غزہ لے کر جاؤں گا۔ اس گاؤں کے جاہل لوگ اسی طرح مرتے رہیں لیکن میں اپنے بچے کو بچا لوں گا۔ بس یہ رات گزر جائے...... بس یہ رات۔''

احمد خلیل نے بے ہوشی کے عالم میں پانی مانگا۔ خدیجہ نے اس کے ہونٹوں سے صراحی لگا دی۔

''کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ ہم سب اس میں جل جائیں گے۔'' احمد خلیل ہذیانی انداز میں چیخا۔

''تمہارے ابا تمہیں کل ہی غزہ کے اسپتال لے جائیں گے۔ ابھی تم آرام سے سو جاؤ۔''

خدیجہ اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے کے بعد ملک وہاب پر ایسی تھکن طاری ہوئی تھی کہ وہ مدہوشی کے عالم میں گیا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

خدیجہ رات بھر احمد خلیل کے سرہانے بیٹھی رہی۔ اس نے ملک وہاب کی طرف غور ہی نہیں کیا۔ صبح فجر کی اذان ہوئی اور خلاف معمول ملک وہاب سو کر نہیں اٹھا تو وہ اس کے بستر کی طرف گئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ''یہ بے چارے بھی کیا کریں۔ کھیتوں میں اتنا تھک جاتے ہیں کہ اب دیکھو تن بدن کا ہوش نہیں۔'' خدیجہ نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے سوچا اسے ابھی نہ اٹھائے کچھ دیر اور سونے دے لیکن پھر اسے یاد آیا، احمد خلیل کو غزہ کے اسپتال لے جانا ہے۔ یہ اٹھیں گے تو جائیں گے نا۔ اس نے ملک وہاب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ ملک وہاب کا ہاتھ نہ ہو کوئی انگارہ ہو۔ ''یا اللہ خیر! یہ تو ویسا ہی بخار ہے جیسا احمد خلیل کو ہوا تھا۔'' اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کی آواز سن کر یوسف ملک، منصور اور ان کی بیویاں اس کے کمرے میں جمع ہو گئیں۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہو گا کہ کوئی صحرائی سانپ نکل آیا ہے لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

''کیا ہوا خدیجہ...... کیوں چلا رہی ہو؟'' اس کی بھاوج نے پوچھا۔

''رات بھر احمد خلیل کی تیمارداری کرتی رہی ہوں۔ اب انہیں بھی وہی بخار ہو گیا۔''

''یہ تو اب اس گاؤں کا مقدر بن گیا ہے۔ اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔'' اس کے بھائی یوسف ملک نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہ گھبراؤں۔ یہ تو رات کو یہ کہہ کر سوئے تھے کہ صبح ہوتے ہی احمد کو غزہ کے اسپتال لے کر جائیں گے اور اب خود پڑ گئے۔''

''ذرا بخار اترے تو ہم انہیں اسپتال لے جائیں گے۔''

''اسپتال جائے بغیر بخار اترے گا کیسے؟''

''اسی طرح اترے گا جس طرح اوروں کے بخار اترے ہیں۔ میں ابھی صحرائی بوٹی لا کر دیتا ہوں۔ اسے پانی میں جوش دے کر پلاؤ۔''

''وہ بوٹی میرے پاس ہے۔ میں احمد خلیل کو پلا چکی ہوں۔''

''تم نے دیکھا نہیں اس کا بخار اب ہلکا ہو گیا ہے۔''

ملک وہاب کو بھی اسی بوٹی کا پانی پلایا گیا اور واقعی اس کا اثر یہ ہوا کہ ملک وہاب نے آنکھیں کھول دیں۔ دو تین خوراکیں اور پلائیں تو بخار بھی کچھ ہلکا ہو گیا۔

اب امید یہی تھی کہ دونوں بیمار جلد اچھے ہو جائیں گے۔ ملک وہاب اب بھی یہی کہہ رہا تھا کہ بدن میں ذرا جان آ جائے تو وہ احمد خلیل کو لے کر غزہ ضرور جائے گا۔

ملک وہاب دن بھر اچھی خاصی باتیں کرتا رہا تھا لیکن رات ہوتے ہی بخار پھر تیز ہو گیا۔ ملک وہاب تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ خدیجہ اپنی دیورانی کے ساتھ مل کر دونوں کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔

ایسی دو راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ یوسف ملک اور منصور دونوں کا خیال تھا کہ احمد خلیل اور ملک وہاب کی حالت جیسے ہی کچھ سنبھلے گی وہ ان دونوں کو غزہ کے اسپتال لے جائیں گے۔ ان کی حالت تو کیا سنبھلتی ایک دن خدیجہ بھی بستر سے لگ گئی۔

غزہ جانے کا خیال، خواب بن گیا۔

☆☆☆

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مسجد سے آنے والی اذان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ملک وہاب کی آنکھ کھل گئی تھی لیکن اسے نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ جہنم کے کسی غار میں ہے جہاں اس کے سوا کوئی نہیں۔

اس نے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا کہ اس غار میں آنے

سے پہلے اس کی ایک بیوی بھی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ وہ بھی شاید اس کے ساتھ یہاں آئی ہو۔ اس نے اپنے پورے بدن کی طاقت جمع کی اور خدیجہ کو آواز دی۔

''خدیجہ! تم کہاں ہو خدیجہ۔''

اس کے جواب میں اسے ایک مرد اور ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ ''ہوش آ گیا۔ ہوش آ گیا۔ وہ خدیجہ کو بلا رہا ہے۔'' پھر اس نے اپنے کندھے پر ایک بھاری بازو کا وزن محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں چراغ جل گیا۔

''منصور! یہ تو تم ہو اور یہ حلیمہ ہے تمہاری بیوی۔ خدیجہ نظر نہیں آ رہی۔ وہ کہاں ہے؟''

''خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔ دو دن سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔''

''میں کہتا ہوں خدیجہ کو بلاؤ۔ اسے کیوں نہیں بلاتے؟ احمد خلیل کہاں ہے؟''

''وہ بھی تمہاری طرح کبھی ہوش میں آ جاتا ہے کبھی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھو وہ لیٹا ہے۔''

''میں کہتا ہوں خدیجہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی بخار میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ہم نے اسے غزہ کے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے، وہاں اس کا علاج ہو رہا ہے۔''

''چلو اچھا ہوا۔ اس جاہل گاؤں میں کوئی کسی کا علاج نہیں کر سکتا۔ وہاں اس کا علاج ہو جائے گا۔ مجھ میں ذرا طاقت آ جائے، میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گا۔''

''ہاں چلے جانا، ابھی تو کچھ کھا لو۔''

گھر میں تھوڑا سا گوشت رکھا تھا، اس کا سوپ بنا کر اسے اور احمد خلیل کو پلا دیا گیا۔

احمد خلیل کچھ زیادہ ہی نڈھال تھا لیکن ملک وہاب کا بخار بالکل اتر گیا تھا۔ رات بھر میں اس نے اتنی طاقت پکڑ لی کہ صبح ہوتے ہی وہ خدیجہ سے ملنے غزہ جانے کی ضد کرنے لگا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اسے حقیقت بتا دے۔

''اب تم خدیجہ سے کبھی نہیں مل سکتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''ایک ہفتے سے بھی زیادہ گزر گیا ہم اسے دفن کر چکے۔ تم اور احمد خلیل بیماری کی شدت سے بے ہوشی کے عالم میں تھے کہ خدیجہ بیمار پڑ گئی اور صرف ایک رات بیمار رہنے کے بعد ہمارا ساتھ چھوڑ گئی۔ ہم نے حتی الوسع خدیجہ کی تدفین بڑے احسن طریقے سے کی ہے۔''

وہ کچھ دیر تو مبہوت ہو کر باتیں سنتا رہا پھر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگا۔

''کوئی چھبیس سال کی عمر میں مرتا ہے؟ وہ مری نہیں ہے تم لوگ نہ جانے کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔'' پھر اس نے اتنی زور سے خدیجہ کو آواز دی کہ صحرا میں کئی میل تک اس کی آواز گئی ہوگی۔ جب خدیجہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ منصور اسے برابر تسلیاں دے رہا تھا۔

''خدا کے کاموں میں کس کا دخل۔ میرے بھائی تم تو پڑھے لکھے ہو، تم تو خدا کی مشیت سمجھتے ہو۔''

''اسے خدا کی مشیت نے نہیں، اس گاؤں کی جہالت اور غربت نے مار دیا۔ اگر یہ لوگ تعلیم یافتہ ہوتے اس جدید دنیا کے فرد ہوتے تو کیا ایسا ہوتا؟ کیا ''نجبا'' کے آبادکاروں میں ایسا ہوتا؟ اسے برطانیہ کی اسلام دشمنی نے مار دیا۔ یہودی آبادکاروں نے مار دیا۔ جاگیرداروں کے لالچ نے مار دیا۔ جہاں کے لوگ دانے دانے کو محتاج ہوں وہاں کے لوگ مریں نہیں تو اور کیا کریں۔ یہ منحوس مقام ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اپنے احمد خلیل کو زندہ دیکھنے کے لیے چلا جاؤں گا۔''

''بھائی تم بیمار ہو لیٹ جاؤ۔ آرام کرو۔''

''نہیں، میں آرام نہیں کروں گا۔ میں قاہرہ چلا جاؤں گا یا کہیں اور۔ میں پڑھا لکھا ہوں۔ کسی بھی اسکول میں پڑھا سکتا ہوں۔ میں اس سے پہلے ہی چلا جاتا۔ کاش! خدیجہ میرے ساتھ شہر جانے کو تیار ہو گئی ہوتی تو اس کے چھ بچے اور وہ خود کبھی نہ مرتی۔'' وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے آخری بیٹے خلیفہ کا خیال آیا۔ ''احمد خلیل تو یہ ہے، خلیفہ کہاں ہے...... کیا وہ بھی مر گیا؟''

''خاندان کے شیر خوار بچوں میں وہ واحد ہے جو معجزانہ طور پر بچ گیا ہے۔ میری بیوی اس کی پرورش کر رہی ہے۔ اپنے بچے کے ساتھ اسے بھی دودھ پلا رہی ہے۔''

''اف میرے خدا۔'' ملک وہاب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

وہ جب تک بیمار رہا گاؤں میں خوب تباہی پھیلی۔ نجبا کی بستی اس وبا سے محفوظ رہی کیونکہ آبادکاروں نے فوری طور پر حفظانِ صحت کے لیے تدابیر اختیار کر لی تھیں۔

عراق المنشیا بھی اس وبا سے بچ سکتا تھا لیکن یہاں کے لوگوں کی جہالت اور بے جا تعصب نے اپنا نقصان خود کر لیا۔ نجبا سے دو ڈاکٹر اور چار نرسیں جو کہ جرمنی سے بطور پناہ گزیں یہاں آ کر آبادکار بن چکے تھے، گاؤں میں طبّی

امداد کی پیش کش لے کر آئے لیکن یہاں کے لوگوں نے ان سے علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن ایک دن عراق المنشیا کے نواح سے چار قبائلی آئے اور انہوں نے ان ڈاکٹروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

وبائی مہلک بیماری کے جراثیم اس آبادی میں پھیلتے چلے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے گھر اجڑ گئے۔ یہ دیکھنے کے لیے ملک وہاب بھی زندہ رہ گیا تھا اور احمد خلیل بھی۔

یورپ کے اکثر ملکوں سے نئے آباد کار نجبا اور دوسری نوآبادیوں میں اُمڈے چلے آرہے تھے اور مزید زمین حاصل کرنے کے لیے عراق المنشیا کے گرد ان کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔

☆......☆

کئی مہینوں کی قیامت خیزی کے بعد بیماری کا زور رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اس طرح نئی زندگی کا آغاز کیا جیسے ہولناک زلزلے کے بعد ملبا اٹھایا جاتا ہے اور نئی تعمیر ہوتی ہے۔

ڈرے سہمے بچوں نے باہر نکل کر کھیلنا شروع کر دیا۔

یوسف ملک نے اب شیخ اسحٰق کی جگہ قبیلے کی سرداری سنبھال لی تھی۔ اس نے خاندان کے بچوں کو یوں بے کار کھیلتے ہوئے دیکھا تو بھیڑوں بکریوں کی نگرانی اس امید پر انہیں سونپ دی کہ اس طرح بچوں کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔

ان ننھے چرواہوں میں احمد خلیل اور اس کے چچازاد اور ماموں زاد بہن بھائی بھی شامل تھے۔ احمد خلیل کو یہ نئی ذمے داری بہت پسند آئی کیونکہ تازہ ہوا میں کھیلنے کا موقع ملتا تھا۔ صبح سے شام تک بڑوں کی نگرانی کے بغیر کھیل کود سکتے تھے۔

چراگاہ، عراق المنشیا اور نجبا کے درمیان ایک سرحد کا کام دیتی تھی۔ بچے اس چراگاہ میں دوڑتے پھرتے، شور مچاتے اور خوب جی بھر کے دودھ پیتے۔

کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ بچے روایتی کھیل کھیلتے کھیلتے تھک گئے تھے۔ ایک دن احمد خلیل نے تجویز پیش کی کہ آؤ یہودیوں سے جنگ کرتے ہیں۔

''یہودی ہیں کہاں جو ان سے جنگ کرو گے۔'' اسما نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عبدالعزیز جو ان سب سے بڑا تھا، اس نے بھی اس کھیل کو پاگل پن سے تعبیر کیا۔

''جنگ اسے کہتے ہیں جس میں دشمن سامنے ہو اور پھر تمہارے پاس ہتھیار کہاں ہیں۔''

''کھیل تو کھیل ہوتا ہے۔ ہم فرض کرلیں گے کہ

یہودی ہمارے سامنے ہیں اور ان سے لڑیں گے اور انہیں ختم کر دیں گے۔" بالآخر تمام بچے تیار ہو گئے اور دشمن سے لڑنے کے لیے ادھر ادھر پھیل گئے۔ اسما کو احمد خلیل نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

"میں یہودیوں کو اسی طرح گولی ماروں گا جس طرح وہ ہمیں فائرنگ سے مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

تھوڑی دیر جھوٹ موٹ کی بندوقیں چلانے کے بعد وہ ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے سے نکل آیا۔ وہ اس وقت بھی اسما کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

"تمام یہودی مارے جا چکے ہیں۔ اب ہمیں مزید یہودیوں کو قتل کرنے کے لیے تلاش کرنا ہے۔"

اس کے اس اعلان کے بعد دوسرے بچے بھی کمین گاہوں سے نکل آئے۔

"سردار! اب ہم مزید یہودیوں کو کہاں تلاش کریں؟" بچوں نے احمد خلیل سے پوچھا۔

"چلو اس پہاڑ کی چوٹی پر چلتے ہیں، وہ ضرور وہاں ہوں گے۔"

چاروں بچے جن میں اسما بھی شامل تھی، پہاڑ پر چڑھ گئے اوپر پہنچتے ہی ایک بچہ زور سے چیخا۔ "احمد خلیل! وہ رہے یہودی۔"

دیگر بچوں نے اس آواز پر نیچے کی طرف دیکھا۔ روشن آنکھوں والے خوش و خرم کچھ یہودی بچے جنہوں نے اپنی کمر پر تھیلے باندھ رکھے تھے فوجیوں کی طرح پریڈ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ شاید اسکول جا رہے ہوں۔ ان بچوں کے چہرے گلاب کی طرح دمک رہے تھے۔ ان کے صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر احمد خلیل نے اپنے گندے کپڑوں اور ننگے پیروں کی طرف دیکھا اور نفرت سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ یہودی بچے اس نفرت کے مفہوم سے ناآشنا تھے کیونکہ ابھی وہ بہت چھوٹے تھے۔ انہوں نے عرب بچوں کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلائے۔ احمد خلیل اتنا غصے میں تھا کہ دوستی کے جواب میں ایک پتھر اٹھایا اور ان کی طرف پھینک دیا۔ تمام یہودی بچے بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوئے۔ چاروں عرب بچے خوشی سے چیخ اٹھے۔ "ہم نے تمام یہودیوں کو مار بھگایا۔"

عبدالعزیز بدستور سنجیدہ تھا۔

"کیوں تم خوش نہیں ہوئے؟ میرے ایک پتھر نے ان سب کو بھگا دیا۔"

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش اس وقت ہمارے پاس بندوق ہوتی۔ یہ یہودی پتھروں کے نہیں گولیوں کے لائق ہیں۔"

"ہمارے بڑے ہمیں بندوقیں کہاں دیں گے۔"

"ہاں، وہ تو جوان ہونے کے بعد ہی ملیں گی۔"

وہ یہی باتیں کرتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اترے۔ دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن احمد خلیل دل میں سوچتا جا رہا تھا کہ وہ کسی دن اکیلا ہی نجبا چلا جائے گا۔ وہاں جا کر دیکھے گا کہ یہودیوں کے گھر اندر سے کیسے ہوتے ہیں۔ وہ دس سال کا ہے۔ اتنا بڑا تو ہے کہ اکیلا جا سکتا ہے۔

پہاڑ سے اترنے کے بعد اس نے دیکھا کہ عبدالعزیز بہت تھک گیا ہے۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ عبدالعزیز سب سے بڑا ہے۔ قد بھی اتنا ہے کہ اچھا خاصا جوان معلوم ہوتا ہے، اس کے باوجود تھک گیا ہے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ عبدالعزیز کا بدن بری طرح کانپ رہا ہے حالانکہ سردیاں نہیں تھیں۔ اس نے عبدالعزیز کو سہارا دینے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا تو اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس کا بدن بخار میں تپ رہا ہے۔

"عبدالعزیز! تمہیں تو بخار ہو گیا۔"

"ہاں جلدی گھر پہنچو۔ مجھ سے اب چلا نہیں جا رہا ہے۔"

"ہمت سے کام لو گھر آنے ہی والا ہے۔"

سب ایک ہی بڑے گھر میں تو رہتے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسما اور عبدالعزیز اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور احمد خلیل اپنے کمرے میں آ گیا۔

سورج غروب ہو گیا تھا۔ احمد خلیل نے باپ کے ساتھ مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور ماموں کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ عبدالعزیز بھاری بھرکم اونی عبا میں لپٹا ہوا اکڑوں بیٹھا ہے۔ اسما بھی اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ احمد خلیل کو تعجب ہوا کہ گرمی میں وہ اونی عبا لپیٹے ہوئے ہے۔ پھر اسے خود ہی یاد آ گیا کہ عبدالعزیز کو بخار چڑھ گیا تھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"کیا تم میرے ساتھ چھت پر بھی نہیں جا سکتے؟"

"میری حالت دیکھ رہے ہو۔ میں سیڑھیاں کیسے چڑھوں گا؟"

"چلو پھر ٹھیک ہے، کل تم ہمارے ساتھ چراگاہ تک چلنا۔ وہاں خوب کھیلیں گے۔"

"کل تک میرا بخار تو اتر جائے۔"

"کل تک تو تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اس کا خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا جب کہ اس کی

حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ یوسف ملک کا خیال تھا کہ چراگاہ میں آوارہ گردی کرتے رہنے سے اس کی حالت بگڑ گئی ہے لہٰذا اس نے دوسرے بچوں پر بھی پابندی لگادی کہ کوئی چراگاہ نہیں جائے گا۔ بے فکری کے دن اچانک ختم ہو گئے۔ عبدالعزیز اب گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔

گرمیوں کے دن گزر گئے۔ اب سردیاں آگئی تھیں۔ احمد خلیل، سرد نم آلود پتھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دروازے کی درزوں میں سے گلی میں چلنے والے گرد وغبار کے بادلوں کو دیکھتا رہتا۔ عبدالعزیز کی حالت نہایت بگڑ گئی تھی۔ ہر وقت خون تھوکتا رہتا تھا۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ خلیفہ کسی ذہنی معذور کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ چلنے پھرنے لگا تھا لیکن کسی کے ساتھ کھیلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اتنے پیسے نہیں تھے کہ ڈاکٹروں کو دکھایا جاتا۔ یوسف ملک کسی مولوی سے پانی دم کرا کے لے آتا تھا۔ یہی عبدالعزیز کا علاج تھا۔

احمد خلیل جب بھی اس کے پاس جاتا، اسے قسطوں میں مرتے ہوئے دیکھتا۔ روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سب سے دور الگ تھلگ پڑا رہتا تھا۔ اسما کو بھی اجازت نہیں تھی کہ اس کے پاس جائے۔ صرف احمد خلیل تھا جو اس سے سرگوشیوں میں باتیں کر لیتا تھا۔

اس روز بھی وہ اندیشوں کو ساتھ لیے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ عبدالعزیز نے اسے دیکھتے ہی لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اپنا انتہائی نادر قسم کا خنجر نکالا جسے وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس بیماری کے عالم میں بھی وہ خنجر اس کے پاس تھا۔

”یہ خنجر دیکھ رہے ہو۔“ عبدالعزیز نے خنجر لہراتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔“

”لیکن اس کے پیچھے جو کہانی ہے وہ تم نے نہیں سنی ہو گی۔ میرے باپ نے یہ کہہ کر یہ خنجر مجھے دیا تھا کہ میں بڑا ہو کر نجبا جاؤں گا اور اپنے چچاؤں کا انتقام لوں گا جو یہودیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں لیکن اب مجھے امید نہیں کہ میں زندہ بچوں گا۔ میں یہ خنجر اب تمہیں دیتا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اسے ہر وقت اپنے پاس رکھو گے۔ یہ تمہیں میری یاد بھی دلاتا رہے گا اور تمہاری حفاظت بھی کرے گا۔“

احمد خلیل نے وہ خنجر اس سے لے لیا اور وعدہ کیا کہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھے گا۔ اسی رات عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس خاندان یا اس گاؤں کی پہلی موت نہیں تھی۔ انتہائی غربت، گندگی اور علاج کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے آئے دن بچے مرتے رہتے تھے لیکن عبدالعزیز کی موت نے احمد خلیل کو کسی تصویر کی طرح خاموش کر دیا۔ وہ اتنا چڑچڑا ہو گیا تھا کہ بچے اس کے قریب آتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ صرف اسما تھی جس سے وہ سیدھے منہ بات کر لیتا تھا ورنہ باپ کی طرف سے بھی مخالفانہ تاثرات اس کی آنکھوں میں صاف نظر آتے تھے۔ اپنے بھائی خلیفہ سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا۔ اس نے تو ایک بھائی اس لیے مانگا تھا کہ اس کو ایک دوست مل جائے گا جو اس کے ساتھ کھیلا کرے گا لیکن وہ تو اس کے لیے بوجھ بن گیا تھا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ بارشیں شروع ہو گئیں۔ گلیوں میں کیچڑ بھر گئی۔ کھیت جوہڑ بن گئے۔ کھیتوں میں اب کوئی کام نہیں تھا۔ فرصت کے ان ایام میں ملک وہاب نے اپنے بیٹے کے لیے کچھ نئے ارادے باندھے اور اسے آگاہ کرنے کے لیے آواز دی۔ احمد خلیل کسی جادو کی جن کی طرح اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”آج کل تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ میں تمہیں پڑھانا شروع کر دوں۔ تمہیں اب کچھ پڑھنا چاہیے۔“ احمد خلیل نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ سرد آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔ وجہ یہی تھی کہ اسے لکھنے پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”سنو احمد خلیل!“ ملک وہاب نے اس کے الجھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں شروع ہی سے تمہیں اسکول بھیجنے کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک جدید اسکول میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ تم پڑھ لکھ لو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ تم اب تک کیسی بے مزہ زندگی گزارتے رہے ہو۔ اس کے لیے تمہیں شہر میں رہنا ہو گا۔“

احمد خلیل خاموشی سے اپنے والد کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ اسے اس گاؤں سے اتنا ہی پیار تھا جتنا اس کی والدہ کو تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا چاہے یہاں اسے کتنی ہی محنت کرنی پڑے۔

”میں تمہارے لیے قرآن پاک کا ایک بڑا نسخہ لے کر آیا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تختی لایا ہوں جس پر پورا سبق بہ آسانی لکھ کر اسے دھونے کے بعد بار بار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قلم اور سیاہی بھی لے آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں پہلے تم کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لو پھر اسکول جاؤ۔“

اس نے اس وقت تو کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا لیکن جب رات کو سونے کے لیے لیٹا تو اسے علم کی اہمیت کا خود بخود احساس ہونے لگا۔ اپنی جہالت کا شدت سے احساس ہوا۔ میں بارہ سال کا ہو گیا اور اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اتنا تو پڑھنا آجائے کہ میں اخبار پڑھ سکوں۔ مجھے معلوم تو ہو کہ میرے گاؤں سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ یہودی اور انگریز ہمارے دشمن کیوں ہیں، مجھے معلوم تو ہو، اس کے والد نے اس کی طبیعت میں ایک گہرا تجسس پیدا کر دیا تھا۔

صبح جب اس کا باپ اسے پڑھنے کے لیے لے کر بیٹھا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ حروف تہجی سے گزر کر جملے اور الفاظ بنانے پر آگیا تھا لیکن ملک وہاب دیکھ رہا تھا کہ اس کی رفتار بہت سست ہے۔ ملک وہاب کو بار بار سمجھانا پڑتا تھا، تب کہیں جا کر وہ کسی لفظ کو سمجھتا تھا۔

ہفتوں گزر گئے لیکن وہ چند جملوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ لکھائی تو اس کی بہت گندی تھی۔

جب ملک وہاب اسے پڑھاتا تو اس کا چھوٹا بیٹا خلیفہ غور سے سنتا اور دیکھتا رہتا تھا۔ پھر وہ بھی ان اسباق میں شامل ہو گیا اور ملک وہاب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ لکھنا سیکھ گیا ہے اور اس کی لکھائی احمد خلیل سے اچھی ہے۔

بہرحال چند ماہ بعد احمد خلیل قرآنی آیات کو کسی غلطی کے بغیر پڑھنے لگا۔ اس دوران وہ باپ کے ساتھ کھیتوں پر بھی جاتا رہا۔ اس روز بھی وہ اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں پہ کام کر رہا تھا کہ اچانک ایک موٹر کار کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کار سے انگریزی سوٹ میں ملبوس سر پر ترکی ٹوپی پہنے ایک ناٹے قد کا موٹا آدمی اترا اور اس کے والد کے پاس پہنچا۔

ملک وہاب اس وقت ایک گڑھا کھود رہا تھا۔ اس کی عبا گرد آلود اور پاؤں کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔

''آفندی! یہاں کیوں آئے ہو؟ جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا اس کے بعد بھی کوئی کسر باقی ہے جسے پوری کرنے آئے ہو۔''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے دو بیٹے ہیں۔ وہ جو اس طرف کام کر رہا ہے، وہ شاید بڑا لڑکا ہے۔''

''ہاں ہے۔ تمہیں اس سے کیا مطلب؟''

''مجھے ایک نوکر کی ضرورت ہے جو گھر کی صفائی کے علاوہ فرش دھو سکے۔ میرے خیال میں تمہارا بیٹا اس کام کے لیے بہت موزوں رہے گا۔''

''شاید تم بھول رہے ہو کہ ترک جا چکے ہیں اور سرکاری حکم کے ذریعے غلامی کو غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ تم میرے بیٹے کو ہاتھ لگا کر دیکھو۔ میں غزہ میں پولیس کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ غزہ میں جتنے اعلیٰ برطانوی حکام ہیں، وہ سب میرے قریبی دوست ہیں۔ رہی پولیس تو اسے کھلانے کے لیے میرے پاس بہت دولت ہے۔ یہ گاؤں اور یہاں کام کرنے والے سب میری ملکیت ہیں جس کے ساتھ جو چاہوں سلوک کروں۔'' اس نے کہا اور پھر اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تاکہ دوسرے لوگ بھی سن لیں۔ ''تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہاری ماں میرے والد کی داشتاؤں میں سے ایک داشتہ تھی۔ میرے حکم کی تعمیل کرو ورنہ میں یہاں کی تمام پیداوار پر دگنا لگان عائد کر دوں گا اور اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔ گاؤں والے اس جرم میں تمہیں خود مار ڈالیں گے۔''

''اس سے پہلے میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' ملک وہاب نے کہا اور چیخ کر احمد خلیل سے کہا۔ ''احمد! جتنا تیز بھاگ سکتے ہو یہاں سے بھاگ کر گھر چلے جاؤ۔''

آواز سنتے ہی احمد خلیل نے بھاگنے کے لیے اپنے جسم کو تولا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا دو مضبوط ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی سے دو آدمی مزید نکلے۔ انہوں نے چیختے ہوئے احمد خلیل کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال دیا۔ نجم آفندی بھی بھاگتا ہوا گیا اور چلتی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ملک وہاب دور تک دھول اڑاتی گاڑی کے پیچھے بھاگتا رہا۔

کھیت میں اتنے لوگ کام کر رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی جو اس کی مدد کو پہنچتا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی غزہ کی طرف جا رہی تھی۔ احمد خلیل گاڑی کی سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ سیٹ پر بیٹھنے والوں کے بوٹ اس کے سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے لیکن یہ معلوم تھا کہ نجم آفندی کے گھر پہنچ کر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔ اس سے جو کچھ کہا جائے گا چپ چاپ کرلے گا اور پھر موقع دیکھ کر وہاں سے نکل بھاگے گا۔

اسے محسوس ہوا کہ گاڑی کسی بڑے گیٹ کے اندر داخل ہوئی ہے۔ پھر گاڑی رک گئی۔ چاروں آدمی ایک ایک کر کے نیچے اترے اور پھر احمد خلیل کو باہر گھسیٹ لیا گیا۔

''شور مچایا تو ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔''

اس نے پہلی مرتبہ نجم آفندی کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور سرخ تھیں۔ طوطا نما ناک نہایت بدنما معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے باپ کے ذریعے اس آدمی کے متعلق اسے بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اس کے دل میں نفرت پہلے ہی سے تھی، اب وہ اسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ یہ شخص بہت ظالم ہے۔ عراق المنشیا میں جتنی غربت ہے، وہ سب اسی آدمی کی وجہ سے ہے۔

نجم آفندی اسے اس کا کام سمجھانے اور کچھ ہدایات دینے کے بعد کہیں غائب ہو گیا تھا۔

”عراق المنشیا کے کیڑے! جب تک میں چاہوں تجھے یہاں رہنا ہے بلکہ اب یہیں رہنا ہے، میری غلامی میں جس طرح تیرا باپ میرا غلام تھا۔ تیرے خاندان سے اب تیرا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں تنہائی میں بھی یاد کرنے کی کوشش نہ کرنا اور خبردار یہاں سے فرار ہونے کی کوشش مت کرنا۔ میرے آدمی چوبیس گھنٹے تیری نگرانی کریں گے۔ تیرا کام فرش دھونا، فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرنا اور باغ کے پودوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔“

وہ سر جھکائے سنتا رہا اور اس کے جانے کے بعد اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے گھوم پھر کر دیکھا کوئی اور نوکر یہاں موجود نہیں تھا جو اس کا ہاتھ بٹاتا۔

بند کمروں میں سامان اور فرنیچر وغیرہ پڑا تھا۔ لگتا تھا کئی سالوں سے صفائی نہیں ہوئی۔ کمرے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ اکیلا کیا کیا کرے گا؟ یہ سوچ کر پریشان تھا لیکن محنت کا عادی تھا صفائی میں جٹ گیا۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ سب لوگ کیسے ہیں۔ رات کو اگر کبھی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسما کو یاد کر کے بہت روتا تھا۔ اب تو عبدالعزیز بھی نہیں تھا۔ وہ بے چاری کس کے ساتھ کھیل رہی ہوگی۔

آہستہ آہستہ وہ اس قید کا عادی ہو گیا۔ جلد ہی اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس گھر میں دوسرے نوکر بھی ہیں لیکن ان کے کام دوسرے ہیں۔ صفائی ستھرائی کا کام صرف اس کا ہے لیکن یہ اسے آخری وقت تک معلوم نہ ہوا کہ آفندی اکیلا رہتا ہے یا اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ مکان کے دوسرے حصے میں ہوں یا کہیں اور رہتے ہوں۔ دوسرے نوکر صرف اس وقت سامنے آتے تھے جب کوئی برطانوی افسر، آفندی سے ملنے آتا تھا اور مہمانوں کے کھانے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ پھل، پنیر، زیتون اور بھیڑ کے کبابوں سے بھرے ہوئے طشت تیار ہوتے تھے۔ ایسی دعوتیں اس کے لیے بھی بڑی خوش کن ہوا کرتی تھیں۔ ان کے چھوڑے ہوئے جھوٹے کھانوں پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑے ہو کر بے صبری سے کھانا ختم ہونے کا انتظار کرتا، تاکہ اگر وہ کوئی چیز چھوڑیں تو وہ چٹ کر ڈالے۔

ایک روز ایسے ہی کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ آفندی نے ڈرائنگ روم میں اسے کسی کام سے بلایا۔ ایک مہمان کے ہاتھ میں عربی اخبار تھا۔ احمد خلیل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اسے پچھلے دنوں اس کے باپ نے اتنا پڑھنا سکھا دیا تھا کہ وہ اخبار پڑھ سکتا تھا۔ اس لیے ایک نظر اخبار پر ڈالی۔ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ہٹلر نے خودکشی کر لی تھی اور دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے بعد فلسطین کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں گی لیکن خود اس کی زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی، اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا۔

باہر کا تو علم نہیں لیکن اس گھر میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ اس نے پہلی مرتبہ آفندی کی دو بیویوں اور کئی بچوں کو دیکھا جو مہمانوں سے ملنے کے لیے بالائی منزل سے نیچے اترے تھے۔ اس سے پہلے اس نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید کہیں اور گئے ہوئے تھے، رات ہی کو آئے تھے۔ وہ کہیں بھی تھے، اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے تو یہ فکر ہو گئی تھی کہ اب کام اور بڑھ جائے گا۔

آفندی کے گھر میں برطانوی اہل کاروں اور دوسرے دوستوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ احمد خلیل چھپ چھپ کر سننے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اسے ان کی زبانی معلوم ہوا کہ دہشت پسندوں کا ظلم و تشدد روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور حکومت.... بے بس تھی۔ ایک روز ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

”اگر صورتِ حال زیادہ ابتر ہوئی تو برطانیہ اپنی فوجیں یہاں سے نکال لے گا اور فلسطین کو یہاں کے عرب اور یہودی باشندوں کے لیے چھوڑ جائے گا کہ وہ خود لڑ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیں۔“

احمد خلیل کے لیے یہ خبر تشویش ناک تھی۔ اس کا خاندان خطرے میں تھا۔ نجبا کے یہودی سب کا جینا حرام کر دیں گے۔ وہ اپنے فرار کے بارے میں سوچنے لگا۔

”میں اگر بھاگ بھی جاؤں تو کہاں جاؤں گا؟ اگر گاؤں جاتا ہوں تو آفندی کو وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ میں پھر

پکڑا جاؤں گا۔ کیا خبر اس مرتبہ وہ میرے خاندان پر کیا آفت ڈھائے۔''

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، آفندی کے گھر پر اس کے لیے زندگی گزارنا آسان ہو گیا۔ اب اس پر زیادہ سخت نگرانی نہیں تھی۔ اتنی آسانی ہو گئی تھی کہ گھر کا کام ختم کرنے کے بعد بازار کی سیر کو بھی نکل جاتا تھا۔

وہ اب اپنی عمر کے تیرہ سال پورے کر چکا تھا۔ اس کا بچپن ہمیشہ کے لیے تیزی سے پیچھے جا رہا تھا اور وہ عنفوانِ شباب میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اس کی عبا کے نیچے چھپا ہوا وہ خنجر کھلونا معلوم نہیں ہوتا تھا جو عبدالعزیز نے مرتے وقت اس کے حوالے کیا تھا۔ وہ اب اس خنجر کو اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اس خیال نے آفندی کا خوف اس کے دل سے نکال دیا تھا۔ اس کے بدلے ہوئے تیور آفندی پر بھی ظاہر ہو گئے تھے لہٰذا اب وہ بھی اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگا تھا۔ ڈانٹتا بھی تو اس ڈانٹ میں ایک خوف چھپا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک دن اس نے احمد خلیل کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھتے ہوئے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے غلیظ ہو کر بھی تم دنیا میں کیسے زندہ پھرتے ہو۔ یہ لو کچھ پیسے اور جب تک کسی حمام میں جا کر صاف ستھرے نہ ہو جاؤ، مجھے دوبارہ نظر نہ آنا۔''

دو سال کے عرصے میں آفندی نے اسے پہننے کے لیے ایک جوڑا تک نہیں دیا تھا اور اب کہہ رہا تھا کہ نہا دھو کر صاف ستھرے ہو جاؤ۔ رویے کی اس تبدیلی نے احمد خلیل کو یقین دلایا کہ مستقبل میں اس کے ساتھ اچھا ہونے والا ہے۔

گلیاں فوجیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لوگ اپنا سامان اور دیگر اشیا بسوں اور ٹرکوں میں لاد رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حمام جہاں نہانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، بالکل سنسان پڑا تھا۔ حمام کا مالک ایک طرف پڑی ہوئی میز پر بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ ریڈیو سے ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''ہم 14 مئی 1948ء کو فلسطین کے علاقے اور تل ابیب کے شہر میں باضابطہ طور پر یہودیوں کی ریاست کے قیام کا اعلان کرتے ہیں جس کا نام اسرائیل ہوگا۔ اسرائیل کی ریاست دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو بغیر کسی پابندی کے اسرائیل میں آباد ہونے کی اجازت دے گی۔ یہ ریاست بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے بتائے ہوئے آزادیِ رائے، انصاف اور امن کے اصول پر قائم ہو گی۔ ہم اسرائیل کے تمام عرب باشندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ امن و امان برقرار رکھیں......!''

حمام کے مالک نے نہ جانے کیوں ریڈیو بند کر دیا اور بیزار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مطلوبہ سکے مالک کے ہاتھ پر رکھے اور نہانے کے لیے ٹائلوں کے فرش سے مزین خالی کمرے میں چلا گیا۔

نہانے کے دوران بھی ریڈیو سے نشر ہونے والے اعلان کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ یہ تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہو چکا ہے لیکن اس کے اثرات کیا ہوں گے، اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ نہانے کے بعد اس نے وہی گندے کپڑے پہن لیے کیونکہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی لباس اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ حمام سے نکل کر گلیوں میں آیا تو عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ گلیاں ٹرکوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان میں گنجائش سے زیادہ سامان بھر دیا گیا تھا۔ ہر عمر کے لوگ اس سامان پر لدے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے دہشت زدہ تھے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ان پر کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے؟ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟

اس نے تیز تیز قدم اٹھانا شروع کر دیے کہ کسی طرح ان آفت زدہ گلیوں سے نکل کر جلد از جلد آفندی کے گھر تک پہنچ جائے اور اس سے پوچھے کہ ماجرا کیا ہے۔ اسے تو ضرور معلوم ہوگا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے پابندی سے اخبار کیوں نہیں پڑھے۔

وہ آفندی کے گھر کے سامنے پہنچا تو اسے سخت دھچکا لگا۔ گھر مکمل طور پر ویران پڑا تھا۔ ہر دروازہ دہرے تالوں سے مقفل تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ اس نے بدحواسی میں کئی آوازیں دیں لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی ملازم بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے آفندی بھی کہیں جا چکا...... کہاں؟ جہاں سب جا رہے تھے...... میں کہاں جاؤں؟

اس کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے عراق المنشیا جانے والی پگڈنڈی پکڑ لی۔ وہ گاؤں پہنچا تو یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے قحط پڑ گیا ہو۔ نجبا کے کسانوں نے پانی کے بہاؤ کا رخ اپنے کھیتوں کی جانب موڑ لیا تھا۔ عراق المنشیا کی زمین تپتے ہوئے گرم سورج کے نیچے جھلسے جا رہی تھی۔ کھیت خشک پڑے تھے۔ کھیتوں میں کوئی کام کرتا ہوا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا کہ کسی بیماری نے کہیں سب کو تو نہیں نگل لیا۔ اس کی یہ غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب اس نے گھر کے دروازے پر اپنے چھوٹے بھائی خلیفہ کو دیکھا۔ وہ ریت اور گیلی مٹی کے آمیزے سے کھلونے بنانے میں

مشغول تھا۔ اس نے احمد خلیل کی طرف دیکھا اور یوں دبک کر بیٹھ گیا جیسے ڈر گیا ہو۔ جب احمد خلیل نے اسے اپنی طرف بلانے کی کوشش کی تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا، اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور ٹانگیں پہلے سے زیادہ پتلی ہو گئی تھیں۔ قد البتہ کچھ بڑھ گیا تھا۔ ملک وہاب سے بھی اس کی ملاقات دروازے پر ہی ہو گئی تھی لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باپ نے بھی اسے دیکھ کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا جیسے وہ تین سال بعد نہیں تین دن بعد آیا ہو۔ پوچھا تو یہ پوچھا کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے بیٹے سے زیادہ شہر کے حالات کی فکر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی اجنبیت تھی جیسے کہہ رہا ہو، لو ایک اور کھانے والا آ گیا۔ احمد خلیل سوچ رہا تھا کوئی اس سے پوچھے کہ اس پر تین سال میں کیا گزری اور اس نے یہ دن کیسے گزارے۔

وہ ابھی اپنی حالت پر افسوس کر ہی رہا تھا کہ اسما آ گئی۔ دو سال میں وہ اس کے تصور سے زیادہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"پگلی کیوں روتی ہے، اب میں آ تو گیا ہوں۔"

"میں اس تکلیف کو محسوس کر سکتی ہوں جو تم نے وہاں رہ کر اٹھائی ہو گی۔ قسمت نے ہمارا بچپن ہم سے چھین لیا۔ یہ کیا کم تکلیف کی بات ہے۔"

"یہ بتاؤ تم مجھے یاد کیا کرتی تھیں؟"

"میں اس دن کے بعد سے کسی کے ساتھ نہیں کھیلی حتیٰ کہ رشید کے ساتھ بھی نہیں۔"

"اب میں آ گیا ہوں، خوب کھیلا کریں گے۔"

"کیا اب ہم کھیلتے ہوئے اچھے لگیں گے؟" اسما روتے روتے ہنس پڑی۔ "گاؤں کے حالات بہت خراب ہیں۔ اب تو بچے بھی بوڑھوں کی طرح سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ نجبا کے یہودیوں نے ہمیں پانی کی ایک ایک بوند کو ترسا دیا ہے۔ اب تو قبائلیوں میں روز یہ باتیں ہوتی ہیں کہ جب مرنا ہی ہے تو ایک بار نجبا پر حملہ کر دیا جائے۔ اگر مر بھی گئے تو وہ موت اس ذلت کی زندگی سے اچھی ہو گی۔"

"اماں نے مسور کی دال چولہے پر چڑھائی ہے تمہارے لیے، لے کر آؤں؟"

وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ احمد خلیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے بچپن میں کئی مرتبہ اس کا ہاتھ پکڑا ہو گا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ کی گرمی نے اسما کو پگھلا کر رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے۔ وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر وہیں بیٹھ گئی جہاں سے اٹھی تھی۔

"اسما! حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ غربت کا عفریت ہمیں نگلنے کو تیار کھڑا ہے۔ بھوک وہ بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ وعدہ کرو کہ تم نہیں بدلو گی۔ میں نے ابا کی آنکھوں میں بھی اجنبیت دیکھی ہے لیکن تمہاری آنکھوں سے مجھے لگا ہے کہ تم میری راہ تکتی رہی ہو۔ وعدہ کرو کہ تم نہیں بدلو گی۔"

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہی ہوں۔ اگر تقدیر نے پھر تمہیں مجھ سے جدا کر دیا تو میں تمہاری راہ تکنے کے سوا کیا کر سکتی ہوں۔"

"اماں کہا کرتی تھیں اسما کو میں اپنی بہو بناؤں گی۔ تمہیں یاد ہے؟"

اب اسما کے لیے مشکل تھا کہ وہ یہاں بیٹھی رہے۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ابھی وہ اسما کے اس طرح شرما کر بھاگ جانے سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ بدحواس بچوں اور خوفزدہ عورتوں کے شور سے چونک اٹھا۔ وہ باہر کی طرف بھاگا۔ ایک قوی ہیکل بند ٹرک اس کے دروازے کے سامنے آ کر رکا تھا۔ خاکی وردیوں میں ملبوس مشین گنوں سے مسلح ایک درجن سے زیادہ فوجی ٹرک سے کودے اور اس کی طرف جھپٹے۔ گھر میں داخل ہوئے، اس کے بھائی، چچا زاد.... ماموں زاد بھائیوں، والد، ماموں اور چچا سب کو گرفتار کر لیا۔ گاؤں کے دیگر تیس آدمی پہلے ہی ٹرک میں بٹھا دیے گئے تھے۔

گھر کی عورتوں کو انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن لڑکوں اور مردوں کو لے گئے۔ عورتیں ان فوجیوں کو گالیاں بک رہی تھیں۔ اسما ان میں سب سے آگے تھی۔ اس گاڑی نے ان سب کو بنگلے والے کوٹھری نما کمرے میں پہنچا دیا جو نجبا میں جیل کا کام دیتی تھی۔

"تمہارا سردار کون ہے؟" ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"میں ہوں ان کا سردار۔" یوسف ملک نے کہا۔

ایک بھاری بھرکم ہاتھ بڑھا اور اسے گردن سے پکڑ کر کوٹھری سے باہر لے جایا گیا۔ ایک دوسرے کمرے میں کندہ کاری سے سجی ہوئی میز کے پیچھے کرسی ڈالے سرخ و سفید چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ ان کا حاکم ہے۔ وہ کرسی سے کھڑا ہوا اور میز سے ایک تحریر شدہ پرچہ اٹھا کر یوسف ملک کو حکم دیا کہ اس پر اپنا انگوٹھا ثبت کرے۔ یوسف ملک نے ایسی کسی دستاویز پر انگوٹھا

ثبت کرنے سے انکار کر دیا جسے وہ پڑھ نہیں سکتا۔

''میں بغیر پڑھے کسی پرچے پر انگوٹھا نہیں لگاؤں گا۔ میں پڑھنا نہیں جانتا۔''

''ہم بتائے دیتے ہیں اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ وہ دستاویز ہے جس کے مطابق تمہارے گاؤں کی زمین ہم بہت عرصہ پہلے نجم آفندی سے بھاری قیمت ادا کر کے خرید چکے ہیں۔ اگر تم انگوٹھا ثبت کردو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم زمین پر ہمارے سرکاری حقوق تسلیم کرنے پر رضامند ہوگئے ہو۔''

''میں یہ حقوق ہرگز تمہیں نہیں لینے دوں گا۔''

''کیا تم بھی اپنے باپ کی طرح احمق ہو اور مزاحمت کر کے اپنا نقصان کرتے رہو گے؟''

''شاید میں ایسا ہی کروں۔''

''یوسف ملک! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' حاکم نے نرمی سے کہا۔ ''اگر تم ہتھیار ڈال دو، اخوان المسلمون کے رضا کاروں کو پناہ دینا بند کردو، ہمارے ساتھ تعاون کرو تو ہم تمہارے اور تمہارے خاندان کی ترقی و خوش حالی کے لیے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو تمہارے لوگ ہزاروں سال میں بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تمہارے لیے گھر مہیا کریں گے۔ تمہیں ٹریکٹروں اور جدید مشینری سے کاشت کاری کرنا سکھائیں گے۔ تمہارے علاج کے لیے ڈاکٹر اور نرسیں بھیجیں گے۔''

یوسف ملک نے کچھ اور سنے بغیر ہی میز پر سے دستاویز اٹھائی اور اس کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دی۔

''تم ہم پر کبھی حکومت نہیں کر سکو گے۔ یہ زمین ہماری ہے، تمہاری ملکیت نہیں۔ غیر قانونی طور پر آنے والے آباد کاروں نے ہماری اجازت کے بغیر جو جائداد حاصل کی ہے اس کا تاوان ادا کرو اور سمندر کے راستے اپنے آبائی ممالک کو واپس چلے جاؤ۔''

اب حاکم کا مشتعل ہو جانا لازمی تھا۔

''ان سب کو وار گون کے قید خانے میں لے جا کر ایسا سبق سکھاؤ کہ ان کی زندگی موت سے بدتر بن جائے ورنہ تو میں انہیں گولی سے بھی اڑا سکتا ہوں۔''

بچوں کو الگ کر کے جن میں احمد خلیل بھی تھا، تمام قبائلیوں کو اذیت گاہ میں لے جایا گیا۔ تقریباً دو درجن سخت گیر دہشت پسند غنڈوں کا ٹولہ اذیت دینے کے لیے اذیت گاہ ..... میں پہنچ گیا۔

رات بھر اندوہناک چیخوں اور دلدوز آوازوں سے عمارت گونجتی رہی۔ تمام بچے اپنے کانوں میں انگلیاں دیے بیٹھے تھے۔ احمد خلیل بار بار اپنے خنجر کو ہاتھ لگا کر دیکھ لیتا تھا لیکن اس خنجر سے وہ کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔

رات بھر کے تشدد کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ان میں سے سات افراد زندگی کی قید سے ہی آزاد ہو گئے تھے۔ بعض ایسے تھے جو پیدل گاؤں تک جانے کے بھی لائق نہیں رہے تھے۔ ان شدید زخمیوں میں یوسف ملک بھی تھا جس کے معدے میں گولی لگی تھی۔ زندہ بچ جانے والوں نے جاں بحق افراد کو کندھے پر ڈالا اور انہیں بھی جو پیدل چلنے کے قابل نہیں تھے۔

نجبا دور ہی کتنا تھا۔ گاؤں کی سرحد شروع ہوتے ہی اخوان المسلمون کے رضا کار پہنچ گئے۔ ان میں دو ڈاکٹر بھی تھے۔ ان کے ساتھ اسٹریچر بھی تھے۔ یوسف ملک کو اسٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ پہلے یہ طے کیا گیا کہ اسے غزہ لے جایا جائے لیکن یوسف ملک جو اب بھی ہوش میں تھا اس نے غزہ جانے سے انکار کر دیا۔

''مجھے میری خفیہ پناہ گاہ لے چلو۔''

احمد خلیل کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ گاؤں میں کوئی خفیہ پناہ گاہ بھی ہے۔ اسے اب بھی نہ معلوم ہو سکا کہ یہ پناہ گاہ کہاں ہے کیونکہ تمام لوگوں کو کسی دوسری طرف روانہ کر کے صرف شدید زخمیوں کو پناہ گاہ لے جایا گیا۔

اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ان زخمیوں میں سے آٹھ لوگ مزید مر گئے لیکن یوسف ملک زندہ بچ گیا حالانکہ اس کا بہت خون ضائع ہو گیا تھا۔ اس پناہ گاہ میں اس کا آپریشن کیا گیا اور گولی نکال لی گئی۔ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا لیکن ابھی گھر نہیں آیا تھا۔

یہودی علاقوں میں اتنا سخت انتقام لیا جا رہا تھا کہ خوف زدہ لوگ ہجوم در ہجوم پناہ کی تلاش میں عراق المنشیا میں آ پڑے تھے۔ گاؤں والے ان کی میزبانی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ گاؤں میں جتنی بھیڑیں رہ گئی تھیں، وہ سب ان کے لیے ذبح کی جا رہی تھیں۔ رات دن پہرا دیا جا رہا تھا تاکہ پناہ گزین کسی بھی ممکنہ خطرے سے محفوظ رہیں۔

احمد خلیل سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی نقل مکانی کے بعد فلسطین میں کوئی عرب باقی بھی رہے گا یا نہیں۔ کئی مہینے گزر گئے اور پھر ایک دن یوسف ملک مسجد میں آیا۔ اخوان المسلمون کے رضا کار اسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ وہ نہایت نحیف نظر آ رہا تھا۔ لوگوں نے اسے زندہ دیکھ کر

نعرے لگائے۔ یوسف ملک آہستہ آہستہ چلتا ہوا منبر تک گیا اور نمازیوں سے خطاب کیا۔ اس نے اپنی لڑائی کو جہاد قرار دیا اور نمازیوں کو یہودیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دی۔ اس نے اپنی تقریر کے دوران اس مہاجر کیمپ کا بھی ذکر کیا جو غزہ کے مضافات میں قائم کیا گیا تھا۔ یہودیوں کے مظالم سے تنگ آکر عرب مہاجرین جوق در جوق پہنچ رہے تھے۔ یوسف ملک نے کہا۔

''ہم اپنے دیہات، قصبات اور شہروں سے ان لوگوں کی طرح بھاگنے والے نہیں جنہوں نے مزاحمت کی ادنیٰ سی کوشش کیے بغیر ہی اپنے گھر چھوڑ دیے حتیٰ کہ ارگون (یہودیوں کی تنظیم) کے ظالم یہودیوں کی طرف سے قتل عام کی کہانی بھی دہرائی گئی تو بھی ہم خوفزدہ نہیں ہوں گے اور یہاں سے فرار نہیں ہوں گے۔ ہم یہیں ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں گے۔''

اسرائیل کے قیام کے بعد یہودیوں کے عزائم بہت بڑھ گئے تھے۔ ان کے ارادے یہ تھے کہ فلسطین کے جتنے علاقے خالی کرا سکیں کرا لیں اور جس طرح وہ اب تک دربدر تھے، فلسطینی بھی کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہو جائیں۔ عراق المنشیا خاص طور پر ان کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا کیونکہ وہ اب تک بھرپور مزاحمت کرتا چلا آیا تھا اور اخوان المسلمون کا مرکز بنا ہوا تھا جہاں شیخ اسحٰق جیسا سردار گزر چکا تھا اور اب یوسف ملک ان کے ارادوں کو خاک میں ملا رہا تھا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ملک وہاب نے قبائلیوں اور اخوان رضاکاروں کے ساتھ مل کر گاؤں کے گرد قلعہ بندی کے لیے خندقیں کھودنے کا کام شروع کر دیا۔ غیور قبائلی بدو اونٹوں پر سوار ہو کر تنگ گلیوں میں پریڈ کرتے رہتے تھے۔ یہ اس آخری معرکے کی تیاریاں تھیں جو نجبا والوں کے ساتھ ہونے والا تھا۔

عراق المنشیا کو خالی کرانے کے لیے یہودی تنظیمیں پورا زور لگا رہی تھیں۔ ایک دن نجبا کے یہودیوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ قبائلیوں نے خوب مقابلہ کیا اور نجبا والے پسپا ہو گئے۔

اگرچہ زمینی جھڑپوں میں نجبا کی تباہی مکمل ہو چکی تھی لیکن جونہی انہیں تازہ کمک پہنچی، عراق المنشیا کی طرف سے جاری نجبا کا محاصرہ ٹوٹ گیا اور معاً لڑائی کا پانسا پلٹ گیا۔

احمد خلیل کسی لڑائی کے لیے بالکل اناڑی تھا لیکن یہ یہودیوں سے نفرت اور اپنی جان بچانے کا جذبہ تھا کہ اس [illegible] ہوئے پانچ اسرائیلیوں کے خون سے اپنے خنجر کی پیاس بجھائی۔ اس نے اپنے گھر کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کی لیکن ایک تو حملہ آور تعداد میں زیادہ تھے، دوسرے مشین گنیں ان کے پاس تھیں جن کی فائرنگ سے ہونے والے قتلِ عام میں صرف وہ اور چند دوسرے لوگ ہی زندہ بچ سکے۔

وہ زخمی ہوا تھا اور غش کھا کر گر پڑا تھا۔ ایک اتھاہ اندھیرے میں ڈوبنے کے بعد جب وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو گھر سے بے گھر ہو چکا تھا۔ دوسرے مہاجرین کے ساتھ مہاجر کیمپ میں تھا۔ کینوس کے پھٹے پرانے خیموں کا گھنا جنگل تھا جسے خاردار تاروں سے گھیر کر اس میں بھوکے اور شکستہ حال لوگوں کو قید کر دیا گیا تھا۔

اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ اس کے خاندان کے تقریباً تمام افراد زندہ سلامت تھے۔ صرف ایک دکھ تھا کہ یوسف ملک اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی دکھ نہیں تھا۔ وہ صرف اس کا ماموں نہیں تھا بلکہ اسما کا باپ بھی تھا۔

کیمپ میں ہر شخص کو راشن کارڈ جاری کیے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ بیرونی ملکوں سے ملنے والی خیرات حاصل کرنے کا اہل ہو گیا۔ یہ خیرات بھی اتنی آسانی سے نہیں مل جاتی تھی۔ لمبی لمبی قطاروں میں گھنٹوں کھڑے رہنے کے بعد تھوڑا سا راشن مل جاتا تھا۔ اس ذلت کا بھی کوئی وقت نہیں تھا۔ جب یہ خیرات کہیں سے آ جاتی تھی، اعلان ہو جاتا تھا کہ قطاریں لگا لو۔

احمد خلیل نے یہ ذلت اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا راشن کارڈ بن ضرور گیا تھا لیکن اس نے بھکاریوں کی طرح قطار میں کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔

جب خیرات میں ملنے والی ان چیزوں سے کھانا تیار ہوا تو اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ دسترخوان پر سب بیٹھے تھے جب اس نے کھانے سے انکار کیا تو اسما نے بھی نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔

''تم نے کھانے سے انکار کیوں کیا۔'' اس کے والد نے پوچھا۔

''جو کھانا اپنی محنت سے روزی کما کر حاصل نہ کیا گیا ہو، مجھے وہ کھانا کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''یہ کیا کم محنت ہے کہ ہمیں گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔''

''یہ خیرات کا کھانا ہے۔''

''اس سے تو اچھا ہے جو عراق المنشیا میں ملا کرتا تھا۔''

"وہ حلال کا ہوتا تھا۔ میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔"
یہاں سے اٹھ کر وہ اسما کے پاس گیا۔
"تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"
"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں۔ کیا تم کھائے پیے بغیر زندہ رہ سکتے ہو؟"
"اس کھانے کو دیکھ کر مجھے اپنے بھکاری ہونے کا احساس ہوتا ہے۔"
"یہی احساس مجھے بھی ہوتا ہے لیکن کھائے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتے۔ کیمپ سے فرار بھی ناممکن ہے۔"
"میں تمہیں بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔"
"جب تک تم نہیں کھاؤ گے، میں بھی نہیں کھاؤں گی۔"
اس نے اسما کی خاطر ایک دن کے فاقے کے بعد... بہ کراہیت اس کھانے کو ہاتھ لگا لیا۔

چند روز نہیں گزرے تھے کہ اس نے اپنے باپ کو عجیب حلیے میں دیکھا۔ اس نے ڈاڑھی منڈوالی تھی اور پتلون قمیص کے ساتھ انگریزی وضع کے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ احمد خلیل نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ باپ سے کچھ کہہ تو نہیں سکتا تھا لیکن اس کی طرف سے نفرت اس کے دل میں اتر گئی۔

بہت جلد یہ راز بھی کھل گیا کہ اس نے یہ وضع کیوں اختیار کی ہے۔ کیمپ میں بہت سے تاجر ایسے تھے جو بڑے شہروں سے فرار ہو کر آئے تھے۔ تعلیم یافتہ تھے اور انگریزی لباس پہنتے تھے۔ مذہب سے بے زاری ان کی فطرت میں تھی۔ ملک وہاب نے ان سے مراسم استوار کرنے کے لیے اپنی ہیئت تبدیل کی تھی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور ایسے لوگوں کی محفلوں میں بیٹھنے لگا۔

احمد خلیل باپ سے برگشتہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان اس موضوع پر طویل بحثیں ہوتی تھیں۔ جب ان بحثوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے اپنے باپ سے بول چال بند کر دی۔ اب دونوں بہت کم ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ احمد خلیل کو اب اپنا راستہ خود تلاش کرنا تھا۔ اسے کیمپ میں ایسے لوگوں کی تلاش رہنے لگی جو اس کے ہم خیال ہوں اور اسے ایسے لوگوں تک پہنچا سکیں جو فلسطین کی آزادی کے لیے کام کر رہے تھے۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے کیمپ میں موجود بچوں کے لیے اسکول قائم کر دیا تھا۔ اساتذہ کی اکثریت اخوان المسلمون کے ارکان پر مشتمل تھی۔ اقوام متحدہ کے اہلکار اخوان المسلمون کے مخالف تھے۔ اسکول کا پرنسپل بھی ان اساتذہ کی جگہ دوسرے لوگوں کو لانے کا خواہش مند تھا لیکن آزاد خیال اساتذہ کی کمی تھی اس لیے وہ انہیں برداشت کر رہا تھا۔

کیمپ میں موجود انگریزی داں طبقے سے مراسم کا فائدہ یہ ہوا کہ ملک وہاب کو یہاں نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے بعد پرنسپل کو خوش کرنے کے لیے اس نے مسجد جانا بھی چھوڑ دیا۔

احمد خلیل اور ملک وہاب میں دوریاں اور بڑھ گئیں۔ ملک وہاب نے اپنے چھوٹے بیٹے خلیفہ کو اسکول میں داخل کرا دیا اور پھر اس نے احمد خلیل کو اسکول جانے کی ترغیب دی لیکن احمد خلیل نے انکار کر دیا۔
"نہیں ابا جان! میں اسکول جا کر بچوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔"

ایک یہی بہانہ تھا جو وہ کر سکتا تھا اور اس نے کر دیا لیکن ملک وہاب نے تو ہمیشہ یہ چاہا تھا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کرے۔ اب اس کا موقع مل رہا تھا تو وہ ہمت کیوں ہارتا۔ اس نے اسکول سے ابتدائی سائنس اور انگلش کا قاعدہ لا کر دے دیا۔
"اگر تم بچوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تو گھر میں رہ کر پڑھو۔ یہ زیادہ مشکل کتابیں نہیں ہیں۔ ذرا سی کوشش کرو گے تو پڑھ لو گے۔ میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔"
"مجھے ان کتابوں سے نفرت ہے۔" احمد خلیل نے ہٹ دھرمی سے کہا۔
"کوئی کتابوں سے بھی نفرت کرتا ہے؟"
"یہ ان لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جنہوں نے میرے وطن پر قبضہ کیا ہے۔"
"حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ہم یہ کتابیں پڑھ کر ہی اپنے وطن کو آزادی دلا سکتے ہیں۔" بحث فضول تھی۔ ملک وہاب کتنی ہی دلیلیں دیتا، احمد خلیل کا رویہ تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔ باپ بیٹے میں دوریاں اور بڑھ گئیں۔

کیمپ کی تکلیف دہ اور بے مقصد زندگی سے وہ اکتانے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ سوچنے لگتا تھا کہ باپ کے کہے پر عمل کرتے ہوئے اسکول میں داخلہ لے لے۔ انہی دنوں وہ خلیفہ سے ملنے اسکول گیا تو اس پر یہ حقیقت کھلی کہ اسکول کے اساتذہ کی اکثریت اخوان المسلمون کے رضا کاروں پر مشتمل ہے۔ اس نے ان سے دوستی کر لی اور ان کے ذریعے اخوان المسلمون کا لٹریچر اس تک پہنچنے لگا۔ عربی کے پمفلٹ تو وہ بہ آسانی پڑھ لیتا تھا لیکن انگریزی سے نفرت کی وجہ سے وہ انگریزی نہیں سیکھ سکا تھا اس لیے جو لٹریچر انگریزی

میں ہوتا تھا، وہ اسے نہیں پڑھ سکتا تھا۔

ان اساتذہ نے اسے صحابہ کرام کے کارناموں پر مشتمل کتابیں...... دیں اور ایک لغت بھی دے دی کہ وہ اس لغت کی مدد سے ان کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اس نے کئی مہینے دن رات ان کتب کا مطالعہ کیا اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوگیا کہ لغت کے بغیر ہی مطالعہ کرنے لگا۔ اس نے مسلمانوں کے اس دور کی تاریخ پڑھ ڈالی جب وہ دنیا کے زیادہ تر حصے پر حکمرانی کرتے تھے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر وہ موجودہ دور کا موازنہ اپنے ماضی سے کرتا تو دل سے ایک آہ نکلتی۔ موجودہ دور کے مسلمانوں کی معراج تو صرف یہ رہ گئی ہے کہ غیر مسلموں کی نقالی اور فرنگیوں کے اطوار اپناتے رہیں۔ ایسے میں اخوان المسلمون کا دم غنیمت ہے۔ وہ سوچنے لگتا تھا اور مکمل مایوسی کے اندھیروں میں جگنو سے چمکنے لگتے تھے۔

باپ اور بیٹا دونوں الگ الگ سمت میں سفر کر رہے تھے۔ ایک انگریزی کے نام پر ترقی کا خواہاں تھا، دوسرا اسلامی ریاست کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک دن اس خواب کے آئینے میں بال آگیا۔ اخباروں میں خبر چھپی کہ تحریک فلسطین کے راہنما حسن البنا قاہرہ کی سڑک پر ایک نامعلوم قاتل کی گولی لگنے سے شہید ہوگئے۔

اسکول کے اساتذہ میں کہرام مچ گیا جبکہ ملک وہاب نے اس خبر کو معمول سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ احمد خلیل باپ کی اس بے حسی پر خاموش نہ رہ سکا۔

”آپ اخوان المسلمون کے اپنے اساتذہ ساتھیوں کو کیوں پسند نہیں کرتے؟ آپ تو ان کے غم میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ اگر میں آپ کی طرح پڑھا لکھا ہوتا تو اپنے آپ کو ان کی تحریک کے لیے وقف کر دیتا۔“

ملک وہاب نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”سب کے سب رجعت پسند ہیں۔ جوشیلے مذہب پسند کہیں کے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود تنگ نظری کے خول سے کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ ایک کٹر مذہبی ریاست کے قیام کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ حال، ماضی سے مختلف ہے۔ اب تو حسن البنا بھی مارے گئے۔ اب تو انہیں دنیا کی دوڑ میں شامل ہوجانا چاہیے۔ ان کی وجہ سے ہم بھی کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اب فلسطین ہمارا نہیں اس حقیقت کو وہ کیوں تسلیم نہیں کرتے۔“

احمد خلیل کچھ اور کہنے والا تھا کہ ایک لمبے قد کا لڑکا خیمے کے اندر گھس آیا اور چیخنے لگا۔

”میرے ابا کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ آپ کو فوراً بلا رہے ہیں۔“

وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس کے ابا کون ہیں۔ بھاگتے ہوئے اس لڑکے کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ لڑکا ایک جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہ دونوں بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔ یہ پہچاننے میں انہیں دیر نہیں لگی کہ گندے فرش پر موجود چیتھڑوں کے ڈھیر کے اوپر پڑا ہوا، درد کی شدت سے تڑپتا ہوا کوئی اور نہیں ان کا ازلی دشمن نجم آفندی ہے جو اشارے سے انہیں اپنی طرف بلا رہا ہے۔

ملک وہاب نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔

زمین پر پڑی لاش کو جنبش ہوئی۔ آفندی نے چابیوں کا بھاری گچھا اس کی طرف پھینک دیا۔

”میں اپنا تمام اثاثہ تمہارے اور احمد خلیل کے حوالے کرتا ہوں۔ میری تمام جائداد کے مالک تم ہو۔ اگر کبھی یہاں سے جاسکو تو سب تمہارا ہے۔ بس میری تم سے یہ التجا ہے کہ تم مجھے معاف کر دینا۔ میں احمد خلیل سے بھی معافی مانگتا ہوں۔“

ملک وہاب نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ اس کے سامنے وہ آدمی پڑا تھا جس نے اسے غلام بنایا تھا۔ عراق المنشیا کے قتل عام کا ذمے دار یہی شخص تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس ہوگیا۔ احمد خلیل اس کے پاس ہی رک گیا اور تمام رات اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا حتیٰ کہ وہ فوت ہوگیا۔

صبح کے وقت اس کی میت کو غسل دیا، نماز جنازہ پڑھائی اور گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا گیا۔

وہ وہاں سے لوٹا تو یہ سوچتا چلا آرہا تھا کہ انسان کس کس طرح دولت جمع کرتا ہے۔ زمین پر خدا بن کر بیٹھا ہوتا ہے اور سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ آفندی کی موت اس کے لیے عبرت تھی۔ اس نے اس کے ٹھاٹ باٹ بھی دیکھے تھے اور اب گندے فرش پر اسے مرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ جس کے کتے انڈے اور گھی کھاتے تھے، وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر مر گیا۔ اس کا ایمان مزید پختہ ہوگیا۔

وہ اپنے خیمے میں آنے کے بعد بھی آفندی کے انجام پر غور کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی حالت پر بھی غور کیا۔ وہ یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اسے اس کیمپ میں آئے دو سال ہوگئے تھے۔ یہاں دھوپ کھانے اور بیکار

بیٹھنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ کتابوں کا مطالعہ بھی کب تک کرتا۔ خیالوں میں اپنے گاؤں کو یاد کرتا رہتا تھا لیکن وہاں جانے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ سرحد عبور کرنے کا مطلب یہ تھا کہ گولیوں کا نشانہ بن جائے۔ اسے اپنے چچازاد بھائی رشید کا خیال آیا جس نے ''فدائین'' کے گروہ میں شمولیت اختیار کرلی تھی اور جلد ہی یہودی آبادکاروں کے لیے وہ دہشت کا نشان بن گیا تھا۔ وہ اسے ''کالے وحشی جانور'' کے نام سے یاد کرتے تھے کیونکہ اس کا رنگ سیاہ تھا۔

اس نے رشید کے سامنے اپنے خیالات رکھ دیے۔

''کیا تم سرحد عبور کرکے مجھے عراق المنشیا پہنچا سکتے ہو؟''

''وہاں جاکر کیا کروگے؟''

''وہاں کی مسجد میں نماز ادا کروں گا۔ اپنی ماں کی قبر پر جاؤں گا اور اگر میرا گھر سلامت ہوا تو سوچتا ہوں اس کیمپ سے تو اچھا ہے وہیں رہ لوں۔''

''وہاں رہ کر کیا کرسکتے ہو۔ وہاں تو اب یہودیوں کی عمل داری ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے وہ مجھ سے تعرض نہ کریں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میرے خیال میں وہ برطانوی انگریزوں سے تو برے نہ ہوں گے۔''

''تم اگر ہمت کرو تو سرحد عبور کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''میں ہر حال میں وہاں جاؤں گا۔''

''اس کے لیے تمہیں اسرائیلی فوجیوں کی وردی پہننا ہوگی۔ اس عربی لباس میں اتنی دور جانا خطرناک ہوگا۔ یہ وردی میں تمہیں فراہم کروں گا۔ ان کا اسلحہ بھی میرے پاس ہے۔''

وہ دونوں مشرقی یہودیوں کا بھیس بدل کر شمال کی جانب پیدل چل پڑے۔ تین دن کے مسلسل سفر کے بعد وہ ''نجبا'' پہنچ گئے۔ راستے میں انہیں جس نے بھی دیکھا ہوگا یہی سمجھا ہوگا کہ یہودی نو آبادکار ہیں۔

ایک یمنی مزدور سے انہوں نے عراق المنشیا کا راستہ پوچھا۔ وہ مزدور کچھ دیر تو حیرت سے انہیں تکتا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''راستہ تو یہ ہے لیکن اب تو وہاں کسی عراق المنشیا کا نام تک نہیں۔ جنگ کے فوراً بعد اس گاؤں کو ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا گیا تھا اب تو وہاں یادمیریشیا نامی قصبہ تعمیر ہوچکا ہے۔''

دونوں بھائی اس طرف چل دیے۔ اب وہ بھی پہچان گئے تھے کہ راستہ یہی ہے لیکن کوئی چیز پہچانی نہیں جارہی تھی۔ وہ راستہ بھی نظر آگیا جہاں کنواں تھا لیکن اب وہ پکی شاہراہ میں تبدیل ہوچکا تھا اور اس وقت یہ راستہ بسوں اور ٹرکوں سے پٹا پڑا تھا۔ یہودی انبوہ در انبوہ گھوم رہے تھے۔ ان کی عورتیں گھٹنوں تک اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ صحت مند بچے ادھر ادھر گھوم رہے تھے، عرب باشندہ ایک بھی نظر نہ آیا۔

مسجد کیا ہوئی؟ اسے بھی مسمار کردیا گیا ہوگا۔

''رشید! اگر ہمارا گھر مل بھی گیا تو اس گھر میں رہنے والے یہودیوں کو ہم کیسے قائل کریں گے کہ یہ گھر ہمارا ہے۔ جہاں ہمارے گھر تھے، وہاں تو کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔''

وہ اچانک تھک گیا۔

''رشید! اب ہر کوشش فضول ہے۔ عرب اب واپس بھی آجائیں تو یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ یہ سب ہمارا ہے۔ ہمارا مقدر یہی ہے کہ کیمپ میں موت سے بدتر زندگی گزارتے رہیں۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔''

وہ جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے۔ وہ کیمپ میں واپس آگیا تھا۔ عراق المنشیا کی تباہی دیکھ کر اس کے غصے میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس بے کیف زندگی میں اگر دلچسپی کا کوئی سامان تھا تو وہ اسما تھی۔ اس سے باتیں کرکے وہ دل بہلا لیا کرتا تھا۔ اب اس کے دل میں یہ امنگ تیزی سے کروٹیں بدل رہی تھی کہ وہ اسما سے شادی کرلے لیکن یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ فاقوں سے بچنے کے لیے کوئی کام تلاش نہ کرلے۔ اس نے کوشش کی کہ غزہ میں اسے کوئی کام مل جائے لیکن اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں تھا۔ ملک وہاب کو اب یہ اعتراض ہونے لگا تھا کہ اس کی کمائی پر سب پل رہے تھے۔ وہ احمد خلیل کو دن رات ذلیل کرتا رہتا تھا کہ وہ کوئی کام کرے۔ کیمپ کے اکثر نوجوان راہ گیروں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے۔ احمد خلیل اپنے اس انجام سے ڈرتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ غزہ گیا لیکن ناکام رہا۔ دن رات اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا رہتا، آسمان تکتا رہتا یا آئندہ زندگی کے خواب دیکھتا رہتا۔

''تم کویت کیوں نہیں چلے جاتے۔ جب سے وہاں تیل دریافت ہوا ہے وہاں کے لوگوں کی کایا پلٹ گئی ہے۔''

''ہاں ابا جان! میں جانتا ہوں لیکن میں ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا، وہاں فیشن کی بھرمار ہے۔ مغربی زندگی کا نمونہ ہیں وہ لوگ۔ مجھے بھی ان جیسا بننا پڑے گا اور مجھے یہ سب پسند نہیں۔''

''تمہیں اس سے کیا، تمہیں تو روزگار سے مطلب ہے۔ اسلام یہ منع نہیں کرتا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام نہ

کرو۔ اسلام تو ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ اسلام یہ کب کہتا ہے کہ ہمیشہ ڈھیلی ڈھالی قبا پہنتے رہو۔ تم اگر پتلون پہنو گے تو اسلام سے خارج نہیں ہو جاؤ گے۔ نماز تو تم ہر لباس میں پڑھ سکتے ہو۔''

''یورپی فیشن اور بے پردگی کا سیلاب امڈا چلا آرہا ہے۔ میں اس میں بہنا نہیں چاہتا۔ میں تو نوکری بھی کروں گا تو ایسی جس میں میری شخصیت مسخ نہ ہو۔''

''ایسی نوکری تمہیں کہاں ملے گی؟ کیا اسی طرح میری کمائی پر گزارہ کرتے رہو گے؟''

''میں آپ کو مزید زحمت نہیں دوں گا۔ کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔'' اس نے کہا اور باپ کے سامنے سے ہٹ گیا اور سیدھا اسما کے پاس پہنچا۔

''اسما! مجھ سے شادی کرو گی؟''

اسما اس کے سوال کا کیا جواب دیتی۔ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''میں تمہاری خاموشی کو رضامندی سمجھ سکتا ہوں لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

''میرا آپ کے سوا ہے کون۔ آپ کا جو فیصلہ ہوگا مجھے قبول ہوگا۔''

''بس میں یہی سننا چاہتا تھا۔ میں ابھی اسی وقت غزہ جارہا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے وہاں کوئی کام ضرور مل جائے گا۔ میرا انتظار کرنا، میں تمہیں بہت جلد اس کیمپ کی کرم خوردہ زندگی سے دور لے جاؤں گا۔''

وہ غزہ چلا آیا۔ کئی عمارتیں بن رہی تھیں۔ وہ ایک ایک عمارت میں گیا اور اپنے لیے مزدوری طلب کی لیکن ہر جگہ سے نکالا گیا۔

وہ یونہی شہر کی نئی پرانی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ اسے ایک مسجد نظر آئی۔ اس مسجد میں کھجوروں کا گھنا باغ لگا ہوا تھا۔ اس نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا، وضو کیا۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی، وہ بھی شامل ہو گیا۔ نماز کے دوران ہی اس کے دل میں کسی نے خیال ڈالا۔ نماز ختم ہوتے ہی وہ امام صاحب کے پاس پہنچ گیا اور عراق المنشیا سے لے کر کیمپ تک جو کچھ اس پر گزری تھی، تمام احوال سناتے کے بعد ان سے درخواست کی کہ اسے کسی کام پر لگا دیا جائے۔ اس کے حالات سن کر امام صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

''تمہیں محنت مزدوری کے لیے کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مسجد زیرِ تعمیر ہے۔ بہت سے مزدور کام کررہے ہیں، میں تمہیں بھی رکھ لیتا ہوں۔ مسجد کا کام ابھی کئی مہینے چلے گا۔ اس دوران کوشش کرنا، اللہ تعالیٰ کوئی اس سے اچھا کام تمہیں دے دے گا۔'' اسے مزدوری مل گئی۔ پانچوں وقت کی نماز بھی وہیں ادا کرتا اور رات کو وہیں پڑ کر سو جاتا۔ کئی دن بعد امام صاحب نے ایک اور مہربانی کی۔

''تم کچھ نہ کچھ پیسے کھانے پر بھی خرچ کرتے ہو گے۔''

''جی ہاں، میں پیسے بچانے کے لیے ایک وقت کھانا کھاتا ہوں لیکن کھانا تو پڑتا ہے۔''

''تم کھجور کے درخت پر چڑھ سکتے ہو؟''

''بڑی آسانی سے۔''

''میں تمہیں اجازت دیتا ہوں جب تمہیں بھوک ستائے درخت پر چڑھ کر جتنی کھجوریں چاہو کھا سکتے ہو۔'' وہ اس مہربانی سے ایسا سرشار ہوا کہ جیب سے کیمپ کا راشن کارڈ نکالا اور اس کے پرزے پرزے کر دیے۔

''میں آپ کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہوں کہ غیر مسلموں کی طرف سے ملنے والی راشن خیرات کو ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ جب کھانے کو اللہ نے دے دیا تو خیرات کیوں قبول کروں۔''

اپنی روزی خود کمانے کے احساس نے اسے اچانک توانا کر دیا۔ امام کی شفقت نے اس کی خواہش کو زبان دے دی۔

''امام صاحب! آپ نے جہاں اتنی مہربانیاں کی ہیں ایک آخری مہربانی اور فرما دیں۔''

''آخری کیوں بیٹا...... تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہو۔''

''میری ماموں زاد ہے، اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ یہودیوں نے سب کو مار دیا۔ میں چاہتا ہوں اس سے شادی کر کے اسے بھی کیمپ کی زندگی سے نجات دلا دوں...... اگر رہائش کا بندوبست ہو جائے......''

''وہ لڑکی بھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہے؟''

''ہم ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔''

''میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے پوچھا وہ راضی ہے؟''

''میں اس سے پوچھ کر ہی کیمپ سے نکلا تھا۔''

''تمہارے والد تیار ہو جائیں گے؟''

''وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''اس لڑکی کو لے آؤ۔ میں تمہیں مسجد کے تہ خانے کا کمرا دے دوں گا۔ جب تک کوئی بہتر رہائش گاہ تلاش نہ

کرلو، اس وقت تک یہاں رہ سکتے ہو۔"

احمد خلیل نے تہ خانے کی صفائی کی۔ کچھ پرانی چٹائیاں بچھالیں۔ امام صاحب نے ایک پرانا گدا اور چراغ دے دیا۔ وہ بازار جاکر کچھ برتن بھی لے آیا۔

جب یہ کمرا گھر کا منظر پیش کرنے لگا تو وہ کیمپ گیا اور اسما کو لے آیا۔ ملک وہاب اور رشید بھی اس کے ساتھ آئے اور اسما سے اس کا نکاح ہوگیا۔

احمد خلیل دن بھر مسجد میں مزدوری کرتا، کھجور کے باغ کی دیکھ بھال کرتا اور عشا کی نماز کے بعد تہ خانے میں چلا آتا۔

ایک دن وہ ظہر کی نماز کے بعد مسجد کے قریب بازار سے دو روٹیاں خریدنے گیا۔ ابھی وہ نان بائی کی دکان پر پہنچا ہی تھا کہ دو پولیس والے اس کے سامنے آگئے اور اسے تھانے چلنے کو کہا۔ ابھی وہ احتجاج کرنے ہی والا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگ گئی۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے تھانے لے گئے۔ تھانے میں ان کا افسر ایک لمبی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کرختگی تھی کہ اس سے کسی رحم کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے کیمپ چھوڑ دیا ہے اور مسجد میں رہائش پذیر ہو۔"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے۔"

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خصوصی اجازت کے بغیر کیمپ کی حدود سے باہر مہاجرین کی رہائش ممنوع ہے۔ تمہارے پاس اجازت نامہ ہے؟"

"آپ کے پاس مجھے میری زمین سے بے دخل کرنے کا اجازت نامہ ہے؟" احمد خلیل نے الٹا اس سے سوال کرڈالا۔

"گورنر نے تمہارے بارے میں حکم دیا ہے کہ تمہیں گرفتار کرکے اس وقت تک جیل میں رکھا جائے جب تک جرمانہ ادا نہ کردو۔ اس کے بعد تمہیں دوبارہ کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔"

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے لے کر جاکر کال کوٹھری میں بند کردو۔ اسے رات بھر کوٹھری میں بند رکھا گیا اور تشدد کی دھمکیاں دے کر مختلف سوالات پوچھے جاتے رہے۔ صبح ہوئی تو کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا۔

"تمہارا جرمانہ ادا کیا جاچکا ہے اس لیے تمہیں رہا کیا جاتا ہے۔"

وہ تھانے کے صدر دفتر میں پہنچا تو اس نے وہاں اپنے امام کو بیٹھے دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جرمانہ انہوں نے ادا کیا ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے پولیس افسر نے اسے خبردار کیا۔

"اس مرتبہ تو ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں لیکن یاد رکھو اگر آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو بدترین انجام کے لیے تیار رہنا۔"

اسے اس صورتِ حال کے نتیجے میں فی الفور کیمپ جانا پڑا۔ وہ اپنا راشن کارڈ پھاڑ چکا تھا لیکن خوش قسمتی سے اسما کے پاس اس کا راشن کارڈ محفوظ تھا جس سے اتنا راشن آسکتا تھا کہ تنگی ترشی کے ساتھ گزر ہوسکتی تھی۔

دو تین مہینے اسی عالم میں گزر رہے تھے کہ مسجد کے وہی امام مہاجر کیمپ میں آئے جن کے پاس وہ غزہ کی مسجد میں رہ چکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ امام صاحب کو اس کی یاد آئی ہوگی اور وہ ملنے آگئے لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہونے والا ہے، یہ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

"میرے بیٹے! تمہارا بلاوا آگیا ہے۔ تمہیں حج پر جانا ہے۔"

"صرف مجھے؟"

"جسے تم لے جانا چاہو۔"

"مگر یہ ہوگا کیسے، مجھے تو کیمپ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، مکہ مدینہ کیسے جاؤں گا؟"

"ہم قانونی تقاضے پورے کرکے جائیں گے۔ میں یہ فارم لے کر آیا ہوں۔ اسے پر کرکے مصری حکام سے اجازت طلب کی جائے گی۔ اجازت ملتے ہی ہم روانہ ہوجائیں گے۔"

"اگر حکام نے اجازت نہیں دی؟ جب سے جمال عبدالناصر کی حکومت آئی ہے ہم مہاجروں کے لیے سختیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔"

"اگر اجازت نہیں بھی ملی تو بھی ہم فریضۂ حج ضرور ادا کریں گے بلکہ میں سعودی حکومت کو درخواست لکھوں گا کہ وہ تمہیں مستقل وہیں قیام کی اجازت دے دیں۔"

وہ خوشی سے چلا اٹھا۔ "امام صاحب! اگر ایسا ہوجائے تو کیا بات ہے۔ اگر مجھے وہاں قیام کی اجازت مل گئی تو میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ اگر فلسطین کی آزادی کے لیے لڑنے کا موقع ملا تو شاید آجاؤں ورنہ میں کبھی واپس نہ آؤں گا۔"

"وہ سرزمین ایسی ہے کہ وہاں تمہیں ہندوستان تک سے آئے ہوئے مہاجرین کی رفاقت میسر آجائے گی۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اگر اجازت نہ ملی تو ہم غیر قانونی طور پر سرحد کیسے عبور کریں گے؟ اگر پولیس نے پکڑ لیا تو ہمارا کیا بنے گا؟ ریلوے اسٹیشن پر متعین پولیس کیا ہمیں یوں آسانی سے جانے دے گی؟"

''ان پولیس والوں میں چار ہماری مسجد کی انتظامی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ وہ تمہیں جانتے بھی ہیں اور میں تمہارے بارے میں انہیں بتا بھی چکا ہوں۔ وہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔'' امام صاحب نے کہا اور اس کے ہاتھوں میں نوٹوں سے بھری ہوئی ایک پوٹلی تھما دی۔

''امام صاحب! یہ کیا؟''

''یہ تمہارے سفری خرچ کے لیے کچھ رقم ہے۔ بھائی وہاں تک جاؤ گے تو کیا کوئی خرچ نہیں ہوگا؟ میں نے نماز جمعہ کے بعد لوگوں سے اپیل کی تھی جس کے جواب میں یہ رقم جمع ہوئی ہے۔ مسلمان دوستوں کی طرف سے دی گئی یہ رقم قبول کرو اور اسے سنبھال کر رکھو۔ جب تم فریضۂ حج کے لیے روانہ ہو گے تو تمہیں یہ بہت قیمتی معلوم ہوگی۔''

احمد خلیل نے یہ پوٹلی بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ قبول کر لی۔

امام صاحب اسما کے لیے نامحرم تھے اس لیے وہ ان کے سامنے نہیں آسکی تھی لیکن کچھ باتیں اس کے کانوں تک پہنچ ضرور گئی تھیں۔

امام صاحب کے رخصت ہونے کے بعد وہ اسما کے پاس گیا تو اس کی آنکھوں میں حیرانی نہیں تھی پھر بھی اس نے امام صاحب کے آنے کی وجہ دریافت کی اور اس نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''میں خود اس کیمپ کی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ اس سے زیادہ خوشی کا موقع اور کیا ہوگا کہ وہ پاک سرزمین ہمیں بلا رہی ہے۔ آپ کے والد جانے کی اجازت دے دیں گے؟''

''وہ بھی تو ہمارے ساتھ جائیں گے۔ میں نے تو امام صاحب سے پورے خاندان کی بات کی ہے۔ بس ایک دکھ ہوتا ہے کہ میں فلسطین کو دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا۔''

''فلسطین کو تو آپ بھول ہی جائیں۔ جنگ ختم ہوئے پانچ سال ہو چکے مگر اب بھی ہم فلسطین واپس جا کر اپنے گھروں کو دوبارہ تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہم بے بس ہیں، کمزور ہیں۔ ہمارا دشمن ہر لحاظ سے طاقتور ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ میں ابا سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے اپنے والد سے بات کی لیکن اسے یہ سن کر تعجب ہوا کہ وہ یہاں سے جانے کو تیار نہیں۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری بھی انہیں کیمپ چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ وہ تو اس کے بھی خلاف تھے کہ احمد خلیل مستقل قیام کے لیے سعودی عرب کیوں جا رہا ہے۔ انہوں نے بہ مشکل اس شرط پر اجازت دی کہ وہ خلیفہ کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائے۔

''میں اب زیادہ دن اس کا خرچ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ مجھ سے اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔''

خلیفہ اب بچہ نہیں رہا تھا لیکن اس پر کبھی کبھی پاگل پن کے دورے پڑتے تھے۔ اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

اب وہ، اسما، رشید اور خلیفہ جانے کے لیے تیار تھے۔

کئی ماہ گزر گئے، مصری حکام کی طرف سے اس کی درخواست کا کوئی جواب نہیں آیا۔ فلسطینی مہاجروں کو حج کی اجازت نہیں تھی اس لیے اس کی درخواست کا جواب نہیں آیا۔ وہ امام صاحب سے مسلسل رابطے میں تھا۔ بہرحال انہوں نے تمام انتظامات مکمل کر کے اسے اطلاع دے دی کہ وہ غزہ ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے۔ وہاں سے ریل گاڑی اسے بحیرۂ احمر کی مصری بندرگاہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گی۔ وہاں سے وہ بحری جہاز پر سوار ہو جائے گا۔

احمد خلیل کو یہ خوف ضرور تھا کہ وہ پکڑا جا سکتا ہے لیکن یہ ڈھارس بھی تھی کہ وہ یہ سفر مقدس مقصد اور اعلیٰ ترین نصب العین کے لیے اختیار کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔

اس نے بچے کھچے خاندان کو سمیٹا اور غزہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا لیکن اپنی گھبراہٹ ظاہر کرتا تو دوسروں پر کیا گزرتی۔

''اسما! تم گھبرا تو نہیں رہی ہو؟'' اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے اسما سے پوچھا۔

''جب آپ ساتھ ہیں تو مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کھجوروں کے تھیلے سنبھال کر رکھنا۔ راستے میں یہی ہماری خوراک ہوگی۔''

''یہ بہت بھاری ہیں، رشید بھائی اٹھائیں گے۔''

احمد خلیل اس سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ ریل کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تیار ہو جاؤ، گاڑی آنے والی ہے۔''

وہ اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے اسے بہت تجربہ ہو حالانکہ وہ اس سے پہلے کبھی ریل میں نہیں بیٹھا تھا۔ ٹرین کے رکتے ہی وہ سب کو لے کر ٹرین کی طرف بڑھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبا تھا جہاں لکڑی کی بنی ہوئی بنچیں تھیں۔ وہ ایک بنچ پر اکٹھے بیٹھ گئے۔

ریل گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ اب کم

ازکم قنطارہ کے ریلوے اسٹیشن تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔

سورج نے آنکھیں دکھانا شروع کی تھیں کہ ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں ان سب مسافروں کو اترنا تھا جو بحری جہاز پر بیٹھنے کے لیے یہاں تک آئے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو حج بیت اللہ کے لیے جارہے تھے اور عام مسافر بھی۔ ان میں کوئی فلسطینی مہاجر اسے نظر نہیں آیا۔ نظر آ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ فلسطینی مہاجروں پر حج پر جانے کی پابندی تھی۔

مختلف ڈبوں سے لوگوں کا ہجوم اتر کر پلیٹ فارم پر آیا۔ وہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے ہجوم کے درمیان چل رہا تھا۔ اسما نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ رشید اور خلیفہ پیچھے پیچھے چل رہے تھے کہ اچانک پولیس کا ایک سپاہی اس کے سامنے آگیا۔

''اے..... اپنے کاغذات دکھاؤ۔''

''اتنے لوگ چل رہے ہیں، تم ان سے کاغذات طلب کیوں نہیں کرتے؟''

''اس لیے کہ تم مجھے فلسطینی لگتے ہو۔''

''تمہارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''اگر تم فلسطینی نہیں ہو، مصر کے شہری ہو تو کاغذات کیوں نہیں دکھاتے؟ تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟ صحت کا سرٹیفکیٹ ہی دکھادو ورنہ میں تمہیں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کے الزام میں جیل بھیج دوں گا۔''

رشید تو فدائین کے گروہ میں رہ چکا تھا۔ اس نے کئی یہودی سپاہیوں کو ڈھیر کیا تھا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے سپاہی سے اس کا ڈنڈا چھینا اور ایسی ضرب لگائی کہ وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ پولیس کے مزید سپاہی اس کی مدد کو پہنچتے، یہ چاروں ہجوم میں شامل ہوکر اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ یہاں ایسی گاڑیاں کھڑی تھیں جو مسافروں کو بندرگاہ تک لے جارہی تھیں۔ وہ بھی ایک بس میں سوار ہوگئے۔ یہ بس ان کے بیٹھتے ہی روانہ ہوگئی۔ یہ خطرہ ٹل گیا کہ پولیس آئے گی اور انہیں تلاش کرے گی۔ البتہ بس کے مسافروں میں اس واقعے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''کچھ لوگ غیر قانونی طور پر سرحد پار کررہے ہیں۔''

''اچھا اسی لیے ایک پولیس والے پر حملہ کیا گیا ہے۔''

''پتا نہیں بے چارے کا کیا حال ہوا۔''

''حملہ آور کہاں چلے گئے؟''

''وہ ہجوم میں شامل ہوکر نکل گئے۔ اب پتا نہیں کہاں ہوں گے۔''

''ان کا حلیہ بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ پولیس والا تو..... بے ہوش ہوگیا تھا۔ ہوش میں آئے گا تو بتائے گا۔''

احمد خلیل نے شکر ادا کیا کہ کسی نے انہیں پہچانا نہیں۔ وہ اسی بس میں سوار تھے اور کوئی ان کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اسے کسی سستے جہاز کی تلاش تھی۔ بس سے اترتے ہی وہ جہازوں کی تلاش میں نکلا۔ بندرگاہ حاجیوں کے جہازوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے کویت سے آیا ہوا ایک پرانا جہاز تلاش کرلیا۔ یہ جہاز صحرائے سینا کے قبائلی بدوؤں، مصری کسانوں اور وسطی افریقا کے سیاہ فام حبشیوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ تمام مکہ جانے والے حاجی تھے۔ یہ چاروں بھی جہاز میں سوار ہوگئے۔ کپتان کی نظر ان پر پڑی تو اس نے انکار کے انداز میں اپنے بازو لہرائے۔

''کسی اور جہاز میں جاؤ۔ یہاں گنجائش سے زیادہ لوگ ہیں۔ سنتے نہیں ہو؟ جہاز ڈوب جائے گا اس میں مت سوار ہو۔'' اس نے کسی کی نہیں سنی۔ اسما، رشید اور خلیفہ کو لے کر جہاز پر سوار ہوگیا۔ جہاز کا عملہ بھی جمع ہوگیا تھا اسے اتارنے پر بضد تھا لیکن اس نے مقررہ کرائے سے زیادہ رقم دے کر سب کے منہ بند کردیے۔

''ہم تمہیں لے چلتے ہیں لیکن یاد رکھو یہ سفر تمہیں اپنی ذمے داری پر طے کرنا ہوگا۔''

''میں اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوں۔''

''تمہیں عرشے پر ہی سفر کرنا ہوگا۔''

''عرشے پر اور بھی لوگ ہیں ہم بھی یہیں پڑے رہیں گے۔''

عرشے پر اتنا ہجوم تھا کہ بیٹھنا محال تھا۔ سورج الگ اپنے جلال پر تھا۔ اسما سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی کسی گٹھری کی طرح بیٹھی تھی۔ خلیفہ اس صورت حال سے سخت وحشت زدہ تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں اس پر دورہ نہ پڑ جائے۔ یہ رشید ہی کا دم تھا جو اسے سنبھالے ہوئے تھا۔

نہایت تکلیف دہ سفر بالآخر اختتام پذیر ہوا۔ جہاز دو دن کی تاخیر سے جدہ کی بندرگاہ پر پہنچا لیکن یہاں پہنچتے ہی ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی۔ جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی وہاں کے ایک افسر نے مسافروں کو بندرگاہ پر اترنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔

اس نے کہا کہ اس جہاز کا کپتان ایک رسوائے زمانہ اسمگلر ہے۔ انسانوں کے اس ہجوم میں غلام لاد کر لایا ہے۔ وہ پہلے بھی یہی کرتا رہا ہے۔ انسانوں کو لایا ہے اور

غلام بنا کر بیچ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے ان میں سے کسی کے پاس بھی ویزا یا پاسپورٹ نہیں ہوگا۔"

اتنے میں ایک اور افسر آگیا جو عہدے میں اس سے بڑا تھا۔ اس نے جھگڑنا شروع کر دیا اور اپنے ماتحت کو ڈانٹا۔

"تم آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ انہیں حج جیسے مقدس فریضے سے روکنے والے تم کون ہوتے ہو۔"

خاصی دیر کی تکرار کے بعد کپتان کو اجازت مل گئی کہ وہ جہاز کو کنارے تک لاسکتا ہے۔ ہجوم نے گھبرا کر جہاز سے اترنے کی کوشش کی کہ نہ جانے کب پہلے افسر کی طرف سے ممانعت کا حکم آجائے۔ وہ بھی اس ریلے کے ساتھ بہہ کر کنارے پر اتر گئے۔ کچھ فاصلے پر درجنوں بسیں کھڑی تھیں جن میں بے پناہ رش تھا۔ رشید نے مشورہ دیا کہ مکہ تک کا سفر پیدل طے کیا جائے۔ پیسے بھی بچ جائیں گے اور بسوں کے رش سے بھی بچ جائیں گے۔ مشورہ کچھ ایسا غلط نہیں تھا لیکن احمد خلیل نے اسما کی حالت دیکھتے ہوئے اس مشورے کو مسترد کر دیا۔ اسما حاملہ تھی اور زیادہ چلنا اس کے لیے نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ انہوں نے بس کی تلاش کی، معلوم ہوا بس کے اندرونی حصے میں باقاعدہ نشستوں پر بیٹھنے کا کرایہ ان کی پہنچ سے باہر ہے۔ چھت پر بیٹھنے کا کرایہ نصف تھا۔ بہت سے لوگ پیسے بچانے کے لیے چھت پر بیٹھ رہے تھے۔ وہ بھی چھت پر بیٹھ گئے مگر اس طرح کہ اکڑوں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ سورج شعلے برسا رہا تھا۔ گرمی سے بچاؤ کا کوئی طریقہ نہیں تھا، صرف ایک طریقہ تھا کہ صبر کیا جائے۔

اسے حضرت بی بی ہاجرہ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیل کی پیاس یاد آگئی۔ اس نے اور سب کو بھی تلقین کی کہ ہم جس عظیم مقصد کے لیے جا رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ صبر کیا جائے۔ بس کچھ دیر جاتی ہے کہ زم زم کا کنواں ہمارے سامنے ہوگا جس سے ہم اپنی پیاس بجھائیں گے۔ تمام دنیا کو بنانے والے کا گھر ہمارے روبرو ہوگا جسے دیکھ کر ہماری آنکھوں میں ٹھنڈک آئے گی۔ منیٰ پہنچ کر ہمارے ایمان کا پودا سرسبز ہوگا۔ ہمارے گناہ اس طرح جھڑ جائیں گے جیسے خزاں میں پتے جھڑتے ہیں لیکن یہ بھی نظام قدرت ہے کہ ان پتوں کی جگہ نئے پتے آتے ہیں اسی طرح ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ یہاں کی پاکیزہ گلیاں ہمیں سہارا دیں گی۔ بس کچھ دیر کی بات ہے۔

سفر ختم ہوا۔ بس رک گئی۔ لوگ بس سے باہر آنے لگے۔ وہ چھت سے نیچے اترے۔ "اے اللہ میں حاضر ہوں" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہوگئے۔ مکہ معظمہ کی تنگ گلیاں لوگوں سے بھری پڑی تھیں۔ اسما مضبوطی سے احمد خلیل کا بازو پکڑے ہوئی تھی۔ اس کا بھائی اور چچازاد اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

مکہ میں رہ کر انہیں عمرہ ادا کرنا تھا اور پھر حج کے ارکان کی تکمیل کے لیے "منیٰ" کی طرف روانہ ہونا تھا۔

☆☆☆

صبح صادق کا وقت تھا جب وہ حج کی تکمیل اور کچھ دن مکہ میں گزارنے کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ ہر قدم پر اس کے دل میں کوئی چیخ چیخ کر کہتا تھا، وسیع وعریض دنیا میں یہی وہ شہر ہے جسے تو مستقل قیام اور وطن ثانی بنانے کے لیے انتخاب کرسکتا ہے۔ اس نے مصر کی آزاد خیالی کو ایک فلم میں دیکھا تھا۔ غزہ شہر جس تیزی سے مغرب کی نقالی کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ کویت اور ترکی کے افسانے بھی اس کے کانوں تک پہنچے تھے۔ وہ مدینہ کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہاں یورپی اثر ونفوذ کی رفتار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اس مختصر سے سفر میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوگیا تھا کہ جو قومیں اپنی خواہشات کی غلام ہوجاتی ہیں، وہ آزادی کی جنگ نہیں لڑسکتیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسما اس کے بچے کا بوجھ اٹھائے چل رہی تھی۔ اس نے عہد کیا کہ وہ اس ہونے والے بچے کو پکا اور سچا مسلمان بنائے گا۔ مغربی زندگی سے اسے دور رکھے گا۔ اسے یاد دلاتا رہے گا کہ اسے فلسطین کی آزادی کے لیے جنگ کرنی ہے۔ فلسطین کی آزادی سے پہلے میں اس شہر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

وہ اور بہت سے لوگوں کے ساتھ مسجد نبوی ﷺ پہنچ گیا اور ایک بہت بڑے محرابی دروازے سے گزر کر مسجد میں داخل ہوا۔ پھر ایک بڑے دروازے سے گزرنے کے بعد حضور پُرنور ﷺ کے روضۂ مبارک پر پہنچا۔ آپ کا روضۂ مبارک ایک زیبائشی جنگلے کی جالیوں کے اندر تھا لیکن آپ کی موجودگی کا احساس اس کے جسم میں دوڑ رہا تھا۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دوبھر تھا۔ اس کے لب حرکت میں تھے۔ وہ شانِ اقدس میں درود وسلام کے نذرانے بھیج رہا تھا۔

اس نے اس مسجد میں دن بھر کی نمازیں ادا کیں۔ عشا کی نماز کے بعد انہوں نے اپنے سامان کی گٹھریاں صحن کے ایک کونے میں رکھیں۔ ہر ایک نے مٹھی مٹھی بھر کھجوریں کھائیں اور وہیں فرش پر سو گئے۔

اگلے دن وہ اور رشید شہر میں رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ تلاشِ بسیار کے

بعد ایک تین منزلہ عمارت میں انہیں کمرا مل گیا۔ یہ پوری عمارت پناہ گزیں مہاجرین سے بھری پڑی تھی۔ ان میں روسی، چینی اور ترکستان سے آئے ہوئے مہاجرین بھی تھے جو اپنے اپنے علاقوں میں ظلم وستم سے تنگ آکر مدینۂ منورہ میں پناہ کے لیے آگئے تھے۔ یہ بلڈنگ ایک قسم کا مہاجر کیمپ بنی ہوئی تھی لیکن ویسا مہاجر کیمپ نہیں جو وہ غزہ میں چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ ان پر بیتی ہوئی ظلم کی داستانیں سنتا تو اپنے دکھ بھول جاتا۔

اس نے غزہ کے مہاجر کیمپ میں اکثر نوجوانوں سے کمیونزم، سوشلزم اور کارل مارکس کے بارے میں سنا تھا۔ اسے کئی آدمیوں نے بتایا تھا کہ کمیونزم کا مقصد انسانوں میں مساوات اور طبقاتی تقسیم کو ختم کرنا ہے اور امیروں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کرنا ہے۔ غزہ کے کیمپ میں وہ اکثر ایسے کمیونسٹوں کو دیکھتا تھا جو روس اور اس کے زیرِ اثر عرب ممالک کے درمیان باہمی گرم جوشی پر مبنی تعلقات کا پرچار کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے جیسے روس ساری دنیا کے انسانوں کا مسیحا ہے۔ وہ ریڈیو ماسکو کی عربی نشریات بھی سنتا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کمیونزم تمام معاشی برائیوں کا علاج ہے۔ فلسطین کی طرح ترکستان میں بھی سفید روسیوں نے غاصبانہ قبضہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے آبائی علاقوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ موت اور جلاوطنی کی دھمکیوں کے ذریعے انہیں اسلام پر عمل کرنے یا اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرنے سے منع کر دیا تھا۔ سرکاری اسکولوں میں الحاد کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ بالائی منزل پر رہائش پذیر کچھ لوگ ایسے تھے جو ان مظالم سے بچ کر یہاں آگئے تھے۔ ان کی داستانیں تقریباً وہی تھیں جو احمد خلیل کی تھیں۔ اس لیے ان کی صحبت میں اس کا جی لگتا تھا۔

اس علاقے میں تنہا وہی عرب تھا۔ اسے ایک بھی ایسا فلسطینی نہ مل سکا جو اس کا ہم راز ہو۔ فلسطینیوں کا تو یہ حال تھا کہ دہران اور کویت کی تیل کمپنیوں میں ملازمتیں کرنے لگے تھے اور ان ہی کے رنگ میں رنگتے جا رہے تھے۔ ان میں سے چند ہی تھے جو مکہ یا مدینہ میں کبھی کبھار آنا گوارا کرتے تھے۔ اسے ہر سال اربابِ حکومت کے دفتروں میں جا کر یہ درخواست دینا پڑتی تھی کہ اس کے قیام کی مدت میں توسیع کی جائے البتہ سعودی عرب کی شہریت حاصل کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ فلسطین جانے کے حق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے۔ فلسطین کی آزادی کا اسے اب بھی انتظار تھا۔

اس گھر میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسما نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ احمد خلیل کا یہ پہلا بیٹا تھا۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند کے نام پر اس کا نام اسمٰعیل رکھا۔

"مستقبل میں کیا خبر اللہ تعالیٰ اس بچے کو "اسمٰعیل" کے نام کی عظیم صفات کا مرقع بنا کر اس کے سر نیک نامی کا سہرا باندھ دے۔"

اس کے تصورات میں امید کے کئی جھروکے ایک ساتھ کھل گئے تھے۔ وہ اسی رات باپ کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا جس میں اس نے اسمٰعیل کی پیدائش کی خوش خبری سنائی تھی اور یہاں کے حالات تفصیل سے لکھے تھے۔

اس خط کو سپردِ ڈاک کرنے کے بعد وہ کئی مہینے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن جواب نہیں آیا۔ اس نے اسے والد کی ناراضی پر محمول کرتے ہوئے صبر کر لیا۔

اخبارات میں غزہ اور سینائی پر اسرائیلی حملوں، پورٹ سعید اور نہر سوئز پر برطانوی اور فرانسیسی بمباری کی تفصیلات سے بھرپور خبریں آ رہی تھیں۔ کئی ماہ بعد جب صدر آئزن ہاور کے حکم سے یہودیوں کو مقبوضہ علاقے خالی کرنا پڑے تو احمد خلیل مصری حکام کی طرف سے گرفتار شدگان کی فہرست میں اپنے والد کا نام پڑھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ ان گرفتار شدگان پر دشمن کے ساتھ سازباز کرنے کا الزام تھا اور مقدمہ چلانے کا اعلان کیا گیا تھا جس میں سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔

احمد خلیل اور رشید نے شہر کے مضافات میں واقع نخلستان میں کھجور کے درختوں کی دیکھ بھال اور سبزیوں کی کٹائی کا کام حاصل کر لیا تھا۔ معاوضہ تو بہت حقیر ملتا تھا لیکن کھجوریں اور سبزیاں گھر لے جانے کی اجازت تھی اس لیے یہ معاوضہ ان کی ضروریات کے لیے بہت تھا۔ کم از کم کمرے کا کرایہ نکل جاتا تھا۔

کئی ہفتوں بعد وہ کام سے واپس آکر بیٹھا تھا کہ اسے ملک وہاب کا خط موصول ہوا۔ اس خط میں اس نے یہ اطلاع دی تھی۔

"مقدمے کے دوران میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب رہا۔ میں اب رہا ہو گیا ہوں اور آزاد ہوں، کیمپ کے اسکول میں دوبارہ پڑھانے کے لیے آگیا ہوں۔"

اب اسما کے ہاں دوسری ولادت ہونے والی تھی۔ پہلا بیٹا اسمٰعیل چار سال کا ہو گیا تھا کہ اسما نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ ان میں ایک لڑکا تھا ایک لڑکی۔

احمد خلیل کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اسے کتنی

خوشی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا اسمٰعیل کو بھی خوشی ہوگی لیکن اس چار سال کے بچے نے تو آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس نے زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر چیخنا شروع کردیا۔ ''مجھے کوئی بہن کوئی بھائی نہیں چاہیے۔ انہیں اٹھا کر پھینک دو، میں اس گھر میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا کھانا کھانے آگئے ہیں۔ میں انہیں بھوکا ماردوں گا۔ تم تو کہتی تھیں تم مجھ سے محبت کرتی ہو پھر یہ کہاں سے آگئے۔''

احمد خلیل نے عراق المنشیا میں ایسا کوئی لڑکا نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں اتنے بچے تھے لیکن مجال نہیں تھی کہ بڑوں کے سامنے کوئی بولتا۔ اب اس کا بیٹا تھا کہ اس پر کوئی نصیحت اثر نہیں کررہی تھی۔ اسے تو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لڑکا جوں جوں بڑا ہوتا جائے گا، بے قابو ہوتا جائے گا۔ پھر اس نے سوچا وقت کے ساتھ اسے بھی اپنے بہن بھائیوں سے محبت ہوجائے گی۔

اس اثنا میں رشید کی بھی شادی ہوگئی۔ اس کے بھی بچے ہوگئے۔ احمد خلیل خوش تھا کہ عراق المنشیا اجڑنے کے بعد پھر اس کا خاندان تعمیر ہو رہا ہے لیکن اسمٰعیل کو اپنے بہن بھائی برداشت نہیں تھے بچا کے بچے کیسے برداشت ہوتے جبکہ اب تو وہ آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اب اس کی خودسری اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے گستاخی سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ اس کا جو جی چاہتا، وہ کرتا تھا۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ گھر کے تمام بچے اس سے ڈرتے تھے۔ وہ ان کی خوراک تک چرا کر کھا جاتا تھا۔ اب تو احمد خلیل بھی اس سے ڈرنے لگا تھا۔

خلیفہ تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ بچپن میں بھی اپنی دیوانگی کے باوجود اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی اور اب تو وہ خطاطی کے ایسے ایسے نمونے تخلیق کر رہا تھا کہ اس کے فن پارے مکہ اور مساجد میں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اسے ایسے قدرداں میسر آگئے تھے کہ جن کی کوششوں سے نہ صرف پورے عرب میں بلکہ عرب سے ملحقہ علاقوں میں بھی اس کے فن کے نمونے پہنچ چکے تھے اور قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھے جارہے تھے۔

اس کی عمر انیس سال تھی تو خانہ کعبہ پر چڑھائے جانے والے غلاف کی آرائش و زیبائش کے لیے اس کا انتخاب کرلیا گیا۔ یہ اس کی زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ وہ اس کام کے لیے مکہ مکرمہ گیا جہاں اس نے کئی مہینے اس طرح گزارے کہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر درجنوں دیگر ماہر کاریگروں کے ساتھ اپنی بیداری کا تمام وقت سوزن کاری میں گزارتا رہا۔

جب خلیفہ کی عمر بیس سال ہوئی تو ایک روسی مہاجر اس کا قدرداں بن گیا اور اتنا مداح ہوا کہ اپنی بیٹی کے رشتے کی پیشکش کردی۔

☆☆☆

احمد خلیل کا بیٹا جب چار سال کا تھا تو اس نے اسے مسجد کے مدرسے میں بھیجنا شروع کردیا تھا تا کہ وہ قرآن پاک حفظ کرسکے لیکن وہ حفظ تو کیا کرتا، دوسرے بچوں کو بھی اپنی راہ پر لے آیا۔ سب نے مل کر استاد کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ اس نے اسمٰعیل کو گھر بھیج دیا۔ لیکن احمد خلیل ڈٹا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسے ایک بڑا عالم دین بنائے گا۔ وہ اسکول پر اسکول بدلتا رہا لیکن اسمٰعیل ہر جگہ سے نکالا جاتا رہا۔

وہ آٹھ سال کا ہو گیا تھا اور ابھی تک کسی جگہ ٹک کر تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا۔ ایک روز وہ اس آخری اسکول سے بھی بھاگ کر آگیا۔

''میں اب مسجد کے اسکول میں واپس نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں، کیا استاد نے تمہیں پھر مارا ہے؟''

''وہاں وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''تم اسے وقت ضائع کرنا کہتے ہو۔ کیا تمہیں قرآن نہیں پڑھایا جاتا؟ کیا حدیث نہیں پڑھائی جاتی؟''

''اب ان چیزوں کا زمانہ نہیں ہے۔ میں تو جدید انداز کے اسکول میں داخلہ لوں گا۔''

''تمہیں معلوم ہے ہم ایسے اسکولوں کی فیس نہیں دے سکتے۔''

''ایسے اسکول بھی ہیں جہاں کوئی فیس نہیں لی جاتی۔''

''ایسے اسکولوں کا انتظام ہمارے دشمن کے ہاتھوں میں ہے۔ ان اسکولوں کے طلبا برائے نام مسلمان یا عرب رہ جاتے ہیں۔''

''میرا بہت وقت ضائع ہوگیا۔ آپ مجھے انگلش اسکول میں داخل کرادیں۔''

''میں اپنے ہاتھوں تمہیں کیسے قتل کردوں۔''

''پھر میں آج سے اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''بیٹا، میں تو زیادہ پڑھا لکھا ہوں نہیں۔ تمہارے دادا کو خط لکھتا ہوں۔ ان سے مشورہ لیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے باپ کو خط لکھا لیکن جواب وہی آیا جیسے ملک وہاب کے خیالات ابتدا سے تھے۔

''اسمٰعیل ٹھیک کہتا ہے۔ تمہیں باپ کی حیثیت سے محسوس کرنا چاہیے کہ موجودہ دنیا اور مستقبل کے مطابق اسے بہتر طور پر

زندگی بسر کرنے کے قابل بناؤ اور یہ تمہارے فرائض میں داخل ہے اور یہ کام صرف جدید اسکول کر سکتے ہیں۔"

یہ خط اتنا مایوس کن تھا کہ اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ کسی کو سنائے۔ رشید تک کو سنانے کی زحمت نہیں کی لیکن یہ سوچنے ضرور بیٹھ گیا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے کہ اس کا بیٹا باغی اور سرکش بن گیا ہے۔

اب اسمٰعیل مسجد کے اسکول میں جانے کو تیار نہیں تھا اور احمد خلیل اسے جدید طرز کے اسکول میں بھیجنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے یہ افسوس بھی ہوتا تھا کہ اسمٰعیل ان پڑھ رہ جائے گا۔ اس کا دوسرا بیٹا رفیق بھی۔۔۔ اسی کے نقش قدم پر چلے گا۔

سوچتے سوچتے احمد خلیل اس نتیجے پر پہنچا کہ اسمٰعیل کو کسی کام پر لگا دیا جائے۔ وہ پڑھے گا نہیں تو مسلمان تو رہ جائے گا۔ اس نے اپنے آجر سے بات کی اور نخلستان میں سبزیوں کی دیکھ بھال کے لیے اسے اپنے مددگار کے طور پر رکھ لیا لیکن وہ یہاں بھی کاہل ثابت ہو رہا تھا۔ احمد خلیل کو تمام کام اب بھی خود ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ دن بھر بیٹھا رہتا اور باپ کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ احمد خلیل ڈانٹتا تو وہ اسے پلٹ کر جواب دیتا۔ دوسرے مزدوروں کے سامنے بے عزتی کے خوف کی وجہ سے احمد خلیل نے اسے ڈانٹنا چھوڑ دیا۔ یہ دن اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھے۔ وہ اکثر تنہائی میں روتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ دعائیں کرتا تھا کہ وہ راہِ راست پر آجائے لیکن ہر دعا رائگاں جا رہی تھی۔ اسمٰعیل مزید بگڑتا جا رہا تھا۔ ایک دن احمد خلیل نے اسے بازار میں سبزیاں فروخت کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ یہ سبزیاں وہ کھیت سے چرا کر لایا تھا۔

"اب تم چوری بھی کرنے لگے ہو۔"

"جب آپ کے پاس میرا خرچ پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے تو میں یہی کروں گا۔"

"کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو چوری کتنی ناپسند ہے اور اگر کسی دن آجر نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"آپ اپنی عزت بچائیے، میں کل سے آپ کے ساتھ کھیت پر نہیں جاؤں گا۔"

"میں خود بھی نہیں چاہوں گا کہ تم وہاں قدم رکھو۔"

اسمٰعیل ایک مرتبہ پھر آزاد تھا۔ اب وہ نہ اسکول جا رہا تھا اور نہ باپ کے ساتھ کھیت پر۔ احمد خلیل گھر سے کام کے لیے نکل جاتا اور وہ باہر گلی میں آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اسمٰعیل جوان ہو گیا تھا۔ جب تک وہ بچہ تھا، احمد اسے ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا لیکن اب وہ اس سے کچھ بھی کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک روز اس سے صاف بات کر لی۔

"میں تمہارا بوجھ اب زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔ کوئی کام ڈھونڈو ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

اسمٰعیل نے کام کی تلاش شروع کر دی اور جلد ہی اسے بازار میں ایک دکان سے دوسری دکان پر بوریاں پہنچانے کا کام مل گیا۔ وہ دن بھر اپنی کمر پر بوریاں اٹھا کر دکانوں پر پہنچاتا رہتا۔

حج کے موسم میں اسے خوب سوجھی۔ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے آنے والے ہزاروں حاجیوں کے لیے اس نے بطور راہبر کام شروع کر دیا۔

اس کام میں اس نے اتنا کما لیا کہ پچھلے چھ ماہ کی مزدوری میں بھی نہیں کمایا ہوگا۔ احمد خلیل نے اس سے پیسے مانگے تو وہ بپھر گیا۔

"یہ رقم میری ہے۔ اس پر آپ کا کوئی حق نہیں۔ اسے میں نے کمایا ہے۔"

"جو میں نے کمایا، اس سے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ اب تم کمارہے ہو تو یہ رقم تمہاری ہے؟"

"آپ نے کیا کمایا اور مجھ پر کیا خرچ کیا؟ آپ نے تو کبھی نئے کپڑے تک خرید کر نہیں دیے۔"

"ہم غریب ہیں بیٹا...... وطن سے بے وطن ہیں۔"

"اگر میری کمائی ہوئی رقم سے آپ رئیس ہو سکتے ہیں تو یہ لیجیے۔" اس نے اپنی جیب سے چھوٹی بڑی مالیت کے نوٹ نکالے اور فرش پر پھینک دیے اور گھر سے باہر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی وہ اسما سے مخاطب ہوا۔

"تم نے دیکھا یہ کیسا گستاخ ہو گیا ہے۔ اسے ہمارا ذرا بھی خیال نہیں۔ تمہیں یاد ہے ہم عراق المنشیا سے کس حال میں آئے تھے۔ ہم نے اسے کس طرح پالا پوسا۔ اب یہ دین کا بھی دشمن بن گیا ہے، ہمارا بھی۔"

"آپ بھی نرمی سے کام لیا کریں۔ بچہ ہے کل کلاں کو عقل آ ہی جائے گی۔"

"اسے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ اب دیکھو پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔"

☆☆☆

رشید اپنے بیٹوں کو ان کے بچپن ہی سے فلسطین کے بارے میں بتاتا رہا تھا۔ عراق المنشیا کی زندگی اور جنگ

کے بعد جلاوطن ہونے کی کہانی اس کے بچوں کو ازبر تھی حالانکہ اس وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیمپ میں ان جلاوطنوں پر کیا گزری اور کس طرح وہاں سے فرار ہو کر وہ یہاں تک پہنچے۔ اس کی تفصیلات سے وہ شروع ہی سے انہیں آگاہ کرتا رہا تھا۔ وہ ذرا بڑے ہوئے تو رشید نے ایک نقشے کی مدد سے انہیں فلسطین کے علاقوں سے واقف کرایا۔ انہیں وہ علاقے سمجھائے جن پر یہودیوں نے قبضہ کرلیا تھا یا انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا تھا کہ ان علاقوں کو حاصل کرنے کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ ہم تو اپنی باری پوری کر چکے، اب نئی نسل یہ جنگ لڑے گی۔

رشید کے تینوں بیٹوں نے اسکول تک کی تعلیم حاصل ضرور کی تھی لیکن بچپن سے فلسطین کے قصے سن سن کر جذبۂ جہاد ان کے لہو میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ شوق ہر وقت دامن گیر رہتا تھا کہ کب فلسطین آزاد ہو اور کب وہ اپنے وطن واپس جائیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ رشید اپنی جوانی میں فدائین کے گروہ میں شامل تھا اور یہودیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیتا رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جوان ہوتے ہوتے ہی فدائین کے دستوں میں شمولیت کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ وہ خاموشی سے ایسے لوگوں تک پہنچے جو فدائین کے لیے کام کر رہے تھے لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ فدائین کی اکثر تحریکیں مارکس کے سوشلزم اور کمیونزم کے تصورات سے آلودہ ہو چکی ہیں تو انہوں نے فوراً اپنا رخ بدل لیا۔ اب ان کا مرکزِ نگاہ ''اخوان المسلمون'' تھی۔ آخر وہ دن بھی آگیا کہ انہوں نے اپنے والدین کو خدا حافظ کہا اور اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان مجاہدوں کے ہمراہ عمان کے بیرونی مضافات میں فدائین کے ایک ایسے تربیتی کیمپ میں پہنچ گئے جس کا تمام انتظام اخوان المسلمون کے ہاتھ میں تھا اور جہاں کمیونزم کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

جب احمد خلیل نے رشید کے بیٹوں کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ یہ خیال اس کے لیے باعثِ تقویت تھا کہ ایک نسل گزرنے کے باوجود ان نوجوانوں میں فلسطین سے وابستگی کتنی شدید ہے۔ اب امید کی جا سکتی ہے کہ فلسطین ضرور آزاد ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ افسوس بھی ہوا کہ اس کا بیٹا اس معرکے میں اپنے چچازادوں کے ساتھ نہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اسمٰعیل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسمٰعیل! یہودیوں کے مظالم بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ ہماری زمینوں پر قبضے کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے ہیں۔ وہ یروشلم میں ہمارے مقدس مقامات اور ہیرون میں مسجد ابراہیم الخلیل پر بھی قبضہ کر چکے ہیں۔ اب مسلمان اس مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ کوئی امید نہیں کہ کل کلاں کو وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے تل ابیب سے اپنے ہوائی جہاز بھیج دیں۔ کیا تم پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ یہودیوں کے ناپاک عزائم کو ناکام کرنے کے لیے ان تنظیموں میں شامل ہو کر جہاد میں حصہ لو جو آزادی کی جنگ میں اپنی جانیں گنوا رہے ہیں۔ کیا تم رشید کے بیٹوں کی پیروی نہیں کر سکتے؟''

اسمٰعیل یہ باتیں اس طرح سن رہا تھا جیسے ان باتوں سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب تک وہ ان باتوں کا جواب نہیں دے گا اس کا باپ اسی طرح بولتا رہے گا۔ اس نے دخل اندازی کی۔

''ابا جان! پرانی لکیریں پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عربوں کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم یہودیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم یہودیوں سے تعلقات قائم کر کے ہی اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ رشید چچا کے بیٹے جہاد کے نام پر لڑنے کے لیے گئے ضرور ہیں لیکن کیا ہوگا۔ مقتولوں میں تین مقتولین کا اضافہ اور ہو جائے گا اور بس۔ ہم نے تمام فلسطینیوں کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ ہمیں اپنی ترقی دیکھنی ہے۔''

''میں بھی تو سنوں تم اپنی ترقی کے لیے کیا کرنے والے ہو؟''

''ابا جان! میں کام کی تلاش میں جدہ جا رہا ہوں۔''

''میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، میں نے سمجھا لیا۔ اب تم خود عقل رکھتے ہو۔ جو جی چاہے کرو۔''

''میں رفیق کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔''

''اپنی ماں کو بھی یہ خبر سنا دو تاکہ وہ کچھ دیر رو کر اپنی ممتا کو تسلی دے لے۔''

☆☆☆

خلیفہ ایک شاندار خطاط کی حیثیت سے متعارف ہو رہا تھا لیکن اس کی بیماری نے اس کے راستے میں کانٹے بچھا دیے۔ وہ ٹھٹک کر جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے بند ہو گئے تھے لیکن اچانک ان میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے سر میں شدید درد رہنے لگا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے پکڑے ادھر اُدھر بھاگتا پھرتا۔ گلی میں نکل جاتا تو گلی کے لڑکے اسے تماشا بنا لیتے رشید یا احمد خلیل

اسے گھسیٹ کر گھر میں لاتے اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا۔

اس کی بیوی اس ناگہانی آفت سے گھبرا گئی اور اسے چھوڑ کر چلی گئی اور بعد میں طلاق لے لی۔ طلاق کے بعد خلیفہ کی حالت مزید بگڑ گئی۔ گھٹنوں دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا رہتا۔ اسے یہ ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کسی کو پہچاننے تک سے عاری ہو گیا تھا۔ دن ہو یا رات، اسے سوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھے رہتے اور منہ سے جھاگ نکلتے رہتے۔

احمد خلیل کے لیے یہ سال نہایت تکلیف دہ تھا۔ ایک طرف خلیفہ کی بیماری تھی، دوسری جانب مالی پریشانیوں نے گھیر لیا۔ خراب موسم کے سبب نخلستان کی پیداوار بہت کم ہو گئی تھی۔ احمد اور رشید کو ملنے والی اجرت پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ نخلستان کے آجر نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے نخلستان کا آدھا حصہ ایک تعمیراتی کمپنی کو فروخت کر دیا۔ کھجوروں کے پیڑ کٹ گئے اور یہاں کوٹھیوں کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک تلوار اور لٹک گئی۔ سعودی حکومت نے احکامات جاری کر دیے کہ حاجیوں کو اب اس امر کی اجازت نہیں کہ پہلے کی طرح جتنی دیر چاہیں جزیرۃ العرب میں قیام کریں۔ مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد فوری طور پر اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں یا شدید ترین سزائیں برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ احمد خلیل بھی قانونی لحاظ سے غیر ملکی تھا۔ اسے خدشہ ہو چلا کہ وہ بھی جلاوطن نہ کر دیا جائے۔ ویسے بھی اس کی کم آمدنی اس کی جلاوطنی کے لیے دلیل بن جاتی۔ ان برے حالات میں ان کے پاس اتنے پیسے کہاں تھے کہ وہ خلیفہ کا علاج کراتے۔ وہ بے بسی سے اسے مرتے ہوئے دیکھتے رہے۔

سورج روز ہی غروب ہوتا تھا لیکن سورج کی کمزور روشنی اندھیرے سے لڑنے کے لیے فوراً سامنے آجاتی تھی۔ اس روز سورج غروب ہوا تو تاریکی نے کمرے کے ننگے فرش کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس شام گھر میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ چراغ میں تیل ڈال دیا جاتا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی لیکن ان میں سے کسی کو بھی نیند نہ آئی۔ جب فجر کی اولین روشنی نمودار ہوئی تو خلیفہ نے کروٹ بدلی۔

”مجھے سورۃ یٰسین سناؤ۔“

”اس وقت میرے پاس قرآن پاک کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ جتنا حصہ زبانی یاد ہے سنائے دیتا ہوں۔“

احمد خلیل نے سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ جب وہ یاد کیے ہوئے حصے کے اختتام پر پہنچا تو وہ خلیفہ کے بالکل قریب ہو کر اس پر جھک گیا۔ خلیفہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ بے نور ہو چکی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس میں سانس نہیں۔ اس نے خلیفہ کی آنکھیں بند کیں اور اس کی ٹانگیں سیدھی کر دیں۔

دن نکل آیا تھا۔ اس کے ہمسایوں کو خبر ہوئی تو وہ آ گئے۔ ان دوستوں کی مدد سے خلیفہ کو غسل دیا گیا۔ ایک نئی سفید چادر کا کفن دے دیا گیا۔ یہ کل پانچ آدمی تھے جو خلیفہ کو اٹھا کر مسجد لے گئے اور نمازِ جنازہ کے بعد دفن کر دیا گیا۔

”بے شک ہر ذی حیات کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔“

☆☆☆

ایک روز احمد خلیل اٹک اٹک کر اخبار پڑھ رہا تھا کہ تین تصویریں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ یہ تینوں تصویریں رشید کے بیٹوں کی تھیں۔ یہ تینوں پورے جنگی لباس میں ایک مشین گن کے پاس اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان تصویروں کے نیچے دشمن کے دور دراز کے علاقے میں ان لڑکوں کے کامیاب چھاپہ مار حملوں کے بعد واپسی کی تفصیل درج تھی۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس نے تفصیل کا کچھ حصہ پڑھا کچھ نہیں پڑھا اور چیخ کر رشید کو آواز دی۔ وہ ابھی کمرے سے باہر نکلا تھا، آواز پر لوٹ آیا۔ اسما آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی تھی، وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا احمد؟“ رشید نے گھبرا کر پوچھا۔

”ذرا یہ اخبار تو دیکھو۔“

”تم جانتے ہو میں اخبار نہیں پڑھ سکتا۔“

”یہ تصویریں دیکھو۔“

”یہ تو میرے بیٹوں کی تصویریں ہیں، کیا ہوا انہیں؟“

”یہ مجاہد ہیں۔ دشمن کے علاقوں کو نیست و نابود کر کے لوٹے ہیں۔ یہ دیکھو۔“ رشید نے ان تصویروں کو غور سے دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

”احمد! میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ میرے بیٹے میرا خواب پورا کر رہے ہیں۔“

”ہاں رشید! تم بہت خوش قسمت ہو۔“

”اسمٰعیل کا کوئی خط آیا؟ اسے گئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا اب تو خط آ جانا چاہیے تھا۔“

”اس نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہوگا کہ اخبار میں تصویر آئے۔ وہ مجھ سے یہیں بات نہیں کرتا تھا، خط کیا لکھے گا۔“

ان تصویروں کو دیکھ کر اسما اور احمد کو اسمٰعیل کی یاد بڑی شدت سے آئی تھی۔ اسما کے کئی بچے ہوئے تھے لیکن سب شیر خوارگی میں مر گئے تھے۔ ایک اسمٰعیل بچا تھا، وہ بھی چلا گیا تھا۔ دل بہلانے کو اس کے ساتھ رفیق تھا، اسمٰعیل اسے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

ایک دن اچانک اسمٰعیل کا خط آ گیا۔ اسے ایک امریکن کی ملکیت کوکاکولا بوتلوں کی فیکٹری میں کام مل گیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ منی آرڈر بھیج رہا ہوں، عنقریب رقم آپ کو مل جائے گی۔

دو تین روز بعد اسے ایک بڑی رقم مل گئی۔ یہ رقم اتنی تھی کہ احمد خلیل نے ایک ساتھ اتنے نوٹ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ حیران ہوا کہ اسمٰعیل نے ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصے میں اتنا کمایا جو وہ ایک سال میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ اس رقم سے اس نے اناج اور خوراک کا سامان خریدا، اسما کو نئے کپڑے دلوائے۔ اپنے لیے نئی چپل خریدی۔ اس کے باوجود بھی کچھ رقم اس کے پاس محفوظ رہی۔

یہ بات خوشی کی تھی کہ اس کا بیٹا اچھی تنخواہ پر ملازم ہو گیا ہے۔ لیکن جب وہ اسمٰعیل کا موازنہ رشید کے بیٹوں سے کرتا تو وہ شرمندہ سا ہو جاتا تھا۔ رشید کے بیٹے جہاد میں مصروف ہیں اور میرا بیٹا کسی امریکن کی ملازمت کرتا ہے۔ ملازم کی کیا مجال کہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکے۔ وہ انہی لوگوں کی ملازمت کر رہا ہے جو فلسطین کے دشمن ہیں۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا۔ حال، ماضی میں ڈھل گیا۔ اسمٰعیل رقم بھیج رہا تھا لیکن احمد خلیل نے باغ میں کام کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ اسے جو خوشی محنت کی روزی سے ملتی تھی، کسی اور طرح نہیں مل سکتی تھی۔

وقت نے گردش کرتے کرتے تاریخ کو اس مقام پر پہنچا دیا جب اخبارات عرب، اسرائیل کی جنگ کی خبروں سے بھرے نظر آنے لگے۔

جب خبر یہ آئی کہ اسرائیل نے غزہ پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ اپنے والد کی طرف سے پریشان ہو گیا۔ ملک وہاب مہینے میں ایک، دو بار اسے خط ضرور لکھتا تھا لیکن اب دو مہینے ہو گئے تھے کوئی خط موصول نہیں ہوا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا والد ضرور دشمن کی قید میں ہے۔ اس خیال نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی۔ اس کے والد سے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ وہ اپنے ساتھ والد کا ناروا سلوک بھولا نہیں تھا۔ یہ تعلقات صرف خطوط کی آمد و رفت تک محدود تھے۔ مدینہ کے پچیس سالہ قیام میں وہ ایک مرتبہ بھی اپنے والد سے نہیں ملا تھا لیکن اس کی محبت اسے سونے نہیں دے رہی تھی۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کی خیریت معلوم ہو جائے۔

چار ماہ اسی تعطل میں گزر گئے، بالآخر اسے ایک ساتھ تین خطوط ملے۔ تاریخوں سے پتا چلتا تھا کہ بہت پہلے لکھے گئے تھے لیکن سخت سنسر شپ کی وجہ سے تاخیر سے ملے۔

یہ خطوط کیا تھے، غزہ شہر کی نئی تصویر تھے۔ ان تصویروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ غزہ شہر قیدیوں کے کیمپ میں بدل گیا ہے۔ کرفیو لگائے جاتے ہیں، رات کے وقت خانہ تلاشیاں ہوتی ہیں۔ فدائین کو پناہ دینے کا محض شبہ ہوتا ہے تو بارود لگا کر پورے مکان کو مکینوں سمیت اڑا دیا جاتا ہے۔ گرفتاریوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اسکولوں میں اسرائیلی حکام نے تمام کتابیں ضبط کرتے ہوئے صرف تل ابیب کے ارباب اقتدار کی طرف سے شائع شدہ نصابی کتب کو رائج کر دیا تھا۔ اس کے والد نے لکھا تھا کہ وہ ان کتابوں کو نظر انداز کر رہا ہے اور صرف تختہ سیاہ کی مدد سے کلاسوں کو پڑھاتا ہے۔

احمد خلیل کے خیال میں ملک وہاب کی یہ باغیانہ سرگرمی کسی بھی وقت اسے مشکل میں پھنسا سکتی تھی۔ اس نے تمام اختلافات بھلا کر اپنے والد کو لکھا کہ وہ جتنی جلد اور جس طرح بھی ہو سرحد عبور کر کے اس کے پاس مدینہ منورہ پہنچ جائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اسے مایوس کر دیا۔

”تمہاری پیشکش پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں مدینہ منورہ پہنچنے کے بجائے اسکول کو چلانے کا فریضہ انجام دیتا رہوں تاکہ طلبا کو ممکنہ حد تک یہودی اثرات سے بچا سکوں۔ انہیں وہ پڑھاؤں جس کی انہیں ضرورت ہے۔“

اس کے بعد چھ مہینے تک والد کی جانب سے کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ اس نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ والد پر مزید دباؤ ڈالے اور انہیں مدینہ آنے کی دعوت دے۔

چھ مہینے مکمل خاموشی سے گزر گئے۔ یہ خاموشی اس وقت ٹوٹی جب ڈاکیا اس کے دروازے پر خط لے کر آیا۔ دل اس وقت زور سے دھڑکا جب لفافے پر مہر غزہ کی نہیں عمان کی دیکھی۔ خط پر جو پتا لکھا تھا وہ اس کے والد کے ہاتھ کی تحریر نہیں تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ یہ خط اس کے چچا منصور کی جانب سے لکھا گیا تھا۔

”میں خود لکھنا نہیں جانتا۔ یہ خط عمان کے ایک خطوط نویس منشی سے لکھوا رہا ہوں۔ میرے عزیز بھتیجے! جب سے

یہودیوں نے غزہ پر قبضہ کیا ہے ہماری زندگی عذاب ہوگئی ہے۔ زیرِ زمین تحریک کی کارروائیوں کا انتقام لینے کے لیے پناہ گزینوں کے کیمپوں اور دیہات پر نیپام بم گرائے گئے۔ تمہارے والد کی جماعت میں پڑھنے والے بہت سے بچے مارے گئے، زخمی اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔

''تمہارے والد کو اسرائیلیوں نے بار بار خبردار کیا تھا کہ اگر تم نے ہمارے مقرر کردہ نصاب کے مطابق طلبا کو نہیں پڑھایا تو تم سزا کے مستحق ہوگے اور اسکول بند کردیا جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے وہ کتنے ضدی تھے۔ بار بار کی تنبیہ کے باوجود وہ اپنی مرضی سے پڑھاتے رہے۔ مجھے یقین ہے انہیں اس کی سزا دی گئی۔

''وہ اسکول کا کچھ سامان خریدنے شہر گئے تھے۔ واپسی میں جب وہ ایک بڑی سڑک پار کررہے تھے، یہودی فوجیوں کی ایک جیپ نے انہیں کچل دیا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔ میں اب بھی لکھتا ہوں، یہ ایکسیڈنٹ نہیں تھا۔ انہیں جان بوجھ کر مارا گیا۔ جیپ میں کوئی فوجی یقیناً تھا جو انہیں پہچانتا تھا۔ میں نے جب اس واقعے کی شکایت درج کرائی تو بہت سے یہودی فوجی آئے اور مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے اپنے گھر میں اسلحہ چھپایا ہوا ہے۔ انہوں نے تلاشی لی۔ جب کچھ نہ ملا تو گھر کا سارا سامان اور میرے کپڑے تک لے گئے۔ میں نے کچھ دوستوں کی مدد سے اردن کی سرحد عبور کرلی۔

''اب میں بڑھاپے کی اس منزل پر ہوں کہ کسی کام کے لائق نہیں رہا۔ بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا آئندہ کیا ہوگا۔ میرے بیٹے رشید سے کہنا پریشان نہ ہو۔ قسمت میں ہوا تو ضرور مل کر بیٹھیں گے۔ ہائے میرا بھائی بھی چلا گیا۔ اب میں کیا کروں۔''

احمد خلیل بڑی دیر تک ملک وہاب کی موت پر آنسو بہاتا رہا۔ اسما اسے تسلی دینے کے لیے موجود تھی لیکن اس کے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ کچھ دیر بعد رشید بھی اس کے آنسوؤں میں شریک ہوگیا۔ پھر اس کی سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''ہمارے بزرگوں نے وطن کی مٹی کو چھوڑنا تو گوارا نہ کیا ورنہ شاید یہ سب نہ ہوتا۔ کاش! چچا جان اور ابا اس وقت ہمارے ساتھ آگئے ہوتے۔''

''یہ اب بھی ہوسکتا ہے رشید۔ میرے ابا تو خیر دنیا میں نہیں رہے لیکن تمہارے ابا تو آسکتے ہیں۔''

''اب ان کا آنا بھی مشکل ہوجائے گا۔ کیا وہ اردن سے یہاں تک آنے کے اخراجات برداشت کرسکیں گے۔''

''اگر کوئی صورت نکل آئے تو اخراجات میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔''

''تمہاری حالت بھی تو میری طرح ہے۔ کیا ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے؟''

''اسمٰعیل اور رفیق مجھے ہر ماہ ایک معقول رقم بھیجتے رہے ہیں۔ اس میں سے کچھ میں پس انداز کر کے رکھتا رہا ہوں۔ ہم انہیں وہ رقم بھیج سکتے ہیں۔''

''اگر انہوں نے پھر بھی نہ آنا چاہا؟''

''میں انہیں خط لکھتا ہوں۔ اگر وہ آنے کو تیار ہوئے تو میں انہیں رقم منی آرڈر کردوں گا۔'' خط پر جو پتا درج تھا، اس نے اسی پتے پر اس مضمون کا خط ارسال کردیا۔

''میرے اور رشید کے لیے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوشی نہیں ہوگی کہ آپ ہمارے پاس آجائیں اور ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ اسما بھی پرزور سفارش کررہی ہے کہ آپ یہاں آجائیں۔ اگر آپ نے آنے کا عندیہ ظاہر کیا تو میں سفر کے اخراجات کے لیے رقم منی آرڈر کردوں گا۔ یاد رکھیے اب یہودی وہاں کسی عرب کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ آپ فوراً آجائیں۔''

خط بھیجنے کے بعد وہ دعائیں مانگتا رہا کہ چچا کی طرف سے مثبت جواب آجائے۔ کچھ دنوں کے بعد جواب آگیا۔ وہ آنے کے لیے تیار تھے۔ احمد خلیل نے بیرونِ ملک بھیجے جانے والے منی آرڈر کے ذریعے رقم ارسال کردی۔

پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ منصور ان کے درمیان تھا۔ اسے دیکھ کر احمد خلیل کو باپ کی یاد آگئی۔ گلے سے لپٹ کر خوب رویا۔ رشید بھی پچیس سال بعد باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بھی عجیب حالت تھی۔ منصور پہلی مرتبہ اپنی بہو کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی اس کے لیے خوشی کا باعث تھا کہ رشید کے بیٹے فلسطین کی آزادی کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

اس روز وہ سب دسترخوان پر بیٹھے تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے عراق المنشیا کا دور پھر واپس آگیا ہے۔ اس خاندان کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ احمد خلیل کے لیے یہ فراغت کے دن تھے۔ ایسی فراغت جو اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اسمٰعیل کی طرف سے بھیجی ہوئی رقم اس کے کئی مہینے کے خرچ کے لیے کافی تھی۔ اسمٰعیل ہر خط میں لکھا کرتا تھا کہ اسے اب کام کرنے کی ضرورت نہیں لیکن احمد خلیل مشقت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسی طرح کام پر جاتا رہا جس طرح پہلے جاتا تھا۔

اسمٰعیل کو گئے تین سال ہو گئے تھے لیکن وہ ایک مرتبہ بھی باپ سے ملنے نہیں آیا تھا حالانکہ جدہ کوئی زیادہ دور نہیں تھا ایسی بسیں دن رات چلتی تھیں جو مدینہ سے جدہ جاتی تھیں۔

احمد خلیل عادت سے مجبور ہو کر کام ضرور کر رہا تھا لیکن اب اس میں وہ پہلی جیسی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ تھوڑے سے کام کے بعد تھک جاتا تھا۔ بخار بھی رہنے لگا تھا اور راتوں کو کھانسی کے طویل دورے پڑتے تھے۔ اب وہ اتنا غریب بھی نہیں رہا تھا کہ ڈاکٹر کو نہ دکھا سکے لیکن ڈاکٹر کے پاس جانے کی عادت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے وجود کو گھسیٹتا رہا اور بیماری بڑھتی گئی۔

ایک روز وہ باغ میں کام کر رہا تھا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے ساتھی مزدوروں نے اسے اٹھا کر گھر پہنچا دیا۔ رشید اور اسما تو اسے دیکھ کر گھبرا ہی گئے تھے لیکن اسے جلد ہی ہوش آ گیا۔ البتہ تیز بخار تھا اور یہ ان جیسے جفاکشوں کے لیے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔

''بخار تو آرام کرنے سے جاتا رہے گا۔ اب اسے زیادہ محنت نہیں کرنی چاہیے۔'' منصور نے کہا۔

''میں تو ان سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ بہت کام کر لیا۔ اسمٰعیل کی بھیجی ہوئی رقم ہمارے لیے کافی ہے۔ اب آرام کریں لیکن یہ سنتے ہی نہیں۔''

''اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے آرام کرنا چاہیے۔'' احمد خلیل نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

اسے اسمٰعیل کی یاد آ رہی تھی۔

تیسرا دن نمودار ہوا تھا کہ اسمٰعیل جدہ سے آ گیا۔ وہ اجنبیوں کی طرح کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا اور غالباً اس گندے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اسے آنا ہی پڑا۔ اسما اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اسمٰعیل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسے خواب بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

''بیٹا یہ تو ہی ہے نا...... میرا اسمٰعیل۔''

''کیا ہو گیا ہے اماں تمہیں۔ تم مجھے نہیں پہچانیں۔''

''کیا پہچانوں۔ تین سال ہو گئے تو نے مجھے اپنی شکل ہی نہیں دکھائی۔''

''کام میں مصروف رہتا ہوں۔ یہاں آ کر کیا کرتا۔ اب بھی اس لیے آ گیا کہ مجھے ابا کی بیماری کا تار ملا تھا۔''

''ہم نے تو کوئی تار نہیں بھیجا۔''

''آپ کے ہمسائے عبدالرحمٰن نے مجھے تار بھیجا تھا۔'' اس نے کہا اور باپ کے قریب جا کر اس کی نبض ٹٹولی۔ اسے اب بھی بخار تھا۔

''اسمٰعیل! میں تو بیمار ہی رہتا ہوں۔ تو اپنی سنا۔ ٹھیک تو ہے؟''

''ہمیشہ بخار رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں جدہ میں ایک ڈاکٹر سے بات کرتا ہوا آیا ہوں۔ وہ آپ کا علاج کرے گا۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

احمد خلیل نے اب پوری طرح آنکھیں کھول لی تھیں۔ وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنا باپ ملک وہاب یاد آ گیا جس نے یہی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔

''میرے بیٹے! کیا مجھے دکھ پہنچانے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں تھا کہ تم امریکیوں کے لیے کام کرنے لگو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم تو وضع قطع میں بھی امریکی زیادہ مسلمان کم لگ رہے ہو۔ ہم عربوں کا لباس یہ تو نہیں۔''

''ابا! آپ کی تنگ نظری ابھی تک گئی نہیں۔ اب نیا زمانہ ہے۔ میں آپ کی طرح لمبی عبا پہن کر نہیں گھوم سکتا۔''

''جو تمہارا دشمن ہے اس کی نقالی کرتے ہو۔ دشمن کتنا خوش ہوگا مگر میں اب کمزور ہوں، تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔ اگر تم نوجوانوں کی یہی حالت رہی تو فلسطین کی آزادی کو بھول جاؤ۔''

''میں اسی لیے اتنے دنوں تک نہیں آیا۔ اب بھی آپ یہی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ ہمیں اسی وقت جدہ روانہ ہونا ہے تاکہ اسپتال میں بروقت داخلہ مل سکے۔''

''بیٹا اسی وقت؟ ابھی تو تو آیا ہے۔''

''ایسی بوسیدہ جگہ میرا دم گھٹتا ہے۔''

اس کا تکبر آمیز رویہ دیکھ کر احمد خلیل نے اس کے ساتھ جدہ جانے سے انکار کر دیا لیکن اسما اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''اسمٰعیل جیسا بھی ہے ہمارا بیٹا ہے۔ وہ آپ سے محبت کرتا ہے اس لیے تو آپ کے علاج کے لیے آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہے۔ اس کا قصور معاف کر دیں اور میری خاطر اپنا علاج کرا لیں۔ ضد چھوڑ دیں۔''

احمد خلیل اس کی التجا اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر جدہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

اسما کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی شوہر کے ساتھ جائے اور اس کی خدمت کرے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اسمٰعیل کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ سنتے ہی بھڑک گیا۔

''آپ کا جانا ضروری نہیں۔ آپ نہ ڈاکٹر ہیں نہ نرس۔ آپ وہاں جا کر کیا کریں گی؟''

اسمانے اس کا ذکر احمد خلیل سے نہیں کیا کہ کہیں وہ بیٹے کی اس گستاخی پر جانے سے بالکل ہی انکار کردے۔ اسمٰعیل اپنے باپ کو لے کر جدہ روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

احمد خلیل کی آنکھوں میں جدہ کا وہی تصور تھا جو اس نے پچیس سال پہلے حج کے لیے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ پُرپیچ گلیاں، چھوٹی سڑکیں، پرانی گاڑیاں لیکن اب یہ شہر کوئی دوسرا تھا۔ پورا شہر کسی مغربی شہر میں ڈھل چکا تھا۔ کشادہ بازار جن میں بے ہنگم سی بلندی والے فلیٹوں، دفتروں اور دکانوں کی قطاریں تھیں۔ مغربی طرز کے ریسٹورنٹ نظر آرہے تھے۔ چمک دار امریکی کاروں، بسوں اور ٹرکوں سے ٹریفک جام ہوگیا تھا۔ بڑے بڑے شاپنگ مالز کھلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے زمانے کی طرح اونٹ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ بے ہنگم جانور کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ معلوم ہوا عام شاہراہوں پر اونٹ کے داخلے پر پابندی لگادی گئی ہے۔

احمد خلیل، اسمٰعیل کے ساتھ ساتھ اسپتال میں داخل ہوا اور اپنی باری پر ڈاکٹر کے سامنے پیش ہوا۔

”آپ اپنی عبا اتاریے تاکہ میں آپ کا معائنہ کروں۔“

احمد خلیل نے گھبرا کر اس نرس کی طرف دیکھا جو ڈاکٹر کے قریب کھڑی تھی اور شاید عبا اتارنے میں اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھنے ہی والی تھی۔

”جب تک یہ عورت ہے، میں عبا نہیں اتاروں گا۔“

ڈاکٹر نے نرس کو باہر بھیج دیا۔

”اب اس مشین کے سامنے پاؤں جما کر کھڑے ہوجاؤ۔“

”یہ کیا ہے؟“

”یہ ایکسرے مشین ہے۔ ہم تمہاری چھاتی کا فوٹو لیں گے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ تمہیں مرض کیا ہے۔“

احمد خلیل نے غزہ میں فٹ پاتھ پر رکھا کیمرا دیکھا تھا جہاں لوگ فوٹو اتروا رہے تھے۔ وہ سمجھا ویسا ہی کیمرا یہ بھی ہے۔ اس کا خوف نکل گیا اور وہ مشین کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

”اب آپ کپڑے پہن سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے باہر آکر اسمٰعیل کو بتایا۔

”تمہارے والد کو تپ دق ہے۔ بیماری بہت بڑھ چکی ہے اس لیے طویل علاج کی ضرورت ہوگی۔“

”میں یہاں فیکٹری میں فورمین ہوں۔ میری اتنی تنخواہ تو ضرور ہے کہ اپنے باپ کا علاج کراسکوں۔“

”مسٹر! یہ امریکی اسپتال ضرور ہے لیکن اس کا خرچ سعودی حکومت اٹھاتی ہے۔ تمہیں بہت معمولی سی فیس ادا کرنی ہوگی۔ وہ بھی اگر تم ادا کرسکتے ہو تو۔“

”آپ میرے والد کو داخل کرسکتے ہیں۔“

”اس فارم پر دستخط کردیجیے۔“

دستخط کرنے کے بعد اسمٰعیل اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

”یہاں جو آپ سے کہا جائے اس کے مطابق عمل کیجیے گا ورنہ یہ لوگ آپ کا علاج نہیں کریں گے۔ میں آپ کو روزانہ آکر دیکھ جایا کروں گا۔“

”یہ لوگ مجھے گھر کب بھیجیں گے۔ میں تو تیرے گھر رہنے آیا تھا۔“

”ابھی تو آپ یہیں رہیں گے۔ کب لے جانا ہے میں ڈاکٹر سے بات کرلوں گا۔“

اسمٰعیل کے جانے کے بعد اسے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ یہ دراصل باتھ روم تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹب لگا ہوا تھا۔ ایک نرس نے آکر ٹونٹی کھول دی اور ٹب نیم گرم پانی سے بھرنے لگا۔ جب ٹب آدھے سے زیادہ بھر گیا تو اس نرس نے اس سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ یہ عورت عربی بول رہی تھی لیکن صاف ظاہر تھا وہ عرب نہیں ہے۔ وہ نہایت بھدی عربی بول رہی تھی۔

”اپنے کپڑے اتارو اور اس ٹب میں اتر جاؤ۔“

”تم کمرے سے جاؤ تو میں کپڑے اتاروں۔“

”میں کمرے سے چلی گئی تو تمہیں نہلائے گا کون؟“

”میں مردہ نہیں ہوں جو تم مجھے نہلاؤ گی۔“ وہ اتنی زور سے چیخا کہ نرس ڈر کے مارے کمرے سے بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آئی۔ اس وقت تک وہ کپڑے اتار کر ٹب میں بیٹھ چکا تھا۔

”یہ جراثیم کش دوا ہے۔ اسے اپنے سر میں ڈال کر اچھی طرح مل لو۔“

”میں سب کچھ کرلوں گا لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

”تمہارے بیٹے نے کہا تھا کہ جیسا ہم کہیں گے ویسا تم کروگے۔“

”اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تمہارے سامنے برہنہ ہوجاؤں گا۔ میں کسی عورت کے سامنے برہنہ نہیں ہوسکتا۔ تم میرے لیے نامحرم ہو۔ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاسکتیں۔“

”ٹھیک ہے نہانے کے بعد کپڑے پہن لو، اس بٹن کو دبا دینا۔“ اس نے دیوار میں لگے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔

احمد خلیل نہا کم رہا تھا، سوچ زیادہ رہا تھا۔ وہ زندگی بھر

جس بے غیرتی کے خلاف لڑتا رہا تھا، وہی بے غیرتی اس کے سامنے تھی۔ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ اس عورت کی آنکھوں میں ذرا شرم نہیں۔ یہ یقیناً امریکیوں کا اسپتال ہے۔ یہ عورت بھی عربی بول ضرور رہی ہے لیکن اتنی کہ چند لفظ سیکھ لیے ہیں۔ ڈاکٹر بھی مجھے یہودی لگ رہا تھا۔ یہ لوگ میرا علاج کیا کریں گے یہ تو مجھے مار دیں گے۔ مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس نے بٹن دبایا اور نرس آ گئی۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں چلی گئی۔ یہاں چند بیڈ پڑے ہوئے تھے۔ ایک پر اسے لٹا دیا گیا۔

''تمہیں یہاں آرام سے رہنا ہے۔ کل تمہارا آپریشن ہوگا۔'' نرس نے بھدی عربی میں اطلاع دی۔

''کیسا آپریشن؟''

''تمہارا ایک پھیپھڑا بے کار ہو چکا ہے، اسے نکالا جائے گا۔''

وہ چپ رہا لیکن تہیہ کرلیا کہ وہ آپریشن نہیں کرائے گا۔ اس نرس کو بھی چاہیے تھا کہ اس کے سامنے آپریشن کا نام نہ لیتی لیکن شاید اسے نتائج کا علم ہی نہیں تھا۔

رات قریب آ گئی تھی۔ چند ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کے لیے آئے۔ وہ آپس میں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ احمد خلیل کی انگریزی میں رسائی اتنی ضرور تھی کہ وہ ان کی باتوں کا مفہوم سمجھ سکے۔ وہ اس کے آپریشن کی پلاننگ کر رہے تھے۔ اسی وقت نرس نے ڈاکٹر کو باور کرایا کہ مریض بالکل تعاون نہیں کر رہا ہے۔ اس نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ کہتا ہے تم لوگ حرام چیزیں کھلاؤ گے جس کی میرے دین میں اجازت نہیں۔ بستر پر لیٹنے سے انکار کر رہا ہے، کہتا ہے اسے زمین پر نیند آتی ہے۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کل اس کا بیٹا آئے گا تو اس سے بات ہوگی۔'' ڈاکٹروں کے جاتے ہی احمد خلیل بیڈ سے اترا اور زمین پر لیٹ گیا۔

اگلے دن اسمٰعیل فیکٹری جانے سے قبل اسپتال آیا تو اس نے ڈاکٹر سے ملاقات کی تاکہ آپریشن کا شیڈول معلوم کرے۔

ڈاکٹر اس کے باپ کی طرف سے بہت مایوس نظر آرہا تھا۔

''میں چند دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں۔ آپ اپنے والد کو گھر لے جائیں۔ ان سے کہیں یہ دوائیں استعمال کرتے رہیں۔ یہ بیماری کے حملے کی شدت کو روکتی رہیں گی۔''

''ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو کہا تھا بیماری پرانی ہے۔ علاج میں وقت لگے گا۔ یہ بھی کہا تھا کہ آپریشن ہوگا۔''

''ہم نے کہا ضرور تھا لیکن ہم صرف ان مریضوں کا علاج کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور تمہارے والد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ گھر پر رہ کر وہ زیادہ دن جی سکیں گے، بہ نسبت اسپتال کے۔ وہ یہاں خوش نہیں ہیں اور تپ دق کے مریض کے لیے خوش رہنا بہت ضروری ہے۔ آپ اپنے والد کو لے جائیں اور انہیں خوش رکھیں۔ انہیں مرنا تو ہے لیکن شاید زیادہ دن زندہ رہ لیں۔''

وہ ڈاکٹر کے پاس سے اٹھ کر بالائی منزل پر گیا۔ احمد خلیل اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑا۔

''یہ تو نے مجھے کہاں داخل کرا دیا ہے۔ میں اس.... بے غیرتی کے اڈے پر زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ میں آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ مسلمان ڈاکٹر مر گئے تھے جو تو نے مجھے امریکیوں کے حوالے کر دیا۔''

''ابا جان! ڈاکٹروں کا کہنا ہے آپ یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتے۔ میں آپ کو گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''چل اچھا ہے، میں تیرے ساتھ رہوں گا تو جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میں چند دوستوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ آپ کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ مجھے شرمندگی ہوگی۔''

''تمہیں تو فخر ہونا چاہیے کہ تمہارا باپ مغرب زدہ نہیں ہوا۔''

''ہم اسی وقت ٹیکسی پکڑیں گے اور مدینہ منورہ چلے جائیں گے۔ میں وہاں ٹھہروں گا نہیں۔ آپ کو چھوڑ کر فوراً آجاؤں گا۔ میں فیکٹری سے چھٹی نہیں کر سکتا۔''

''تم کہاں تکلیف کرو گے۔ میری طبیعت اب بہت بہتر ہے۔ میں ٹیکسی لے کر خود ہی چلا جاؤں گا۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔''

احمد خلیل گھر پہنچا تو اسما اسے دیکھ کر کھل اٹھی لیکن فکر مند بھی ہو گئی کہ تین دن بعد ہی گھر آ گئے۔ اسمٰعیل تو کہہ رہا تھا وہ انہیں اسپتال میں داخل کر کے ان کا مکمل علاج کرائے گا۔

''کیا ہوا، اسپتال میں داخل نہیں ہوئے؟''

''اسپتال ہی سے آرہا ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں پریشانی کی بات نہیں۔ کچھ دوائیں دے دی ہیں۔ کہتے ہیں یہ کھاؤ ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔ اسمٰعیل کے گھر گئے تھے؟''

''گیا تھا۔'' احمد خلیل نے مردہ آواز میں کہا۔ ''بڑی اچھی رہائش ہے۔ کئی دوست مل کر رہتے ہیں۔ ایک شاندار عمارت

میں اس کا گھر ہے۔"
"اچھا، دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اسی لیے مجھے لے کر نہیں گیا۔ شریر نے بتایا بھی نہیں۔ وہ کوئی بات بتاتا ہی کہاں ہے۔ اب کے آیا تو اس کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔ تم بھی اچھے رہے اس کے گھر تو ہو آئے۔"
احمد خلیل اپنے جھوٹ پر نادم ضرور تھا لیکن اسے یہ خوشی تھی کہ اس کے جھوٹ پر اسما کتنی خوش ہو گئی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ اسمٰعیل اپنے باپ کو گھر لے کر ہی نہیں گیا اور اسے دوستوں کے سامنے احمد کو اپنا باپ کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی تو اسے کتنی تکلیف ہوتی۔
اس نے اب سوچ لیا تھا کہ وہ مکمل آرام کرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ طبیعت پھر بگڑ جائے اور اسمٰعیل اسے پھر اسی اسپتال میں لے جائے۔
وہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی دوائیں برابر استعمال کر رہا تھا لیکن کھانسی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بخار البتہ دو چار دن کے وقفے سے آتا تھا۔ اس نے کام پر جانا چھوڑ دیا تھا۔
اس کی بے کاری کو دیکھتے ہوئے اسی بلڈنگ میں رہائش پذیر عبدالرحمٰن اور انعام اللہ نے اس کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ اس کے دوست پہلے بھی تھے لیکن ایک واقعے نے دونوں کو اس کے بہت قریب کر دیا اور پھر یہ ملاقاتیں روز کا معمول بن گئیں۔ ان ملاقاتوں میں دنیا بھر کی باتیں زیر بحث آتی تھیں۔ عبدالرحمٰن اخبار کے رسیا تھے۔ وہ خبریں پڑھتے تھے اور پھر ان خبروں پر تبصرے ہوتے تھے۔ احمد خلیل کا دل بھی بہل جاتا تھا اور معلومات بھی ہو جاتی تھیں۔
کچھ دنوں سے مدینہ منورہ کو جدید قالب میں ڈھالنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قدیم عمارتیں مسمار کی جا رہی تھیں تاکہ سڑکوں کو کشادہ کیا جائے۔ دکانوں میں درآمد شدہ غیر ملکی مصنوعات کی بھرمار دکھائی دے رہی تھی۔ شہر کو جدید اور خوب صورت بنانے کے لیے جو ماسٹر پلان بنایا گیا، اس میں یہ طے کیا گیا کہ پرانے رہائشی محلے مسمار کر دیے جائیں۔ اس فہرست میں مہاجرین کا محلہ جہاں احمد خلیل پچھلے پچیس سالوں سے رہ رہا تھا، سرفہرست تھا۔ یہی وہ خبر تھی جسے لے کر اس کا ہمسایہ عبدالرحمٰن اس کے گھر آیا تھا اور پھر یہ ملاقاتیں روز ہونے لگی تھیں۔
"احمد خلیل! تم نے سنا، اس عمارت کو گرا دیا جائے گا جہاں ہم مقیم ہیں۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں کتنے خاندان رہتے ہیں۔"
"دیکھو اخبار میں بھی آیا ہے۔ یہ عمارت اور یہ محلہ شہر کی خوب صورتی پر دھبا ہے اس لیے اسے مسمار کر کے یہاں جدید طرز کی عمارتیں کھڑی کی جائیں گی۔"
"تو کیا یہاں بھی مغربی چالیں کام آ گئیں؟"
"یہ چالیں تو اب گھر گھر میں پہنچ گئی ہیں۔ جو تبدیلیاں مہینوں میں آتی تھیں، اب دنوں میں آ رہی ہیں جن سے ہمارے حکمران بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ ہے ٹیلی ویژن کی بیماری۔ جب سے عرب میں ٹیلی ویژن آیا ہے، عربوں کے بچے پردۂ اسکرین پر نت نئے فیشن، نئی وضع، طور طریقوں اور عادات کی نقل اتارنے کی دھن میں ماں باپ کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔ تباہ کن ہتھیار سے بھی تباہ کن ہے ٹیلی ویژن۔"
اسمٰعیل کا خط آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہم نے جدہ کی فیکٹری کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ اب ہم دہران میں ہیں اور ایک امریکن تیل کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں ہمارے سامنے ترقی کے شاندار مواقع ہیں۔
احمد خلیل اپنے دروازے پر بیٹھا تھا کہ اس نے سامان لانے، لے جانے والی ایک گاڑی کو دروازے کے سامنے رکتے ہوئے دیکھا۔ اس گاڑی میں ایک بڑا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ گاڑی رکتے ہی عبدالرحمٰن گاڑی سے نیچے اترا اور پھر گاڑی میں بیٹھے ہوئے دو مزدوروں نے گاڑی سے اس بڑے ڈبے کو اتارا۔ ڈبا نیچے اترا تو احمد خلیل کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ اس بڑے ڈبے میں کچھ اور نہیں ٹیلی ویژن تھا۔
عبدالرحمٰن نجی محفلوں میں ٹیلی ویژن کو خطرناک بم کہتا تھا اور اب وہی بم اپنے گھر لے آیا تھا۔ محض اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے بچے آئے دن اسی مطالبے کی تکرار سے اس کا جینا دوبھر کر دیتے۔
اس کی گلی میں کاروں اور ٹرکوں کے لیے پارکنگ بنائی جا رہی تھی۔ بہت سی عمارتیں بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھیں۔ یہ بات عام ہونے لگی تھی کہ یہ تمام محلہ ایک سال کے اندر اندر گرا دیا جائے گا۔
وہ اپنے برسوں پرانے دوستوں سے بچھڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن جس طرح کی خبریں آ رہی تھیں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ وقت آنے والا ہے۔
عرصے بعد اسمٰعیل نے اسے پھر خط لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے کئی خوش خبریاں ایک ساتھ سنائی تھیں۔
"مجھے آرام کو آئل کمپنی میں اعلیٰ تنخواہ کے ساتھ ترقی دے دی گئی ہے اور امریکی طرز تعمیر کے کوارٹر میں رہائش کا خصوصی اجازت نامہ بھی مل گیا ہے۔

''رمضان کا مہینا ہے اس لیے میں چھٹی پر ہوں۔ میں آپ کو ایک حیران کن خبر سنانے کے لیے جلد ہی گھر آرہا ہوں۔ یہ خبر آپ کی زندگی کو یکسر بدل ڈالے گی۔''

اس خط کے پہنچنے کے تیسرے دن بعد ہی اسمٰعیل پہنچ گیا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ احمد خلیل اسے دیکھتے ہی چھڑی کی مدد سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اسمٰعیل کو گلے سے لگالیا۔ لیکن وہ یہ دیکھ ضرور رہا تھا کہ اسمٰعیل کو اس کے قریب آتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی کہہ دیا۔

''مجھے تپ دق ہے شاید اس لیے تم میرے قریب آتے ہوئے گریز کر رہے تھے۔''

''ڈاکٹر تو یہی کہتے ہیں۔ ایسے مریض کے جراثیم سے بچنا چاہیے۔''

''بیٹا، مجھے معاف کر دینا۔ مجھے خود ہی خیال کرنا چاہیے تھا لیکن کیا کروں اسلام میں چھوت چھات کا کوئی تصور نہیں اس لیے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''جاؤ اپنی ماں سے مل آؤ۔ اس غریب کو تو معلوم ہی نہیں کہ اس کا بیٹا برسوں بعد اسے صورت دکھانے آگیا ہے۔''

''اچھا تو وہ ابھی تک کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے زنانہ حصے میں رہتی ہیں۔'' اسمٰعیل کمرے میں پڑے پردے کے پیچھے چلا گیا جہاں نہ صرف اسما بیٹھی تھی بلکہ رشید کی بیوی میمونہ بھی موجود تھی۔

اسما نے اسمٰعیل کے آنے کی خوشی میں بھیڑ کے سینے کا گوشت پکایا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ حالانکہ بات یہ تھی کہ اب وہ اس طریقے سے کھانے کا عادی نہیں رہا تھا۔ یہاں ایک کرسی تک نہیں تھی جس پر بیٹھ سکے اور وہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سب ایک ہی برتن میں انگلیاں ڈبو کر کھا رہے تھے۔ پھر بھی اس نے ماں کے کہنے پر ایک روٹی پر گوشت کی بوٹی رکھ کر کھالی اور باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان پھر وہی باتیں شروع ہو گئیں جو اس وقت یقیناً شروع ہو جاتی تھیں جب وہ دونوں ملتے تھے۔ اس مرتبہ اسمٰعیل کی گفتگو میں ایک نئے موضوع کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ شاید دہران میں رہائش کا نتیجہ تھا کہ وہ سوشلزم کا قائل ہو کر لوٹا تھا۔ وہ کسی جذباتی مقرر کی طرح کہہ رہا تھا۔

''جن مسائل کا ہمیں آج کے دور میں سامنا ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں شاہ فیصل انہیں حل کر لے گا؟ شاہوں کا زمانہ چلا گیا آج کے مسائل کا واحد حل سوشلزم ہے۔ یہ ملک انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟''

''میں سب سمجھتا ہوں۔'' احمد خلیل نے کہا۔ ''میں تو یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم نماز نہیں پڑھتے۔ روزہ نہیں رکھتے۔ تمہارا اب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ تمہارا کوئی عقیدہ نہیں۔''

''یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟ میں بھی ایک عقیدہ رکھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسانوں کو خود اپنی محنت سے اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ماضی مر چکا۔ ہمیں مرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ضرورت ہے بڑے بڑے ڈیموں کی، کارخانوں کی، بڑی بڑی صنعتوں اور ہر قسم کی مشینوں کی۔ ہمیں ضرورت ہے بڑے بڑے اسکولوں اور اسپتالوں کی۔''

''میں نے کب کہا کہ ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان کا استعمال غلط طور پر نہ کیا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ اسی وقت ڈاکٹر ہو سکتے ہیں جب انگریزوں کی طرح کوٹ پتلون پہنیں۔ وضع قطع میں ان غیر ملکیوں جیسے بن جائیں۔ اب غلامی کا دور گزر گیا۔ یہ لوگ تمہیں ذہنی غلام بنا رہے ہیں جو غلامی کی اول قسم ہے۔ بھی ذلیل تر ہے۔''

''ابا جان! غلام کم تر ضرور ہوتا ہے لیکن مردہ نہیں ہوتا۔ غلام سے تو پھر بھی امید رکھی جاسکتی ہے آپ تو مردے سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ پرانی دنیا مر چکی، اب تو صرف جدید روش ہی بہتر مستقبل کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ میرے پاس سعودی عرب کی شہریت ہے۔ آپ ابھی تک اس بھروسے پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ کبھی فلسطین لوٹ کر چلے جائیں گے۔ جی نہیں آپ غلطی پر ہیں۔ اب مسئلہ فلسطین کا واحد حل اسرائیل کے ساتھ پرامن تعلقات ہیں۔''

احمد خلیل کے پاس ان دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا اس نے بات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا۔

''ہمارے لیے کتنی شرم کی بات ہے کہ تم نے ہماری اجازت کے بغیر شادی کر لی اور وہ بھی عیسائی عورت سے۔ کیا تمہیں ہم مذہب بیوی نہیں مل سکتی تھی؟''

''وہ بھی بس نام کی عیسائی ہے۔ جن آزادیوں کا میں روادار ہوں انہی کی وہ شائق ہے۔ یہی ہماری ہم خیالی ہے۔ میں پرانے خیالات کی ایسی عورت سے شادی کا روادار نہیں جو مسکین، اطاعت گزار اور اپنے حق سے بے بہرہ ہو۔ ہر سال ایک بچہ پیدا کرتی جائے۔ میری بیوی نے معاشیات میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میرے نزدیک وہ دنیا کی انتہائی خوب صورت عورت ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس سے ضرور ملیں۔''

''کبھی اسے یہاں لے کر آؤ۔ میں اس سے ضرور مل لوں گا حالانکہ تم نے اپنی شادی پر مجھے نہیں بلایا۔ اجازت تو

بڑی بات ہے، مشورے تک کے قابل نہ سمجھا۔''

''میں نے سوچا تھا کہ مشورہ لوں پھر میں نے سوچا آپ یقیناً انکار کردیں گے اور میں آپ کے انکار کے باوجود شادی کروں گا لہٰذا پھر مشورے کا فائدہ کیا ہوتا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ یہاں آئے اور آپ سے ملاقات کرے تو میں اسے یہاں اس ماحول میں کیسے لے آؤں۔ میں تو سیکڑوں میل کا سفر کرکے اس لیے یہاں آیا ہوں کہ آپ کو اور امی کو دہران لے جاؤں جہاں ایک جدید اور پرتعیش زندگی آپ کی منتظر ہے۔''

''اس گھر میں اور بھی لوگ رہتے ہیں۔''

''آپ کا اشارہ اگر رشید، اس کے بوڑھے باپ اور بیوی کی طرف ہے تو ان کا خیال چھوڑ دیں۔ وہ اپنی کفالت خود کرسکتے ہیں۔''

''نئی تہذیب جس کے تم خوگر ہو یہی سکھاتی ہے کہ انسانی زندگی میں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر تمہارے ساتھ دہران چلا جاؤں تو یہ خودغرضی ہوگی۔ جو لوگ پچیس سال سے میرے ساتھ ہیں پل بھر میں انہیں کیسے چھوڑ دوں؟''

''آپ کو بہت جلد یہاں سے بے دخل کیا جارہا ہے۔ اس گندی آبادی کا مسمار ہوجانا ہی اچھا ہے۔ آپ سوچیں آپ کہاں جائیں گے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں میرے ساتھ دہران چلیں۔''

''تم خود ہی سوچو ان حالات میں سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ کیسے دہران جاسکتا ہوں۔ جو خدا ہمیں عراق المنشیا سے نکال کر یہاں تک لایا تھا وہی ہمیں کہیں اور پناہ دے گا۔''

''کمال ہے! ابھی تک عراق المنشیا کا نام آپ کو یاد ہے۔ آپ جب اس کے بارے میں سوچتے رہیں گے تو آگے کیسے بڑھیں گے۔ عراق المنشیا تو اس مردے کی طرح ہے جس کی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہیں اور آپ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ان ہڈیوں میں پھر سے جان پڑے گی۔''

''یہی سوال میں ذرا دوسرے انداز میں تم سے بھی کرسکتا ہوں۔ عراق المنشیا میرے نزدیک کسی گاؤں کا نہیں ایک ارادے کا نام ہے۔ تمہارے اجداد اس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ تم گاؤں کو بھول کر اپنے اجداد کو بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔ عراق المنشیا، فلسطین کا ایک جزو ہے۔ تم جزو کو چھوڑ کر کل کو کیسے حاصل کرسکتے ہو۔''

''مجھے فلسطین حاصل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے، دنیا بہت بڑی ہے ابا جان۔''

''افسوس کہ تم یہودیوں سے بھی بدتر ہوگئے۔ جنہوں نے اپنے گھر کو محسوس کیا اور تمہارے علاقوں کو اپنی ملکیت بنا کر بیٹھ گئے۔ تم کہتے ہو دنیا بہت بڑی ہے۔ قومیں صدیاں کوشش کرتی ہیں تب جاکر انہیں آزادی نصیب ہوتی ہے۔ جب تمہیں ہی احساس نہیں تو تم اپنے بچوں کو کیا بتاؤ گے کہ ان کی جڑیں کہاں ہیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ صرف ایک نسل کا عرصہ گزرتے ہی میرے خاندان سے عربوں کا ماضی ختم ہوگیا۔''

''میں تو خیر آپ کا ناکارہ بیٹا ہوں۔ آپ کے بھائی رشید کے بیٹے تو ماضی زندہ کرنے کے لیے گھر سے گئے ہوئے ہیں انہوں نے یہودیوں سے کتنے علاقے خالی کرالیے۔''

''یہ ان جیسے سرفروش نوجوانوں کی چھاپامار کارروائیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ میں یہ کہنے کو زندہ ہوں کہ فلسطین کبھی میرا تھا۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہودیوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے ہیں لیکن اب تم جیسے نوجوان سامنے آئیں گے۔ مرنے کے قریب پہنچنے والی میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ فلسطین کی لڑائی لڑی ضرور جاتی رہے گی لیکن لڑنے والے دشمن کی تہذیب میں رنگے جاچکے ہوں گے۔ تمہاری نمائندگی سب کریں گے میرا نمائندہ کوئی نہیں ہوگا۔ مغربی تہذیب جس تیزی سے پھیل رہی ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نئی نسل کو کوئی نہیں بتاسکے گا کہ عراق المنشیا کے لوگوں نے یہودیوں کی یلغار کو کب تک روکے رکھا تھا۔''

''ابا جان! جب آپ کو معلوم ہے کہ یہی ہونا ہے تو آپ فلسطین کو کیوں روتے رہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ مسلمان کی نظر دنیا پر نہیں، آخرت پر ہوتی ہے۔ میں مرنے کے بعد کہہ تو سکوں گا کہ ایک آزاد ریاست فلسطین کے لیے آواز بلند کرتا رہا تھا۔''

اسمٰعیل ان فلسطینیوں کی نمائندگی کررہا تھا جو آزاد خیال اور مغربی فیشن کے دلدادہ بن چکے تھے۔ ایک طبقہ جہاد میں مشغول تھا لیکن ان کے جسموں پر بھی مغربی لباس تھے۔

☆......☆

مدت ہوئی احمد خلیل مرچکا۔ اسمٰعیل کے عیسائی بیوی سے تین بچے پیدا ہوئے۔ یہ تینوں بچے یورپین طرز رہائش میں رہتے ہیں اور دین اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس نے اپنے بچوں کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان بچوں کو نہیں معلوم کہ عراق المنشیا نام کا کوئی گاؤں روئے زمین پر کبھی تھا۔

یہ بچے 1948ء (قیام اسرائیل) سے قبل کے فلسطین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔